کلیاتِ مصحفی

جلد اوّل

مشتمل بر

دیوان اوّل

غلام ہمدانی مصحفی امروہوی [متوفی 1240ھ / 1825ء]

بتصحیح

نثار احمد فاروقی

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک ۔ 1 آر ۔ کے ۔ پورم، نئی دہلی 110066

کلیاتِ مصحفی

جلد اوّل

مشتمل بر

دیوان اوّل

غلام ہمدانی مصحفی امروہوی [متوفی 1240ھ / 1825ء]

بتصحیح

نثار احمد فاروقی

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔1 آر۔کے۔پورم، نئی دہلی 110066

Kulliyat-e-Mus'hafi
Volume One
By
Ghulam Hamdani Mus'hafi
Edited by: **Prof. Nisar Ahmed Faruqi**

سنہ اشاعت : اپریل۔جون 2003 شک 1925
پہلا اڈیشن : 1100
قیمت : =/220
سلسلہ مطبوعات : 1084

ISBN : 81-7587-004-4

ناشر: ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈس، جامع مسجد دہلی 110006

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ اس کی کارگزاریوں کا دائرہ کئی جہتوں کا احاطہ کرتا ہے جن میں اردو کی ان علمی و ادبی کتابوں کی مکرر اشاعت بھی شامل ہے جو اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور اب دھیرے دھیرے نایاب ہوتی جارہی ہیں۔ ہمارا یہ ادبی سرمایہ محض ماضی کا قیمتی ورثہ ہی نہیں، بلکہ یہ حال کی تعمیر اور مستقبل کی منصوبہ بندی میں ہماری رہنمائی بھی کرتا ہے اور اس لیے اس سے کماحقہٗ واقفیت بھی نئی نسلوں کے لیے ضروری ہے۔ قومی اردو کونسل ایک منضبط منصوبے کے تحت عہدِ قدیم کے شاعروں اور نثر نگاروں سے لے کر عہد جدید کے شاعروں اور نثر نگاروں تک تمام اہم اہلِ فکر و فن کی تصنیفات شائع کرنے کی خواہاں ہے تاکہ نہ صرف اردو کے اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا جاسکے بلکہ زمانے کی دستبرد سے بھی اسے محفوظ رکھا جاسکے۔

عہدِ حاضر میں اردو کے مستند کلاسیکی متون کی حصولیابی، نیز ان کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، لیکن قومی اردو کونسل نے حتی الوسع اس مسئلے پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ کلیاتِ غلام ہمدانی مصحفی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے کونسل قارئین کی خدمت میں پیش کر رہی ہے۔

اہلِ علم سے گزارش ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں دور کی جاسکے۔

(ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ)

ڈائرکٹر

فہرست

دیوانِ اوّل

(الف) غزلیات

شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ
	ردیف الف	
1	تو ہووے باعث شیرازہ ان اجزاے ابتر کا	67
2	بروز حشر ہو سر پر مرے سایہ پیمبر کا	67
3	ایک پھاہانہ میں ناسور جگر پر رکھا	68
4	نام آنسو نے مرے سلکِ گہر پر رکھا	68
5	میں نے سر پر سے اٹھا دیدہ تر پر رکھا	69
6	پر اے دل ایک روز کہیں تو نہ مر چکا	69
7	کر رہا ہے بے قراری پارۂ سیماب سا	70
8	یوں کرتے ہیں امتحان کسی کا؟	70
9	شورِ محشر کی طرح ہر نالہ شور انگیز تھا	71
10	ہاتھ میں گو اس کے یارو نیمچہ خونریز تھا	71
11	ہرجائیوں سے فائدہ کیا اختلاط کا	72
12	کام اک عالم کا برہم کھا گیا	72
13	کبھی نکلا بھی تو ہاں آہ و فغاں سے نکلا	72
14	تو البتہ وہ تلملا تا رہے گا	73
15	گل کو شکستِ رنگ کا پیغام آ گیا	73
16	پاس اپنے تو اے شوخ ستم گار یہی تھا	74
17	تو دیکھو گے مہ خاک میں رُل گیا	74
18	روز اک بے چارہ یاں آ کر کے مَر رہنے لگا	75
19	اک دن میں آئینہ اُسے سو بار دیکھنا	76
20	کر ذبح اس کو ہائے تو قاتل کدھر چلا	77
21	بیٹھے بھی گا ہے جا کے تو ہشیار بیٹھنا	77
22	اس حق میں اشک مرہمِ کافور ہو گیا	78
23	فریاد کرتے کرتے میں رنجور ہو گیا	79
24	خدا کرے کہ برا ہووے اس محبت کا	79
25	مُوا اب میں تو مت روؤ کوئی ماتم سے کیا ہوگا	80
26	ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا	80
27	جس کو سنتے ہی مرے خواب نے پرواز کیا	80
28	سونا تو انھوں نے ہمیں جاں بلب کیا	81
29	اب تک بھی نہ پٹی ہے نہ مرہم ہے ہمارا	81

شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ
30	ہم جانیں ہیں یہ دل نہیں دشمن ہے ہمارا	82
31	زہر بھی تجھ کو کیا نہیں ملتا	82
32	پر دلِ باصفا نہیں ملتا	83
33	گل چاک چاک اپنی جیب وقبا کرے گا	83
34	تب کا آنا بھی اک بہانہ تھا	84
35	غیر از خوناب کچھ نہ نکلا	84
36	اس میں جو گھر نظر آتا ہے سو ٹوٹا پھوٹا	85
37	گیا میں جان سے اس بیوفا کے ہاتھ کیا آیا	85
38	یوں کسی سنگ پہ زنہار نہ شیشہ پھوٹا	85
39	سر رہ ہو گیا روشن زمیں پہ چاند سا نکلا	86
40	طالع نے کیا ہے اسے نخچیر اثر کا	86
41	قبضے پہ ہاتھ رکھ کے ڈراتے ہو ہم کو کیا	87
42	میں شوریدہ ایسے گریباں سے گذرا	87
43	کیوں ہاتھ گیا گل کے گریباں میں صبا کا	88
44	ابرِ سیاہ آکر تربت پہ میری رویا	88
45	اس دل کے تئیں ایک دم آرام نہ دینا	89
46	دیکھنا اس کا جو مشکل تھا میسّر ہو گیا	89
47	اس برس کچھ جلد روز اور شب برابر ہو گیا	90
48	آنکھوں میں مری ہر گل جوں خار نظر آیا	90
49	ظلم بیارانِ دگر کر گیا	91
50	رنگ بہاراں جو سفر کر گیا	92
51	اشک کے قطرے کو گہر کر گیا	92
52	سچ کہہ تو مری جان کے دشمن تو کہاں تھا	93
53	دوش کو کب میرے اس نے تکیۂ بازو کیا	94
54	کیا ہووے الم اس کو خراش جگری کا	94
55	اس سیاہی کو صنم ٹک اپنے گالوں سے لگا	95
56	ٹک آکے پس پردہ ہی آواز سنا جا	95
57	ستم تو ہووے و لے یہ ستم نہیں ہوتا	96
58	دیکھ اسے ہر کوئی ہو جائے ہے سودائی سا	96
59	ہر لختِ جگر روکش گل برگ طری تھا	97
60	چلے فتنے کی یاں کیا دور ہے دامن درازوں کا	97
61	اتنا میں مارے رشک کے تڑپا کہ جی دیا	98
62	شوق دل ہی میں رہا چاک گریبانی کا	98
63	کیا ہے کس نے بھلا امتحاں خدائی کا	99
64	تغافل نے تمھارے خاک میں ہم کو ملا ڈالا	99
65	پوشیدہ کر کے سب سے وعلامہ لے گیا	100
66	لیکن نہ اس کا رُخ کبھی سوے قضا پھرا	100
67	میں تکیے سے تیرے گلے لگ کے رویا	100
68	میں کیا ایک عالم ہے اس دل کا جویا	101
69	دشمن تو ہوا ہمارے جی کا	101
70	پلکوں کی کاوشوں نے سینوں کو چھان مارا	102
71	کبھو تو اس طرف بھی آیئے گا	102
72	کھوت میں گہر آب دار باندھ دیا	103
73	مجھ کو سودائی سمجھ یاروں نے زنداں میں دیا	103
74	میرے اس کے حجاب کس دن تھا	104
75	ابرّ میں آفتاب کس دن تھا	104

شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ
76	لے گیا ہے تو نام ہے تیرا	105
77	صدقے میں اس ادا سے گرمانا	105
78	سب ماجرا ہے اپنی یہ چشمِ خوں فشاں کا	106
79	آ کر عدم سے بھولے نقشا بھی ہم تو واں کا	107
80	یار و مرے اور اس کے کب ربط سخن کا تھا	107
81	کہہ کس طرف کو جاوے اب یہ خدا کا مارا	108
82	یوسف کو زلیخا کے میں زندان میں دیکھا	108
83	صد لختِ جگر دیدۂ گریان میں دیکھا	109
84	اور اس گلے سے اس کی تلوار کا لپٹنا	110
85	سحر کے ہوتے نہ اک قطرہ خوں جگر میں رہا	110
86	وہ رنگ دبو نہ رہا اور وہ نہ رو دمو نہ رہا	111
87	ہوے ضعیف اِدھر ہم اُدھر وہ تو نہ رہا	111
88	ہے تیغ کا سا جو ہر سبزہ تری مسوں کا	112
89	مجھ کو اک نظارہ روزن ہو گیا	112
90	راہ بر قسمت سے رہ زن ہو گیا	113
91	تمھیں ایسے بُرے لگتے ہیں ہم کیا	113
92	پہنچا تلے زمیں کے مردوں کے دل کو دھچکا	114
93	منھ لال ہے پانوں سے ترا گل کی کلی سا	114
94	جوں غنچہ میں عقدہ ہوں پر اپنی ہی زباں کا	115
95	فرہاد نہ کچھ بولا مجنوں نے نہ دم مارا	115
96	گر ہم ذلیل ہو گئے طفلاں سے کیا کیا	116
97	تو زیر خاک نہ یہ بے قرار ٹھہرے گا	116
98	یہ رنگ کیوں ہو مرے اشک سندروسی کا	117
99	ہے ہمیں اپنے نصیبوں کی رسائی کا گلا	118
100	جس وقت اپنے تیروں کا ترکش الٹ دیا	118
101	قیامت ماجرا نالوں کی ہے ہنگامہ سازی کا	118
102	کر ذبح اس کو ہائے تو قاتل کدھر چلا	119
103	آتش خفتہ پہ دامن کو جھٹک کر چلنا	119
104	کب شوخ تصور ترا آگے سے نہ بھاگا	120
105	میں کوچہ بدل دوڑ کے اس کا لیا آگا	120
106	جوش کھا کھا کے مرا خون جگر بیٹھ گیا	120
107	دست و پا ماریں تھے ہم بھی جب تلک تھے دست و پا	121
108	مور چے آ جاویں جوں چیل دماں کے زیر پا .	121
109	ابر کو پانی سے پتلا کر دیا	122
110	خلق کو محو تماشا کر دیا	123
111	بلبل نے کہا سلّمہٗ اللہ تعالیٰ	123
112	بوقت گریہ ہے یاں کس حساب میں دریا	124
113	ہے مدعی وہ محلّہ تمام عاشق کا	124
114	زباں ہلائے سے نکلے ہے کام عاشق کا	125
115	حیف صد حیف کہ یہ شیشہ مکرّر نوٹا	126
116	ناوک آہ جو یک بار جگر سے گذرا	126
117	کیا کیا ہمارے جی میں اے بیوفا نہ گذرا	127
118	رونا وہی راتوں کو وہی سر کو پٹکنا	127
119	اس آہ میں تو ہم نے کچھ بھی اثر نہ دیکھا	127
120	بھلا بیوفا بے مروت بھلا	128
121	سرسری تم کو نہ مشکل سے گذر کرنا تھا	128

شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ
122	میں کیا کہوں کہ اس کو کل کس ادا سے دیکھا	129
123	پردہ بھی دیکھتا تھا ہم نے دغا سے دیکھا	129
124	شام گھر آنے لگا اب وہ سحر کا نکلا	130
125	اور بیش وکم جو ہے بھی تو ہجراں کی رات کا	131
126	اب تلک تو یہ گرفتار وہی ہے جو تھا	131
127	یاں تک کہ خوں میں اپنا مرقع ڈبو دیا	132
128	کہ ان آنکھوں کو اک مدت سے ہے آزار رونے کا	132
129	ان آنکھوں ہی نے آخر کو نکالا تار رونے کا	132
130	بھلا تیرے جی کا تو ارمان نکلا	133
131	یہ دل تڑپ تڑپ کے مری جان رہ گیا	134
132	کچھ وہ بھی مجھ کو دیکھ کے حیران رہ گیا	134
133	خوں میں نہ بھرے کیونکر پھر اس کا کفن سارا	135
134	کس واسطے کرتا ہے تو تیغا علم اپنا	135
135	دیکھ کر اس کو میں اپنے ہاتھ مل کر رہ گیا	136
136	مرغ بسمل کی طرح دو گام چل کر رہ گیا	136
137	کہ دل ہر اک قدم پر لوٹ ہے گبرو مسلماں کا	137
138	کہ ہے چاک کفن کی شکل چاک اس کے گریباں کا	137
139	غضب یہ ہے کہ پردہ درمیاں کا اٹھ نہیں سکتا	138
140	رفتہ رفتہ مجھ کو سوجھے ہے جنوں ہو جائے گا	139
141	مجھ پر تو اک قیامت عہد شباب لایا	140
142	مرنے میں ہمارے کیا رہا تھا	140
143	لازم ہے پاسباں سے اب ہم کو ساز کرنا	141
144	بانکوں میں طرحدار نہ دیکھا تھا سو دیکھا	142
145	اُلٹا ہی نت پھر آیا خط یار تک نہ پہنچا	142
146	خدا جانے کہ بعد از مرگ کیا احوال ہووے گا	143
147	ہر شعلہ آہ کا مری نار جحیم تھا	143
148	فائدہ کیا مرے کڑھ جانے کا	144
149	ہوا یوں معرکے میں عشق کے سینہ سپر کس کا	144
150	منہ تو غرفے سے دکھا دے کبھو چھپ کر اپنا	145
151	ہاتھ رہتا ہے اسی واسطے دل پر اپنا	146
	ردیف ب	
152	میں کروں گریہ تو تا عرش بریں جاوے ڈوب	146
153	سوتے سوتے اٹھے ہمسائے پکار آخر شب	147
154	ہے یہی جاگنے کا میرے سبب آخر شب	148
155	پھسلے کیا پڑتے ہو ہر لحظہ ہمیں پر صاحب	148
156	حق نے یہ چہرہ بنایا ہے خط و خال سے خوب	149
157	بس اپنا تو کام ہو چکا اب	149
158	یاں سے پرواز کیا چاہیے اب	150
159	جھوٹی باتوں سے مراجی نہ جلاؤ صاحب	150
160	یہ بھی کوئی بات تھی بھلا صاحب	150
	ردیف پ	
161	فرمائیے یہ بارے کہ جاتے ہیں کدھر آپ	151

شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ
	ردیف ت	
162	خاطر نشاں کرے ہے ترے تیر کی نشست	152
163	کیا خوش کرے اسے گل دگلزار کی نشست	152
164	کردی ہے پست جن نے کہ تلوار کی نشست	153
165	ہرگز میں اس کی شکل کا دیکھا نہ چیں میں بت	153
166	گیا اس سے نہ آزار محبت	154
167	خلش کرتا ہے آزار محبت	154
168	نہ کیجیے گا ہے اقرار محبت	155
169	کوئی چھپتا ہے آزار محبت	155
170	کتنے اس شہر میں مارے گئے تلوار کی موت	156
171	تب سے کرتا ہی نہیں لطف وعنایات کی بات	156
172	رہے ہے دیدۂ گریاں پہ آستیں دن رات	157
173	روز محشر خاک سے اٹھیں گے ہم طوفاں سمیت	157
174	بہ گئی ہیں کشتیاں اس بحر میں لنگر سمیت	158
175	لخت دل دامن میں گرتے تھے مرے اخگر سمیت	158
176	پہنچی ہے میرے عشق کی اس کو خبر درست	159
177	پیکاں نے تیرے کس کا رکھا ہے جگر درست	159
178	میں وہ کافر ہوں جسے کہتے ہیں تصویر پرست	160
179	دیکھ اس کی شکل آخر ہو گیا صورت پرست	160
180	آہ وفغاں میں گذرے ہے مجھ کو تمام رات	161
181	گلے اس کے تیغا حمائل رہا نت	161
182	مجھ سے نہ ہوا کچھ بھی سرانجام محبت	162
183	سودہ دل یوں ہوا حیران خدا کی قدرت	162
184	رومال اشک خوں میں ڈوبے رہا کریں نت	163
	ردیف ث	
185	گیا کیوں بھول کر کے ملنے کا اقرار کیا باعث	163
186	پھرتا ہے ڈھونڈتا تو اسے کو بہ کو عبث	164
	ردیف ج	
187	آرام وسکوں میں نظر آتا ہے خلل آج	164
188	بھیجے ہے تو کاغذ کو تنک اک لوہو لگا بھیج	165
189	اب تو مرنا ہی پڑا اس غم سے ہم کو لا علاج	166
190	کافر ہو جس کو ہو دل خرم کی احتیاج	166
191	شام سے زلف نے لیا ہے خراج	167
	ردیف چ	
192	اپنے دامن کو مرے ہاتھ سے اے یار نہ کھینچ	167
193	شمع روشن ہو کہیں جیسے شبستان کے بیچ	168
194	کام دونوں کا کیا یار نے اک آن کے بیچ	168
195	چھپتا پھرا میں سایہ سرو دمن کے بیچ	169
196	یہ خبر پہنچے اسے جو جاوے ہے محمل کے بیچ	169
	ردیف ح	
197	گل گریباں پھاڑتے ہیں اپنے دیوانے کی طرح	170
198	سیکھے کوئی تجھ سے پیارے دل کے لے جانے کی طرح	170

شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ
199	رہ گئی یاں کون سی اب جی کے بہلانے کی طرح	171
200	پر کہاں اس میں بہار اس گل رخسار کی طرح	171
	ردیف خ	
201	میں دیکھتا ہوں ان کو تو ہیں ابتدا سے سرخ	172
202	نہ جس بدن کو لگی ہو کبھی ہوا گستاخ	173
203	ہیں برگ لالہ دار سپید و سیاہ و سرخ	173
204	دیکھا اس کو ہو گیا ہے گل تر کا رنگ فخ	174
	ردیف د	
205	بسمل ترا لگتے ہی تو خنجر کے ہوا سرد	174
206	تو بھی ترے ملنے سے دل اپنا نہ ہوا سرد	175
207	دیکھیں یہ بیوفائیاں تا چند	175
208	آ کے لبوں کے جس کے نہ ہو وے شکر سپید	176
209	رو رو کے اب تو نامہ اعمال کر سپید	177
210	نہ گل اس کے عذار کے مانند	177
211	رخ ہے نقش و نگار کے مانند	178
212	وہ کرتا کاش یہ چاک جگر بند	179
213	فراغت سے وہ بیٹھا چشم کر بند	179
214	ہوا لیکن نہ خوناب جگر بند	180
215	قفس کا جس کے نت رہتا ہو در بند	180
216	وہ ہیں بہنے سے ہو جا آب جو بند	181
217	چمن کا وہ ہیں رستہ ہو گیا بند	182
218	تری ہی نذر ہیں اب لے یہ مشت پر صیاد	182

شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ
219	اڑ جاؤں قفس لے کے نہ ہوں گر مرے پر بند	183
	ردیف ذ	
220	گیا برباد ہی مانند کبوتر کاغذ	183
221	ہو کبوتر کی طرح آپ پر افشاں کاغذ	184
222	ساتھ عاشق کے غرض اس کی ملاقات ہے شاذ	184
	ردیف ر	
223	کہ بیٹھے دل زدہ کوئی سایۂ سمن میں دیر	185
224	قاتل کو بیقراریٔ بسمل سے کیا خبر	186
225	تیری گلی میں عاشق آئے تھے کیا سمجھ کر	186
226	باز آ کہیں ان چالوں سے از بہر خدا پھر	187
227	ان باتوں سے آوے گی بلا شہر کے اوپر	187
228	کرتا ہے کب ہمارے وہ احوال پر نظر	188
229	نہ ترا پیار بھلا اور نہ ستم ہی بہتر	188
230	جلاد سر پہ آ گیا شمشیر کھینچ کر	189
231	پھر دیر کیا ہے آیئے شمشیر کھینچ کر	189
232	مل کے تنہا تو گلے سے کبھی لگ جایا کر	189
233	بیٹھا ہوا غم میں مرے فریاد کیا کر	190
234	کتنا پچھتائے ہیں ہم کل اس کا داماں کھینچ کر	190
235	پھر آ گیا ہے وہ بت کافر گھمنڈ پر	191
236	کام در پردہ کیا تم نے ہمارا آخر	191
237	اس بت کے بھی رہتی ہے تلوار کمر پر	192
238	آئے تری گلی سے ہم خون میں نہا کر	192

شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ
239	کہ لاعرش کو یاں اتار از میں پر	193
240	وہ نالہ کھینچے کے جو پہنچے چمن سے دور	194
241	رووے نہ کیونکے شیشہ بھلا پھوٹ پھوٹ کر	194
242	ہے گھٹا کا جھومنا گلزار پر	195
	ردیف ز	
243	سوے فلک دراز ہیں دست دعا ہنوز	195
244	لہو بھرا تر ادامن ہے ہم کو دستاویز	196
245	ساون کا سا گذرے ہے میاں مجھ پہ تو ہر روز	196
246	اپنی چالوں سے تو نہ آیا باز	197
247	ہے اسی ڈھب پہ نگاہ غلط انداز ہنوز	198
	ردیف س	
248	کی حق نے عطا تیرے تئیں صورت بلقیس	198
249	ہوں داغوں کی کثرت سے میں ہم بستر طاؤس	199
250	لائے ہیں جو یہ رنگ ہزاروں پر طاؤس	199
251	چشم پوشی سے اس کی آہ افسوس	200
252	جی کی جی میں رہی ہزار افسوس	201
253	کیا کہیں دل نے کیا کیا افسوس	201
254	ہم سے وہ بھاگتا ہے لاکھوں کوس	202
255	کہ طرحدار ہے زیبندہ طرحدار کے پاس	202
256	لوگ سب جمع ہیں اس نرگس بیمار کے پاس	203
	ردیف ش	
257	گل تو معلوم لگے ہاتھ مرے خار ہی کاش	203
258	ہمارے عشق کی ہوتی ہے یاں ویسی ہی افزایش	204
259	دن ہیں برسات کے اور رہ میں خطر ہے در پیش	204
260	اے گریہ چھڑک آب کہ تک جاوے تب آتش	205
261	ہوتا نہیں مجھ سے وہ دل آرام فراموش	205
262	رہتی ہے ہمیں اک ترے دیدار کی خواہش	206
	ردیف ص	
263	ہرگز نہیں اور کسی سے اخلاص	206
264	یا اشک مصفا ہیں یا خون جگر خالص	207
	ردیف ض	
265	ہے زلف بھی مبتلاے عارض	207
266	پیار کی نظروں سے ہوتا ہے نثار عارض	208
	ردیف ط	
267	جو سو سو گالیاں مجھے دیتے ہو بے نقط	209
268	جوں گل ہے چاک جیب کو دلماں سے اختلاط	209
	ردیف ظ	
269	میں عشق کی داستاں ہے محفوظ	210
	ردیف ع	
270	پھر ہوا موسم برسات شروع	210
271	تدبیر و تلاش کی ہے اک وضع	211
272	ہم غمزدوں کی بزم میں کب ہے گذار شمع	211
	ردیف غ	
273	کرتی ہے خون بے گنہاں گام گام تیغ	212

شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ
274	تو اس نے کھینچ کے میرے ہی اک لگائی تیغ	213
275	قیامت ایک غریبوں کے سر پہ لائی تیغ	213
276	برنگ لالہ ہے یہ آتشیں داغ	214
277	کیا جانے علم قتل کو اب کس کے کرے تیغ	215
	ردیف ف	
278	ہم کو قضا جولائی تو شمشیر کی طرف	215
279	خاطر کو میل ہی نہیں آرام کی طرف	216
280	موتی رہے کانوں میں ڈھل اک اس طرف اک اس طرف	217
281	یا میری اک آہ ہے تری زلف	217
282	اس سے مرنا ہی بھلا اب کیا رہا جینے کا لطف	218
	ردیف ق	
283	کچھ نہ پوچھو بد بلا ہوتا ہے عشق	218
284	جان دیتے ہیں آن پر عاشق	219
285	کچھ آپ ہی آپ پیدا ہو گیا عشق	219
286	رات دن اکثر اٹھایا کرتے ہیں ایذائے خلق	219
	ردیف ک	
287	دیکھیں تو بتاں کو بھی بھلا آ کے ذرا ایک	220
288	اے فغاں اس وقت تو تو مجھ کو رکھ معذور تک	220
289	یہ باتیں ہو چکیں بس چشم تر تک	221
290	پر غش سا آ گیا وو ہیں پہنچے جو در تلک	222
291	پہنچا تو ہے یہ نالہ مقام اثر تلک	222
	ردیف گ	
292	اُٹھ صبح ہوئی ہے کچھ دعا مانگ	223
293	کچھ مکدر سا نظر آیا مجھے جیحوں کا رنگ	223
294	ویسا تو کہاں پاوے میاں حور و پری رنگ	224
	ردیف ل	
295	بھر جاویں گے روتے روتے جل تھل	225
296	یعنی یہ ہے عاشقوں کا مقتل	226
297	اب آپ کو نہ کر دل شاش مبتذل	226
298	آخر کو جذب عشق نے یاں بھی کھلائے گل	227
299	ہم نے نظروں سے چنا گلشن دیدار کا پھل	227
300	بیٹھے بیٹھے ہو گئے ہیں ہم گرفتار خیال	228
301	گریے نے دل سے خوب نکالا بخار دل	229
302	جیسے ہوتا ہے پرانی کسی تلوار میں بل	229
	ردیف م	
303	عالم کے میاں خانہ برانداز ہوئے تم	230
304	تس پر بھی چین دیتی نہیں جستجوئے چشم	230
305	پردے میں نہاں بہت رہے ہم	231
306	ان دنوں پھر جی چلا بیٹھے ہیں ہم	232
307	مت مجھ سے منہ چھپائیو اے آرزوئے چشم	232
308	کوئی چال ہے یہ بھی آہ ظالم	233
309	قاصد تو صبح آئیو جا لکھ رکھیں گے ہم	233

شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ	شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ
310	اور آنکھوں سے سیکھا گل بادام تبسم	234	331	یہ چشم کی گردش کدھر یہ شوخی مژگاں کہاں	245
311	جنبش لب ہی میں اپنا تو ہوا کام تمام	234	332	اپنا جو روز مقرر ہے سو پا رہتے ہیں	245
312	نکلی نہ دل سے پر ہوس سوختن تمام	235	333	سلک گوہر ہو گیا ہے تار تار آستیں	246
313	اس مجھلے میں کاشکے ہو جاویں ہم تمام	235	334	منہ موڑ دیں گی ورنہ مری سخت جانیاں	246
314	کیا کیجیے کہ اب تو پڑا ہے خدا سے کام	236	335	ہم بھی اپنے گماں میں کچھ ہیں	247
315	یا ترستے ہیں قفس میں باغ تک جانے کو ہم	236	336	سنتے بھی ہو جو بولتے ہیں لوگ بولیاں	247
316	ہیں بہ کنج قفس فغاں میں ہم	237	337	جاتی رہی ہے آہ سے تاثیر کیا کروں	248
317	گر پانو اٹھایئے تو یہ عرصہ ہے دو قدم	238	338	تجھ ساتھ کرے میاں وفا کون	248
318	آئے تھے شوق دام میں اڑ آشیاں سے ہم	238	339	اک حق نے دیا ہے ہمیں آزار بغل میں	249
319	گو یاد ہووے ان کو نہ مجھ خستہ جاں کا نام	239	340	آتا ہے دوڑ دوڑ جو یہ بے سبب نہیں	249
320	اُٹھ کر ترے دروازے سے جانے کے نہیں ہم	239	341	وہی نت کی آہ و زاری وہی اضطراب تجھ بن	250
321	حق آشنائی ادا کر چکے ہم	239	342	جو تیرے ملنے والے ہیں کبھی غمناک رہتے ہیں	250
322	کیا لطف میں گذرا ہے غرض رات کا عالم	240	343	شمع ساں استخواں پگھلتے ہیں	251
323	وہ رات تھی یا رب کہ طلسمات کا عالم	241	344	ہاں اس کا ڈر نہیں نہ سنورات اگر کہوں	251
	ردیف ن		345	بانہوں کے تئیں ڈال دے اے یار گلے میں	252
324	بیش ازیں اے عشق اب رسوا نہ کر میرے تئیں	241	346	کھنچے تیغ کہ مدت سے فدا ہم ہی ہیں	252
325	صبح گلشن میں نہ کرنا تھا گذر میرے تئیں	242	347	رونے ہی سے ٹک اپنا دل شاد کروں روؤں	253
326	سو گذریں ہیں باتیں یار جی میں	242	348	لاؔ کہ قصر تن کی ہے دیوار درمیاں	253
327	مخترع ہم ہیں کہ آتش ہے بھری شیشے میں	243	349	مژگاں ہیں اشک سرخ سے پھولوں کی ڈالیاں	254
328	ہم تمھیں اپنا جان دیتے ہیں	243	350	بانہیں گلے میں یار نے کب آکے ڈالیاں	254
329	باغ میں جاکے سرو کو قد کی لچک دکھا کہ یوں	244	351	دیکھا جو ہم نے اس کو تو آنکھیں نکالیاں	255
330	ایک ہم ہیں کہ پرے بیٹھے ہیں	244	352	جوں ہی یہ بات کہی اس سے تو بولا کہ نہیں	255

شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ	شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ
353	رات دے آہ وزاریاں کیا تھیں	256	375	یاں تک کہ آخرش کو اسے مار کے پھریں	269
354	نہ سوئے ڈال کر اک شب گلے میں یار کے باہیں	256	376	ہم اپنی بے نصیبی کے ہاتھوں سے داغ ہیں	269
355	وہ جو اک چیز ترحم تھی بتاں میں وہ نہیں	257	377	ان نے تیری سی کہاں پائیں ہوائی آنکھیں	270
356	جی تو چاہے ہے ولیکن یار کی خواہش نہیں	257	378	کیوں نہ دوں اس کے تئیں دل سے دعائیں لاکھوں	270
357	یا پڑے بہتے ہیں اب لخت جگر پانی میں	258	379	میں ترے واسطے مانگی ہیں دعائیں لاکھوں	271
358	تھرتھری پڑ گئی ہر لہر او پر پانی میں	258	380	وہی راتیں وہی بیداریاں ہیں	271
359	شکل آغوش ہے ہر ایک لہر پانی میں	259	381	تہِ ہر مو یہاں خنجر چھپے ہیں	272
360	عجب کیا ہے پریشانی کرے تاثیر پانی میں	260	382	اس نے آنکھیں ہمیں دکھادی ہیں	272
361	دے آنکھیں نہیں اب جو ہم دیکھتے ہیں	261	383	شمشیر جنگ یعنی مرزا احمدی خاں	273
362	یا اب اک جھپکی کو ترسے ہے نظر آنکھوں میں	261	384	لے آنکھوں سے لگاوے گل تیرا طرف داماں	274
363	اس کا مارا کوئی جیا تو نہیں	262	385	کانپتے پانو وہاں رکھتے ہیں	274
364	اپنے ہی چاک دل کا احوال دیکھتے ہیں	263	386	جگہ سیکڑوں ہیں ٹھکانے بہت ہیں	275
365	ہر لب گرد ساغرِ تبخالہ کروں میں	263	387	کیا سماوے بہار آنکھوں میں	276
366	ہائے ان آنکھوں سے یہ رنگ گلستاں دیکھوں	263	388	عمر گذری کہ میں اس کام کے نزدیک نہیں	276
367	شکر خدا کہ آرزوے جاہ ہی نہیں	264	389	ہزاروں کے جی کو تلف دیکھتا ہوں	277
368	بیتاب ہوں نظارہ گلشن کی ہوس میں	265	390	پھر ان دنوں تو تیرے لچھن سے جھڑ گئے ہیں	278
369	خواہی اسے ہاتھوں میں رکھے خواہ قفس میں	265	391	رویا بہت میں رکھ کے وہیں منہ پر آستیں	278
370	میں تھا آزادہ دل اپنی گرفتاری پہ روتا ہوں	266	392	اپنے ہمیں دکھاتی ہے تب جو ہر آستیں	279
371	ہر اک بات میں چٹکلا باندھتے ہیں	266	393	ہم لگے جاتے جو ہیں ان سے برا کرتے ہیں	280
372	تو ہم کو ٹھہرنے دیں گی نہ یک جا دل کی بیکلیاں	267	394	شام تک تیری ہی پھر راہ تکا کرتے ہیں	280
373	رکھا تری خواہش نے ہمیں روز سفر میں	267	395	عشق کے ابتدا کی باتیں ہیں	281
374	کچھ ان دنوں میں آنکھیں لگیں یار کی پھریں	268	396	یا رات اندھیری میں تارے چھٹک رہے ہیں	282

شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ
397	جان سے لاکھوں اس نے مارے ہیں	282
398	تو برچھیاں سی کلیجے کے پار ہوتی ہے	282
399	دو چار نالے ہم بھی ناچار کھینچتے ہیں	283
400	تمام روز رہا ہے ملال میرے تئیں	284
401	دے قتل پر ہمارے تلوار باندھتے ہیں	285
402	جو یار و مری آنکھیں پھر جوش کر آئی ہیں	285
403	معلوم نہیں مجھ کو کہ میں کون ہوں کیا ہوں	286
404	جب دیکھتا ہوں تجھ کو آنکھیں بھر آتیاں ہیں	286
405	فتنہ اٹھے ہے ایک جہاں بیٹھتا ہوں میں	287
406	جی تو کرتا نہیں جانے کو وے لے جاتے ہیں	287
407	تا نہ اس بات کا چرچا ہو مری جان کہیں	288
408	یار و واز بہر خدا دیکھی ہے یہ آن کہیں	288
409	بانکے مغل بچے کریں خانہ جنگیاں	289
	ردیف و	
410	پردے میں نہ فلک کے یہ آواز ہے سنو	290
411	مے سی چھلکے ہے یہ مینا دیکھیو	290
412	کس دھج سے قدم پڑتا ہے انداز تو دیکھو	291
413	مزہ گلگشت کا گلشن کے بیماروں سے مت پوچھو	291
414	آنکھوں کا اشک سرخ سے یہ رنگ ہے تو ہو	292
415	غم میں اس قد کے اک آہ دل ناشاد ہے سرو	293
416	بے جگہ رات مگر جا کے کہیں بیٹھے ہو	293
417	دردسر مجھ کو نہ دو جی مرا بیکل نہ کرو	294

شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ
418	از بہر خدا ناوک جاناں کو نہ چھیڑو	294
419	کیا مدعا ہے اس سے مری جان یہ کہو	295
420	الٰہی دیکھیے عفو گناہ کیونکر ہو	296
421	یہ نہیں ممکن فقیر اس آستاں سے دور ہو	296
422	تو نہ کہہ پیارے اسے اپنی زباں سے دور ہو	297
423	دل کی بیتابی مری یارب کہاں سے دور ہو	297
424	تلوار لیے ہاتھ میں جاتے ہو کدھر کو	298
425	خود وفا گر نہ ہمیں اس میں وفا ہو کہ نہ ہو	298
426	میاں کیوں کھینچتے ہو تیغ کو کیا کام کرتے ہو	299
427	نہیں پاتا میں اپنے ساتھ ہرگز آشنا تجھ کو	299
428	سر پیٹ لیا دیکھ کے میں اس کی جبیں کو	300
429	جیتے تو نہ چھوڑوں گا میں اس مہر جبیں کو	300
430	سورج نے بھی دیکھا نہیں جس پردہ نشیں کو	301
431	کوئی جاوا سے خبر تو کرو	302
432	تیر مژگاں کا ہدف سینے کو کر دیکھیں تو	302
433	ہم بھی شیخی تری اے دیدۂ تر دیکھیں تو	302
434	یوں چاہو تو ہم کو مار ڈالو	303
435	تس پہ کہتے ہو دیا ہے تجھے لو اور سنو	303
436	پھر تو خطرے ہیں جو ایسے میں یہ ناکام بھی ہو	304
437	بس جی بس دیکھ لیا میں تمھیں جاؤ جاؤ	304
438	وہ کون ہے کہ جس پہ میاں خشمگیں ہے تو	305
439	آتا ہے تجھ کو تو آ جیتا ہوں اب تلک تو	306

شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ
440	اور ہووے بھی تو اس سے صحبت برآر کب ہو	306
441	مستعد بیٹھے ہیں ہم یاں سے سفر کرنے کو	307
442	تس پہ پھر حکم ہوا شہر بدر کرنے کو	307
443	دل گیا وہ ہیں اسے میری خبر کرنے کو	308
444	آیئے ہم بھی ہیں دنیا سے سفر کرنے کو	308
445	تم ہمارے پاس تو اک شب کو رہ جایا کرو	309
446	دل بس گئے ہیں سیکڑوں بیداد دیکھیو	309
447	مرنا ہی جب آیا تو مری جان کہیں ہو	310
448	بجی ہے اس نے بھی تلوار دیکھیے کیا ہو	311
449	جس بات کو جی چاہے ہے وہ بات کہیں ہو	312
	ردیف ہ	
450	رہ گئی ضعف سے آکر سر مژگاں پہ نگاہ	312
451	کیا آئینہ دیکھے ہے مری جان ادھر دیکھ	313
452	عاشق نہیں پھر وہ جو کرے جان کا صرفہ	313
453	اللہ رے ترا غرور اللہ	314
454	شفقِ صبح تو ہے زور بہار آلودہ	314
455	پر کس کو دل و دماغ ہے یہ	315
456	ایک اک دم میں دراند از صد افغان ہے یہ	315
457	پر ہو تو رام کسی کا کوئی امکان ہے یہ	316
458	خاک میں مل جائے گی ساری بہار آئینہ	316
459	اپنے پردے میں ہوا ہے وہ شکار آئینہ	317
460	لاکھوں کے بیچ چھپتی نہیں پیار کی نگاہ	318
461	اک دم تو مرے پاس بھی از بہر خدا بیٹھ	318
462	اے فتنہ برخاستہ از بہر خدا بیٹھ	319
463	پھر تس پہ اتنی تلخی ہے یہ بھی بات تحفہ	320
464	دیکھ تو اک تری خاطر میں سنا کیا کیا کچھ	320
465	میکشو لاؤ بھی کیدھر ہے کہاں ہے شیشہ	321
466	اس تمنا میں کہ دیکھے گل وگلزار کا منھ	322
467	گو تلخ بولے کام ہے کیا باغباں کے ساتھ	323
468	سر اٹھانے نہیں دیتا ہے یہ کیا درد ہے آہ	324
469	کہیں کچھ ہے کہیں کچھ ہے کہیں کچھ	324
470	بعد ازاں آ مرے جگر کو دیکھ	325
471	صدقے تیرے میں ٹک ادھر کو دیکھ	325
472	اک ذرا جوش لالہ زار تو دیکھ	326
	ردیف ے	
473	کہ سدا نغمہ سرا تھے چمن و بستاں کے	326
474	ہم پھاڑ کر گریباں صحرا میں جا کے بیٹھے	327
475	کھل گئے ایسے کہ ہم سب کام سے جاتے رہے	328
476	پھر تس پہ یہ غضب ہے چشمک ہے جھانولی ہے	329
477	اپنا دل افسردہ تصویر کی کلی ہے	329
478	ہم نے بھی اپنے دل میں کیا کیا خیال باندھے	330
479	جس میں ترا اسب بدن چھپا ہے	330
480	دیکھ اب کوئی دم میں مرتا ہے	331
481	پر چتا نہیں دل جہاں بیٹھے	331

شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ
482	گر ہیں بھی تو اس نری آواز کے صدقے	332
483	شعلہ بے شرارہ بے آتش ہے بھبوکا ہے	332
484	لیک یہ نہیں معلوم ہم کدھر کو چلے	333
485	واں مارے نزاکت کے تلوار نہیں اُٹھتی	333
486	پر ہاتھ کا بھی دزدِ حنا اُس کا زور ہے	334
487	کیا دور ہے گر اس کو سورج کا سلام آوے	334
488	کر آپ تطاول مجھے بدنام کیا ہے	335
489	بے طاقتی دل نے غرض کام کیا ہے	335
490	ہے ہے شب فرقت میں مری جان نہ نکلی	336
491	کرتے ہی کچھ کنویں میں یہ بجلی سما گئی	337
492	ہر رات مجھ کو آ کے ستاتی ہے چاندنی	337
493	جو کام ہو نہ سکے اس کا نام کیوں لیجیے	338
494	نالے ہمارے ضعف سے کب واں تلک گئے	338
495	سر کاٹ کے عاشق کا جو فتراک سے باندھے	339
496	گر تارِ جگر ہو نہ تو کیا خاک سے باندھے	340
497	دھجی تو وہ میرے بھی دل چاک سے باندھے	340
498	ہم آنکھوں سے یک لخت خوناب روئے	341
499	یہ آرزو ہے مجھ کو کہ تو خوب رُو رہے	341
500	چاہے تو کرے راہب بت خانہ کو ناجی	342
501	کوئی کس طرح دیوے داد میری	342
502	پھرتے ہو شبنم کا جامہ بر میں بھڑکائے ہوئے	343
503	پر زلف بھی فراق میں شانے کے لٹ گئی	343
504	گو پلٹی اس میں کچھ مری قیمت نہ گھٹ گئی	344
505	اور بے خبر آوے بھی تو پھر جانے نہ پاوے	344
506	صدقے میں گیا تیرے اس آنکھ لڑانے کے	345
507	گاو زمیں زمین کے نیچے اُچھل پڑی	345
508	پھر اس دل کو آزار پیدا ہوا ہے	346
509	ہاتھ آ جائے گا خنجر تو جگر چیریں گے	346
510	آرسی کس نے یہ لے جا کے اسے دکھلا دی	347
511	مجھ کو اک آن میں بجلی کی ادا دکھلا دی	348
512	کہیں سے پی ہے تو نے یا اٹھا ہے نیم خوابی سے	348
513	پر بات کو بھی میری ذرا مان لیجے	349
514	آرسی میں منھ کو اپنے منھ دکھایا کیجیے	350
515	کہ دیکھے سے جنھوں کے جان لہراتی ہے کالوں کی	350
516	لگی ہو چوٹ جس کے دل پہ ان چھڑیوں سے بالوں کی	351
517	آفت ہر اک نشاں پر آئی	352
518	ہم نے کیوں چھیڑا انہیں کیا ہم سے نادانی ہوئی	352
519	آشیاں سے مجھے کچھ ہو گئی ہے وحشت سی	353
520	مقدور ہر کسی کا نہیں میری ہم رہی	353
521	کوند بجلی کی کہوں یا یہ لپک موتی کی ہے	354
522	جو دل میرا زنبور خانہ ہوا ہے	354
523	اس مسی سے کتنوں کو ابھی مار اٹھا ہے	355
524	تو بولے تو ہو زندگانی ہماری	356
525	کاش ہم اس بت کافر سے نہ یاری کرتے	357

شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ	شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ
526	رات کیا آتی ہے اک مجھ پہ عذاب آتا ہے	357	548	ترے کوچے سے جو چمن تلک گل اڑاتی خاک صبا گئی	370
527	چمپا سے ترے بدن کے صدقے	358	549	سو صورتوں سے آنکھ مرے بے خبر رہی	370
528	کسو سے ہمیں یاں لڑا کر رہیں گی	359	550	نہ خیال دل شیدا ہے تجھے	371
529	میں نے رو رو کے لہو ہر مژہ عنابی کی	359	551	اس نے کتنوں کو مار رکھا ہے	372
530	تو پہلے اس پہ اپنا دل گیا ہے	360	552	ہرگز کہیں دو شخص میں الفت نہیں رہی	372
531	کھائیں سو ٹھوکریں پرواں سے نہ سر کے آگے	360	553	اس کے بن دیکھے نہیں ایک دم آرام مجھے	373
532	خون کتنوں کے ہوئے یار کے گھر کے آگے	361	554	دن رات اُسے کام ہے خوں خواری دل سے	374
533	جو پھرتا ہے گلیوں میں زنار باندھے	361	555	کیا میں نہیں واقف تری بیزاری دل سے	374
534	ہیں ایسے کہاں نصیب میرے	362	556	اک قاتل خوں خوار سے ہی آنکھ لڑی ہے	375
535	ضرر ہوا پنے تئیں جس کے ملے سے	362	557	جو ہر رگ گل خار سی نظروں میں گڑی ہے	376
536	کبھو ہم سے بھی گفتگو تھی کسو کی	363	558	ہوتی ہی نہیں بزم تو اغیار سے خالی	376
537	آگو زباں تھی لیکن اب گوش کر دیا ہے	363	559	سجدہ محراب میں کیے ہی بنے	377
538	جیسے چراغ ہم کو خاموش کر دیا ہے	364	560	خون دل ہم کو اب پیے ہی بنے	377
539	نظروں میں میری یار کی صورت جھمک گئی	364	561	یہ دل شایستہ کب اس جور کے ہے	377
540	کیجیے سیر کوئی دم تو فضا اچھی ہے	365	562	اپنے مشتاقوں کو دیدار دکھائے ہی بنے	378
541	نت مرے ساتھ چلی جاتی ہے کیں ویسی ہی	366	563	چند پریشاں نظری کیجیے	379
542	میں ادھر تڑپوں ہوں اور یار اُدھر ترسے ہے	366	564	اب تلک یاں گلاب چھلکے ہے	379
543	وابستہ اک نظر کی تمنائے خلق ہے	367	565	اے دیدہ اور رو کہ ابھی شام دور ہے	380
544	بہر نظارہ بے ہودہ غوغائے خلق ہے	367	566	پھر تو نے رنگ اپنے اے چشم تر نکالے	380
545	عاشق کو تجھ سے جائے شکایت کہاں رہی	368	567	پر تو بھی تو نے رکھی نہ تلوار ہاتھ سے	381
546	کشتی نوح اسی گریے نے طوفانی کی	368	568	ٹک ہم کو بھی خاک سے اٹھا لے	382
547	حسرت نصیب ہم تھے کہ زنداں میں مر گئے	369	569	اک جہاں جسم و جاں سے اٹھ جاوے	382

شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ	شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ
570	یاں روز یہی واقعہ درپیش رہے ہے	383	592	جا کسی اور ہی کو اب کوئی دم دیکھیں گے	394
571	سر و ساماں میں مرے برق دوہیں پڑتی ہے	383	593	ہر قدم قتل عام کرتا ہے	394
572	کیا کروں خون دل آنکھوں سے بہا جاتا ہے	383	594	لے چلو واں مجھے جس جا گہ گذار اس کا ہے	395
573	مژہ کا تیری رخ پھر کچھ ادھر معلوم ہوتا ہے	384	595	کب صبح ہووے یہ یہ شب دیجور دیکھیے	395
574	الفت تری اس قدر بہت ہے	384	596	مانند نقش پا مرا بستر زمین ہے	396
575	کچھ خبر مجھ کو دل اپنے کی نہیں مدت سے	385	597	مسجود خلق ہے یہ عجب سرزمین ہے	396
576	ہم نے بھی خون پہ یاں اپنی کمر باندھی ہے	386	598	کیا خاک کربلا یہی کافر زمین ہے	397
577	تس پہ تری پازیب کی جھنکار غضب ہے	386	599	حق نے گردی ہے تجھے آنکھیں تماشا دیکھ لے	398
578	اب اس گلی کا ہم بھی جانا ہی کم کریں گے	387	600	گر نہیں تیغ تو خنجر ہی میاں لاؤ بھی	398
579	طبع ہی مبتلا بھی ہوتی ہے	388	601	غیر سے یوں منھ پھرانا چاہیے	399
580	جاتا ہے کدھر او بے مری جان کے ٹکڑے	388	602	شور جنوں کدھر گیا زنجیر کیا ہوئی	399
581	اور ہو بھی تو یاں طاقت پرواز کہاں ہے	389	603	ہم گئے جان سے پر تری جدائی نہ گئی	400
582	تن بے جاں میں جان پڑتی ہے	389	604	آنے لگا لہو سا ہر انگشت کے تلے	400
583	اٹھنے کی ترے در سے ہم کھا کے قسم بیٹھے	390	605	یوں ہی لیل و نہار گذری ہے	401
584	وہی ادا ہے وہی عظم و شان باقی ہے	390	606	خالی بغل ہی ہم تو کئی بار سو گئے	401
585	ہم خون جگر کیوں نہ بھریں جام میں اپنے	390	607	اک صنم زہرہ جبیں چاہیے	402
586	دیکھیو بے قرار کیسا ہے	391	608	بس شرم و حجاب دور کیجیے	402
587	پر دل زار کا انداز فغاں اور ہی ہے	391	609	سحر تک ہمیں آہ و زاری میں گذری	403
588	جس سے کوئی تم کو سراہے وہ زباں اور ہی ہے	392	610	مری یاں سدا آہ و زاری میں گذری	403
589	جیوے کوئی مرے کوئی بیمار ہو کوئی	392	611	اہل زمانہ ہم پہ یہ بیداد کر گئے	404
590	پر جی ہی کا دشمن ہو تو کیا کیجیے اس سے	393	612	عاشق کے حق میں پیارے تسخیر ہے تو یہ ہے	405
591	ہم ہیں اور یہ رات ہے ساری	393	613	ہم رہیں یاں ہاتھ ہی ملتے ہزار افسوس ہے	405

شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ
614	آئینہ ہوا اس کا ہم زانو ہزار افسوس ہے	406
615	یعنی کس طرح تو ہمیں یاد کیجیے	406
616	چلیے چمن میں رویئے فریاد کیجیے	407
617	آتا ہے نظر سرخ ازار گل مہندی	407
618	یہ بھی نہ کیجیے جو مروّت نہ کیجیے	408
619	بہ ہوش باش کہ عالم رواروی پر ہے	409
620	تا صبح ہوتے ہم پہ طوفان ہو گئے	409
621	ہم لاکھ حسرتوں سے ہم آغوش ہو گئے	410
622	ایک بوسہ بھی عوض اس کے نہ لوں ایسے جی	410
623	بگڑی بندے سے گر خدا سے	411
624	ہمارے حال پہ کرنی نگاہ بھول گئے	411
625	اے بتاں ہم تو خدا کے ہیں غضب کے مارے	412
626	آنہ اے اشک ہے آنکھوں میں تری جا خالی	412
627	جی ہے سو جدا عذاب میں ہے	413
628	محجوبہ ابھی حجاب میں ہے	414
629	اس کے دامن کے پکڑنے کو غبار اٹھتا ہے	414
630	کیا یاں سے بھی اڑ کر کہیں برباد ہو کوئی	415
631	اس کے واقف ہو میاں کیا کوئی سر رشتے سے	415
632	سانپ کے کاٹے کو لگتا ہی ہے ڈر رشتے سے	416
633	ہم اے کاش ان انکھڑیوں سے نہ ملتے	417
634	تو دیکھے جو یک بار تو پتھر بھی پگھل جائے	417
635	کچھ آج زور سج سے آتے ہو دھج بدلتے	418
636	میں ہوں ادھر کھڑا پس دیوار پھینک دے	418
637	پھر تب سے خواب میں بھی نہ آئے بھلے گئے	419
638	اس قفس میں کوئی اسیر ہی ہے	419
639	اجل آوے مرے رقیبوں کی	420
640	اپنے بھی اشک کے ہیں یاں بے شمار دانے	420
641	یہ چھیڑ کیا نکالی اے یار بیٹھے بیٹھے	421
642	آ گیا یاد تو اک بار ہنسے اور روئے	421
643	میں صورت ہی تکتا ہوں قاتل کی اپنے	422
644	کہنے لگا تجھے کیا' چل تجھ کو کام کیا ہے	422
645	جو گر دیے مرتا ہوا سے زہر نہ دیجیے	423
646	بجائے خار و خس موتی ہی رولے جو زمیں جھاڑے	423
647	کیا مرے تئیں عشق نے اقبال دیا ہے	424
648	ایک تو شب یاں بھی سحر کیجیے	425
649	کوئی مجھ کو بتا دو وہ مرا یار کدھر ہے	425
650	دیکھیے آج کی شب کیوں کہ بسر ہوتی ہے	426
651	تو کافر بل نہ دے اس کو کہ یہ زنار نازک ہے	427
652	شمع تک پہنچے نہ پروانے لگن میں مر گئے	427
653	وہ طفل شوخ کیا معنی جو نک اک جائے پر ٹھہرے	427
654	سوچتے کیا ہو کہ ہم پر کل قیامت ہو گئی	428
655	تم کو کیا تھا اور بھلا یار کس لیے	429
656	تو حلقے حلقے میں لاکھوں ہی دل کو بند کرے	430
657	تکلف برطرف منت ہمارے سر پہ رکھتا ہے	430

شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ	شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ
658	جس کی خوں ریزی کو تلوار نہ خنجر پہنچے	431	679	گو تجھ پہ میاں جان ہو قربان کسی کی	441
659	مشت خاک اپنی کی طاقت ہے کہ اڑ کر پہنچے	431	680	جس طرح لالہ کہیں ہو گل خنداں کے تلے	442
660	اک یار ملا ہم کو سو اس وضع کا اے وائے	432	681	ننگ شرم ہے تو بھی تری مژگاں کے تلے	442
661	ان آنکھوں سے موتی کی اب کھان نکلتی ہے	432	682	آنکھوں کا مسکنا ہوش ربا ہر ایک پلک پھر ویسی ہی	443
662	حق میں عاشق کے قیامت ہے خدا خیر کرے	432	683	اُسے کیا وضع خوش آئی ہے تیری	444
663	دل بہت بے قرار ہوتا ہے	433	684	ہو کے محظوظ گل اے وقت تو خوش، بولے ہے	444
664	سرسبز ہو شاگرد کب استاد کے آگے	433	685	تو جاوے مرغ چمن بھول داستاں اپنی	445
665	صدقے ترے میری جان صدقے	434	686	چاندی کے ورق پر ہے یہ تحریر طلا کی	445
666	پڑے جب کچھ مصیبت تب ہمیں اللہ یاد آوے	434	687	لے کے چٹکی رات وے دل مل گئے	446
667	جو ہم پہ پڑی آ کر اس عشق میں کھے گذرے	435	688	کافر نگاہ اس کی بجلی سی آ پڑی ہے	447
668	دیکھو تو تہِ نقاب کیا ہے	435	689	باندھے گا بھلا کون ترے زخم کو پٹی	447
669	منہ کھول بھی دو نقاب کیا ہے	436	690	مرے سلام کو کب وہ جبیں پہ ہاتھ دھرے	448
670	خورشید پر دو دستی شمشیر کھینچتا ہے	436	691	کیا کرتا ہے قاتل کا کہیں ہاتھ تو تھم لے	448
671	عشاق تھے ہزار سو دو چار رہ گئے	437	692	ہمیں اس وضع تر سایا نہ کیجیے	449
672	واں جو کچھ ہے تمام آفت ہے	438	693	یاں تو آنکھوں میں مری جان نزار آئی ہے	450
673	سر دے دے مارے ہے در و دیوار سے کوئی	438	694	ہم اک بات کہہ کر گنہ گار ٹھہرے	450
674	معلوم ہو تب تجھ کو میاں چاہ کسی کی	439	695	اس چمن کی بہار پھر چمکی	451
675	جی کے دشمن رہ گئے اہلِ مروت مر گئے	439	696	تو جا کے اس کی گلی کے نثار ہوتے تھے	451
676	ایک فتنہ وہاں سے اُٹھتا ہے	440	697	کون سے شہر میں ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے	452
677	اک جہاں جسم و جاں سے اٹھتا ہے	440	698	غرض اس طرح ہی یہ خوبرو مجھے چاہ اپنی جتا گئے	452
678	غش کرے وو ہیں اگر تیرا خدا منہ دیکھے	441	699	نہ کیجیے آپ بھی گر اپنی غم خواری تو مشکل ہے	453

شمار غزل	مطلع کا مصرع دوم	شمار صفحہ
700	تو چاہے گر ہمیں تو میاں کیا نہ چاہیے	454
701	صحرا کے وحشیوں سے دل اپنا لگائیں گے	455
702	نگہ سے کیجیے بوس و کنار عنبا سی	455
703	عشق ہے یہ تو چھپائے سے نہاں کیوں کر رہے	456
704	کہ اشک گذرے ہے مانند چاک داماں سے	457
705	بنے ہیں خون سے واں گلستاں زمیں کے تلے	457
706	تو وہ ہیں شعر و سخن کا مرے مزا پھر جائے	458
707	خبر تو لو کوئی کیا اس کا دل دھڑکتا ہے	459
708	جی دیتے ہیں ہم ناحق یہ چاہ نرالی ہے	459
709	آنکھ پردوں میں چھپا رکھتی ہے	460
710	بے طرح ہاتھ یار کے طرز جفا لگی	461

(ب) دیگر اصناف

نمبر شمار		شمار صفحہ
1-	ترکیب بند مسدس	462
2-	ترکیب بند مخمس	466
3-	ترکیب بند مخمس	468
4-	رباعیات	470
5-	مثنوی در ہجو پسر حجام	475
6-	مثنوی در ہجو چارپائی	477
7-	مثنوی در صفت اجوآئن	479
8-	مثنوی جذبۂ عشق	482

☆☆☆☆

پیش لفظ

شیخ غلام ہمدانی مصحفی اردو زباں کے اُن چند باکمال اور قادر الکلام شعراء میں سے ایک ہیں، جن کی خدمات صدقہ جاریہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اُنھوں نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو حاتم، میر، سودا، درد اور مظہر جیسے باکمالوں کا غلغلہ بلند تھا؛ جوان ہوئے تو قائم، سوز، انشا، جرأت، حسرت اور رنگین جیسے خوش نوا استادوں کی ہم طرحی نصیب ہوئی، بوڑھے ہوئے تو خود اُن کی فیضانِ تلمذ سے آتش اور اسیر جیسے شاگرد آسمانِ شہرت پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمک اٹھے، اِن شاگردوں نے اردو غزل کی معنوی قدر و قیمت میں اضافہ کرنے کے ساتھ ہی زبان کو ایسا سان پر چڑھایا کہ لکھنؤ کو اردو کی ٹکسال بنا دیا اور شاعری کا مرکزِ ثقل پچھم سے پورب کو منتقل ہو گیا۔ پھر ان شاگردوں کے شاگرد بھی پنڈت دیا شنکر نسیم، امیر مینائی اور جلال لکھنوی جیسے ماہرِ فن اساتذہ ہوئے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اُردو زبان کی جتنی خدمت مصحفی اور اُن کے شاگردوں کے ذریعے سے ہوئی اتنی اُس عہد میں اور اس کے بعد بھی سوا نواب مرزا داغ دہلوی کے اور کسی شاعر سے نہیں ہو سکی۔

مصحفی کا کلام اپنی فنی قدر و قیمت اور موضوع و معیار میں اپنے کسی ہم عصر سے کم نہیں ہے؛ اور حیرت ہوتی ہے کہ مقدار میں بھی سب پر بھاری ہے۔ انہیں معاشی فارغ البالی اور اطمینان کی زندگی کبھی نصیب نہیں ہو سکی؛ آصف الدولہ کے لکھ لٹ دربار سے بھی معمولی معاش کے وسائل میسّر نہ آ سکے؛ لیکن ایسے نامساعد حالات اور خلافِ طبع ماحول میں رہ کر بھی انھوں نے اُردو اور فارسی میں نظم و نثر وافر سرمایہ چھوڑا ہے جو کم و بیش چار ہزار صفحات کو محیط ہے۔ تصنیف و تالیف سے ان کی مناسبت طبع کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ علمی زندگی بسر

کرنے کے لیے جن معمولی وسیلوں اور معاشی اطمینان کی ضرورت ہوتی ہے وہ اگر مصحفی کو میسّر آ گیا ہوتا تو کیا عجب تھا کہ اُن کا علمی اثاثہ اس سے بھی زیادہ ہوتا۔

اُردو میں اُن کے آٹھ دیوان غزلیات اور ایک دیوانِ قصائد ہے، فارسی میں تین دیوان اور تین تذکرے ہیں، مگر دواوین کا بڑا حصّہ قلمی کتابوں کی شکل میں ہند و پاک کے مختلف کتاب خانوں میں بند پڑا ہوا تھا۔ کئی سال ہوئے عزیز مکرم نثار احمد صاحب فاروقی نے ان دواوین کی ترتیب و طباعت کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور مصحفی کی حیات اور شاعری کے مباحث پر حاوی ایک کتاب بھی لکھنا شروع کی تھی جس کے پہلے باب کا کچھ حصہ ۱۹۵۸ء میں رسالہ بُرہان (دہلی) بالاقساط شائع ہوا تھا اور اہل ذوق نے اسے استحسان کی نظروں سے دیکھا تھا، مجھے بھی خوشی ہوئی تھی کہ شاید مصحفی کے اتنے طویل عرصہ تک نظرانداز کیے جانے کی تلافی ہو جائے گی لیکن کئی ہزار صفحات کو اہتمام سے شائع کرنے کے لیے کسی اہل ہمّت کی ضرورت تھی۔ غالباً یہی باعث تاخیر بھی تھا۔

بارے مقامِ شکر ہے کہ اس اہم علمی منصوبے کی اشاعت کا بیڑا علمی مجلس دہلی نے اٹھایا ہے۔ یہ ادارہ محبّ مکرم جناب مالک رام صاحب کا قائم کردہ ہے جن کے ذوقِ علم و تحقیق سے اُردو ادب کا ہر طالب علم واقف ہے۔ اس لیے اُمید ہے کہ علمی مجلس سے جو کتاب شائع ہوگی اس میں صحت اور نفاست دونوں کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

ادھر آزادیٔ ہند کے بعد جو نوجوان لکھنے والے تحقیق و تنقید کی طرف آئے ہیں ان میں جناب نثار احمد صاحب فاروقی کا نام ممتاز ہے۔ اُنھوں نے اپنی تحریروں سے مشرقی علم و ادب میں دل چسپی رکھنے والوں کو خاصا محظوظ کیا ہے۔ تحقیق و تنقید کے لیے وسعتِ مطالعہ، حسنِ ذوق اور محنت کی سخت ضرورت ہے۔ ان میں سے کسی ایک جزء کی بھی کمی ہو تو تحریر افادیت و جاذبیت سے محروم ہو جاتی ہے۔ فاروقی صاحب قدیم و جدید دونوں قسم کی تعلیم سے بہرہ ور ہیں اور ان کے سامنے عربی و فارسی کا ہزار سالہ تصنیفی معیار موجود ہے۔ اس لیے

وہ پوری کوشش کرتے ہیں کہ جس موضوع پر کام کریں اس کا حق ادا کریں۔ چنانچہ ان کے مقالے پڑھنے والے پر اُن کی تحقیقی وتنقیدی صلاحیتوں کا اچھا اثر قائم ہوتا ہے۔

فارسی وعربی سے واقفیت کے علاوہ ایک اور وجہ سے بھی فاروقی صاحب کو مصحفی کے کلام کی ترتیب وتدوین کا کام انجام دینا چاہیے تھا؛ یعنی وہ خود امروہہ کے باشندے ہیں جو مصحفی کا وطن ہے، اوراس لیے علاقہ روہیل کھنڈ کی کھڑی بولی کے محاورے اورلب و لہجے کو اس کی ساری نزاکتوں کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ اُردو کی ٹکسال اور اس کی معیار بندی کا علاقہ وہی ہے جو میرٹھ سے سہارن پوراور مرادآباد سے شاہ جہاں پور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس علاقے کی زبان اور لہجہ شعرائے متقدمین میں صرف قائم چاند پوری اور مصحفی امروہوی کے کلام میں ملتا ہے۔

آج کے دور میں کلّیاتِ مصحفی کی اہمیّت محض روایتی شاعری کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کی نحوی اورلسانی قدر و قیمت اس سے بہ مراتب بلند ہے۔ کھڑی بولی کی لغت مرتب کرنے والے کو جتنے الفاظ کے شواہد کلام مصحفی سے مل جائیں گے اتنے اور کہیں نہیں ملیں گے۔

مجھے اُمید ہے کہ نثار احمد صاحب فاروقی نے پوری کاوش اورنفاست ذوق کے ساتھ کلّیاتِ مصحفی کی ترتیب وتدوین کی ہوگی، اس طرح مصحفی کی مقبولیت میں تو اضافہ ہوگا ہی، اُردو زبان کے بہت سے الفاظ اور محاوروں کی ایک قابلِ قدر فرہنگ بھی سامنے آجائے گی۔ علمی مجلس دہلی اس منصوبے کی اشاعت کر کے تمام اُردو دنیا کو مرہون منت بنائے گی۔

امتیاز علی عرشی

یکم جنوری ۱۹۶۷ء
رضا لائبریری، رام پور

حرفِ اوّل

مشکل شدست کارِ دل از عشق و خوش دلم
شاید رسد بخاطرِ مشکل پسندِ تو

کلیّاتِ مصحفی جلد اوّل، غلام ہمدانی مصحفی کے دیوانِ اوّل پر مشتمل ہے، جو اس صحت و اہتمام سے پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔ علمی مجلس دلّی، ایک خالص علمی ادارہ ہے جس کے مقاصد میں اساتذہ و اساطینِ ادب کے آثارِ فکر کو حُسنِ ترتیب اور صحت کے ساتھ شائع کرنا بھی شامل ہے۔ اس ادارے نے ابتک جو کتابیں شائع کی ہیں، انھیں اربابِ نظر نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ اس سے ہمارے حوصلوں کو نئی تاب و توانائی ملی ہے۔ ہم نے ابتدا میں اعلان کیا تھا کہ مصحفی کا کلیاتِ نظم آٹھ جلدوں میں حتی الوسع صحت کے ساتھ شائع کیا جائے گا۔ بعد کو یہ منصوبہ بشمول کلیات نثر، بارہ جلدوں تک وسیع ہو گیا۔ اور اب عملی اندازے کے مطابق شاید یہ اس سے بھی تجاوز کر جائے۔ اگر توفیقِ ایزدی رفیق، حالات سازگار اور حیاتِ مستعار وفادار رہی، تو ہم کم سے کم مدّت میں اس منصوبے کی تکمیل چاہتے ہیں۔

اعلان کے مطابق جلد اوّل میں مصحفی کی حیات اور کارناموں کا تفصیلی جائزہ، تنقیدی اور تحلیل پر مشتمل مبسوط مقدمہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن مقدمہ اتنا طویل ہو گیا کہ اُسے علیحدہ جلد میں شائع کرنا ہی مناسب معلوم ہوا۔ چناں چہ اُسے ''مقدمہ کلیاتِ مصحفی'' کے نام سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ کلیاتِ مصحفی کی ہر جلد کا پیش لفظ ادبیات اردو کی کسی اہم اور باوقار شخصیت کے قلم سے ہو، تا کہ اس سے ہمارے حوصلوں کو بھی نئی توانائی ملتی رہے، اور اس کام کی معنوی وقعت میں بھی اضافہ ہو اور مرتب کلیّات بھی اپنی 'کلاہِ نمد' کج رکھ سکے۔ چنانچہ پہلی جلد کا پیشِ لفظ علوم مشرقیہ کے مسلم الثبوت عالم اور محقق حضرت مولانا امتیاز علی عرشی نے تحریر فرمایا ہے۔ انھوں نے اپنی ناسازی طبع اور گوناگوں مصروفیات کے باوجود، ہماری درخواست کو شرف قبول عطا فرمایا، اس کے لیے مرتّب اور ادارہ موصوف کا شکر گذار ہے۔

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کا مضمون، جو پہلی بار 'نگار' کے مصحفی نمبر میں چھپا تھا، اور اس صدی میں مصحفی کی تعبیر و تشریح کی طرف پہلا منصفانہ قدم ہے، بطور مقدمہ شامل کر لیا گیا ہے، علمی مجلس فراق صاحب کی شکر گذار ہے کہ انھوں نے اسے شاملِ کلّیات کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی؛ وہ اس پر نظر ثانی کرنا چاہتے تھے، لیکن اُن کی موجودہ صحت اور مصروفیات نے اس کا موقع نہیں دیا۔

دیوانِ اوّل کا متن چار قلمی نسخوں کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔ اساسی متن رام پور کے نسخے کا ہے، جو دیوان اوّل کے معلوم نسخوں میں قدیم ترین یعنی ۱۲۱۱ھ/ ۱۷۹۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ یہ شاہانِ اودھ کے کتاب خانے میں بھی رہ چکا ہے۔ اسے خود مصحفی نے شہزادہ سلیمان شکوہ کے لیے لکھوایا تھا، اُسے ن ۱، قرار دیا گیا ہے۔

ن ۲ سے مراد کتب خانۂ مشرقیہ (خدا بخش) بانکی پور کا نسخہ ہے۔ یہ ۱۲۴۹ھ/ ۱۸۳۳ء کے لگ بھگ لکھا گیا ہے۔

تیسرا نسخہ کتاب خانہ دار العلوم دیوبند میں محفوظ ہے اور ۱۲۴۹ھ/ ۱۸۳۳ء کا مکتوبہ ہے۔ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی (ناظم ندوۃ المصنّفین، دہلی) نے میری درخواست پر یہ نسخہ دار العلوم سے مستعار منگوا دیا تھا جس کے لیے اُن کا ممنونِ احسان ہوں۔

دیوانِ اول کا چوتھا نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری کا ہے، یہ مصحفی کی وفات کے تقریباً چالیس سال بعد ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء میں کتابت ہوا ہے، مشتبہ اشعار کے متن کی تعیین میں اس سے بھی مدد لی گئی ہے۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا نسخہ دیوانِ اوّل ۱۹۶۳ء میں میری نظر سے گذرا تھا اور اس سے کچھ یادداشتیں قلم بند کی تھیں، لیکن وہ ایسی نہ تھیں کہ اب مقابلۂ متن میں اُن سے مدد مل جاتی، لہٰذا اس نسخے کا مقابلہ "بہ عمرِ دگر افتاد۔"

کلیاتِ مصحفی کی آخری جلد تفصیلی حواشی، فرہنگ اور اشاریے پر مشتمل ہوگی، لیکن ظاہر ہے کہ وہ سب سے آخر میں آئے گی۔ اس وقت تک متن کے بعض اشعار کو سمجھنے کے لیے قاری کی دوسری کتب لغات و مصطلحات پر انحصار کرنا ضروری تھا، اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ہر جلد کے متن پر مختصر اور ضروری حواشی لکھ دیے جائیں تاکہ اُس کا فائدہ عام اور آسان ہو جائے اور مجوزہ جلد اپنے وقت پر تفصیلی مباحث کے ساتھ شائع ہو۔ چنانچہ دیوانِ اوّل پر موجز حواشی لکھ دیے گئے ہیں۔

کلّیاتِ مصحفی کی دو جلدیں جو دیوان اول و دوم پر مشتمل تھیں ۱۹۶۸ء میں علمی مجلس دہلی نے شائع کی تھیں۔ وہ ایڈیشن جلد ہی ختم ہو گیا تھا اس کے بعد دوسری اشاعت کی نوبت اب تقریباً تیس سال کے بعد آرہی ہے یہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (حکومت ہند) کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کی علم دوستی اور ادب پروری ہے کہ غلام ہمدانی مصحفی کی تمام تصانیف نئی ترتیب کے ساتھ سامنے آئیں گی۔ یہ اس سلسلہ انتشارات کی پہلی کڑی ہے۔ اس منصوبے کی تحریک اور سرپرستی کے لیے میں قومی کونسل اور اس کے عہدیداروں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

نثار احمد فاروقی

سرزمینِ

امروہہ

کے نام

سلامٌ علی نَجْدٍ وَمَنْ حَلّ بِالنَّجدِ

مقدمہ

میرے ایک نوجوان دوست ہیں جنھوں نے اردو کی ایک کتاب بھی نہیں پڑھی، لیکن انگریزی کے ایم، اے ہیں اور ہندی لٹریچر کے ماہر۔ باتوں باتوں میں ان سے ذکر آیا کہ مصحفی پر کچھ لکھنے کی فکر میں ہوں۔ تو انھوں نے کہا۔ ''کیا مصحفی اور مصحفن والے مصحفی؟'' یہ سن کر مجھے خیال آیا کہ محمد حسین آزاد نے آبِ حیات لکھ کر کم از کم اتنا تو کیا کہ اردو شاعروں کے قصے کہانیاں بھلائے جانے سے بچا لیے۔ سچ پوچھیے تو ''مصحفی اور مصحفن کے فقرے میں اُس موڑ کا بھید چھپا ہوا ہے۔ جہاں سے وہ دلّی کی غزل گوئی کی طرف پھر جاتی ہے۔ یہ فقرہ دلّی اور لکھنؤ اسکول کے سنگم کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ کیسے؟ سنیے۔

دلّی اسکول میں قریب قریب تمام تر ذکر عاشق کا ہوتا ہے اور لکھنؤ اسکول میں معشوق کا۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ دلّی والے داخلی شاعری پر جان دیتے تھے اور لکھنؤ والے خارجی شاعری پر مٹے ہوئے تھے۔ مصحفی اور مصحفن کو یک جا کر دینا دونوں اسکولوں کے میل کا شگون ہے۔ انشا کی جس پھبتی کو نقل کر کے آزاد نے مصحفی کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ اس میں معاملہ بندی اور خارجی شاعری کی وہ شان چھپی ہوئی ہے جو دلّی کی شاعری کو لکھنؤ کی شاعری کی طرف لے جا رہی ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ دلّی اسکول میں خارجیت بالکل نہیں ہے لیکن یہ داخلی قسم کی خارجیت ہے جیسی لکھنؤ اسکول میں ایک خارجی داخلیت پائی جاتی ہے۔ میر کے یہ اشعار لیجیے جن میں خالص داخلیت پائی جاتی ہے۔

میر کا طور یاد ہے ہم کو　　　نامُرادانہ زیست کرتا تھا

کلیاتِ مصحفی

وصل اس کا خدا نصیب کرے　　　میرؔ دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ

لیکن ذیل کے اشعار داخلی خارجیت کی مثال میں پیش کیے جا سکتے ہیں:

کھلا جو نشہ میں پگڑی کا پیچ اس کی میرؔ
سمندِ ناز پر اک اور تازیانہ ہوا

کیوں کے نقاشِ ازل نے نقش ابرو کا کیا
کام تھا اک منھ پہ تیرے کھینچنا شمشیر کا

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی، تصویر نظر آئی

میرؔ اُن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

دوسرے شعر میں پُر تصنع خیال کے ساتھ زبان کی رنگینی کو دیکھیے۔ لیکن دلّی اسکول کا وہ شاعر جس کے یہاں داخلیت کے ساتھ خارجیت بھی کافی نمایاں ہے، سوداؔ ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ داخلی شاعری دل کی شاعری ہے اور خارجی شاعری دماغ کی۔ اگر یہ تقسیم صحیح ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ دل کی شاعری میرؔ کا خاص حصہ ہے۔ جس میں اس کا دماغ بھی حل ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن ہاں اس عہد کے صفِ دوم کے شعرا (جیسے یقیںؔ، اثرؔ، قائمؔ وغیرہ) ضرور دل کے شاعر تھے۔ اور اسی لئے میرؔ سے ملتی جلتی ہوئی باتیں کہتے ہوئے بھی میرؔ کی گہرائی اور گیرائی اپنے نغموں میں پیدا نہ کر سکے۔ سوزؔ البتہ اپنے خالص فطری احساس کی وجہ سے یقیںؔ، اثرؔ اور قائمؔ سے بڑھ جاتے ہیں اور دردؔ نے چونکہ روحانیت کا سہارا لیا، اس لیے ایک نمایاں شستگی اور سنجیدگی ان کے لہجے میں آ گئی ہے۔

ہاں تو ایک سوداؔ کو چھوڑ کر اس زمانے کے دہلوی شعراء تمام تر داخلی رنگ میں غرق تھے۔ سوز و گداز، درد و غم، سپردگی و خستگی ان کی شاعری کی تنہا خصوصیت تھی اور ان کے تغزل

پر کوئی خیالی تصویر آنکھوں کے سامنے نہ آسکتی تھی لیکن میؔر البتہ اپنا ہمہ گیر تخیل رکھتا تھا کہ اس نے خارجی شاعری کو بھی زیرنگیں کرلیا اور غالباً اردو کے کسی غزل گو شاعر کے یہاں تصویر کھینچنے کے قابل اتنے اشعار نہ ملیں گے جتنے میؔر کے یہاں اور باوجود اس کے کہ داخلی شاعری میں عاشق زیادہ تر پیشِ نظر ہوتا ہے۔

سوؔدا کے کلام میں داخلیت کی چاشنی ہوتے ہوئے بھی خارجیت نمایاں ہے لیکن اس کے یہاں داخلیت نے سوز و ساز اور درد و غم کا گہرا رنگ اختیار کرنے کے بجائے شگفتگی، البیلا پن، سرمستی، نشاط اور رنگینی اختیار کرلی ہے۔ کیوں کہ جب داخلیت بجائے غم کے نشاط کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے تو نشاط کی فطری وسعت شاعری کے دل کو دنیا کی رنگارنگ بزم آرائیوں کی طرف لے جاتی ہے اور صحیح معنی میں خارجی شاعری کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ پھر یہ نشو ونما محض خیال و مضمون تک پہنچ کر نہیں رک جاتا ہے۔ بلکہ زبان و بیان پر بھی نمایاں اثر ڈالتا ہے۔

بے اعتدالی، تصنع یا دوسرے نقائص۔ داخلی اور خارجی شاعری دونوں میں پائے جاسکتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ داخلی شاعری میں یہ خرابی ایک گھنونے قسم کا مرثیہ پن پیدا کر دیتی ہے اور خارجی شاعری تو بگڑ کر نہ جانے کتنی شکلیں اختیار کرلیتی ہے۔ چنانچہ انؔشا، ناسؔخ، امانؔت اور نصیؔر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہوئے بھی اسی بگڑی ہوئی خارجی شاعری کی روشن مثالیں ہیں۔ داخلی شاعری ہو یا خارجی شاعری شاعرانہ خلوص بڑی مشکل چیز ہے۔ شاعرانہ خلوص میں جس نازک توازن اور جس رکھ رکھاؤ کی ضرورت ہے وہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔

مصحؔفی سے پہلے دلی کے مشہور شعراء کا نام لیا جاچکا ہے۔ اسی زمانے میں مصحؔفی نے اپنے وطن امروہہ ضلع مرادآباد کو خیرباد کہہ کر دلی میں غزل سرائی شروع کی اور اسی رنگ میں جو اس وقت وہاں مقبول تھا۔ مصحؔفی کے یہاں کثیر تعداد میں اشعار داخلیت لیے ہوئے ملیں

گے لیکن سوز و گداز کم کم ہے یعنی جو خارجی رنگ طبیعت سودا کا تھا وہ مصحفی کے یہاں کچھ زیادہ اُبھر آیا ہے اس میں شک نہیں کہ مصحفی کو تقلید اور انتخابیت کا حیرت انگیز ملکہ حاصل تھا۔ لیکن میرؔ کا سوز و گداز یا تو مصحفی نے پیدا کرنا نہیں چاہا۔ یا ان سے پیدا نہ ہو سکا۔ اب رہ گئے میرؔ سے کم تر درجے کے شعراء، سو ان کی کون سی بات مصحفی کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ وہی زبان و بیان کی نرمی اور وہی خاموش سپردگی بلکہ اسی کے ساتھ ایک خاص قسم کی لطافت جو خالص داخلی رنگ کے شعراء کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔

اسی معتدل، متوازن اور ہموار انداز میں مصحفی کی یہ غزل ملاحظہ ہو:۔

دیکھ اس کو اک آہ ہم نے کر لی — حسرت سے نگاہ ہم نے کرلی
کیا جانے کوئی کہ گھر میں بیٹھے — اس شوخ سے راہ ہم نے کرلی
جب اُس نے چلائی تیغ ہم پر — ہاتھوں کی پناہ ہم نے کرلی
نخوت سے جو کوئی پیش آیا — کج اپنی کلاہ ہم نے کر لی

دی ضبط میں جب کہ مصحفی جان
شرم اس کی گواہ ہم نے کر لی

اگر ان اشعار کے صوتی اثرات اور وجدانی کیفیات کا صحیح احساس ہم کر سکیں تو پتہ چلے گا کہ مصحفی کی شاعری محض انتخابیت، تقلید اور تتبع کا معجزہ نہیں ہے۔ بظاہر اس غزل میں میرؔ کی تقلید معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقتہ اس میں میرؔ کی دل برشتگی دردؔ کی کم سخن سنجیدگی اور سوزؔ کی سادگی سب شامل ہے۔ مصحفی نے میرؔ کی پیروی کی ہے لیکن ہمیشہ ذرا کترا کے کی ہے۔ میرؔ کہتا ہے:

ہو گا کسو دیوار کے سایے میں پڑا میرؔ
کیا کام محبت سے اُس آرام طلب کو

کہتا تھا کسی سے کچھ تکتا تھا کسی کا منھ — کل میرؔ کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانہ تھا

مصحفی کہتا ہے:

کبھو تک کے دَر کو کھڑے رہے کبھی آہ بھر کے چلے گئے
ترے کوچے میں جو ہم آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے

میؔر کا پہلا شعر شدّتِ احساس کا معجزہ ہے لیکن مصحفی کے شعر میں جو فطری واقعیت اور محاکاتی خصوصیت پائی جاتی ہے وہ مصحفی کو میؔر سے الگ کر رہی ہے۔ مصحفی کے اور اشعار سنیے:

ہم تو اس کوچے میں گھبرا کے چلے آتے ہیں دو قدم جاتے ہیں پھر جا کے چلے آتے ہیں

وہ جو ملتا نہیں ہم اس کی گلی میں دل کو
در و دیوار سے بہلا کے چلے آتے ہیں

گلی سے اس کی جاتا ہے تو کیا اک چشمِ حسرت سے دلِ مسکیں بسوئے رخنۂ در دیکھ لیتا ہے

جذبات کی میانہ روی، تخیل و وجدان، کو قدم بہ قدم اس خارجیت کی طرف بڑھا لے چلی ہے جہاں اسے ہم مصحفی کو دلّی اور لکھنؤ اسکول کے دوراہے پر کھڑا پا آگے بڑھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اسی داخلی خارجیت سے اس معاملہ بندی کا شگون بھی ہوتا ہے جو لکھنؤ میں جرأت کے ہاتھوں کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور انؔشا اور رنگیؔن کے ہاتھوں کہاں سے کہاں بہک گئی۔ مصحفی کی ایک مشہور غزل ہے:

کھینچ کر تیغ یار آیا ہے اس گھڑی سر جھکا دیے ہی بنے
یار کا صبح پر ہے وعدۂ وصل ایک شب اور بھی جیے ہی بنے

اب تو اس دردِ دل کی تاب نہیں
مصحفی کچھ دوا کیے ہی بنے

مصحفی کا پہلا شعر میؔر کے اس شعر سے ملا کر دیکھیے:

ابھی ہوں منتظر جاتی ہے چشمِ شوق ہر جانب
بلند اس تیغ کو ہونے تو دو سر بھی جھکاؤں گا

میرؔ و مصحفیؔ میں وہی فرق ہے جو دوپہر اور غروب آفتاب کے وقت میں پایا جاتا ہے اور جس طرح شام کو آفتاب میں ساتوں رنگ جھلکنے لگتے ہیں اسی طرح رنگین فضا میں وہ خارجیت نکھرتی ہے اور سنورتی ہے جس کی جھلک مصحفیؔ کی شاعری میں ملتی ہے۔ اگر ہم سنگیت کے استعارے کو کام میں لائیں تو کہہ سکتے ہیں کہ مصحفیؔ کے نغموں میں وہی دل فریب کیفیت پیدا ہوگئی ہے جو آواز میں پتّی لگ جانے سے پیدا ہوتی ہے۔

اب مصحفیؔ کے چند ایسے اشعار سنیے جن پر میرؔ کی تقلید کا دھوکا ہوسکتا ہے لیکن دونوں کے وجدان و لہجے کے لطیف و نازک فرق کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ ان اشعار میں میرؔ کا سوز نہیں ہے۔ لیکن مصحفیؔ کا ساز ضرور ہے۔ شدّت تاثیر نہیں ہے لیکن ایک نرم کیفیت ضرور ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ میرؔ کی ماورائی سادگی اور معصومیت نے ایک نیا رنگ اختیار کر لیا ہے اور جذبات کی پاکیزگی و دوشیزگی میں کچھ شباب کی کیفیات بھی جھلکنے لگتی ہیں:

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا — ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا
جس کو ہم روزِ ہجر سمجھے تھے — ماہ تھا یا وہ سال تھا کیا تھا

مصحفیؔ شب جو چپ تو بیٹھا تھا
کیا تجھے کچھ ملال تھا کیا تھا

یادِ ایّام بے قراریٔ دل — وہ بھی یارب عجب زمانہ تھا

ہم سمجھے تھے جس کو مصحفیؔ یار
وہ خانہ خراب کچھ نہ نکلا

پیار تو آیا تھا میرے جی میں رات — پر میں تیری وضع سے ڈر کر گیا

ایسا ہی گیا جلد کہ پھر منھ نہ دکھایا
وہ سرورِ واں اپنی مگر عمرِ رواں تھا

ہم سے خبرِ مصحفی خستہ نہ پوچھو تم آپ ہی سوچو نہ میاں دل میں کہاں تھا

کل قافلۂ نکہتِ گل ہوگا روانہ
مت چھوڑیو تو ساتھ نسیمِ سحری کا

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے[1] گا

حادثے ہوتے ہیں زمانے میں اس قدر انقلاب کس دن تھا[2]

مصحفی آج تو قیامت ہے
دل کو یہ اضطراب کس دن تھا

بھٹکا پھرے ہے تیری دل اک ادا کا مارا کہہ کس طرف کو جائے اب یہ خدا کا مارا

زلفوں سے اس کی اے دل ہے مجھ کو کیا سروکار پھرتا ہوں میں تو اپنے آپ ہی بلا کا مارا

وہ صید خوں گرفتہ جیتا بچا نہ ہرگز
جو صید گہ میں تیری آیا قضا کا مارا

داغ دیکھے تھا کھڑا لالۂ صحرائی کا زور عالم نظر آیا ترے سودائی کا

افشائے عشق بعد خدا جانے کیا بنے
جب تک حجاب تھا یہی امید و بیم تھا

---

[1] بے ساختہ میر کا یہ شعر یاد آ گیا:

رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں کیا قافلہ جاتا ہے تو بھی جو چلا چاہے

لیکن مصحفی کی انفرادی شان نمایاں ہے۔

[2] میر کہتا ہے:

مصائب اور تھے پر دل کا جانا عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

میر کے یہاں بے پناہ سوز ہے لیکن مصحفی کے یہاں وہی سوز کم ہو کر اک نرم ساز ہو گیا ہے۔

جنبشِ لب نے تری میری زباں کردی بند   تونے کچھ پڑھ کے عجب مجھ پہ یہ منتر مارا
بھڑک اُٹھا میں نسیمِ سحری تونے تو   دامن ایسا ہی مری آتشِ دل پر مارا
مصحفی عشق کی وادی میں سمجھ کر جانا
آدمی جائے ہے اس راہ میں اکثر مارا
کیا یار کے دامن کی خبر پوچھو ہو ہم سے
یاں ہاتھ سے اپنا ہی گریباں گیا تھا
مصحفی کہتے ہیں راہِ عشق میں مارا پڑا   کون جانے کیاہوئی اس بےوطن کی سرگذشت
شمعِ شبِ فراق بنے ہم تو مصحفی
ہم دل جلوں کو عیش کی محفل سے کیا خبر
اے مصحفی بتا تو کیا کچھ خوشی ہوئی ہے   ہے ان دنوں جو تیرا چہرہ بحالیوں پر
بے گانگی ہے اس کی ملاقات میں ہنوز
واحسرتا کہ فرق ہے دن رات میں ہنوز
وہی ٹھوکر ہے اور وہی انداز   اپنی چالوں سے تو نہ آیا باز
ہم پہ وہ مایہ کہاں لیک زروے تقریب
جا کھڑے رہتے ہیں ہم اس کے خریدار کے پاس
یار کرتا نہیں نگاہ افسوس   چشم پوشی سے اس کی آہ افسوس
مصحفی کر نہ عبث تُو شکوۂ ایامِ فراق
اگلی نسبت تو بہت ہے ترے حالات میں فرق
گرچہ ہیں قہر سادی آنکھیں بھی   پر غضب ہے خمار کا عالم
تھے جو جنوں زدہ گئے زنجیر کی طرف
ہم کو قضا جولائی تو شمشیر کی طرف

اور سب تم سے ورے بیٹھے ہیں　　ایک ہم ہیں کہ پَرے بیٹھے ہیں

پھٹ چکا جب سے گریباں تب سے　　ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں

شیشۂ مے کی طرح اے ساقی　　چھیڑیو مت کہ بھرے بیٹھے ہیں

قتل کا کس کے ارادہ ہے جو آپ　　ہاتھ قبضے پہ دھرے بیٹھے ہیں

مصحفی یار کے گھر کے آگے

ہم سے کتنے نگھرے بیٹھے ہیں

ہوئی نہ سازمری اس کی صحبتِ شب ہائے　　ادھر سے عجز ادھر سے رکھائیاں ہی رہیں

جس بیابانِ خطرناک میں اپنا ہے گذر

مصحفی قافلے اس راہ سے کم نکلے ہیں

بن دیکھے جس کو پل میں آنکھیں آئیاں ہوں　　کیا قہر ہے جو اس سے برسوں جدائیاں ہوں

ٹک رحم کرو چاک گریبان پہ میرے

یار کوئی اس شوخ کے داماں کو نہ چھیڑو

ہماری بزم سے اے مصحفی سحر ہوتے　　گیا ہے ہو کے وہ بے زار دیکھیے کیا ہو

ایک دن رو کے نکالی تھی میں کلفت دل کی

آج تک دامنِ صحرا ہے غبار آلودہ

میں تیرے واسطے سر پٹکوں ہوں دیواروں سے　　چین کس طرح تجھے خانہ خراب آتا ہے

دامن کی اک جھپک نے مدہوش کر دیا ہے

مثلِ چراغ ہم کو خاموش کر دیا ہے

تم رات وعدہ کر کے جو ہم سے چلے گئے　　پھر تب سے خواب میں بھی نہ آئے بھلے گئے

پکارتا ہے تجھے مصحفی جواب تو دے

کھڑا رہے یہ ترے آستاں پہ یا پھر جائے

حیران ہے کس کا جو سمندر   مدت سے رُکا ہوا کھڑا ہے

تو دیکھتے ہی اس کو جو دیوانہ ہو گیا
سچ کہیو مصحفی ترے کیا جی میں آ گئی

کبھی روئے کبھی پیٹے شبِ تنہائی میں   ہم کو ساتھ اپنے عجب طرح کی صحبت گذری

ملو ہو غیروں سے اور ہم سے بے وفائی ہے
یہ کون شیوہ ہے کیا رسم آشنائی ہے

از بس کہ مرے دیدۂ حیران میں کچھ ہے   اک آن میں دل کچھ ہے تو اک آن میں کچھ ہے
جادو تو میں کہتا نہیں پر سمجھوں ہوں اتنا   واللہ تری نرگسِ فتان میں کچھ ہے

خالی ہی چلے آتے ہیں ہم سیر چمن سے
داماں میں کچھ ہے نہ گریبان میں کچھ ہے

اٹھنے لگے جو وہ مری بالیں سے وقت نزع   نکلا یہی زباں سے آہستہ، کیا چلے

نہیں معلوم کہ کیا نام ہے اس کا لیکن
کوئی اس کوچے میں اک آہ تو بھر جاتا ہے

حیف ہے محملِ لیلیٰ نہ نمودار ہوا   یوں تو محمل کئی یاں گردِ سفر سے نکلے

مندرجۂ بالا اشعار کا انداز بیان بالکل میرؔ کا سا ہے لیکن تخیّل کے کان پرکھ لیتے ہیں کہ بجائے میرؔ کے ان میں سوداؔ کا رنگ زیادہ جھلکتا ہے۔ شعرائے دلّی میں اگر کوئی سوداؔ کے انداز پر للچایا تھا تو وہ ذوقؔ تھے۔ ورنہ دلّی اسکول کی تمام تر روایت وہی رہی ہے جو میرؔ کے رنگ سے وابستہ ہے۔ لیکن سوداؔ کے رنگ کو اگر کسی نے واقعی فروغ دیا تو وہ شخص مصحفیؔ ہے۔

اس مضمون کے دوران میں یکا یک خیال آیا کہ اگر مصحفیؔ کا تمام تر کلام میرؔ، سوداؔ، انشاؔ اور جرأتؔ ہی کے رنگ و انداز میں ہے یعنی اگر مصحفیؔ کی استادی تمام تر تقلید ہے تو مصحفیؔ کا اپنا

کیا ہے؟ اُس شاعر کا کلام قدرِ اوّل کی چیز نہیں ہو سکتا جو صاحب طرز نہیں جس میں انفرادی خلّاقی نہ ہو جو ایک الگ شاعرانہ شخصیت نہ رکھتا ہو۔ حقیقی شاعر ایک نئے ذوق کی داغ بیل ڈالتا ہے۔ ہمارے قدیم احساسات کو نئے طریقوں سے چونکا تا ہے۔ ہمارے شعور کے لیے ایک نیا سانچا تیار کرتا ہے۔

ایک زمانہ ہوا جب میں نے مولوی اسمٰعیل کی مرتب کردہ ''تزک اردو'' میں جو میرے نصاب میں شامل تھی، غالباً پہلے پہل مصحفی کا نام دیکھا اور سُنا۔ اب میرے جذبات کا حال سنیے۔ سب سے قابلِ توجہ بات تو یہ تھی کہ مصحفی کا تخلص وہ لفظ تھا جس کی صورت وصوت نے مجھ پر فوراً اپنی دل کش انفرادیت کا اثر ڈالا۔ اس کے بعد مولوی اسمٰعیل کا یہ مختصر نوٹ پڑھ کر مجھے کچھ بُرا لگا کہ ''مصحفی ہیں تو مشہور لیکن ان کے کلام میں کوئی انفرادیت نہیں۔ کہیں میرؔ کی سادگی ہے کہیں سوداؔ کی شان وشکوہ۔'' میں نے اس وقت تک مصحفی کا کلام نہیں دیکھا تھا لیکن نہ جانے کیوں کچھ ایسا نیم شعوری احساس ہوا کہ مولوی محمد اسمٰعیل دھوکا کھا رہے ہیں۔ جس شخص کا تخلص اتنا حسین ہو وہ محض نقال نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد سے اب تک میں مصحفی سے آہستہ آہستہ متاثر ہوتا رہا اور مصحفی کی انفرادیت میرے وجدان پر اپنا کام کرتی رہی اور مجھے بسا اوقات یہ فکر رہی کہ مصحفی کے خاص رنگ کو کس طرح اُجاگر کیا جائے۔ یہ مسئلہ جو میرے لیے ایک دل کشی بھی رکھتا تھا اور جس سے میں ڈرتا بھی تھا آج پھر سامنے آ گیا۔

غور کرنے سے میرؔ و سوداؔ کے مخصوص رنگوں میں جو امکانات چھپے ہوئے ہیں وہ ذہن میں آنے لگے اس سلسلے میں ایک ایسا اہم اصول دھیان میں آیا جس کی طرف جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی نے اشارہ نہیں کیا۔ وہ اصول یہ ہے کہ غم آمیز وجدان میں تنوع کے اتنے امکانات نہیں ہوتے جتنے نشاط آمیز وجدان میں ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مصحفی کے یہاں بہ نسبت میرؔ کے تنوع زیادہ پایا جاتا ہے۔ مصحفی کے وہ اشعار جو میرؔ کی یاد دلاتے ہیں

کافی تعداد میں اس مضمون میں دیے جا چکے ہیں۔ ان میں سے قریب قریب ہر شعر میر کے اشعار کے مقابلے میں ہلکا ہے۔ لیکن ان دونوں میں وہی فرق ہے جو تیز درد اور میٹھے میٹھے درد میں پایا جاتا ہے اور یہی فرق سودا اور میر کے درمیان پایا جاتا ہے اور یہیں سے سودا کی وہ نمایاں خصوصیت شروع ہو جاتی ہے جو اسے میر، درد، سوز اور ان کے ہم نوا شعراء سے الگ کرتی ہے اور جس سے مصحفی کی طبیعت کو بھی خاص ربط اور خاص مناسبت ہے۔ لیکن ان دونوں کے نشاط آمیز وجدان میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ اور اسی لیے جب میں یہ کہتا ہوں کہ مصحفی سودا کا ہم نوا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سودا کی آواز بازگشت ہے۔

آزاد نے لکھا ہے کہ ایک مشاعرے میں جب مصحفی نے یہ شعر پڑھا:

باتوں میں ادھر لعلِ فسوں گرنے لگایا

دے پیچ اُدھر زلف اڑا لے گئی دل کو

تو میر کو اس شعر نے چونکا دیا اور مصحفی سے میر نے اسے دوبارہ پڑھنے کی فرمائش کی۔ جب میں نے آبِ حیات میں اپنے لڑکپن میں یہ روایت پڑھی تو مجھے کچھ حیرت ہوئی۔ حیرت اس وجہ سے تھی کہ مصحفی کا یہ شعر میر کے رنگ میں نہیں ہے پھر بھی میر کو اس شعر نے متوجہ کر لیا۔ اب معلوم ہوا کہ یہ شعر خارجی اور داخلی دونوں طرح اتنا مکمل ہے کہ میر سے بھی نہ رہا گیا۔

اب میں وہ اشعار مصحفی کے پیش کرتا ہوں جن میں مصحفی کا خاص رنگ نمایاں ہے اور جن سے مصحفی، سودا اور میر میں مشابہت اور فرق ہے، دونوں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ مشابہت تو صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ لیکن فرق؟ مصحفی کے مندرجہ ذیل اشعار میں ایک مانوس و معصوم درد اور حسرت ہے۔ ان پھولوں کی رگ ہائے گل میں ایک دُکھتی ہوئی سی رگ ہے اور ان کی نکہت میں کچھ درد بھی ملا ہوا ہے۔ چونکہ میر کی جذباتی یا نفسیاتی انانیت

مصحفی میں نہیں ہے۔ اس لیے مصحفی کے یہاں ایک رُکی رُکی سی معصوم حیرت، ایک دبی ہوئی بے چارگی کی مسکراہٹ، اوپر کے دانتوں سے نیچے کا ہونٹ دبا لینے کی ادا ملتی ہے۔ سودا کے یہاں یہ عنصر کم ہے لیکن جہاں ہے وہاں مصحفی کی نرم غم زدگی سے بلند تر ہے۔ کیوں کہ سودا کا تخیل زیادہ زوردار اور باجرأت ہے۔ مگر عام طور پر سودا کی رنگینی اس نرم ٹیس اور کسک سے خالی ہے جو مصحفی کے رنگین اشعار میں ہے۔

وصل میں ایسے سے ڈھونڈے کوئی کیوں کر واشد
جن نے سو ناز سے اک بندِ قبا بام کیا

ملزم تری باتوں سے ہمیں آپ ہی ہونا اور تجھ کو کسی بات میں الزام نہ دینا
جس کے نہ لگا زخم تری کج نظری کا کیا ہوئے الم اس کو خراشِ جگری کا

اے مصحفی افسوس کہاں تھا تو دوانے
کل اس کے تئیں ہم نے عجب آن میں دیکھا[1]

جب کوہ و بیاباں میں جا ہم نے قدم مارا فرہاد نہ کچھ بولا مجنوں نے نہ دم مارا

اس دل میں تیرے ملنے کا ارمان رہ گیا
یہ دل تڑپ تڑپ کے مری جان رہ گیا

کل اسے میں لے چلا تھا سیرِ گلشن کی طرف کچھ سمجھ کر ساتھ سے میرے وہ ٹل کر رہ گیا

تجھے اے مصحفی کب ہے خبر دردِ محبت سے
نہ لے تو آگے میرے نام اے بے درد درماں کا

خورشید کو سائے میں زلفوں کے چھپا رکھا چتون کی دکھا شوخی سُرمے کو لگا رکھا

---

[1] سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

جس دم کہ وہ کمر میں رکھ کر کٹار نکلا
جس رہ گذر سے نکلا عالم کو مار نکلا

کیا نظر آیا مجھے اس میں کہ میں نے روز وصل   لب تلک لے جا کے جامِ آبِ حیواں رکھ دیا[1]

یہ ادا دیکھ کے کتنوں کا ہوا کام تمام
نیمچہ کل جو ٹک اس عربدہ جو کا نکلا

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم   تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

مہر و مہ اس کے تئیں دیکھ کے حیران رہے
جب ورق یار کی تصویرِ دو رُو کا نکلا

تو گیا پیارے سفر کو چھوڑ کر میرے تئیں   رفتہ رفتہ میں ترے جی سے بسر کر رہ گیا

دامن ترا بنے گا گریبان عاشقاں
گر یوں ہی ٹھوکریں دمِ رفتار کھائے گا

شبِ ہجراں تھی میں تھا اور تنہائی کا عالم تھا   غرض اس شب عجب اک بے سروپائی کا عالم تھا

حسن اس کا اب سماں کچھ اور دکھلانے لگا
چاند سا پردے سے وہ مکھڑا نظر آنے لگا

یا وہ عالم تھا کہ کوئی اس سے واقف بھی نہ تھا   یا یہ عالم ہے کہ عالم اُس پہ مر جانے لگا

رونے سے کام بس کہ شب اے ہمنشیں رہا
آنکھوں پہ کھینچتا میں سرِ آستیں رہا

ٹوٹے تھے اس کے تیر جو سینے میں اب تلک   پیکاں کے بعد نکلے ہے پیکان دوسرا[2]

---

[1] کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا   ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں (سودا)

[2] سب ہوئے نادم پئے تدبیر ہو جاناں سمیت
تیر تو نکلا مرے سینے سے لیکن جاں سمیت (غالباً میر)

سلسلہ اک نظر پڑا موج ہوا کے پانو میں
پیچ جو کھل گیا کبھی سنبلِ تاب دار کا

لالہ ہوا بروے خاک رنگ شفق بر آسماں　　خون کہاں کہاں گرا زخم دل فگار کا

خون بسمل سے ہے اس ساعد نازک پہ بہار　　تم نے گو پھینک دیا ہاتھ سے خنجر اپنا

مصحفی گر چہ خفا ہم سے وہ رہتا ہے ولے
ذکر آجائے ہے اس بزم میں اکثر اپنا

عشوہ و ناز و ادا اس کے یہی کہتے ہیں　　لے سکے نام تو یاں کوئی شکیبائی کا

صرصر سے کم نہیں کچھ وہ تیغ تیز جس نے
لاکھوں کا کر دیا ہے دم میں چراغ ٹھنڈا

کبھی جو یوں بھی ملو تم تو مہربانی ہے　　غرض وہ وصل کا وعدہ تو درکنار رہا

ترے ہی غم کی لگے ہم خوشامدیں کرنے　　جہاں میں جب کوئی اپنا نہ غم گسار رہا

ملے نہ آکے کبھی مصحفی سے تم افسوس
امیدوار تمھارا امیدوار رہا

جو پھرا کے اس نے منھ کو بہ قفا نقاب اُلٹا　　اِدھر آسمان اُلٹا اُدھر آفتاب اُلٹا

رنگ روپ صورت و شکل، سجاوٹ اور نکھار کا آئینہ دار جتنا مصحفی کا کلام ہے اتنا اردو کے کسی اور غزل گو کا کلام نہیں۔ یہ بات جتنے مختلف عنوانوں سے جتنی واقعیت اور اصلیت لیے ہوئے مصحفی کے یہاں ہے وہ میر، سودا، جرأت، انشا، غالب، ذوق، ظفر، مومن، داغ اور امیر کسی کے یہاں بھی نہیں پائی جاتی۔ اس کا کلام ایک تصویر خانہ یا پکچر گیلری ہے دیکھیے:

بھیگے سے ترا رنگِ حنا اور بھی چمکا
پانی میں نگاریں کفِ پا اور بھی چمکا

جوں جوں کہ پڑیں منہ پہ ترے مینھ کی بوندیں جوں لالہ تر حُسن ترا اور بھی چمکا

پیرہن سے ہے جھلکتا بدنِ سرخ ترا زیرِ شبنم نہیں چھپتا چمن سرخ ترا

شب اِک جھلک دکھا کر وہ مہ چلا گیا تھا

اب تک وہی سماں ہے غرفے کی جالیوں پر

اک قرص ماہ کے نظر آتے ہیں سو ہلال عارض پہ اس کے طرّہ پُرخم کی سیر کر

دل لے گیا ہے میرا وہ سیم تن چُرا کر

شرما کے جو چلے ہے سارا بدن چُرا کر

ہونے دے خوش کسی کو سچ کہہ تو کیا کرے گا موجِ تبسّم اپنی اے خوش دہن چرا کر

چہرے پہ نازکی سے ہے جوشِ شکست رنگ

یہ تازہ گل ہے لالہ فروشِ شکست رنگ

یوں ہے ڈلک بدن کی اس پیرہن کی تہ میں سرخی بدن کی جھلکے جیسے بدن کی تہ میں

آستیں اُس نے جو کہنی تک چڑھائی وقتِ صبح

آرہی سارے بدن کی بے حجابی ہاتھ میں

جہاں تک صورت و رنگ کے احساس یا خالص احساس رنگ کا تعلق ہے۔ مصحفی کی اس خصوصیت کا مجمل احساس مجھے پہلے سے تھا۔ لیکن کچھ دن ہوئے۔ ہمایوں میں کسی کا مضمون مصحفی کی ''تشکیل بیان'' پر شائع ہوا تھا۔ اس کے مطالعے نے مصحفی کی اس انفرادی صفت کو مجھ پر زیادہ واضح کر دیا۔ آج تک اُردو کے کسی غزل گو کے کلام میں رنگ کا لفظ اتنی بار نہیں آیا ہے، جتنی بار مصحفی کے یہاں آیا ہے اور مصحفی کو اس لحاظ سے ہم اگر حواس خمسہ کا شاعر کہیں تو بجا ہوگا۔ کچھ اشعار اور سنیے:

مجھے رحم آئے ہے حسرت پہ آہ اس مرغ بے پر کی

کہ اڑ سکتا نہ ہو اور ہو بزیر آشیاں بیٹھا

حسرت پہ اس مسافر بے کس کے روئیے جو تھک کے بیٹھ جاتا ہو منزل کے سامنے

ان اشعار سے مصحفی کی ایک اور خصوصیت نمایاں ہوتی ہے اور وہ خصوصیت ''ترسنے'' کی ہے۔ یونان کی میتھالوجی میں تنتاتوس (TANTAUTUS) نامی ایک نوجوان کو کنویں میں الٹا لٹکا دیا جاتا ہے اس کنویں میں پانی بھی ہے اور سیب سے لدے ہوئے درخت بھی۔ لیکن پانی تک اس کے ہونٹ اور پھلوں تک اس کے ہاتھ پہنچ پہنچ کر رہ جاتے ہیں۔ اس کش مکش کو (TANTIVLID) کہتے ہیں اور انگریزی لفظ (TANTALIZING) اسی سے نکلا ہے۔ اور اس رنگ میں مصحفی کا کوئی حریف نہیں یہ احساس محض مصحفی کے مضمون اور مفہوم سے پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے لہجے اور اس کے اشعار کی صوتی اور وجدانی فضا سے پیدا ہو جاتا ہے۔ جرأت کی معاملہ بندی میں اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں لیکن جس طرح میر اور سودا کے رنگ کو ایک نرم کسک اور معتدل انداز دے کر مصحفی نے اپنی انفرادیت نمایاں کی ہے اسی طرح وہ جرأت کی معاملہ بندی کو بھی اپنے خاص انداز میں بدل دیتا ہے۔ اب میں ان اشعار کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے جو معاملہ بندی کے مضامین سے عموماً الگ ہیں پھر آگے بڑھتا ہوں۔ سودا کے انداز میں سودا سے الگ مصحفی کی آواز پھر سنیے:

نہ تنہا مصحفی ہی اس کے ہاتھوں سے ہے آوارہ
کوئی بھی چین سے یارو نہ زیرِ آسماں بیٹھا

تجھے کس نے روک رکھا ترے جی میں کیا یہ آئی
کہ گیا تو بھول ظالم ادھر التفات کرنا

بارے اب تم بھی لگے خونِ غریباں کرنے ہاتھ میں تم نے بھی تلوار سنبھالی کیا خوب

جب کہ تو اس میں سے جھانکے ہے ستاروں کی طرح
جگمگاتی ہے ترے غرفے کی جالی کیا خوب

اس گل کی باغ میں جو صبا نے چلائی بات غنچے نے مسکرا کے کہا میں نے پائی بات

اے زبانِ تیشہ کہہ کچھ کوہ کن کی سرگذشت
یعنی آخر کیا ہوئی اس بے وطن کی سرگذشت

نالہ جاتا ہے تابہ عرش بریں ہے شبِ ہجر کی یہی معراج
ہے دوا اس مریض کی تجھ پاس جس کا عیسیٰ بھی کر سکے نہ علاج

کب کا اک عمر سے جھگڑا ہے دل و جان کے بیچ
کام دونوں کا کیا یار نے اک آن کے بیچ

چمکے ہے کچھ وہ ابروے خم دار بے طرح چلتی ہے آپ ہی آپ یہ تلوار بے طرح
ہمسائگی پہ یار کی کیا دل کو خوش کروں مجھ سے تو ہے کھنچا وہ حیادار بے طرح

سحر ہے رُخ پر ترے زلفوں کے بَل کھانے کی طرح
سیکھے کوئی تجھ سے پیارے دل کے لے جانے کی طرح
کل جو وہ رستے میں ناگہ مل گیا، تھی دیدنی
میرے رَہ جانے کی وضع اور اس کے رُک جانے کی طرح

کہاں تلک پھریں اُڑتے اِدھر اُدھر صیاد تری ہی نذر ہیں اب لے یہ مشت پر صیاد
وہ خوں گرفتہ ہوا کون قابلِ فتراک جو آج دامنِ زیں ہے بہار پر صیاد
خدا کے واسطے چوبِ قفس کو سُرخ نہ کر
ہمارے قتل پہ باندھے ہے کیوں کمر صیاد
بھلا تمیز تو کر بوے مشک و گیسو میں رہی ہے بادِ صبا تو بھی تو ختن میں دیر

اس تیغ زن کو یار و مرے دل سے کیا خبر
قاتل کو بے قراریٔ بسمل سے کیا خبر
منہ اٹھ گیا جدھر کو اُدھر ہی چلے گئے آوارگانِ شوق کو منزل سے کیا خبر
شمع شب فراق بنے ہم تو مصحفی

ہم دل جلوں کو عیش کی محفل سے کیا خبر

کچھ یوں ہے نقاب اس بت بے پیر کے منھ پر — جیسے ورقِ سادہ ہو تصویر کے منھ پر

کیا جانے کسے ذبح کیے آئی ہے کافر — ہے آج تو سرخی تری شمشیر کے منھ پر

گو غیر کی خواہش ہے ترے دل میں تو ہوئے — یہ بات نہ رکھ عاشق دلگیر کے منھ پر

عزت نہیں اُس صید کی کچھ صیدِ حرم میں

جو صید کہ آیا نہ ترے تیر کے منھ پر

تھا سرخ پوش وہ گل شاید چمن کے اندر — شعلہ سا شب پھرے تھا سرو دمن کے اندر

جو ہاتھ دلبروں کے دامن کو کھینچتے تھے — وہ کھنچ کے رہ گئے ہیں کیسے کفن کے اندر

گورے بدن کا عالم اس کے میں رات دیکھا — اک نور کا جھمکڑا تھا پیرہن کے اندر

شکوے کا نامہ اس نے وہ خوں چکاں لکھا تھا

چھریاں دھری تھیں جس کی ہر اک شکن کے اندر

آسودگانِ خاک کے عالم کی سَیر کر — کیا چُپ پڑے ہیں محفلِ ماتم کی سَیر کر

اے مصحفی بہار کے دن ہیں یہ بے نصیب

چل تو بھی باغ میں گل و شبنم کی سَیر کر

مصحفی کی اس خصوصیت کو تو سب ہی نے مانا ہے کہ وہ سنگلاخ سی سنگلاخ زمین کو پانی کر دیتا ہے۔ مصحفی کے مجموعۂ کلام میں اکثر غزلیں بلکہ اسی مضمون میں کتنے شعرا ایسے ملیں گے کہ رو میں آپ پڑھ جائیں گے اور اس طرف مطلق دھیان نہ جائے گا کہ زمین کتنی سنگلاخ تھی۔ آپ انشا اور مصحفی کے معرکوں کے سلسلے کی وہ غزلیں پڑھیے جن کے قافیے اور ردیف ہیں ''مغرور کی گردن''، ''لنگور کی گردن'' آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ مصحفی انشا سے کتنا بڑھ گیا ہے۔ اخیر کے چند اشعار یہاں نقل کرتا ہوں جن سے مصحفی کی انفرادیت

پوری طرح ظاہر ہوتی ہے:

انصاف کیا اس کا میں اب شہ کے حوالے　　جھکتی ہے جہاں مار کی اور مور کی گردن
جس سَر پہ ٹک اپنا وہ رکھے دستِ نوازش　　اس سَر کا بنے تکیہ سرِ حور کی گردن
اس دَر کا جو سجدہ اسے منظور نہ ہوتا　　ملتی نہ فرشتوں کو کبھی نور کی گردن

اے مصحفی خامش یہ سخن طول نہ کھینچ جائے
یاں کو تہ ہی بہتر سر پُر شور کی گردن

جس آسانی سے انشا کی غزل کے اُلجھاؤ کو اس غزل میں مصحفی نے سلجھایا ہے اور جس نرم دھار سے انشا کے غلط اشعار کو مصحفی نے کاٹا ہے وہ نظر انداز کرنے کی چیز نہیں۔ سودا کی ہجو اور مصحفی کے ان اشعار میں بھی اب آپ کو ایک فرق نظر آ گیا ہوگا۔ یعنی یہاں بھی مصحفی نے اسی نرم سلاست اور اسی اعتدال و توازن کا ثبوت دیا ہے جو اس کا حصّہ ہے۔ مصحفی کا وہ معذرت نامہ جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

قسم بذات خدائے کہ ہے سمیع و بصیر
کہ مجھ سے حضرتِ شہ میں ہوئی نہیں تقصیر

مجھے کیا سب کو غالب کے اس قطعہ کی یاد دلاتا ہوگا جو یوں شروع ہوتا ہے:

منظور ہے گذارشِ احوال واقعی
اپنا بیان حسنِ طبیعت نہیں مجھے

لیکن غالب کی شوخ نگاری کی جی کھول کر داد دیتے ہوئے بھی میں یہ ہی سمجھتا ہوں کہ اپنی معصومیت کے یقین دلانے کا نرم و شریں لب و لہجہ جو مصحفی کے معذرت نامے کا ہے وہ غالب کے قطعہ کا نہیں ہے۔ آیئے مصحفی کی غزلوں کی پھر سے سیر کریں۔

دل لے گئے آنکھوں میں یہ تدبیر لگا کر
آئے تھے جو کل سرمہ تسخیر لگا کر

شاید ہوئی نہیں مری حاجت روا ہنوز سوے فلک دراز ہیں دست دعا ہنوز
دیکھا تھا ایک دن کہیں اس گل کو باغ میں آوارۂ چمن ہیں، نسیم و صبا ہنوز
ہاتھوں سے اس کے رنگ حنا اُڑ گیا ولے تڑپے ہیں خوں میں کشتۂ رنگ حنا ہنوز
فندق ان انگلیوں پہ نہیں ہے تو کیا ہوا رنگینیاں وہی ہیں اشارات میں ہنوز

پہنا جو میں نے جامۂ دیوانگی تو عشق
بولا کہ یہ بدن پہ ترے سج گیا لباس

ازبس کہ چشمِ تر نے بہاریں نکالیاں مژگاں ہے اشک سرخ سے پھولوں کی ڈالیاں
کل کر رہا تھا غیروں سے نظروں میں گفتگو پر دیکھتے ہی کچھ مرے نظریں چرا لیاں

اے مصحفی تو ان سے محبت نہ کیجیو
ظالم غضب کی ہوتی ہیں یہ دلّی والیاں

مصحفی کیوں کے نہ بھڑکوں میں کہ تحریک نسیم آتشِ دل پہ مرے کرتی ہے کارِ دامن

مصحفی کے تئیں دیکھیں ہیں جو وہ کشتہ پڑا
پاس جاتے نہیں شرما کے چلے آتے ہیں

نے اُنس کے خواہاں ہیں نے پیار کے بھوکے ہیں
ہم لوگ ہیں بازاری دیدار کے بھوکے ہیں

جی میں آتا ہے کہ بوسہ کفِ پا کا لے لوں رنگ ہونٹوں پہ تری تازہ حنا کا لے لوں

سرمہ دینے میں اس کی آنکھوں میں
کیا کہوں آب داریاں کیا تھیں

زلفیں تری زاہد سے الجھتی ہیں تو آنکھیں

کہتی ہیں کہ اس مرد مسلماں کو نہ چھیڑو

کیا نظر پڑ گئی وہ چشمِ خمار آلودہ　　　شفق صبح تو ہے زور بہار آلودہ

میری نظر مجھی کو لگے دور چشم بد

اس دم تو بن رہے ہو پری پھر کے دیکھ لو

اٹھنے سے ترے شور قیامت بھی گیا بیٹھ

اے فتنۂ برخاستہ از بہر خدا بیٹھ

پردہ نہ رکھ اس روے دل افروز کے آگے　　　یوں چاہے تو سب اپنا بدن مجھ سے چھپا بیٹھ

کیا ہم نہیں پہچانتے یہ ساختہ صورت

غصّے سے ٹک اک اور بھی تو منھ کو بنا بیٹھ

انداز کے صدقے ہیں نہ ہم ناز کے صدقے　　　گر ہیں بھی تو اس گرمیٔ آواز کے صدقے

مت دیکھ تو اوروں کی طرف میری طرف دیکھ

کافر میں تری چشمِ فسوں ساز کے صدقے

جس وقت کہ کوٹھے پہ وہ ماہِ تمام آوے　　　کیا دور ہے گر اس کو سورج کا سلام آوے

پانووں کو لگا مہندی دل خون کیا میرا

کیا جانیے کیا آفت تا وقت خرام آوے

اک شاخِ گل پہ صبح مری جا پڑی تھی آنکھ　　　قامت کو کھینچ مجھ کو قیامت دکھا گئی

افغاں کہ سر سری سی کسی کی نگاہِ لطف

بیٹھے بٹھائے اک ہمیں تہمت لگا گئی

جنھیں تیری ٹھوکر کا دل میں تھا کھٹکا　　　لحد میں بھی آرام سے وے نہ سوئے

اڑائے ہیں لختِ جگر آہ نے جب

ہوا میں بھی گلزار پیدا ہوا ہے

میں ساعد نازک کے ترے صدقے ہوں تجھ سے
کیوں کر قفسِ مرغ گرفتار اُٹھا ہے
اے مصحفی دل جس نے اُٹھایا ہے جہاں سے
اُٹھتے ہوئے وہ یاں سے سبک سارا اٹھا ہے[1]

کون آیا ہے نہانے لطف بدن نے کس کے	لہروں سے سارا دریا آغوش کر دیا ہے
نوبت سخن کی ہم تک جب آئی ہے ادب نے	خاموش کہہ کے سب کو خاموش کر دیا ہے
مجلس میں مصحفی کی آیا ہے جو بدعویٰ
میں اک قدح میں اس کو مدہوش کر دیا ہے

منظور اگر تمھیں بھی تماشاے خلق ہے	وابستہ اک نظر کی تمناے خلق ہے
کس طرح کوئی چین سے بیٹھے کہ رات دن	دورِ سپہر درپے ایذاے خلق ہے
میرا گناہ کیا ہے جو مجھ بے گناہ پر	عالم سمٹ کے آیا ہے، دعواے خلق ہے
معنی طلب کی صورتِ خالق پہ ہے نظر	صورت پرست محو تماشاے خلق ہے
شاید کہ آج مصحفی مارا گیا کہیں
اس کی گلی میں کہتے ہیں غوغاے خلق ہے

انداز و ناز میں تجھے استاد کر گئے	اہل زمانہ ہم پہ یہ بیداد کر گئے
کرتے نہیں جو یاد تو بیداد کیجیے
یعنی کسی طرح تو ہمیں یاد کیجیے

---

[1] سبک رُوح دنیا سے چھوٹیں گے ستے
گراں ہوں گے وہ جن کو ستی ہے دنیا (حضرت عبرت گورکھپوری)

ترے چہرے کے ہنگام تماشا دل دھڑکتا ہے
نگاہیں سخت ہیں بے باک اور رخسار نازک ہے
نزاکت عاشق و معشوق کی یکساں نہیں ہوتی
مری گفتار نازک ہے تری رفتار نازک ہے

ہم اُٹھ کر خواب سے تیری گلی کا قصد کرتے ہیں
گدا کو صبح دم جوں بارگاہ شاہ یاد آوے

برق رخسار یار پھر چمکی اس چمن کی بہار پھر چمکی
میرے گریے سے آب و تاب آیا صورت روزگار پھر چمکی
دیکھیو پانْو رکھ دیا کس نے
آج کیوں نوکِ خار پھر چمکی

اس کی رفتار کا مذکور جب آجاتا ہے
جی کی ہوتی ہے یہ حالت کہ رندھا جاتا ہے
کون اس باغ میں اے باد صبا جاتا ہے
رنگ رخسار سے پھولوں کے اُڑا جاتا ہے
دل کے دھڑکوں کا یہ عالم ہے کہ بے منتِ دست
پُرزے ہو ہو کے گریباں اُڑا جاتا ہے

کیا ستم ہے کہ تو غرفے میں پھرے بال کھُلے
اور نظّارہ ترا دیدۂ روزن مارے
دشمن و دوست کو الفت نے تری ایک کیا ہاتھ پر ہاتھ نہ کیوں شیخ و برہمن مارے
اے خوشا حال انھوں کا جو ترے کوچے میں خاک پنڈے سے ملے بیٹھے ہیں آسن مارے

مصحفی کام مرا ضبط سے اب در گذرا
کب تلک غم میں کسی کے کوئی تن من مارے

میں وہ نہیں ہوں کہ اس بُت سے دل مرا پھر جائے
پھروں میں اس سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے

بکھیر دے جو وہ زلفوں کو اپنے مکھڑے پر
تو مارے شرم کے آئی ہوئی گھٹا پھر جائے

تو دَر کو شوق سے رکھ بند پر نہ اتنا بھی
کہ آوے جو کوئی وہ ہو کے بدگماں پھر جائے

اس سبب تو پریشاں رہا میں دنیا میں کہ سالہا تری زلفوں کی ابتری دیکھی

حسرتؔ موہانی کے اس مصرعہ کا سلسلہ کہاں پہنچتا ہے:
''وہ ابتری جو تری زلفِ پُرشکن میں رہے''

جس دم وہ میری خاک کو ٹھوکر لگا چلے
چوکے یہی کہ وہاں سے نہ دامن اُٹھا چلے

بلبل کے مشتِ پَر بھی اڑاوَ تو سیر ہے
غنچوں کو چٹکیوں میں تو آخر اُڑا چلے

لیلےٰ بھی سَیرِ باغ کو ہوتی نہیں سوار
ناقے کے آگے آگے نہ جب تک صبا چلے

نالے تو ہم نے وادئ غربت میں سر کیے
پر خفتگانِ خاک کو ناحق جگا چلے

میں دَوڑ کے لگ جاؤں ہوں ظالم کے گلے سے
جب تک کہ نزاکت سے وہ تلوار سنبھالے

کھول دیتا ہے تو جب جا کے چمن میں زلفیں
پا بہ زنجیر نسیمِ سحری نکلے ہے

مصحفی کس کے کھلے بال تو دیکھ آیا ہے
کہ تری وضع سے شوریدہ سری نکلے ہے

زُلف رُخسار پہ کھولی تھی سرِشام اُس نے
کہ سیاہی شب ہجراں کی تھی آغاز ہوئی

جو ہے سو تمھارا ہی طرفدار ہے صاحب
ہندو ہیں ہمارے نہ مسلمان ہمارے

میں اتنے اشعار نقل کر کے اس مضمون کو اس قدر طول نہ دیتا۔ لیکن مصحفی کا کلام چوں کہ عام طور پر دستیاب نہیں، اس لیے اسے ضروری سمجھا گیا۔ بہر حال آپ یہ مضمون یہاں تک دیکھ کر میرے اس بیان کی صداقت کا احساس غالباً کر چکے ہوں گے کہ اگرچہ میرؔ کا سوز و ساز ایک نرم اور معتدل شکل میں مصحفی کے یہاں موجود ہے اور یہ نرمی و اعتدال ایک نفوی صفت[1] نہیں ہے بلکہ ایک اثباتی صفت ہے۔ پھر دلّی میں مصحفی تنہا وہ شخص تھا جس کی طبیعت کو سوداؔ کے رنگ طبیعت سے خاص مناسبت تھی، وہ شگفتگی و رنگینی، وہ البیلا پن اور رسیلا پن، وہ سج دھج، وہ نشاط وہ سرمستی، جو سوداؔ کی خصوصیتیں تھیں، یہاں صفات بیک وقت کچھ نرم ہو کر نکھر کر اور زیادہ سُبک رفتار ہو کر مصحفی کی رَچی ہوئی اور سنواری ہوئی شاعری میں جلوہ گر ہیں۔

اگر ہم اس مرکزی و مستقل خصوصیت کو بیان کر دینا چاہیں جو میرؔ و سوداؔ کے مختلف اندازوں کو اڑاتے ہوئے بھی مصحفی کے وجدان و کلام میں جاری و ساری ہے تو اس کو ہم ایک رچا ہوا اعتدال کہہ سکتے ہیں یا ایک تحت الغنائی کیفیت، اگر میرؔ کے یہاں آفتاب نصف

---

[1] فاضل مقدمہ نگار نے نفوی بہ معنی منفی استعمال کیا ہے۔ (مرتّب)

النہار کی پگھلا دینے والی آنچ ہے تو سودا کے یہاں اُس کی عالم گیر روشنی ہے۔ لیکن آفتاب ڈھل جانے پر سہ پہر کو گرمی اور روشنی میں جو اعتدال پیدا ہو جاتا ہے اور اس گرمی اور روشنی کے ایک نئے امتزاج سے جو معتدل کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ مصحفی کے کلام کی خصوصیت ہے۔ مصحفی کے کلام میں بے پناہ اشعار نہ سہی، نرم نشتر نہ سہی لیکن شبنم کی نرمی اور شعلہ گل کی گرمی کا ایسا امتزاج ہے جو اس کی خاص اپنی چیز ہے۔ اس کے یہاں تنقید حیات نہ سہی، لیکن ایک مزاجِ حیات ہے اور یہ مزاج جاذب توجہ ہے۔ کیا ایک رچے ہوئے مزاجِ شاعری کی تخلیق تنقیدِ حیات نہیں ہے؟ مصحفی محض ایک کم تر میر یا ایک کم تر سودا نہیں ہے۔ وہ ہے مصحفی، اس کی شاعری ایک نجی شخصیت ہے۔ اس کی عروس سخن کے خدوخال جدا ہیں جس کے کول اور رسمسے گات میں نئی جاذبیت، نئی دل کشی، نیا سہاگ اور نیا جوبن ہے۔ اس کے نغموں کی شبنم سے دُھلی ہوئی پنکھڑیاں ان گل ہائے رنگا رنگ کا نظارہ کراتی ہیں جن کی رگیں کچھ دکھی ہوئی ہیں اور جن کی چٹیلی مسکراہٹ سے بھینی بھینی بوے درد آتی ہے۔ مجھے اس وقت دو شاعروں کے نام یاد آ گئے۔ ایک حالی جو میر کے رنگ میں اسی اعتدال کا ثبوت دیتے ہیں، جو مصحفی کی مرکزی اور مستقل خصوصیت ہے اور پھر حسرت موہانی جو مصحفی کی رنگینی کی تقلید کرتے ہوئے مصحفی کے اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ حالی:

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اُجاڑ
ہو گئی اک اک گھڑی تجھ بن پہاڑ

بے قراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشق بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرتے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

کر دیا خوگرِ جفا تو نے　　　خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے

حسرت موہانی: رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا

طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

دل کو خیال یار نے مخمور کر دیا

ساغر کو رنگِ بادہ نے پر نور کر دیا

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے

ہم نے اس شوخ کو مجبور حیا دیکھا ہے

رونقِ پیر ہن ہی خوبیِ جسمِ نازنین

اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

آنکھوں کے تبسّم نے سب کھول دیا پردہ

ہم پر نہ چلا جادو اے چین جبیں تیرا

جہاں تک خیال و بیان میں اعتدال ومیانہ روی کا تعلق ہے۔ نہ حالؔی کے یہ اشعار میرؔ کی تقلید ہیں نہ حسرتؔ کے اشعار سوداؔ کی تقلید، دونوں کے یہاں مصحفؔی کا رنگ آ گیا ہے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ شعر میں جب داخلیت اور خارجیت کا امتزاج ہوتا ہے تو زبان و بیان کی طرف بھی شاعری کی توجہ خاص طور پر ہونے لگتی ہے اور یہی وہ خصوصیت تھی جس نے سوداؔ کو قادرالکلام بنایا۔ زبان دانی میں میرؔ، سوداؔ سے کم نہ تھے لیکن چونکہ سوداؔ کی طبیعت میں شگفتگی زیادہ تھی، اس لیے ان کی زبان نکھر گئی تھی۔ مصحفؔی میں میرؔ کا شدید الیہ جذبہ یا ہیجان (HIGH TRAGIC PASSION) نہیں ہے، نہ مصحفؔی کا غم بے دلی کا رنگ اختیار کرتا ہے۔

مصحفؔی کی طبیعت میں ہر چند وہ تلاطم، وہ طوفان، وہ جوش و خروش نہیں ہے جو سوداؔ کا حصہ ہے پھر بھی اس رنگینی و خارجیت نے جو مصحفؔی کے وجدان میں تھی، اس کی زبان میں ایک خاص نکھار پیدا کر دیا ہے اور اس کو اتنا ہموار و سُبک بنا دیا ہے کہ مشکل زمینوں کو شگفتہ کر

دکھانے میں وہ سودا سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ اردو کا شاعر یا میری ہوتا ہے یا سودائی۔ سودائی ہونے کی پھبتی ذوق پر تو غالب نے کامیابی سے کس دی۔ لیکن مصحفی پر یہ پھبتی نہیں کسی جا سکتی۔

خود مصحفی کا بیان سنیے۔ ایک رباعی میں وہ اپنے کو سودا کے بعد آنے والا شاعر بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ میری شاعری کی شان سودا سے الگ ہے۔

سودا کا تو سرد ہو چکا ہے بازار
اب بزمِ سخن ہے میرے دم سے گلزار
ہے شان تری جلوہ گری میں ہر وقت
سچ ہے کہ تجلّی کو نہیں ہے تکرار

چوتھے مصرع میں اپنی انفرادیت کا نکتہ مصحفی نے صاف صاف بیان کر دیا ہے۔ ایک اور رباعی ملاحظہ ہو:

اس کلبۂ اجزاں کو وطن تو نے کیا — اس تودۂ خاک کو چمن تو نے کیا
القصہ کہ مصحفی کو اپنے یارب — دستاں زنِ گلزار سخن تو نے کیا

جب اُجڑی دلّی چھوڑ کر مصحفی لکھنؤ پہنچے تو یہاں جرأت و انشا کا طوطی بول رہا تھا۔ جرأت کی معاملہ بندی بہ حیثیت مجموعی، اردو غزل میں ایک نئی چیز تھی۔ آنے کو دلّی سے یہاں میر، سوز اور سودا بھی آ چکے تھے لیکن ان تینوں میں سے کسی پر جرأت کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی اور خاص لکھنؤ کا بھی کوئی شاعر، بڑا یا چھوٹا جرأت کا انداز نہ اڑا سکا۔ لیکن مصحفی نے جرأت کے رنگ کو اختیار کیا اور ایسے حسن کے ساتھ کہ وہ مخصوص ان ہی کی چیز نظر آنے لگا۔ جرأت کا مخصوص رنگ اس کے ان اشعار میں جھلک رہا ہے۔

دیکھا تو یوں وہ کہہ کے لگے منھ کو ڈھانپنے
کم بخت پھر لگا مجھے نظروں میں بھانپنے

کلیاتِ مصحفی

جب یہ سُنتے ہیں وہ ہمسائے میں ہیں آئے ہوئے
کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے
اس ڈھب سے کیا کیجیے ملاقات کہیں اور
دن کو تو ملو ہم سے، رہو رات کہیں اور

اک واقف کار اپنے سے کہتا تھا وہ یہ بات   جرأت کے جو گھر رات کو مہمان گئے ہم
کیا جانیے کم بخت نے کیا ہم پہ کیا سحر
جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

ان حدود سے بڑھ جاتا ہے تو جرأت یہاں تک بھی کہہ جاتا ہے کہ:

بال ہیں بکھرے، بند ہیں ٹوٹے، کان میں ٹیڑھا بالا ہے
جرأت ہم پہچان گئے، کچھ دال میں کالا کالا ہے

آخری شعر جرأت کے رنگ کی بہترین مثال نہیں کہی جاسکتی ہے۔ اس شعر میں انہیں انشا اور رنگین کی ہوا لگ گئی ہے۔

جرأت کے عاشقانہ اشعار میں ہر جگہ معاملہ بندی نہیں ہوتی۔ لیکن واقعیت اور اصلیت ہمیشہ ہوتی ہے معاملہ بندی کے اشعار میں معشوق کی کردار نگاری خاص چیز ہوتی ہے لیکن عاشق کی تصویریں کھینچنے میں بھی جرأت نے اسی محاکاتی انداز کا ثبوت دیا ہے۔ جس کا ثبوت اس نے معاملہ بندی میں دیا ہے۔

وہ گیا اُٹھ کر جدھر کو میں اُدھر حیران سا
اُس کے جانے پر بھی کتنی دیر تک دیکھا کیا
جب تلک کرتے رہے مذکور اُس کا مجھ سے لوگ
جی میں کچھ سوچا کیا میں اور دل دھڑکا کیا

یہی وہ واقعیت اور اصلیت ہے جو آپ مصحفی کے قریب قریب ان سب اشعار میں پائیں گے جنھیں میں نے نقل کیا ہے۔ اب جرأت کے انداز میں مصحفی کے اشعار سنیے۔ جرأت جنسی نفسیات کی بہت بے لاگ ترجمانی کر جاتا ہے۔ اس کی دوٹوک باتوں میں آمد کی شان ہوتی ہے اور شدید نفسیاتی و کرداری واقعیت۔ مصحفی ان نفسیاتی کیفیات کو ذرا نرما دیتا ہے۔ وہ حسن کی اداؤں کو، معشوق کی چھب کو، اپنے دل کی امنگوں اور امنگوں کی چٹکیوں کو سمجھ سمجھ کر رہ جاتا ہے۔ اور معاملہ بندی میں ایک خفیت نرم تلملاہٹ پیدا کر دیتا ہے۔ جمال یار و دیدیار کی خارجی سج دھج پر للچاتا ہوا بھی وہ ان کے مشاہدۂ محض سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ معشوق کی اداؤں کی مصوری اس کا خاص موضوع ہے۔ غرض کہ مصحفی کے للچانے، ترسنے، جی مار مار کے رہ جانے، تلملا اُٹھنے، کسمسانے، تماشائے حسن اور حسن تماشا کا انداز جرأت کے انداز سے کچھ جدا ہے۔

میں انداز کے صدقے کہ نہ کی مجھ پر نظر
دیکھتے ہی مجھے ان نے نظر انداز کیا

تمھارے عدوں پہ ہم کو تو اب نہیں ٹھہراؤ
مگر نیا کوئی امیدوار ٹھہرے گا

آساں نہیں ہے تنہا در اس کا باز کرنا
لازم ہے پاسباں سے اب ہم کو ساز کرنا

سویا تھا لپٹ کر میں اس ساتھ وے اس نے
پہلو سے مرے پہلو تا صبح جدا رکھا

کسی کو گرمیٔ تقریر سے اپنی لگا رکھا
کسی کو منھ چھپا کر نرمیٔ آواز سے مارا

دل سے خبر نہیں ہے مجھے اس کے مصحفی

آنکھوں میں تو اشارہ کئی بار ہو گیا
عشق سے میرے جو گھبرایا تو پھر ناچار ہو

آ کے گھر میرے وہ مجھ کو آپ سمجھانے لگا
پاس میرے وہ ترا پیار سے آنا نہ رہا
وہ محبت نہ رہی اور وہ زمانہ نہ رہا
ہوش کا اس کے میں کشتہ ہوں کہ وہ مایۂ ناز
شب رہا گھر مرے اور غیر نے جانا نہ رہا
کب شبِ وصل وہ آیا کہ مرے اور اس کے
درمیاں میں شبِ ہجراں کا فسانہ نہ رہا
ہو کے ناچار کہاں میں نہیں جاتا اُس کو
پاس سے جب مرے اُٹھنے کا بہانہ نہ رہا

انگڑائی لے کر اپنا مجھ پر خمار ڈالا   کافر کی اس ادا نے بس مجھ کو مار ڈالا

ترے کوچے کی طرف سینے سے اٹھ دوڑے ہے دل
اس کو یاد آوے ہے جب آنکھ لڑانا تیرا

ہو گیا کیا وہ بگاڑ آہ کہ مطلق نہ رہا
رُوٹھنا تجھ سے مرا اور منانا تیرا

اب میں اس دن کو بھی روتا ہوں کہ بے لطف نہ تھا
ہاتھ رکھ رکھ کے وہ دَر پر سے اٹھانا تیرا

ساتھ سونا اس کا یاد آیا جو مجھ کو مصحفی
رات میں بستر پہ کیسا تلملا کر رہ گیا

''رہ گیا'' اور ''رہ گیے'' کی ردیفوں کو مصحفی کے مزاج سے خاص مناسبت ہے۔ اس نے متعدد غزلوں میں ان ردیفوں کو لیا ہے۔ ہوتے ہوتے کسی بات کا ''نہ ہونا'' اس کا ہوتے ہوتے ''رہ جانا'' یہی وہ (TANTALIZING) باتیں اور موقعے ہیں جن کی مصوری اور ترجمانی اس وقت تک تنہا مصحفی نے کی۔ آتش، شاگردِ مصحفی نے بھی اس ردیف کو دو غزلوں میں باندھا ہے۔ ''میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا''، ''ہر قدم پر خوف ہے یاں رہ گیا واں رہ گیا'' اور ان کے سو برس بعد کچھ مولانا حسرتؔ موہانی نے اس مخصوص نفسیاتی کیفیت کی ترجمانی کی۔ بلکہ مصحفی کی طرز میں بالا رادہ غزل لکھتے وقت حسرتؔ نے ''شرما کے رہ گئے'' اور ''قسم کھا کے رہ گئے'' والی زمین منتخب کی۔ مصحفی کے اب اور چند شعر سنیے:

ہے ہے ترا سر جھکا' کے چلنا پھر شرم سے مسکرا کے چلنا
آنا گھر میں تو کھل کھلانا اور راہ میں منہ بنا کے چلنا

غیروں سے میاں تیری ملاقات نہیں خوب
کچھ عقل کے نزدیک تو یہ بات نہیں خوب

یوں آنکھیں ملا جس سے کہ چاہے تو و لیکن
آگے مرے ہر اک سے اشارات نہیں خوب

کیا جانیے کیا سمجھے کوئی ملنے کو صاحب
اتنی بھی تو بندے پہ عنایات نہیں خوب

کیا خوار پھرا کرتے ہو تم اس کی گلی میں
میاں مصحفی جانے دو یہ اوقات نہیں خوب

واں کیوں کے اشاروں میں کہوں حال دل اپنا
جس جا کہ نہ ہو دور سے اک بات کی تقریب

سُن سُن کے مرے ذکر کو کہتا ہے وہ کافر
ہر ایک کرے ہے اسی بد ذات کی تقریب

اے مصحفی سو آنکھیں لگیں دیکھنے اُس سے
نکلی جو کبھی حرف و حکایات کی تقریب

ہمسائگی پہ یار کی کیا دل کو خوش کروں
مجھ سے تو ہے کھنچا وہ حیا دار بے طرح

سحر ہے رُخ پر ترے زلفوں کے بَل کھانے کی طرح
سیکھے کوئی تجھ سے پیارے دل کے لے جانے کی طرح

کل جو وہ رستے میں ناگہ مل گیا تھی دیدنی
میرے رہ جانے کی وضع اور اس کے رُک جانے کی طرح

شب ہم سے وہ روٹھے تو ہمیں چھوڑ کے باہر
جا گھر میں الگ سو رہے زنجیر لگا کر

دیکھا تھا بات کرتے اسے ساتھ غیر کے
سو اپنا جی کھپے ہے اسی بات میں ہنوز

ہوئے نہ وصل کی دولت سے ہم کبھی محظوظ
جو رفتہ رفتہ ہوا بھی تو مدّعی محفوظ

کام کر جاتی ہیں تری آنکھیں
چپکے چپکے ہزار آنکھوں میں

تمہاری اور مری کج ادائیاں ہی رہیں
رہے جو پاس تو باہم لڑائیاں ہی رہیں

جمنا میں کل نہار کر جب اس نے بال باندھے
ہم نے بھی اپنے دل میں کیا کیا خیال باندھے[1]

ہنستے ہو تو اچھی ہی طرح مجھ کو ہنسو نہ
یوں منہ میں میاں کاہے کو رومال دیا ہے

تو در کو شوق سے رکھ بند پر نہ اتنا تھی
کہ آوے جو کوئی وہ ہوکے بدگماں پھر جائے

اُلجھا ہے تو کس سے کہ ترے جامے کی پیارے
نے چین ٹھکانے ہے نہ دامان ٹھکانے

ایسا نہ ہو پھر ہم بھی کریں اور سے یاری
اس حسن پہ کچھ آپ ہیں مغرور بہت سے

کہتا تھا وہ شب ڈال کے بانہوں کو گلے میں
گردن پہ تری ہیں کئی احسان ہمارے

---

[1] تو اور آرائش خم کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز (غالبؔ)

آپ نے دیکھا کہ جرأت کے رنگ کو اگر کسی نے نباہا تو وہ مصحفی ہے۔ لیکن ''چوماچوٹی'' اور ''دھول دھپا'' سے مصحفی صاف بچ گیا ہے۔ معاملہ بندی اور محاکاتی انداز میں وہ جرأت سے کچھ کم ضرور ہے۔ لیکن مصحفی کے اعتدال اور ایک لطیف حسرتناک لہجے نے عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔

مصحفی کو شاعری میں اگر واقعی مصیبت پیش آئی تو اس بدنداقی میں شریک ہونے کے وقت آئی جس نے انشا کو اچھال رکھا تھا۔ کاش انشا نے اپنے خاص رنگ کو سلیقے اور قرینے سے نباہا ہوتا اور نئی راہ نکال کے اتنا نہ بھٹکتے تو آج وہ زبردست سنجیدہ صاحبِ طرز ہوتے۔ کیوں کہ انشا کے مخصوص رنگ میں اگر اسے مستقل طور پر سلیقے سے برتا جائے تو ایک نئی قسم کی غزل گوئی کا امکان ہے۔ چنانچہ اسی سے عام خیال ہے کہ اگر انشا کو اہل دہلی یا سنجیدہ لوگوں کی صحبت نصیب ہوئی ہوتی تو وہ بڑا زبردست شاعر ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ انشا کو خود اپنی صحبت اگر نصیب ہوئی ہوتی تو وہ غضب کا شاعر ہوتا۔ افسوس کہ خود اپنی صحبت انشا کو اس وقت نصیب ہوئی، جب وہ ختم ہو چکے تھے۔ انشا کا فطری میلان اہلِ دہلی یا سنجیدہ لوگوں کے مزاج سے میل نہیں رکھتا تھا۔ وہ میر، سودا اور مصحفی کے زمرے میں شریک ہونے کے لیے نہیں بنا تھا۔ البتہ قصیدے اور ہجویں لکھنے والا سودا ضرور انشا سے کچھ ہم آہنگ ہے لیکن سودا کی ہجووں کو غزل کے سانچے میں ڈھالنے کی جو حیرت انگیز صلاحیت انشا میں تھی وہ نہایت عجیب وغریب تھی۔ جرأت اور انشا مسلسل غزلوں کے لیے بھی خاص طور پر مناسب طبیعتیں لے کر آئے تھے۔ انشا کے چند وہ شعر سنیے جن کی زمینوں میں مصحفی کو بھی طبع آزمائی کرنی پڑی۔

سج گرم جبیں گرم نگہ گرم ادا گرم
وہ سر سے ہے تا ناخنِ پا نام خدا گرم

پَر تو سے چاندنی کے ہے صحنِ باغ ٹھنڈا
پھولوں کی سیج پر آ' کردے چراغ ٹھنڈا

لے کے میں اوڑھوں بچھاؤں یا لپیٹوں کیا کروں
روکھی پھیکی، سوکھی ساکھی مہربانی آپ کی

جھڑکی سی ادا سہی چین جبیں سہی
یہ سب سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی
گر نازنیں کہے کا بُرا مانتے ہیں آپ
میری طرف تو دیکھیے میں نازنیں سہی
منظور دوستی جو تمھیں ہے ہر ایک سے
اچھا تو کیا مضائقہ انشا سے کیں سہی

یا اؔنشا کی ''آفتاب الٹا'' ''نقاب الٹا'' والی غزل، یہ رنگ اؔنشا سے پہلے اردو غزل میں تھا ہی نہیں اور غزل کے سوز وساز وغیرہ کے متعلق ہمارے جو کچھ بھی اصول ہوں اور یہ اصول اؔنشا کے اس انداز سے چاہے کتنے ہی مجروح ہوتے ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے اشعار سن کر ایک بار زاہد خشک کے منھ سے بھی واہ نکل ہی جائے گی۔ کاش اس رنگ میں اؔنشا کے دو تین سو شعر ہمارے پاس محفوظ ہوتے۔

اؔنشا نے شوخ رنگ کو بگاڑا کیوں کر بات یہ ہے کہ مؔیر کا رنگ ہو یا کسی اور شاعر کا، جب وہ جزئیات کا شکار ہو جائے گا تو ضرور بگڑ جائے گا۔ اؔنشا نے اپنے ساتھ اور اپنے رنگ کے ساتھ بے اعتدالی یہ برتی کہ خارجی چیزوں کو مثلاً ''چولی'' ''دوپٹہ'' ''ازار بند'' چوڑیوں اور جوتیوں کو لے لیا اور اپنے طربیہ وجدان (COM IC SP IR IT) کو نقالی (FARCE) بنا دیا۔

بعض زمینوں میں انشا اور مصحفی دونوں کی غزلیں ہیں مگر انشا کی شوخی اور گرما گرمی اتنی بے پناہ چیز ہے کہ مصحفی دب جاتا ہے۔ لیکن یہ رنگ مصحفی کے شایان شان بھی نہ تھا اور اس لیے وہ انشا کی طرح کھل کھیلنے سے معذور تھا۔ غالب اور انیس معمولی لوگ نہ تھے۔ لیکن انیس غالب کے انداز میں ایک غزل بھی نہیں کہہ سکتے تھے اور نہ غالب انیس کے انداز میں مرثیہ کہہ سکتے تھے۔ ان میں سے کوئی اگر دوسرے کا رنگ اڑانا چاہتا تو منہ کی کھاتا۔ غزل ہی کو لے لیجیے۔ غالب ظرافت، شوخی اور طنز کا بادشاہ ہے۔ لیکن داغ کے چنچل رنگ میں غالب سے بھی غزل نہ ہوتی اور داغ سے غالب کی شوخی نہ نبھتی۔ اس لیے اگر مصحفی وہ شوخی وطرّاری نہ دکھا سکے جو انشا کے لیے مخصوص تھی تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مصحفی کسی طرح بھی انشا سے کم تھے۔ یہ بات یاد رہے کہ بڑے سے بڑا شاعر صرف اس لیے بڑا نہیں ہے کہ وہ اپنے رنگ مس لاثانی ہے یا نہایت کامیاب ہے بلکہ اس لیے بڑا ہے کہ دوسرے کے رنگ میں کہنے سے وہ معذور ہے۔ حقیقی شاعری میں کچھ معذویاں بھی شامل ہوتی ہیں۔ شاعر بہر وپیا نہیں ہوتا۔ مصحفی اور انشا کی جو ہم طرح غزلیں ملتی ہیں اور جن میں انشا اور مصحفی نے اپنے اپنے رنگ کو کامیابی سے نباہا ہے انھیں دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ انشا کی غزلیں اپنی جگہ ہیں اور مصحفی کی غزلیں اپنی جگہ۔ ہر چند کہ مصحفی کے کلام میں ترنّم، سلاست اور رنگینی سب کچھ ہے اور زبان و بیان کے معاملے میں بھی اس کو انشا پر تفوق حاصل ہے اور معنویت میں تو وہ انشا سے کوسوں آگے ہے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ سطحی بلکہ بازاری جذبات بھی زور بیان اور جوش بیان سے نکھر آتے ہیں اور یہی ایک آنچ کی کسر مصحفی کے معانی و بیان کو پورے طور پر نکھرنے نہیں دیتی۔ یوں تو ادب اور شعر کا نسبتی اور متقابلانہ مطالعہ پُر لطف اور کار آمد بلکہ ضروری چیز ہے لیکن ایسے مطالعے میں گمراہ ہو جانے کا احتمال رہتا ہے اور خاص کر دو مختلف المذاق شاعروں کا مطالعہ بات یہ ہے کہ مصحفی اور انشا کی ان غزلوں کا ساتھ

ساتھ فیصلہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے قدرتی پھولوں اور آتش بازی کے پھولوں کا مقابلہ کرنا۔ انشا کی شاعری ہمارے وجدان کی ظاہری سطح کو لے اڑتی ہے اور ہم میں متکیف یا متاثر ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رہ جاتی۔ لیکن اس اثر سے بچ کر اگر ہم دل کی دھڑکنوں کو انشا اور مصحفی کی ہم طرح غزلوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں تو انشا ساز بے آہنگ ہو کر رہ جائے گا اور مصحفی ساز باآہنگ ثابت ہوگا۔ انشا ہماری تخیلی سماعت کو تشفی نہیں بخشتا اور مصحفی ہماری سامعہ نوازی کرتا ہے۔ بہر حال اس سلسلے میں جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ مصحفی اور انشا کی ہم طرح غزلوں پر بحیثیت مجموعی اظہار رائے کیا ہے ورنہ متفرق اشعار اور خاص قافیوں میں کبھی مصحفی زیادہ کامیاب ہیں اور کبھی انشا اور کبھی دونوں برابر رہتے ہیں۔ مثلاً مصحفی کا مطلع ہے:

جو پھرا کے اس نے منھ کو بہ قفا نقاب اُلٹا
اودھر آسمان اُلٹا ادھر آفتاب اُلٹا

اور انشا کا مطلع ہے:

مجھے کیوں نہ آوے ساقی نظر آفتاب اُلٹا
کہ پڑا ہے آج خم میں قدحِ شراب الٹا

لیکن جواب کا قافیہ اگرچہ مصحفی نے دو اسلوب سے باندھا ہے۔

بسوالِ بوسہ اُس نے مجھے رُک کے دی جو گالی میں ادب کے مارے اُس کو نہ دیا جواب اُلٹا
میں لکھا ہے خط تو قاصد پہ یہ ہوگا مجھ پہ احساں انھیں پانو پھر کے آ تو جو ملے جواب اُلٹا

پھر بھی انشا نے بہت برجستہ کہا ہے:

عجب اُلٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب الٹا

مصحفی کا شعر ہے:

کسی مست کی لگی ہے مگر اس کے سر کو ٹھوکر
جو پڑا ہے مے کدہ میں یہ خم شراب الٹا

لیکن اس قافیے کو انشا نے نہایت مستانہ انداز سے باندھا ہے:

ابھی جھڑ لگا دے بارش، کوئی مست بھر کے نعرہ
جو زمیں پہ پھینک مارے قدح شراب اُلٹا

ایک دوسری غزل میں دونوں کے اشعار یہ ہیں:

انشا

پرَتو سے چاندنی کے ہے صحنِ باغ ٹھنڈا
پھولوں کی سیج پہ آ، کردے چراغ ٹھنڈا
مے کی صراحی ایسی لا برف میں لگا کر
جس کے دھوئیں سے ہووے ساقی دماغ ٹھنڈا
ہیں ایک شخص لاتے خس کی شراب انشا
دھودھا گلاب سے تو کر رکھ ایاغ ٹھنڈا

مصحفی

پیری سے ہو گیا یوں اس دل کا داغ ٹھنڈا
جس طرح صبح ہوتے کر دیں چراغ ٹھنڈا
سرگرم سیرِ گلشن کیا خاک ہوں کہ اپنا
نزلے سے ہو رہا ہے آپی دماغ ٹھنڈا
گرمی کی رُت ہے ساقی اور اشک بلبلوں نے
چھڑکاؤ سے کیا ہے سب صحن باغ ٹھنڈا
ایسے میں اک صراحی شورے لگی منگا کر
لبریز کرکے بھر دے مجھ کو ایاغ ٹھنڈا

مصحفی کا یہ رنگ لکھنؤ کی خارجیت کا فیضان ہے جو سودا کی خارجیت سے بالکل علیحدہ چیز ہے۔ ہم کو مصحفی کے یہاں اس طرح کے اشعار بھی ملتے ہیں جو انشا کے کچھ کم بگڑے ہوئے اور کبھی بہت زیادہ بگڑے ہوئے رنگ میں ہیں۔ مثلاً:

یہ طرفہ اختلاط نکالا ہے تم نے واہ
آتے ہی پاس چٹ سے وو ہیں مار بیٹھنا

رات پردے سے ذرا منھ جو کسو کا نکلا
شعلہ سمجھا تھا اُسے میں وہ بھبھوکا نکلا

پانی بھرے ہے یارو یاں قرمزی دوشالہ لنگی کی سج دکھا کر سقنی نے مار ڈالا

گیند بازی سے اذیت نہ کہیں پہنچے تمھیں
کہ پلٹتی ہے بُری طرح سے سرکا کی گیند

میری طرح سے یار نے میلا کیا لباس پر کیا کہوں پھبا اُسے کیا ملگجا لباس
ہم تو کبھی کہیں نہ کہ کپڑے اُتاریے پہنا کریں گر آپ اسی وضع کا لباس

اب لگے ہاتھوں اس رنگ میں انشا کے بھی کچھ اشعار سن لیجیے۔

جوگی جی صاحب آپ کی بھی واہ دھرم مورت عجب کڈھنگی ہے
چشم بد دور شیخ جی صاحب کیا ازار آپ کی اٹنگی ہے

لیا گر عقل نے منھ میں دلِ بے تاب کا گٹکا
تو جوگی جی دھرا رہ جائے گا سیماب کا گٹکا

ہیں زورِ حسن سے وہ نہایت گھمنڈ پر
نام خدا نگاہ پڑے کیوں نہ ڈنڈ پر

دونوں کا فرق ظاہر ہے اور یقیناً اس رنگ میں مصحفی انشا کو نہیں پہنچتا۔
اب سوال یہ ہے کہ مصحفی کو ہم دلّی کا شاعر سمجھیں یا لکھنؤ کا۔ خود تو وہ کہتا ہے:

اے مصحفی شاعر نہیں پورب میں ہوا میں
دلّی میں بھی چوری مرا دیوان گیا تھا

میں تو کہوں گا کہ جس طرح وہ عمر بھر بے وطن تھا۔ اسی طرح اس کی غزلیں بھی دلّی اور لکھنؤ کے دوراہے پر آوازِ بازگشت کی طرح گونج رہی ہیں۔ مصحفی کے اشعار سنیے:

اے مصحفی تو واں سے کیوں روٹھ کے آیا تھا
دیوانے تری خاطر کڑھتا ہے وطن سارا
روے وطن نہ دیکھا تو نے جو مصحفی پھر
شاید کہ جھینکتے تو اپنے وطن سے نکلا

میں ایک فقیر غریب الوطن مسافر نام — رہے ہے آٹھ پہر جس کو قوت کی تدبیر
مرے حواس پریشاں بایں پریشانی — ہو جیسے لشکر بشکستہ کی خراب بہیر
جو کچھ ہوا سو ہوا مصحفی بس اب چپ رہ — زیادہ کر نہ صداقت کا ماجرا تحریر
خدا پہ چھوڑ دے اس بات کو وہ مالک ہے — کرے جو چاہے جو چاہا کیا بحکم قدیر

ایک رُباعی میں کہتا ہے:

یارب شہر اپنا یوں چھڑایا تو نے — ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تو نے
میں اور کہاں یہ لکھنؤ کی خلقت — اے وائے یہ کیا کیا خدایا تو نے

رہا مصحفی کا محض مقلد اور انتخابی شاعر ہونا سو یہ محض نیم صداقت ہے اور میں نے اب تک جو کچھ اس باب میں لکھا ہے اس سے مصحفی کی انفرادی حیثیت واضح ہوگئی ہوگی۔ اس کا اپنا بھی ایک رنگ طبیعت ہے جس کا وہ تنہا مالک ہے اور جو کسی اور شاعر کا نہیں۔ مصحفی کا کلام

جتنا پڑھے جانے کا مستحق ہے اور اسے جس طرح پڑھنا چاہیے، اتنا اور اس طرح وہ غالباً نہیں پڑھا جاتا۔ اس مضمون کے لیے جب تک میں نے خود اپنے تاثرات پر غور نہیں کیا' مصحفی کی شاعری اور اس کے مزاج کی خصوصیتیں خود مجھ پر نمایاں نہیں ہوئی تھیں۔

آپ مصحفی اور خاندان مصحفی کے شعرا سے قطع نظر کر کے تمام مشہور غزل گویوں کا تصوّر کیجیے۔ میر، سودا، سوز، درد، غالب، مومن، ذوق، داغ، جرأت، انشا، ناسخ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد اگر یہ اشعار سنیے تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ ان اشعار میں کسی اور استاد کا رنگ نہیں بلکہ مصحفی کا اور صرف مصحفی کا رنگ جھلک اور دَمک رہا ہے، جذبات کا اعتدال دیکھیے:

آتش:

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ
ہر قدم پر خوف ہے یاں رہ گیا واں رہ گیا

نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے قافلہ روانہ ہوا

دہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے ‎ ‎ سخن آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

اسیر:

نبض بیمار کی اے رشکِ مسیحا دیکھی ‎ ‎ آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی

خدا جانے یہ دُنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی

امیر:

خنجر نے ترے دیا نہ پانی ‎ ‎ ترسا ترسا کے مار ڈالا

سرد آہیں جب کسی نے کیں وطن یاد آگیا ‎ ‎ چار جھونکے جب چلے ٹھنڈے چمن یاد آگیا

جس جگہ دو گز زمیں پائی کھدی سمجھا میں گور ‎ ‎ جب نئی دو چادریں دیکھیں کفن یاد آگیا

تن سے باہر آ کے دھیان آیا عدم کا روح کو　　قید سے چھٹ کر مسافر کو وطن یاد آ گیا
نزع میں سنگیں دلی کا حال شیریں پر کھلا　　موت کی سختی اٹھائی کوہ کن یاد آ گیا
گور میں بھی ہم نہ بھولے صحبت احباب کو　　گوشۂ خلوت میں لطفِ انجمن یاد آ گیا
جامۂ صد پارۂ گل جب نظر آیا مجھے　　سو جگہ سے چاک اپنا پیرہن یاد آ گیا

رہ گیا اپنے گلے میں ڈال کر باہیں غریب
عید کے دن جس کو غربت میں وطن یاد آ گیا

جلیل:

جھومتی آج جو متوالی گھٹا آئی ہے　　یاد کیا کیا تری مستانہ ادا آئی ہے
پھونکے دیتی ہے مجھے یاد مرے ساقی کی　　آگ برساتی دھواں دھار گھٹا آئی ہے
ہم کو کیا بلبل و گل میں ہے کوئی بات اگر　　وہ صبا تھی جو زمانے میں اُڑا آئی ہے
اب اس کو پردہ دری سمجھو یا کچھ اور کہو　　تمھارے حسن کا چرچا ضرور میں نے کیا
آئے وہ اس ادا سے نسیمِ سحر کے ساتھ　　جتنے چراغِ بزم تھے قربان ہو گئے

صبا:

باغباں بلبلِ کشتہ کو کفن کیا دیتا　　پیرہن گل کا نہ اُترا کبھی میلا ہوکر
اختیاری عملِ رندِ قدح نوش نہیں　　خطِ تقدیر ہے موجِ مے سر جوش نہیں
پہلو میں نگار ہاتھ میں جام　　اس وقت تو بادشاہ کیا ہیں

اثر عظیم آبادی:

حُسن کی جنس خریدار لیے پھرتی ہے　　ساتھ بازار کا بازار لیے پھرتی ہے
دربدر حسرتِ دیدار لیے پھرتی ہے　　سَر کو ہر کوچہ و بازار لیے پھرتی ہے
دیکھ اے جان جہاں شمس و قمر کو دن رات　　آج تک حسرتِ دیدار لیے پھرتی ہے
رات کیا کیا نہ بڑھا دردِ جگر مت پوچھو　　کس خرابی سے کٹے چار پہر مت پوچھو

ہم دَمو کہہ تو چکے حال دل خوں گشتہ　　اب ہمیں تاب نہیں بار دگر مت پوچھو
کچھ خدا جانتا ہے جیسے بسر ہوتی ہے　　زندگی ہے کہ مصیبت ہے آثر مت پوچھو

والد مرحوم عبرت گورکھ پوری:

زمانے کے ہاتھوں سے چارا نہیں ہے　　زمانہ ہمارا تمھارا نہیں ہے

وہ چاہے تو خوش کردے دم بھر میں عبرت
پر ایسا مقدر ہمارا نہیں ہے
کیا ڈھونڈھتی ہے گلشنِ عبرت میں اے خزاں
تو جانتی ہے سب کے چمن میں بہار ہے

ایک وہ بال ہیں جو ہیں سروگردن پہ وبال　　ایک وہ بال ہیں جو تا بہ کمر جاتے ہیں
پوچھو مجھے کہ دہر میں اک کس مپرس ہوں　　دیکھو مجھے کہ ہیچ ہوں سب کی نگاہ میں

راقم الحروف (فراق) بہ زمانۂ نومشقی:

سوئے ہوئے نصیب نہ جاگے ہمارے حیف
ہنگامے تیری چال سے لاکھوں بپا ہوئے

راقم الحروف (فراق) کئی سال کی مشق کے بعد:

اک ذرا عشقِ سبک روح گراں بار سہی　　نگہِ شوق میں کچھ شرم کے آثار سہی
اُسے خلوت میں حیا آئے کیا　　وہ تو خود شرم ہے شرمائے کیا
غم زدوں کا کیوں تپا دینے لگیں باتیں تری
دن ترے بھرپور، رنگا رنگ ہیں راتیں تری
کہہ گئی لہلہا کے قوس قزح　　داستاں تیری نوجوانی کی

یہ نمونہ ہے ان شعراء کے کلام کا جو ایک آدھ کو چھوڑ کر سب مصحفی کے خاندان سے ہیں

اور جن کو بالواسطہ یا بلا واسطہ مصحفی سے فیض پہنچا ہے۔ مصحفی، ان کے شاگرد اور ان کے شاگردوں کے شاگرد جس طرح پھولے پھلے اس طرح کس کس کی کھیتی لہلہائی؟ مندرجہ بالا اشعار کو دیکھو اور سوچو کہ ان اشعار کو نقل کرنے سے قبل میں نے جن صاحب طرز استادوں کا نام لکھ دیا ہے وہ یا ان میں سے کوئی بھی ان اشعار کو دیکھ کر یاد آتا ہے کیا یہ تمام اشعار ناگزیر طور پر ہمیں مصحفی اور تنہا مصحفی کی یاد نہیں دلاتے۔ وہی نرمی، وہی ہمواری، وہی حلاوت، وہی اعتدال و رنگینی، وہی تناسب، وہی توازن، وہی صوتی اور معنوی اثرات، وہی میٹھا میٹھا درد، وہی بندش میں چستی و نرمی کا امتزاج، وہی نرم کشاکش جو کلام مصحفی میں پائی جاتی ہے۔ یہاں بھی موجود ہیں۔ اس سلسلے میں اسیر لکھنوی شاگرد مصحفی کے بھی دو شعر میں نے دیے ہیں۔ ذرا غور کیجیے لکھنؤ اسکول کی غزل گوئی غریب بہت بدنام ہے۔ لیکن ''آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی'' یہ مصرعہ کیا سوائے لکھنؤ کے کہیں اور کسی شاعر کے لیے ممکن تھا۔ اکثر کہہ دیا جاتا ہے، غالباً غالب ہی نے کہا تھا کہ دلّی مضمون کے لیے مشہور ہے اور لکھنؤ زبان کے لیے۔ یہ بات سچ بھی ہے اور غلط بھی' کیوں کہ دہلی کے شعرا کے یہاں بھی زبان کی بہت سی خوبیاں ملتی ہیں۔ اور روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی سے اہلِ دلّی کا کلام خالی نہیں ہے۔ لیکن میرے نزدیک دلّی اور لکھنو ٔ کی خالص زبان کی شاعری میں بھی ایک اہم فرق ہے۔ وہ یہ کہ دلّی والے زبان میں بھی جو اشعار کہتے ہیں ان میں معنویت بیان پر حاوی رہتی ہے۔ اس کے برعکس لکھنؤ والے جب زبان میں شعر کہتے ہیں تو قریب قریب تمام تر توجہ زبان اور محاورے کے حسن کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ اب اسیر کا دوسرا شعر لیجیے۔ مضمون کے لحاظ سے تو یہ شعر لکھنؤ اسکول کا معلوم ہی نہیں ہوتا اور بادی النظر میں غالب کا انداز اس شعر میں معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ''ہزاروں اُٹھ گئے'' وہ ٹکڑا ہے جو غالب کی زبان نہیں بلکہ لکھنؤ کی زبان ہے اور یہی وہ سجاوٹ ہے یہی وہ رچا ہوا انداز بیان ہے۔ یہی وہ

رنگین بول چال ہے جس کی طرف مصحفی اردو غزل کو لے گیا اور جو لکھنؤ کی خاص چیز ہوگئی یہی چیزیں تو انیس کے مرثیوں میں قیامت ڈھاتی ہیں۔ ''تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے''۔ یا ''ہر آنکھ کو پریوں کا اکھاڑہ نظر آئے''، ''تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا'' ان مصرعوں کا صوتی اثر وہی ہوتا ہے جو طبلے پر آہستہ آہستہ تھاپ پڑنے کا صوتی اثر کے ساتھ ساتھ جذبات میں بھی تموج پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک بار میرے دوست مجنوں نے خاندان مصحفی کے کئی شعرا کے اشعار مجھے سنائے۔ میں متحیر تھا کہ یہ سلاست، یہ گھلا ملا ہوا انداز بیان نہ غالب کے یہاں ہے، نہ میر کے یہاں، نہ یہ آتش کے دھکتے ہوئے انگارے ہیں نہ امیر کے تکلف کے نمونے، پھر ان اشعار کا سلسلہ کہاں پہنچتا ہے۔ ہم دونوں نے اس وقت تو یہ ہی فیصلہ کیا کہ شاگردان آتش نے زبان کی صفائی میں بڑا حصہ لیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ اسکول میں زبان کی وہ خوبی جو تکلف و تصنع یا ضلع جگت اور ایہام سے پاک ہے۔ اس کی داغ بیل مصحفی نے ڈالی تھی اور اسی راہ پر چل کر شاگردان آتش اور خود آتش نے لکھنؤ کی زبان کو پروان چڑھایا۔ ہاں لکھنؤ کی زبان میں جہاں جہاں اوچھاپن ہے۔ اس کے لیے انشا، ناسخ، امانت یا جس کا بھی ہم چاہیں شکریہ ادا کریں۔ آتش اور ناسخ کا نام اس سلسلے میں کئی بار آچکا ہے لیکن ان دونوں کی شخصیتوں میں وہ زور ہے کہ وہ کسی کے شاگرد ہوتے ہوئے بھی صرف اتباع و تقلید کے ہور ہیں یہ ناممکن تھا۔ آتش نے صرف مصحفی کے باغ کی آبیاری نہیں کہ بلکہ اس نے اپنا آتش کدہ الگ تعمیر کیا۔ ناسخ کو جہاں تک شاگردی کا تعلق ہے مصحفی سے کوئی نسبت تھی یا نہیں یہ امر صیغہ راز میں ہے اور غالباً ہمیشہ رہے گا۔ صرف مصحفی کے تذکرے سے کچھ پتہ چلتا ہے کہ شاید کبھی کبھی شروع میں ناسخ نے بھی مصحفی سے مشورہ کیا۔ بہر حال شاگردی بر طرف لیکن کیا مصحفی کا اثر براہ راست صرف اس کے شاگردوں تک محدود تھا؟ ناسخ کے یہ اشعار لیجیے:

سب ہمارے لیے زنجیر لیے پھرتے ہیں ہم سرِ زلف گرہ گیر لیے پھرتے ہیں

تیری صورت سے کسی کی نہیں صورت ملتی

ہم جہاں میں تری تصویر لیے پھرتے ہیں

یہ اشعار میرؔ کے رنگ میں ہیں یا سوداؔ کے یا غالبؔ کے یا خود ناسخؔ کے؟ کہا جاتا ہے کہ ایسے اشعار میں ناسخؔ پر آتشؔ کا اثر پڑا ہے۔ لیکن خود آتشؔ کے یہاں یہ کسی نے نہیں سوچا کہ دو طرح کے اشعار ہیں۔ ایک وہ جن میں آتشؔ کی انفرادی گرما گرمی اور کڑک ہے۔ دوسرے وہ جن میں آتشؔ نے مصحفیؔ ہی کے رنگ کو چمکایا اور جن کے لہجے اور انداز میں مصحفیؔ کا اعتدال اور مصحفیؔ ہی کی نرمی پائی جاتی ہے۔

ناسخؔ ہی کے خاندان میں جلالؔ لکھنوی گذرے ہیں، ان کی یہ غزل لیجیے:

وہ دل نصیب ہوا جس کو داغ بھی نہ ملا

ملا وہ غم کدہ جس میں چراغ بھی نہ ملا

گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زلفِ یار کی بُو

پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا

اسیر کرکے ہمیں کیوں رہا کیا صیاد

وہ ہم صفیر بھی چھوٹے وہ باغ بھی نہ ملا

بتوں کے عشق میں کیا ہوتی ہم سے یاد خدا

کہ دل بھی تھا نہ ٹھکانے فراغ بھی نہ ملا

خبر کو یار کی بھیجا تھا گم ہوئے ایسے

حواسِ رفتہ کا اب تک سراغ بھی نہ ملا

دکھائیں یار کو کیا جسمِ داغدار کی سیر

نظر فریب ہمیں ایک داغ بھی نہ ملا

بھر آئے محفلِ ساقی میں کیوں نہ آنکھ اپنی
وہ بے نصیب ہیں خالی ایاغ بھی نہ ملا

چراغ لے کے ارادہ تھا بخت کو ڈھونڈیں
شبِ فراق تھی کوئی چراغ بھی نہ ملا

جلاؔل باغِ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم
چمن کو پھول ملے ہم کو داغ بھی نہ ملا

آپ نے دیکھا؟ اس پوری غزل کے بارے میں اگر مقطع سے قطع نظر کر کے آپ سے کہا جائے کہ یہ سوا سو برس پہلے کی غزل یا کچھ اس سے بھی پہلے کی اور پھر پوچھا جائے کہ یہ غزل کس کی ہے تو غور کرنے پر میرؔ، سوداؔ یا ان کے ہم عصر شعرا میں آپ کسی کا نام نہ لیں گے نہ میرؔ اور غالبؔ، نہ مومنؔ اور ذوقؔ کا نہ انشاؔ اور جراُتؔ کا نہ ناسخؔ اور آتشؔ کا نہ رشک کا نہ بحرؔ کا نہ کسی اور کا۔ صرف مصحفیؔ کا نام زبان پر آئے گا۔ جلاؔل خاندان ناسخؔ کے شاعر تھے لیکن جو اشعار اور غزلیں آج ان کے نام کو مٹنے سے بچائے ہوئے ہیں۔ وہ ناسخؔ اور خاندان ناسخؔ کے رنگ میں نہیں بلکہ مصحفیؔ کے رنگ میں ہیں۔ مثلاً

داغ پر میرے پڑی مرغانِ گلشن کی جو آنکھ
سب نے منقاروں میں لے لے کر گلِ تر رکھ دیا

نگہِ مست سے تیری وہ ٹپکتی ہے شراب
جو سبُو میں نہیں خم میں نہیں ساغر میں نہیں

جس زمانے میں امیرؔ و داغؔ کے بعد ہی جلاؔل کا نام مشہور معاصرین میں لیا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں کسی نے ایک شعر میں تینوں کی خصوصیتوں کو بیان کیا تھا:

انصاف کا ہے قول کہ ہے داغ کی زباں
مضمون ہے امیرؔ کا، بندش جلاؔل کی

مگر جلالؔ سے پہلے یہ بندش کس کے یہاں تھی۔ سوائے مصحفی کے اور ہم کسی کے یہاں نہیں پاتے۔ غالبؔ کے یہاں بہت ترنّم ہے۔ لیکن وہ بہت تیز قسم کا ترنّم ہے۔ مصحفی کا ترنّم مدھم سُر میں ہے۔ اس کا ٹھہراؤ' بہاؤ اور اس کی نرم اور خفیف تھرتھری غالبؔ کے ترنّم سے مختلف ہے۔ غالبؔ کے یہاں نغمہ ہے تو مصحفی کے یہاں ایک چیز ہے جسے تحت النغمہ (SUB-LYRICISM) کہہ سکتے ہیں اور یہی نغمہ جلالؔ کے رنگِ تغزل میں پایا جاتا ہے۔

مصحفی ہی سے لکھنؤ اسکول کے اس سلسلہ کا بھی آغاز ہوتا ہے جسے ہم قافیہ اور ردیف کو مختلف پہلوؤں سے باندھنا کہتے ہیں۔ اور اس طرح ردیف و قافیے کے تمام امکانات ظاہر ہو جاتے ہیں۔ دلّی کا لب ولہجہ چھوڑے بغیر مصحفی نے اسی ترکیب سے لکھنؤ اسکول کے لب و لہجے میں تنوع پیدا کیا اور اسی چیز کو لے کر آتشؔ بیک وقت دلّی اور لکھنؤ دونوں جگہ کے شاعر کہہ دیے جاتے ہیں۔ بہر حال لکھنؤ کی زبان وضع کرنے میں مصحفی کا حِصّہ ہے۔ مصنف شعر الہند کو بھی مصحفی کی اس خصوصیت نے اور اس کے اس اثر نے متوجہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مصحفی ایک خاص بات میں تمام اساتذہ سے بڑھے ہوئے ہیں۔ یعنی جو صفائی اور روانی ان کے کلام میں پائی جاتی ہے وہ میرؔ' سوداؔ اور جرأتؔ و انشاؔ کسی میں نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ مرزا علی لطف ''تذکرۂ گلشن ہند'' میں لکھتے ہیں: ''اور گفتگو اس کی بہت صاف ہے۔ بندش نظم میں اس کے ایک صفائی و شیرینی اور بندش میں اس کی بلندی اور رنگینی ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں بھی جب اس خاندان کے لوگوں کو اسیرؔ و امیرؔ کے دامن میں پناہ نہیں ملتی تو زبان کے لحاظ سے اپنے ابوالآباء مصحفی ہی کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ چنانچہ جلیلؔ فرماتے ہیں:

اس سخن کا جلیلؔ کیا کہنا   مصحفی کی زبان ہے گویا

قدماء کے کلام میں جو شتر گربگی۔ ناہمواری اور فحاشی پائی جاتی ہے۔ باوجود پُرگوئی کے بھی مصحفی کا کلام اس عیب سے بہت کم آلودہ ہے۔ مصنف شعرالہند سے یہاں تک تو میں بالکل متفق ہوں لیکن اس کے بعد ہی وہ جب یہ کہتے ہیں کہ ''مصحفی کسی خاص رنگ کے پابند نہیں'' اور جب وہ آزاد کی اس رائے کو صحیح بتاتے ہیں کہ ''مصحفی کی غزلوں میں سب رنگ کے شعر ہوتے ہیں کسی خاص طرز کی خصوصیت نہیں'' تو مجھے اس کے ماننے میں تامل ہوتا ہے۔ کیوں کہ تقلید و انتخابیت کے باوجود بھی مصحفی، مصحفی رہتا ہے۔ اس کے بہروپ میں بھی اس کا اصل روپ نظر آتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ مصحفی کو کس سے زیادہ اور کس سے کم اور کس کے برابر سمجھا جائے۔ اس سوال کا فیصلہ کرتے ہوئے کچھ تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ خود مصحفی کے زمانے میں تو مصحفی کو جگت استاد مانا جاتا تھا اور آج بھی اس کو جگت استاد ماننا پڑتا ہے۔ سوؔدا کا قائل ہوتے ہوئے بھی مصحفی نے سوؔدا کو جیسا کچھ سمجھا ہے۔ اس کا حوالہ میں مصحفی کی رُباعی نقل کر کے دے چکا ہوں۔ ایک اور مقطع میں کہتے ہیں۔

مصحفی ریختہ پہنچاؤ تم اس رُتبے کو
شوریاں گرد ہو مرزؔا کی بھی مرزائی کا

اب اس کا فیصلہ آپ کیجیے کہ مصحفی غزل میں اپنے آپ کو سوؔدا کے برابر مانتا تھا یا کم یا زیادہ، میرؔ کو تو اس نے اس رُباعی میں سوؔدا سے ٹکرانے کی کوشش کی ہے اور مصلحت اسی میں دیکھی کہ خود اپنا نام اس سلسلے میں نہ لائے۔

بہرحال مصحفی کو دوسرے شعراء سے جو نسبت حاصل ہے وہ ہم بتا چکے ہیں اور مصحفی کے انفرادی رنگ کو بھی واضح کر چکے، مصحفی کے ہمہ گیر اثر کو بھی دیکھ چکے۔ مصحفی نے اُردو غزل کو جو چیز دی وہ ایک مزاج یا رنگ مزاج ہے اس نے ہمارے شاعرانہ کیف واثر کو ایک ایسا پیمانہ دیا جو نہ بلا نوشوں کے لیے ہے نہ کم ظرفوں کے لیے اور جس کے نغمے کے چڑھاؤ

اتار میں ایک ایسا ربط پیدا ہو جاتا ہے کہ خمار کے کرب سے یہ پیمانہ ہم کو بچا لیتا ہے۔

مصحفی کے نغمے اب سے پونے دو سو برس پہلے ہندوستان کی فضا میں گونجے تھے۔ پہلے دلّی سے پھر لکھنؤ سے۔ ان ہی نغموں کی نرم آنچ آتش اور دیگر شاگردان مصحفی و آتش کی شعلہ نوائیاں بن گئیں۔ مصحفی کے نغموں کی پنکھڑیوں نے وہ داغ بیل ڈالی کہ ناسخ اور خاندان ناسخ تک کے شعراء نے ان سے پھول اور کلیاں چُن کر اپنے دامن بھر لیے۔ انیس کے مرثیوں اور سلاموں اور رُباعیوں میں زبان جس طرح سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ ان کے مصرعوں کی نرم رَوی۔ بیان کی رنگینی اور نکھار ہمیں مصحفی اور تنہا مصحفی کی یاد دلاتے ہیں۔ جب انیس کے خاندان کا ایک شاعر میان سے تلوار کھینچنے کا سماں یوں باندھتا ہے:

"کیچلی چھوڑ کر اُڑتی ہوئی ناگن نکلی"

تو ہمیں مصحفی ہی کی تشکیل بیان کی یہ ارتقائی صورت معلوم ہوتی ہے۔ شاد عظیم آبادی کے بہت سے اشعار اور متعدد غزلیں صوبۂ بہار کے وہ شاعر جو وہاں کے مذاق سخن کے نمایندے کہے جا سکتے ہیں، سب ہمیں اسی رنگ طبیعت، اسی جمالیاتی مزاج کی یاد دلاتے ہیں جس کی پہلی رنگا رنگ جھلکیاں مصحفی نے دکھائی تھیں۔ امیر اور ان کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد تو خاندانِ مصحفی سے متعلق ہیں۔ اگر چہ کبھی زیادہ کبھی کم، یہ لوگ ناسخ کی طرف جُھک جاتے ہیں۔ لیکن جیسا جلال کے کلام کی مثالوں سے ہم دیکھ چکے ہیں' جلال خاندان ناسخ سے وابستہ ہوتے ہوئے فیضانِ مصحفی سے بے نیاز نہیں۔ حالی کی غزلوں کی سادگی اور کہیں ان کی زبان کا البیلا پن ان کے کلام کی معصومیت؛ اور اس کی نرم ٹیس میں بھی اور اس کی مخصوص روک تھام توازن' میانہ رَوی اور نرم چال میں بھی کیا مصحفی کے انداز کی ترغیب و تحریک ہمیں نظر نہیں آتی؟ جوش ملیح آبادی کی رنگینی اور لمسیّت (SENSUOUSNESS) کی اولیں مثالیں مصحفی کے کلام ہی میں نظر آتی ہیں۔ حسرت موہانی کی غزلوں کی متعدل سرمستی اور نرم گھلاوٹ میں مصحفی ہی کی اسپرٹ کارگر ہے۔ اصغر

کی نشاطِ روح میں جو روحِ نشاط ہے اور ان کے مصرعوں کے خرام سکوں نما میں فانی کے اکثر اشعار کی سجاوٹ میں وہی آواز بنتی اور سنورتی نکھرتی اور چمکتی نظر آ رہی ہے جسے ہم بوجھ سکیں تو وہ میر، سودا، انشا، جرأت، غالب، مومن کسی کی آواز نہیں ہے۔ بلکہ مصحفی کی آواز ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس آواز کے کچھ سُر اوروں کے یہاں بھی سُنائی دے جاتے ہیں۔ کیوں کہ بالکل نئی بالکل ان دیکھی ان سُنی چیز کوئی نہیں ہوتی۔ مگر یہ مخصوص لَے ہے مصحفی کی۔ یہ ضروری نہیں کہ میں نے جن شعراء کا نام ابھی گِنایا ہے وہ اور جانے کتنے دوسرے شعراء شعوری طور پر اس فیض یابی سے واقف ہوں یا انھوں نے قصداً مصحفی کی تقلید کی ہو۔ مصحفی کے اثر کو جو اتنی وسعت ملی وہ اس کے نفوذ پذیری یا ہمہ سرا یگی (PERVASIVENESS) کی صفت کے باعث تھی۔ ہندوستان کی زمین نرمی پختگی اعتدال اور معصومیت، ایک خاص سوندھاپن اور سلوناپن رکھتی ہے اور یہ تمام عناصر پہلے پہل کلام مصحفی کی شعریت میں نکھرے۔ مصحفی کے طرزِ سخن ہی میں نہیں، اس کے طرزِ احساس وطرزِ تخئیل میں ایک مدرسۂ شاعری بن جانے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

ہمارے ادبی کلچر کو جو مزاج مصحفی نے دیا وہ مزاج دوسرے صاحبِ طرز شعراء کے عطیوں سے بالکل الگ ہے۔ یہ مزاج کئی لطیف قدروں کا حامل ہے۔ اس مزاج کی لچک۔ جھلک۔ نرمی۔ رنگینی۔ اس کا ''سہج سبھاؤ'' اس کی رچی ہوئی سرمستی، شاید انانیت یا عصبی المزاجی سے اس کا آزاد ہونا۔ اس کا امتزاج خارجیت و داخلیت زندگی کے رَس اور جَس کی لذّت شیرینی اور تلخی کا باہم سمویا ہونا ٹیس اور راحت کسک اور سکون کا میل اس کا میٹھا میٹھا درد، اس کی طبیعت کا رکھ رکھاؤ یہ وہ قدریں ہیں جن کا حامل مصحفی کا کلام ہے سوچو، تو ان قدروں میں بہت سے امکانات چھپے ہوئے ہیں، ان میں ارتقائی صفات ہیں۔ یہی گوناگوں امکانات ان تمام شعراء کے یہاں نمایاں ہوتے ہیں جو خواہ مصحفی کے خاندان سے ہوں یا نہ ہوں لیکن غیبی طور پر فیضانِ مصحفی سے بے نیاز نہیں رہے کیوں کہ ان میں کسی کا

کلام مصحفی کے کلام کی محض آواز بازگشت نہیں ہے بلکہ اخلاقانہ طور پر مصحفی کی آواز کوئی آواز بنا دیتا ہے۔ چراغ سے چراغ جلے ہیں۔ لیکن ہر چراغ کی لو میں نئی تھرتھراہٹ ہے اور نیا اُجالا۔

یہ ہے مصحفی...... مجھے اپنے ایک محبوب نوعمر دوست کا کہنا یاد آتا ہے کہ مصحفی کا تخلص جس صوتی سانچے میں ڈھلا ہوا ہے، اسی سانچے میں مصحفی کا وجدان، مصحفی کا کلام اور مصحفی کے کلام کی جمالیاتی قدریں بھی ڈھلی ہوئی ہیں۔

رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری

۸/۴ بنک روڈ، الہ آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الف

1

لگے گر ہاتھ میرے تار اُس زلفِ معنبر کا — تو ہووے باعثِ شیرازہ ان اجزائے ابتر کا

بہ دورِ مے کشی، جب سے تری آنکھوں کو دیکھا ہے — ستارہ تب سے جوں خورشید گردش میں ہے ساغر کا

وہ صیدِ سخت جاں ہوں میں کہ جس کی سخت جانی سے — ہوا جاتا ہے دم برگشتہ وقت ذبح خنجر کا

اُڑے ہے بسکہ دل اندر ہوائے نامہ پردازی — ہراک نالہ ہمارا بال ہے جیسے کبوتر کا

وہ خاکسترنشیں ہوں میں کہ مثلِ اخگر آتش — نہ مجھ کو فکر بالا پوش کا ہے اور نہ بستر کا

کلیجا چھن گیا ہے آہ نالے سے مرایاں تک — کہ اب جو دم نکلتا ہے تو جیسے دود مجمر کا

نہ ہوگی جاں کنی کے وقت ہرگز تشنگی غالب
کہ تو اے مصحفی مدّاح ہے ساقیِ کوثر کا

2

خداوندا نہیں مشتاق میں سرو[1] و صنوبر کا — بروزِ حشر ہو[2] ہو سر پر مرے سایہ پیمبر کا

گیا ہوں جان سے، تو بھی تڑپ اک مجھ میں باقی ہے — خدا جانے کہ میں مذبوح ہوں کس دست و خنجر کا

پڑا رہتا ہے اکثر راہ میں دامن درازوں کی — یہ سرِ مشتاق ہے کیا جانے کن پانوؤں کی ٹھوکر کا

جوابِ نامہ تو معلوم اُس کے پاس سے آنا — کوئی پر اُڑتے اُڑتے شاید آپہنچے کبوتر کا

---

[1] ن: سمن بر — [2] ن ۳: میرے سر پر ہو

جوابِ نامہ تو معلوم اُس کے پاس سے آنا　　کوئی پر اُڑتے اُڑتے شاید آپہنچے کبوتر کا

غرض ہر وقت روتے ہی رہے ہم دل کے ماتم میں　　نہ سُوکھا ایک دم رومال اپنے دیدۂ تر کا

مری آنکھوں سے گر پڑتے ہیں آنسو بیچ مجلس کے　　چھلکنا جب کہ ساقی مجھ کو یاد آتا ہے ساغر کا

کوئی دن مصحفی ہمسائے ٹک سکھ نیند سوئے تھے
کیا نالوں نے تیرے پھر بپا ہنگامہ محشر کا

3

روز رومال نیا دیدۂ تر پر رکھا　　ایک پھاہا نہ میں ناسورِ جگر پر رکھا

میں اسی رشک سے مرتا ہوں کہ کل غیر نے ہائے　　ہاتھ ہنگامِ قسم کیوں ترے سر پر رکھا

جھڑ پڑا داغ چمن میں جو کوئی لالے کا　　ہم نے وہ داغ اٹھا اپنے جگر پر رکھا

کیوں نہ دل دیکھ اُسے ہاتھ سے جاوے یکبار　　ایسے ہی ناز سے جب اُن[1] نے کمر پر رکھا

کیا برا ہے جو رہے مصحفی نت[2] یاں بیٹھا
تم یہی جانیو دربان ہے در پر رکھا

4

جب سرِ انگشت کو میں دیدۂ تر پر رکھا　　نام آنسو نے مرے، سلکِ گُہر پر رکھا

مارے بیتابی کے آیا مرے منھ تک، ہر چند　　دستِ تسلیں میں بہت اپنے جگر پر رکھا

اُس کی آنکھوں کو نہ دیکھا کبھی دیں داروں[3] نے　　جرمِ نظّارہ عبث میری نظر پر رکھا

حد دغاباز ہے بے تو بھی، کہ کل وعدہ کر　　غیر سے شام ملا، ہم کو سحر پر رکھا

کیا بچوں گا میں، کہ دل کے مرے خمیازوں نے　　ایک ٹانکا نہ مرے زخمِ جگر پر رکھا

---

[1] ن۳ ہاتھ ان نے　　[2] ن۴: اب یاں　　[3] ن۳ دیداروں

کیا کروں شکر ادا آپ کے آنے کا، کہ رات جو قدم تم نے کہ رکھا مرے سر پر رکھا

مصحفی چاہیے کیا پھر اُسے اُٹھ چلنے کو

جس مسافر نے کہ دل اپنا سفر پر رکھا

5

شب جو اُس نے قدم اپنا مرے سر پر رکھا میں نے سر پر سے اُٹھا دیدۂ تر پر رکھا

تیرے بیٹھے جو ہمیں یاد بھی آیا کوئی کام ہم نے موقوف اُسے وقتِ دگر پر رکھا

چونک اُٹھا وہ کہ تمھیں خیر ہے صاحب اے واہ شب جو میں دست خیال اُس کی کمر پر رکھا

شوقِ نظارۂ دیدار نے تیرے شب دوش تا سحر دیدۂ مہ روزنِ در پر رکھا

چار ٹکڑے ہو مرے داغ کا اُترا جو[1] کھرنڈ لے کے لالے نے اُسے اپنے جگر پر رکھا

کچھ ادا دیکھی[2] کہ کل کھینچ کے اُس کافر نے

نیمچہ مصحفی خستہ کے سر پر رکھا

6

سوسو طرح کا حادثہ تجھ پر گذر چکا پر اے دل ایک روز کہیں تو، نہ مر چکا

اتنا بھی خال و خط کا بنانا ہے کیا میاں بس رکھیو آئینہ کہیں[3] مکھڑا سنور چکا

قیمہ کرے گا کیا کہیں، اب مجھ سے ہاتھ اُٹھا تا قبضہ نیمچہ تو ترا خوں سے بھر چکا

اس ہاتھ سے یہ دل نہ تسلّی ہوا، دریغ سو مرتبہ میں دل کے اُپر ہاتھ دھر چکا

اے یار وقتِ چہرہ خراشی و مو کنی قطعہ کیا کیا نہ میرے ہاتھوں سے مجھ پر گذر چکا

اک سر پہ خاک ڈالنی باقی رہی ہے سو دیکھو گے شام و صبح کہ میں وہ بھی کر چکا

کتنا ہی میں بساروں اُسے لیک مصحفی

نقشا اگر یہی ہے تو جی سے بسر چکا

---

[1] ن۳: اترا تھا [2] ن۳: دیکھیں [3] ن۱: کہ یہ مکھڑا

7

آج کچھ سینے میں دل ہے خود بخود بیتاب سا — کر رہا ہے بے قراری پارۂ سیماب سا

جوں گلِ تر کیا ہی اس سے جھلکے ہے اس کا بدن — وہ جو پیراہن گلے میں اس کے ہے اک آب سا

یاد میں کس فندقِ پاکی میں روتا ہوں کہ آج — جو سرشک آنکھوں سے گرتا ہے سو ہے عناب سا

میں ہوں اور خلوت ہے، اور پیشِ نظر معشوق ہے — ہے تو بیداری، ولے کچھ دیکھتا ہوں خواب سا

کوزۂ دولاب وش زیر و زبر ہیں آدمی — جب تلک یہ آسماں گردش میں ہے دولاب سا

کل شبِ تاریک میں جوں ہی ہوا وہ بے نقاب — جلوہ گر روئے زمیں پر ہوگیا مہتاب سا

کیا کہوں حسن و لطافت، جامۂ شبنم سے ہائے — نکلا ہی پڑتا ہے وہ گورا بدن مہتاب سا

مصحفی کیوں لختِ دل رونے کی کھاتا ہے قسم
ہے نمایاں کچھ تو آنکھوں میں تری خوں ناب سا

8

جی جائے گا رایگاں کسی کا — یوں کرتے ہیں امتحاں کسی کا

مکھڑے سے نقاب مت اُٹھاؤ — کیا فائدہ، ہو زیاں کسی کا

جز آہ وہاں کوئی کرے کیا — کچھ بس نہ چلے جہاں کسی کا

ہو دیکھے فرشتہ اس پہ عاشق — ہوتا ہے وہ بدگماں کسی کا

آزردہ کریں ہیں اس طرح واہ — دل مفت میں، او میاں کسی کا

اے مرغِ چمن یہاں، نہ کر شور — قطعہ میراث ہے گلستاں کسی کا

تا فصلِ دگر رہا نہ ہرگز — اس باغ میں آشیاں کسی کا

دیتے نہیں مصحفی پھر اس کو
دل لیویں جو یہ بتاں کسی کا

9

شب کہ دل درد و الم سے سر بسر لبریز تھا — شورِ محشر کی طرح ہر نالہ شور انگیز تھا

ان اداؤں کا کوئی مارا جیے کس طرح ہائے — یا ہے اب یہ گرم جوشی یا کہ وہ پرہیز تھا

ایک ہی تیشے میں سر فرہاد کا دو ہوگیا — کیا کرے فرہاد بے چارہ کہ تیشہ تیز تھا

نو بہاراں میں جو کرتے ہم بھی دعوائے جنوں — مثلِ گل چاکِ گریباں ہم کو دستاویز تھا

کی تنک اک آب دمِ شمشیر قاتل نے کمی — ورنہ پیمانہ ہماری عمر کا لبریز تھا

اولیاؤں کو بھی کھینچا اُس نے آخر زیرِ تیغ — تو کہے وہ قاتلوں میں عصر کا چنگیز تھا

بے تہوں کو مصحفی مطلق نہ سوجھا ورنہ یاں
رنگِ خونِ دل مرا ہر اشک میں آمیز تھا

10

عاشقِ بے دل تو مشتاقِ نگاہِ تیز تھا — ہاتھ میں گو اس کے یارو نیمچہ خوں ریز[1] تھا

اک نگہ کے بیچ جیسے نیم بسمل کر گیا — قہر تھا، آفت تھا، لڑکا تھا، کوئی خوں ریز تھا

ہم نے بھی کچھ اپنی دانائی سے کی یہ راہ طے — ورنہ جو کانٹا تھا اس وادی کا، سو سر تیز تھا

ایک دم میں کر دیا یوں اس کو شیریں سے جدا — خنجرِ شیرویہ کب کا دشمنِ پرویز تھا

وہ جو خط بھیجا تھا تو نے، چاک کر، میرے تئیں — میں جو دکھلاتا تو مجھ کو وہ ہی دستاویز تھا

گھر میں ہمسائے نہ سوئے ایک شب آرام سے — حسن اُس رشکِ پری کا بس کہ عشق انگیز تھا

کہتے ہیں دیکھ اس کی صورت مصحفی کل مر گیا
کیا عجب اس کا، کہ تھا بیمار و بد پرہیز تھا

---

[1] ن ا: رنگ ریز

11

کچھ اعتماد ان کے نہیں ارتباط کا ۔۔۔ ہرجائیوں سے فائدہ کیا اختلاط کا

کاہے کو بیٹھوں جا کے میں، واں کام کیا مرا ۔۔۔ جس بزم میں کہ ذکر ہو عیش و نشاط کا

واشد کی آسماں سے کچھ امید ہی نہیں ۔۔۔ روزِ ازل سے بند ہے در اس رباط کا

مستی سے گو کہ میں دمِ شمشیر پر گروں ۔۔۔ کب ہے خیال اس کو مری احتیاط کا

گردوں پہ یہ شفق نہیں، دیکھا تو مصحفی
خونِ شہاں سے سُرخ ہے رنگِ اس بساط کا

12

جب سرِ زلفِ صنم خم کھا گیا ۔۔۔ کام اک عالم کا برہم کھا گیا

کان میں پھونکی جو میں اس کے وہ بات[1] ۔۔۔ آج تو سنتے ہی کچھ دم کھا گیا

میں ہوں کس گنتی میں از یک تا ہزار ۔۔۔ گالیاں اس کی تو عالم کھا گیا

تیغ نے اس کی کیے گھایل بہت ۔۔۔ زخم ایسے پر کوئی کم کھا گیا

مصحفی ایسا تھا کب زار و نزار
اس کے تئیں[2] پیارے ترا غم کھا گیا

13

کامِ دل اپنا تو ہرگز نہ بتاں سے نکلا ۔۔۔ کبھی نکلا بھی تو ہاں آہ و فغاں سے نکلا

تم تو کہتے تھے میاں: دل ترا ہم پاس نہیں ۔۔۔ سچ کہو، کیوں جی بھلا اب یہ کہاں سے نکلا

یوں ہے برقع سے نمایاں جھلک اس عارض کی ۔۔۔ نورِ مہ پھوٹ کے جیسے کہ کتاں سے نکلا

دل میں کہتے تھے ملے یار تو کچھ اُس سے کہیں ۔۔۔ مل گیا وہ، تو نہ اک حرف زباں سے نکلا

---

[1] ن۳، ن۴: پھونکی میں اس کے جب [2] ن۴: اس کو تو پیارے

دوستاں مصحفیِ خستہ کی ٹک لیجو خبر
یہ دمِ سرد سا کیا اُس کے دہاں سے نکلا

14

جو دل اس کوچے سے آتا رہے گا تو البتہ وہ تلملاتا رہے گا
پس از مرگ کیجو مری خاک تُودہ کوئی تیر اُس پر لگاتا رہے گا
لگا تارِ جاں پر جو ناخن اجل کا نہ رشتہ رہے گا، نہ ناتا رہے گا
نہ جاگیں گے خوابیدہ خوابیِ[1] عدم سے اگر ایک عالم جگاتا رہے گا
گر اس فصلِ گل میں جیے گا دوانا تو ہر سال دھومیں مچاتا رہے گا
یہ شرطِ مروّت ہے اے بے مروّت قطعہ کہاں تک تو مجھ کو کڑھاتا رہے گا
جو ملنا ہے تجھ کو تو آجلد مل لے کہ پھر ہاتھ سے وقت جاتا رہے گا
نہ ہو مصحفی خصمئ دل سے ایمن
رہے گا یہ جب تک ستاتا رہے گا

15

ناگہ چمن میں جب وہ گل اندام آگیا گل کو شکستِ رنگ کا پیغام آگیا
اُٹھا جو صبح خواب سے وہ مستِ پُرخمار خورشید کف کے بیچ لیے جام آ گیا
سوچے تھا اہلِ جرم سے کسکو کروں میں قتل اتنے میں اُس کو یاد مرا نام آگیا
افسوس ہے کہ ہم تو رہے مستِ خواب صبح اور آفتابِ عمر لبِ بام آگیا
ہے جائے رحم حال پہ یاں اُس اسیر کے جو گرتے ہی ہوا سے تہِ دام آگیا
گو میں تڑپ تڑپ کے دی حسرت میں اپنی جاں بارے ٹک ایک دم کو تو آرام آگیا
سمجھو خدا کے واسطے پیارے بُرا نہیں دو دن اگر کسی کے کوئی کام آگیا

---

[1] ن۳: خاکِ عدم

کر قطع کب گیا ترے کوچے سے مصحفی
گر صبح کو گیا وہیں پھر شام آگیا

16

دل تجھ کو دیا، لے مرا غم خوار یہی تھا — پاس اپنے تو اسے شوخ ستم گار یہی تھا
دے داد مری ورنہ میں اُٹھ بولوں گا قاتل — کل حشر کے دن بھی، مرا خوں دار یہی تھا
بے رونقیِ سینہ میں اب کس کو دکھاؤں — داغوں سے بُتاں کے کبھی گلزار یہی تھا
اب جس دلِ خوابیدہ[1] کی کھلتی نہیں آنکھیں — راتوں کو سرہانے مرے بیدار یہی تھا
دامن کو کیا رشکِ چمن خوب ہی، شاباش — رونے کا حق اے دیدۂ خونبار یہی تھا
لے چٹکی میں دل کھینچ لیا سینے سے اُس نے — انصاف کرو تیر کا سوفار یہی تھا
بوسے کے عوض تم تو لگے گالیاں دینے — کل تم سے ہمارا میاں اقرار یہی تھا
ابرو نے تری دل ہی پہ تلوار چلائی — یعنی صفِ مرداں میں نمودار یہی تھا
یوسف کو ترے حسن پہ دوں کیوں کے بڑائی — اس کے بھی تو خال و خط و رخسار یہی تھا
اسکو، میں جو دیکھا مجھے شب اُس نے تو بولا — لاؤ اسے، کل بھی پسِ دیوار یہی تھا
بیزاری کے عالم میں کبھی آگے سے میرے — جاتا ہے، تو کہتا ہوں مرا یار یہی تھا
میرا دلِ پُرداغ پسند اس کی نہ آیا — ہرچند متاعِ سرِ بازار یہی تھا
دیکھی جو مری نعش تو کر اُس کو اشارہ — بولا کہ مری چشم کا بیمار یہی تھا

کیوں مصحفیِ خستہ کے تئیں تو نے کیا قتل
کیا سینکڑوں عاشق میں گنہگار یہی تھا

17

گر اس منھ سے برقع کبھی کُھل گیا — تو دیکھو گے مَہ خاک میں رُل گیا
رہے اس کے وابستہ، عمرِ دراز — نہ ہم سے یہ سودائے کاکل گیا
گیا جان سے ایک عالم میاں — و لیکن نہ تیرا تغافل گیا

[1] ن۳: بیمار

رہا ہے کہاں ہم میں آرام و صبر — وہ طاقت گئی، وہ تحمل گیا
ہمیں دے گیا داغ جاتے ہوئے — غرض اس گلستاں سے جو گل گیا
وہی رنگِ گل ہے، وہی چہچہے — چمن سے کہاں شورِ بلبل گیا
لگی چوٹ دل پر مرے، باغ سے — سحر نالہ کرتا جو بلبل گیا
میں کہتا تھا عاشق نہ ہو مصحفی
تو ایسی ہی باتوں میں تو کُھل گیا

18

اب تو پھر کوچے میں اس کے شور و شر رہنے لگا — روز اک بے چارہ یاں آ کر کے مر رہنے لگا
یا تو آگے دیکھتے آئینہ شرماتے تھے تم — یا وہ اب تصویر سا پیشِ نظر رہنے لگا
یہ صباحت، یہ لطافت، یہ نزاکت، تس پہ ہائے — آگے ہر اک کے کھڑا تو پیشِ در رہنے لگا
اس قدر پرچا، کہ گھر خوش ہی نہیں آتا اُسے — دل اُسی کوچے میں اب آٹھوں پہر رہنے لگا
چاکِ در سے جھانکنے کی یا اُسے رخصت نہ تھی — یا سر اُس کا اب سرِ دیوار پر رہنے لگا[1]
ہائے کیا سر ماروں اے یارو کہ اس سر کے تئیں — ساری ساری رات اب تو دردِ سر رہنے لگا
خشک ہونے کے قریب آیا تو تھا ٹک داغِ دل — پھر نئے سر سے یہ کچھ ان روزوں تر رہنے لگا
چل بے یاں سے دور ہو، ہم تم بھی نئیں اب آشنا — راتوں کو جا جا کے تو، غیروں کے گھر رہنے لگا
آ گئی کیا جانیے کس بات سے اس پر شکست — اب جو یہ دل اس قدر آزردہ تر رہنے لگا
یا تو ہم نامِ سفر سے بھاگتے تھے لاکھ کوس — یا ہمیں اب ہر گھڑی عزمِ سفر رہنے لگا
مصحفی کو آگے یارو یوں کب آتی تھی غشی
اب تو کچھ دو دو پہر یہ بے خبر رہنے لگا

---

[1] غزل نمبر ۱۸ کے اشعار میں سر کے محاوروں کا استعمال محلِ غور ہے۔

19

کیا جانے کیا کرے گا یہ دیدار دیکھنا　　ایک دن میں آئینہ اُسے سَو بار دیکھنا

کیسی ہے اُس کی ابروے خم دار دیکھنا　　لینی ہے مول اُس کو یہ تلوار دیکھنا

تنہا ہی جا بھڑا صفِ مژگانِ یار سے　　کیا زور ہے یہ دل بھی جگردار دیکھنا

یاں حسن کو[1] ہے عشق سے آفت لگی ہوئی　　ظالم کوئی نہ ہو جو طرح دار دیکھنا

کھینچیں[2] ہیں اپنی اپنی طرف زلف و خال و خط　　کتنے ہیں ایک دل کے خریدار دیکھنا

عالم کو اک نگہ سے کیا تو نے قتلِ عام　　ظالم ٹک اس طرف بھی تو اک بار دیکھنا

شاکی ہیں اس کے، جان و دل و دیدہ سب بہم　　کس کس کے ہے وہ درپئے آزار دیکھنا

کچھ پھر تو لگ چلی ہے صبا اُس کی زلف سے　　مت ہو جیو اس بلا میں گرفتار دیکھنا

گر زلف و خط یہی ہیں، تو ایک دن تو میری جان　　عالم کو اس بلا میں گرفتار دیکھنا

خواہی میں آب، خواہ ہوں آئینہ، ہر طرح　　منظور ہے مجھے ترا دیدار دیکھنا

پھینٹا رکھیں ہیں سر پہ تو وہ بھی ہے یک پلک　　خوبانِ کج کلاہ کی[3] دستار دیکھنا

جب دیکھا ہم نے اُس کو، تو مر مر کے ہم بچے　　یعنی ہمیں نہیں ہے سزاوار دیکھنا

جاتے ہی اُن کے ساتھ چلی جانِ عاشقاں　　اِن خوش قدوں کی خوبیٔ رفتار دیکھنا

بہرِ خدا تم اُس بُتِ آشفتہ زلف کی　　ٹک ڈھیلی پیچ و لٹ پٹی دستار دیکھنا

اے مصحفی میں تجھ سے کہوں طرفہ ماجرا قطعہ سنتا ہے، اس طرف کو ٹک اے یار دیکھنا

لیکن بشرط آں کہ تجھے میری ہے قسم　　کہیو کسی سے اِس کو نہ اظہار دیکھنا

کچھ ان دنوں میں آگو کی نسبت ترا رفیق　　بے طرح ہو چلا ہے بد اطوار دیکھنا

باور نہیں ہے تجھ کو اگر یہ مرا سخن　　تو آپ جاکے تو، بہ شبِ تار دیکھنا

دیوار و در پہ اس کے ٹک اک رکھ کے گوش و چشم　　سننا یہ حرف اور یہی اسرار دیکھنا

---

[1] ن ۳: یاں جن کو ہے یہ عشق کی　[2] ن ۳: کھینچے ہے　[3] ن ۱: خوباں کی کج کلاہی

چھیڑے ہے اس کو غیر تو کہتا ہے اس سے یوں　　کوئی کھڑا نہ ہو پسِ دیوار، دیکھنا
بس اس طرح ہی یک دگر اس شمع رو کے تئیں　　ہے ہر کسی سے گرمیِ بازار دیکھنا
اپنی طرف سے ہم تو میاں تجھ کو کہہ چکے　　ٹک تو بھی اپنے دل میں تو اک بار دیکھنا
یہ بات ہے مناسبِ غیرت کہ روز و شب　　اس کو نشستہ دربرِ اغیار دیکھنا
یا تو تو اپنے دام میں لا اس کو صبح و شام
یا جا کے کوئی اور طرح دار دیکھنا

20

ٹک دیکھتا تو جا ترا بسمل کدھر چلا　　کر ذبح اُس کو ہائے تو قاتل کدھر چلا
شرطِ وفا یہی تھی بھلا، کوے عشق میں　　تنہا تو مجھ کو چھوڑ کے اے دل کدھر چلا
مانندِ گرد باد ہے کچھ رو بہ آسماں　　آوارگانِ شوق کا محمل کدھر چلا
آنکھوں سے بحرِ اشک کو ہونے دے موج زن　　ہم تجھ سے تب کہیں گے کہ ساحل کدھر چلا
دل تک پہنچ کے تو نے کیا سوئے کعبہ رو
اے مصحفی تو چھوڑ کے منزل کدھر چلا

21

صحبت میں غیر کی نہ مرے یار بیٹھنا　　بیٹھے بھی گاہے جا کے تو ہشیار بیٹھنا
یہ طرفہ اختلاط نکالا ہے تم نے واہ　　آتے ہی پاس چٹ سے وو ہیں مار بیٹھنا
اُٹھ جاویں گر تم ایسے ہی ہوتے ہو بد دماغ　　لازم ہے تم کو ہم سے ہو بیزار بیٹھنا
ہو جاویں گے اک آن میں رستے کے رستے بند　　جا کر کہیں نہ تو سرِ بازار بیٹھنا
وقتیکہ در کے آگے سے اُن نے اُٹھا دیا　　کیا فائدہ دلا، پسِ دیوار بیٹھنا

خواہی بر آب خواہ بر آتش ہمیں میاں جس جاگہ تو بٹھاوے گا ناچار بیٹھنا
بیٹھوں میں کیوں کے چین سے یارو کہ ان دنوں خاطر سے لے گئی ہے وہ رفتار، بیٹھنا
ہوں گرچہ بے گنہ پہ مجھے تیرے روبرو سر کو جھکائے مثلِ گنہ گار، بیٹھنا
کیا یہ بھی چڑ نکالی ہے، یوں میرے سامنے آئینہ لے کے ہاتھ میں ہر بار بیٹھنا
اے مصحفی وہ دوست ہی دشمن ہے جان کا
تو اُس کے پاس جا کے نہ زنہار بیٹھنا

22

رونے سے سوزِ داغِ جگر دور ہوگیا اُس حق میں اشک، مرہمِ کافور ہوگیا
کیا جانے ماہ تھا کہ کوئی آفتاب تھا سارا گھر اُس کے آتے ہی پُرنور ہوگیا
اب در تک اس کے اپنی رسائی ہو کس طرح سب کوچہ داد خواہوں سے معمور ہوگیا
دینے لگا وہ جامِ تہی جب کہ غیر کو پیمانہ کیوں نہ عمر کا معمور ہوگیا
آتے ہی اس نے مکھڑے پہ زلفیں جو کھول دیں روزِ وصال بھی شبِ دیجور ہوگیا
شبنم کو کیا میں روؤں کہ اس گلستاں کے بیچ جو گل کھِلا سو کھلتے ہی کافور ہوگیا
واں اس کی چشم سے نہ بہا ایک قطرہ آب یاں سینہ داغِ عشق سے ناسور ہوگیا
تھا شب کی مے کشی کا مجھے تا سحر صُداع دیکھ آنکھیں اُس کی اور بھی مخمور ہوگیا
تو بھی فرو ہوئی نہ ترش روئی شیخ کی[1] بھڑوا گرچہ سُوکھ کے اچھور ہوگیا
اے مصحفی چھپائے ہے کیا اب[2] تو عشق کو
یہ قصہّ اک جہان میں مشہور ہوگیا

---

[1] لفظ ترش بہ حرکت دوم باندھا ہے [2] ن ۱: تو بھی

23

پاسِ وفا بتاں سے زبس دور ہوگیا فریاد کرتے کرتے میں رنجور ہوگیا
جب آئینے سے اس نے منھ اپنا پھرا لیا آئینہ جیسے دیدۂ بے نور ہوگیا
پیرانِ موٗ سپید سے گرمی نہ ڈھونڈیے یعنی ہوا جو پیر سو کافور ہوگیا
اوّل تو تھا ہی اُس کے تئیں اک غرورِ حسن دیکھ آئینے کو اور بھی مغرور ہوگیا
ساقی خبر لے جلد کہ کل آئینے میں شوخ آنکھوں کو اپنی دیکھ کے مخمور ہوگیا
تجھ کو بھی کتنا دعویٰ طاقت تھا مصحفی
بس تو تُو ایک[1] ہی زخم میں سب چور ہوگیا

24

دل و دماغ تھا کب ہم کو ایسی ذلّت کا خدا کرے کہ بُرا ہو وے اس محبت کا
نہ بوسہ لینے کی کر مجھ پہ او میاں تہمت وہ ہوگا اور کوئی شخص میری صورت کا
شبِ وصال گذر ہی گئی اک آن کے بیچ پھر آیا دکھ مجھے دینے کو روز فرقت کا
جفائے یار سے گذری سو دل ہی پر گذری زباں پہ حرف نہ آیا کبھو شکایت کا
نہ آفتاب چھپے ہے نہ شام ہوتی ہے یہ روزِ ہجر ہے یا رب کہ دن قیامت کا
مرے جنوں پہ نپٹ تنگ ہے فضائے جہاں مکان چاہیے اس کو بڑی فراغت کا
نہ دلبری، نہ ترحم، نہ لطف و نے اشفاق ہو آشنا کوئی کیا ایسے بے مروّت کا
نہیں ہے اور کوئی، اب تو آ گلے لگ جا ملے گا پھر نہ کبھی ایسا وقت فرصت کا
نہ جان اس کو تو اور عاشقوں[2] سا ہرجائی
ہے مصحفی تو بَرگِرَوَ ایک تیری الفت کا

---

[1] ن۴: دو ہی زخم میں [2] اگر اور کو بروزن فع نہ پڑھا جائے تو عاشقوں کی عین ساقط ہے۔

25

مرا زخمِ جگر کاری ہے، اس مرہم سے کیا ہوگا | مواب میں تو مت روؤ کوئی، ماتم سے کیا ہوگا
اس اشک و آہ سے گر دل نہیں کھلتا تو گلشن میں | نسیمِ بوے گل اور قطرۂ شبنم سے کیا ہوگا
رہا ہے کون عالم میں سدا، عالم یہ فانی ہے | گر اُٹھ جاویں گے ہم بھی ایک دن عالم سے کیا ہوگا
یہی نا روتے روتے جی ہمارا ڈوب جاوے گا | اگر ہنس کر نہ بولو گے میاں تم ہم سے، کیا ہوگا
ہمیں آگو ہی اپنا حوصلہ معلوم ہے، سچ ہے | بغیر از نالۂ و فریاد و زاری ہم سے کیا ہوگا
ڈبویا خانماں مردم کا ان راتوں کے روزے نے | خدا جانے اب آگے دیدۂ پُرنم سے کیا ہوگا
ترا بیمار بچنے کا نہیں اتنا سمجھ لینا | کوئی دم اس میں گر آتا ہے تو اس دم سے کیا ہوگا

دلِ مرحوم پر اب صبر کرنا ہی مناسب ہے
نہ داڑھیں مار رو اے مصحفی، اس غم سے کیا ہوگا

26

خواب تھا یا خیال تھا، کیا تھا | ہجر تھا یا وصال تھا، کیا تھا
میرے پہلو میں رات جا کر وہ | ماہ تھا یا ہلال تھا، کیا تھا
چمکی بجلی سی پر نہ سمجھے ہم | حسن تھا یا جمال تھا، کیا تھا
شب جو دل دو دو ہاتھ اُچھلتا تھا | وجد تھا یا وہ حال تھا، کیا تھا
جس کو ہم روزِ ہجر سمجھے تھے | ماہ تھا یا وہ سال تھا، کیا تھا

مصحفی شب جو چپ تو بیٹھا تھا
کیا تجھے کچھ ملال تھا کیا تھا

27

میں نے کس چشم کے افسانے کو آغاز کیا | جس کو سنتے ہی مرے خواب نے پرواز کیا

شبِ وصل ایسے سے ڈھونڈے کوئی کیوں کر واشد　　جن نے سو ناز سے ایک بندِ قبا باز کیا
میں اس انداز کے صدقے، کہ جو کی مجھ پہ نظر　　دیکھتے ہی مجھے اُن نے نظر انداز کیا
گر کرے ناز تو اس حسن پہ اپنے، ہے بجا　　کہ خدا نے بھی بنا تجھ کو بہت ناز کیا
مصحفی آفریں اس تیرے لب و لہجے پر
کہ فصاحت نے تری ہند کو شیراز کیا

28

ملنے کا اس کے جب بھی کچھ ہم نے ڈھب کیا　　سو ناتوانیوں نے ہمیں جاں بلب کیا
کب وقتِ بوسہ آگے وہ دیتا تھا گالیاں　　ہم نے ہی منھ لگا کے اُسے بے ادب کیا
ہوں بس کہ صرف یاد میں میں اُس کی، ان دنوں　　جو کچھ پڑھا تھا میں نے فراموش سب کیا
ضبطِ عطش پہ کیجو نظر اس مریض کے　　مرتے بھی وقت جس نے نہ پانی طلب کیا
پیماں شکن تم اتنے تو آگے نہ تھے میاں　　جھوٹوں میں لیک نام کو مشہور اب کیا
دن عہد کر گئے تو نہ پھر رات کو ملے　　آئے نہ دن کو چل کے اگر وعدۂ[1] شب کیا
اے مصحفی وہ دم میں نہیں اپنا آشنا
تو نے جو اس کو راہ میں ٹوکا غضب کیا

29

گو زخمی ہیں ہم، پر اُسے کیا غم ہے ہمارا　　اب تک بھی نہ پٹی ہے نہ مرہم ہے ہمارا
جوں شمع سراپا ہیں زبس مائلِ گریہ　　جو بال ہے مژگاں کی طرح نم ہے ہمارا
ٹک دیدۂ انصاف سے دیکھو تو عزیزاں　　معشوق بھلا اوروں سے کیا کم ہے ہمارا
دل جس کے تئیں دیجیے سو ایسا[2] نہیں کوئی　　یوں یار اگر پوچھو تو عالم ہے ہمارا

---

[1] ن ۳: اگر وعدۂ شب (فک اضافت بھی ہوسکتا ہے) ن ا میں جو اقرارِ شب [2] ن ۴: انساں

روتے ہیں کھڑے لاش پہ سب دیکھنے والے   یعنی کہ ترے کوچے میں ماتم ہے ہمارا
اُٹھ جائیں گے رہنے کے نہیں کوے بتاں میں   عزمِ سفر اب یاں سے مصمّم ہے ہمارا

اے مصحفی اب کوچے میں اس صبح جبیں کے
نہیں اور[1] تو کوئی، مگر اک دم ہے ہمارا

30

ہر بات کے کہنے میں جو جاں گُن ہے ہمارا   ہم جانیں ہیں، یہ دل نہیں دشمن ہے ہمارا
پوشیدہ نہیں شمع صفت سوزِ دلِ زار   احوال غرض آپ پہ روشن ہے ہمارا
کیا جامۂ صد چاک کو ناصح[2] تو سیے گا   ثابت نہ تو چولی ہے نہ دامن ہے ہمارا
زلف و خط و کاکل نے چرایا نہیں دل کو   وہ اور ہی ہے جس کے اُپر ظن ہے ہمارا
انداز محبت کے، کوئی سیکھ لے ہم سے   کہتے ہیں جسے عشق، سو وہ فن ہے ہمارا
تکلیف نہ دے ہم کو تو گلگشتِ چمن کی   خود سینہ ترے داغوں سے گلشن ہے ہمارا

پھرتا ہوا آجائے جو ایدھر سے تو ملنا
اے مصحفی اُس کوچے میں مسکن ہے ہمارا

31

تجھ سے گر وہ، دلا نہیں ملتا   زہر بھی تجھ کو کیا نہیں ملتا
جس کو وہ زلف مار ڈالے ہے   سرِ موخوں بہا نہیں ملتا
اور سب کچھ ملے ہے دنیا میں   لیکن اک آشنا نہیں ملتا
دلِ دیوانہ رات سے گم ہے   کہیں اُس کا پتا نہیں ملتا

---

[1] ن۴: زندہ نہیں کوئی مگر   [2] ن۱: کا

شیخ کلبے سے اُٹھ، نکل باہر گھر میں بیٹھے خدا نہیں ملتا
درد و غم کو بھی ہے نصیبہ شرط یہ بھی قسمت سوا نہیں ملتا
اک نے پوچھا یہ مصحفی سے، بھلا قطعہ کیوں تو اے بیوفا نہیں ملتا
ہنس کہ بولا کہ او میاں اُس سے
کیا کروں دل مرا نہیں ملتا

32

یوں تو دُنیا میں کیا نہیں ملتا پر دلِ با صفا نہیں ملتا
کشتۂ خنجرِ تغافل کو حشر تک خوں بہا نہیں ملتا
بت پرستی سے باز آ، اے دل بت کے پوجے خدا نہیں ملتا
دیکھے بت خانے سیکڑوں، کوئی بتِ کافر ادا نہیں ملتا
جان میری مجھے غنیمت جان عاشقِ با وفا نہیں ملتا
جب زمیں پر قدم رکھے ہے وہ شوخ خاک میں دل مرا نہیں ملتا
میں جو اس سے کہا تو مجھ سے میاں قطعہ عید کے دن بھی کیا نہیں ملتا
ہو کے روکھا وہ یوں لگا کہنے کیا کرے گا بے، جا، نہیں ملتا
بن نمک چھڑکے، زخم سینہ پر
مصحفی کچھ مزا نہیں ملتا

33

جامے کے بند جب وہ گلشن میں وا کرے گا گل چاک چاک اپنی جیب و قبا کرے گا
تو آ کے پاس میرے اے شوخ کیا کرے گا سچ ہے کہ غیر ہی سے مہر و وفا کرے گا

۔اے باغباں خوشی سے رہنے دے مرغِ دل کو — یہ بھی چمن میں گاہے نالہ کیا کرے گا
خورشید رو ہمارا جس سے ملے گا ہر صبح — دانستہ وہ نمازیں اپنی قضا کرے گا
دیکھے ہے کیا ہمیں بھی دے ڈال ایک بوسہ — حق، اے سخی خدا کے، تیرا بھلا کرے گا
غم خواریاں تمھاری یارو یہ سب مسلّم — ہونا وہی ہے لیکن جو کچھ خدا کرے گا
رو مصحفی کو بھی دے اے دلبرِ نمازی
ہے شخص مستحق وہ تجھ کو دعا کرے گا

34

اُس کو منظور یاں نہ آنا تھا — تب کا آنا بھی اک بہانا تھا
چشمِ بیمارِ یار، سن تو بھلا — کیا مجھی کو یہ دکھ دکھانا تھا
یادِ ایامِ بے قراریٔ دل — وہ بھی یا رب عجب زمانا تھا
اب کہاں ہم، کدھر وہ کنجِ قفس — کوئی دن واں بھی آب و دانا تھا
ایسے بھولے قفس میں سیرِ چمن — کہ گویا یاں ہی آشیانا تھا
دلِ صد چاک پر نہ کر تہمت — رات زلفوں میں تیری شانا تھا
مفت میں اس کی گالیاں کھائیں
مصحفی تجھ کو غم ہی کھانا تھا

35

ان آنکھوں سے آب کچھ نہ نکلا — غیر از خوناب کچھ نہ نکلا
بوسے کا کیا سوال، لیکن — اُس منھ سے جواب کچھ نہ نکلا
باہم ہوئی یوں تو دیدوادید — پر دل کا حجاب کچھ نہ نکلا

جز تیری ہوا کے اپنے سر میں مانندِ حباب کچھ نہ نکلا
کرتا تھا بہت سا مجھ پہ دعویٰ پر وقتِ حساب کچھ نہ نکلا
سینے میں جو دل کی کی تفحص جز دودِ کباب کچھ نہ نکلا
ہم سمجھتے تھے جس کو مصحفی یار
وہ خانہ خراب کچھ نہ نکلا

36

کشورِ دل کو خدا جانے یہ کس نے لوٹا اس میں جو گھر نظر آتا ہے سو ٹوٹا پھوٹا
اس گرفتار کے صدقے میں، کہ اڑکر وو ہیں پھر گیا دام کی جانب جو قفس سے چھوٹا
دیدنی ہیں یہ غرض صانعِ قدرت کے رنگ کیا ہی موقع پہ لگایا ہے ہر اک گل بوٹا
چرخ پر دیکھ کے نالے کو مرے کہتی ہے خلق بان چھوٹا ہے کہیں یا کہ ہے تارا ٹوٹا
مصحفی مر ہی گیا میں تو ادا دیکھ اس کی
جب ہتھیلی سے کل اس شوخ نے ماتھا کوٹا

37

مجھے کر قتل ناحق دل ربا کے ہاتھ کیا آیا گیا میں جان سے، اس بیوفا کے ہاتھ کیا آیا
ہمارے قتل کو وہ پنجہ خود دستِ حنائی تھا ہمیں خوں میں ملا رنگِ حنا کے ہاتھ کیا آیا
کیا میرے تئیں برباد اس نے کوہ وصحرا میں اُڑا کر خاک کو میری، صبا کے ہاتھ کیا آیا
خدا جانے ہے اے یارو! ہم اپنے درد سے خوش تھے ہمارے درد کو کھوکر دوا کے ہاتھ کیا آیا
دُعا ہر چند کی اے مصحفی ہم نے و لے آخر
تہی دستی سوا دستِ دعا کے ہاتھ کیا آیا

38

جس طرح ہاتھ سے اُس بت کے مرا دل ٹوٹا یوں کسی سنگ پہ زنہار نہ شیشہ پھوٹا

دل آوارہ سے رہتی ہے سدا اس میں بہار ہے ہمارے چمنِ دل کا یہی گُل بوٹا
ہائے یہ زلف ہے یا دامِ بلا ہے یا رب جو پھنسا اس میں سو زنہار نہ جیتا چھوٹا
تُرکِ چشم اُس بُتِ کافر کی عجب رہزن ہے سیکڑوں کے تئیں اک آن میں جس نے لوٹا
مصحفی جس نے مرا حالِ دلِ زار سُنا
رو دیا، نالہ کیا، سنگ سے سینہ کوٹا

39

نقاب افگندہ از رخ جس طرف شب کو وہ جا نکلا سرِ رہ ہوگیا روشن، زمیں پر چاند سا نکلا
شکارِ دل کو ناحق ذبح کرکے ہاتھ سے کھویا بھلا اس ناتواں میں کہہ تو اسے صیاد کیا نکلا
ہوئی اک عمر مجھ کو اس سے کرتے نامہ پردازی عبارت کا مری لیکن نہ اب تک مدعا نکلا
جو شیخِ شہر آیا ہم سے اوباشوں کی مجلس میں اگر دھولیں نہیں تو گالیاں دوچار کھا نکلا
دلِ گم گشتہ کی کل ہم نے اپنے فال دیکھی تھی کریں اب کس پہ تہمت نام اس میں آپ کا نکلا
میں ہوں اپنی شناسائی کا دیوانہ، کہ مدت سے سمجھتا تھا جسے بیگانہ، سو وہ آشنا نکلا
نہ جانے مصحفی کو کیا کہا، اے بدزباں تو نے
کہ تیری بزم سے شب سخت وہ ہوکر خفا نکلا

40

شرمندہ نہ تھا، نالۂ شبگیر اثر کا طالع نے کیا ہے اسے نخچیر اثر کا
جاتی ہے فلک پر جو مری آہ مسلسل درجا کے ہلاتی ہے یہ زنجیر اثر کا
اک پُٹ سی ہے نالے میں مرے خونِ جگر کی کچھ رنگ تو رکھتی ہے یہ شمشیر اثر کا
مڈبھیڑ ہو رستے میں، مرے پیکِ دعا سے منھ پھیر دے۔ ادھر کو جو تاثیر اثر کا

نالہ مرا کرتا تو ہے تسخیر اثر کو ‏ پر آپ بھی ہو جائے ہے تسخیر اثر کا
شب مرغِ سحر خواں کی جو آواز سنی میں ‏ سنتے ہی لگا دل میں مرے تیر اثر کا
نالہ ترے بیمار کا، جاوے گا فلک تک ‏ منھ اُس کو دکھاوے گی جو تقدیر اثر کا
اے مصحفی کرتا تھا رقم جب یہ غزل میں ‏ جنبش میں قلم تھا، دمِ تحریر اثر کا

41

تم بانکپن یہ اپنا دکھاتے ہو ہم کو کیا ‏ قبضے پہ ہاتھ رکھ کے ڈراتے ہو ہم کو کیا
آنکھیں تمھاری جھپکیں ہیں ایدھر کو بیش تر ‏ تم ان اشارتوں سے بلاتے ہو ہم کو کیا
آویں ہماری گور میں گر منکر و نکیر ‏ اتنا کہیں: ابھی سے اُٹھاتے ہو ہم کو کیا؟
لاکر کبھی دیا ہے کوئی پھول پھل ہمیں؟ ‏ تم سیرِ گلستاں کو جو جاتے ہو، ہم کو کیا
کہتے ہو: ایک آدھ کی ہے میرے ہاتھوں موت ‏ ہم بھی سمجھتے ہیں یہ، سناتے ہو ہم کو کیا
ہم سے تو اب تلک وہی شرم و حجاب ہے ‏ گر ہر کسی کے سامنے آتے ہو ہم کو کیا
کہتے ہو روز ہم سے یہی: کل کو آئیو ‏ کیا خو نکالی ہے یہ، ستاتے ہو ہم کو کیا
دینا ہے کوئی بوسہ تو دے ڈالیے میاں ‏ کیوں پانو توڑتے ہو، پھراتے ہو ہم کو کیا

لے لے کے نام اس کی جفاؤں کا مصحفی
ہم آپ جل رہے ہیں، جلاتے ہو ہم کو کیا

42

یہ چاکِ گریباں تو داماں سے گذرا ‏ میں شوریدہ، ایسے گریباں سے گذرا
اگر دردِ دل میں یہ لذّت ہے، یارو ‏ تو میں ان طبیبوں کے درماں سے گذرا
کسی اپنے دُشمن پہ ہرگز نہ گذرے ‏ جو مجھ پر جدائیِ یاراں سے گذرا

وہیں جی اُٹھے وے جو مردے پڑے تھے — تماشا کناں، جب وہ زنداں سے گذرا
نہ دشتِ محبت کو سرسبز دیکھا — کئی بار خضر اس بیاباں سے گذرا
لگا تیر ایسا مرے دِل میں اُس کا — کہ دل تا بہ سوفار، پیکاں سے گذرا
ہوئے فرش، گل اُس کے ہر ہر قدم پر — جو دامن کشاں، وہ گلستاں سے گذرا
یہ شکوہ رہا مجھ کو تجھ سے، تو قاصد — نہ ہوکر کبھی کوے جاناں سے گذرا
میں اک نالہ ایسا کیا کل چمن میں — کہ شعلہ سا برگِ درختاں سے گذرا
صد اَحسنت اُس کشتۂ بے اجل پر — جو الفت میں تیری، دل و جاں سے گذرا
ہوئی مصحفی پر عجب رقّت اُس دم — وہ مسکیں جو گورِ غریباں سے گذرا

43

احوالِ پریشاں ہے، گلستاں میں صبا کا — کیوں ہاتھ گیا گل کے گریباں میں صبا کا
یارو یہ جو آتی ہے ہوا پانی سے لگ کر — مشتاق ہے دل، موسمِ باراں میں صبا کا
ہم تک بھی وہ لاتی ہی کوئی برگِ گل، افسوس — روزن سے گذارا نہیں زنداں میں صبا کا
ایسا نہ ہو، شانے سے کہیں ہووے لڑائی — اُلجھا ہے دل اُس زلفِ پریشاں میں صبا کا
شاید کہ مرا غنچۂ دل آ کے کھلا دے — میں چشم براہ ہوں، شبِ ہجراں میں صبا کا
اُس طفل کو لکھ بھیجتے ہم بھی کوئی پرزہ — ہوتا جو گذر اُس کے دبستاں میں صبا کا

اے مصحفی جب خاک مری[1] اُس نے اُڑا دی
کیا کام ہے پھر کوچۂ جاناں میں صبا کا

44

زُلفوں سے اُس کی میں نے جس دن کہ ہاتھ دھویا — ابرِ سیاہ آ کر تربت پہ میری رویا
اُس کے مزار پر تو آنا روا ہے اک شب — حسرت کو اپنے دل کی جو ساتھ لے کے سویا

---
[1] ن۳: تری

شوخی تو دیکھ اس کی، کل چٹکی لیتے لیتے ‏ چٹکی کے ساتھ دل میں ناخن مرے گڑویا

تا بات کھل نہ جاوے، لوگوں کے ڈر کے مارے ‏ جو خط لکھا سو میں نے پانی ہی میں ڈبویا

تیرے شہیدوں کے ہم از بس مزاج داں تھے ‏ تربت پہ ہم نے اُن کی یک لخت لالہ بویا

جن گلیوں میں مَلک کا ہوتا نہیں گذارا ‏ اُن گلیوں میں پھریں ہیں ہم چشمکوں کے جویا

اے مصحفی میں بیٹھا اب کیوں نہ خاک چھانوں

دل سا عقیق میں نے اُس کی گلی میں کھویا

45

اے عشق تو کامِ دلِ ناکام نہ دینا ‏ اس دل کے تئیں ایک دم آرام نہ دینا

کام اُس کا ہے عاشق کے تئیں کام نہ دینا ‏ تڑپانا جدائی میں، اور آرام نہ دینا

اِس چپ کا میں دیوانہ ہوں، کیا قہر ہے اے وائے ‏ اس لطف پہ میرے تئیں دشنام نہ دینا

ملزم تری باتوں سے ہمیں آپ ہی ہونا ‏ اور تجھ کو کسی بات میں الزام نہ دینا

شیوہ ہے یہی اس کا، کہ خورشید کے مانند ‏ رُو صبح جو دینا تو ہمیں شام نہ دینا

ٹک کنجِ قفس میں بھی سکوں کیجیو بُلبل ‏ جی اپنا تڑپ کر کے تہِ دام نہ دینا

جانے کا جو دل قصد کرے اُس کی گلی میں ‏ فرصت اُسے، اے گردشِ ایّام نہ دینا

کچھ یہ بھی عداوت ہے کہ جب ہو مری نوبت ‏ ساقی سے یہ کہتے ہو: اِسے جام نہ دینا

قاصد یہ غضب ہے کہ جب اس کوُ میں پہنچنا ‏ سب اپنی ہی کہنی، مرا پیغام نہ دینا

اے مصحفی یار آوے تو تُو رو یا ہی کیجیو

بہتے ہوئے آنسو کو کہیں تھام نہ دینا

46

کل ہمیں اُس کی طرف کو، شوق رہبر ہو گیا ‏ دیکھنا اس کا جو مشکل تھا، میسّر ہو گیا

یا کوئی بالوں کی بو سے اُس کی واقف ہی نہ تھا　　یا کُھلی جب زلف تو عالم معطّر ہوگیا

خط منڈانے سے، ترے چہرے کا نکلا اور ہی رنگ　　ووں بھی بہتر تھا پر اب بہتر سے بہتر ہوگیا

لکھ کے نامہ، نامہ بر کو جب لگے ہم ڈھونڈنے　　رنگ چہرے کا ہمارے خود کبوتر ہوگیا

قطرۂ خوں بھی نہ اپنا حلق میں اپنے گیا　　ہم رہے لب تشنہ اور سیراب خنجر ہوگیا

عارضِ افروختہ کی اس کے لالی کیا کہوں　　جس پہ ہر قطرہ عرق کا، جیسے اخگر ہوگیا

کم ہے کچھ کندن سے کیا چہرے کا اس کے رنگِ زرد
عشق کرکے مصحفی تو کیمیا گر ہوگیا

47

جانشیں رخ پر ترے خطِ معنبر ہوگیا　　اس برس کچھ جلد، روز اور شب برابر ہوگیا

اس قدر ہم سے خلش کی اس کی مژگاں نے کہ ہائے　　ہر سرِ مو تن پہ اپنا نوکِ نشتر ہوگیا

رشتۂ شیرازۂ اجزائے دل تھی اُس کی زلف　　وہ جو واں بکھری تو یاں یہ دل بھی ابتر ہوگیا

اشک کا قطرہ مری آنکھوں کی سرخی کے سبب　　تھا اگر الماس تو یاقوت احمر ہوگیا

تھا اگر روزِ قیامت، تو بھی ہم شاداں رہے　　وہ جو اک دن، اُس سے ملنے کا مقرر ہوگیا

گر ہوس کی مے کی میں نے اشک خونی سے مرے　　آستیں کا حلقہ میری، خوں کا ساغر ہوگیا

مصحفی کیوں کر چھپے اب اس میں سوزِ داغِ دل[1]
چھن کے اُن پلکوں سے، سینہ جیسے مجمر ہوگیا!

48

جب اُس گلِ نازک کا دیدار نظر آیا　　آنکھوں میں مری ہر گل جوں خار نظر آیا

یوسف کی خریداری آسان نہ تھی، از بس　　جب مصر میں پہنچے تب بازار نظر آیا

---

[1] ن۴ داغِ عشق

مے ٹپکی ہی پڑتی ہے آنکھوں سے تری، کافر — تو آج بہت ہم کو سرشار نظر آیا
اس مست شلائیں نے جب بھر کے نظر دیکھا — مجلس میں نہ پھر کوئی ہشیار نظر آیا
جھوٹے نہیں، سچے ہو اُس کوچے میں ہاں، یارو — مجھ کو بھی چھلاوا سا اک بار نظر آیا
آنکھوں سے ہوئے جا کر ہم حلقہ بگوش اُس کے — جب زلف کے حلقوں سے رخسار نظر آیا
یک بار وہ تجھ پر ہی خنجر کو چلا بیٹھا — اے دل تجھے اب اُس کا کچھ پیار نظر آیا
یارو کہیں ایسی بھی دیکھی ہے صفاے شست — جو تیر لگا دل کے، سو پار نظر آیا
کیا وصل میں پُوچھے ہے، رونے کا مرے باعث — دن مجھ کو جدائی کا، اے یار نظر آیا
جب رخنۂ دل سے میں سینے کی طرف جھانکا — داغوں سے مجھے سینہ گلزار نظر آیا

اے مصحفی آنکھوں کا کس کی ہے نظر کردہ
تو اب کے بہت مجھ کو بیمار نظر آیا

49

کنجِ قفس میں جو کوئی مر گیا — ظلم بہ یارانِ دگر کر گیا
بھیجنے سے خط کے کچھ آیا نہ ہاتھ — ہاتھ سے برباد کبوتر گیا
قصہ کہوں کیا دلِ بیمار کا — عشق کی تب تھی، نہ بچا، مر گیا
فتنے کا بھی پڑ نہ سکا واں تو پانو — وہ بھی ترے کوچے سے بچ کر گیا
اس نے نہ پوچھا مجھے تو کون ہے — جس کی اداؤں پہ میں مر مر گیا
نالہ مرے دل سے جو نکلا سحر — وہ بھی تو افلاک پہ مضطر گیا
روکھی سناتے ہو مجھے واہ وا — آپ کی باتوں سے میں کیا ڈر گیا
چلتی تھی تلوار، درِ عشق پر — پانو کے رکھتے ہی وہاں، سر گیا
ساقی نے شیشے سے جو اُلٹی شراب — دیکھتے ہی جام کے، دل بھر گیا

مصحفی کو دیکھتے تھے ہم بھی رات
جب وہ تری بزم میں چھپ کر گیا

50

موسمِ گل کوچ مگر کر گیا رنگِ بہاراں جو سفر کر گیا
سن کے مجھے کشتہ، وہ آیا نہ پاس دور سے اک آکے نظر کر گیا
پیٹوں ہوں سر اپنا کہ مجھ کو وہ شوخ جاتے ہوئے کیوں نہ خبر کر گیا
تعزیہ داروں کی یہ مجلس ہے یاں جو کوئی آیا مژہ تر کر گیا
ماجرا لیلیٰ کا سنا ہو وے گا عشق بلا ہے جب اثر کر گیا
خون میں لوٹوں ہوں کہ مجھ کو وہ شوخ قتل بہ اندازِ دگر کر گیا
روزِ طرب، گاہ وہ لایا بہ شام گاہ شبِ غم کو سحر کر گیا
شمع صفت مصحفی اس بزم میں
جوں بنی دوں عمر بسر کر گیا

51

عشق مجھے اہلِ بصر کر گیا اشک کے قطرے کو گُہر کر گیا
رہ گئے ہم سوتے ہی افسوس ہے قافلۂ صبح سفر کر گیا
لاشوں کے ستھراؤ وہاں پڑ گئے اک نظر اپنی وہ جدھر کر گیا
آ گیا میں سامنے اس کے تو وہ دیکھ مجھے نیچی نظر کر گیا
کیوں کہ نکالوں ترے پیکان کو اب تو مرے دل میں وہ گھر کر گیا
آ کے مری خاک پہ کل گرد بار دیر تلک خاک بہ سر کر گیا

دل نہ لگا اس کا کہیں ایک بار — جو ترے کوچے سے گذر کر گیا
یہ شبِ ہجراں ہے، اُسے آفریں — جو کوئی اس شب کو سحر کر گیا
یار مرے سر سے نہ گذرا تو کیا — یار کا خنجر تو گذر کر گیا
صورِ سرافیل ہے نالہ مرا — گور کے سوتوں کو خبر کر گیا
پیار تو آیا تھا مرے دل میں رات — پر میں تری وضع سے ڈر کر گیا
لشکرِ خط لے کے جو آیا وہ شوخ — کشورِ دل زیر و زبر کر گیا
چشم نے دکھلائی صفا شست کی — تیرِ نگہ اپنا ہنر کر گیا
ہے وہ جہنم دلِ سوزاں مرا — جس سے جہنم بھی حذر کر گیا
خنجرِ مژگاں پہ گرا ٹوٹ کر — دل بھی مرا زورِ جگر کر گیا
دیکھیے اب زیست مری کیوں کے ہو — زہرِ جدائی تو اثر کر گیا

رونے پہ آیا جو میں کل مصحفی
سیکڑوں رومال کو تر کر گیا

52

دن رات نپٹ غم سے ترے نالہ کناں تھا — سچ کہہ تو مری جان کے دشمن، تو کہاں تھا
سوجھا نہ ہمیں خاک بھی کچھ بے بصری سے — یاں ورنہ ہر اک ذرّے میں خورشید عیاں تھا
اس چال سے گذرا کہ کیا کتنوں کو پامال — معشوق نہ تھا، یہ تو کوئی آفتِ جاں تھا
جن روزوں کہ کھینچے تھا وہ بے تیر کبادہ[1] — میرا دلِ خوں گشتہ تبھی اس کا نشاں تھا
معذور مجھے رکھیو تم، اے قافلہ باشاں — مانندِ جرس، دل مرا لبریز فغاں تھا
ایسا ہی گیا جلد کہ پھر منھ نہ دکھایا — وہ سروِ رواں اپنی مگر عمر رواں تھا
میں جامِ بلوریں میں شراب اس کو پلائی — پیمانۂ گل جس کی نزاکت پہ گراں تھا

---

[1] کبادہ بفتح اول کمان بسیار نرم (غیاث) ابجد کمان داراں (مصطلحات) یعنی سیکھنے کے لیے یا کھیلنے کے لیے بچوں کی کمان

جی دینے میں صرفہ نہ کیا ہم نے کسی سے ہر چند کہ اس بات[1] میں اپنا ہی زیاں تھا

ہم سے خبرِ مصحفیِ خستہ نہ پوچھو
تم آپ ہی سوچو نہ میاں دل میں، کہاں تھا

53

غیر ہی کو نت فلک نے اس کا ہم پہلو کیا دوش کو کب میرے اس نے تکیۂ بازو[2] کیا

جب مصوّر نے لکھا گر وہ تری تصویر کا لالہ و گل کر کے حل، صرف اُس میں رنگ و بو کیا

اب خیال اس کا نہیں چت سے اترتا ایک دم رفتہ رفتہ اس نے بھی دل پر مرے قابو کیا

گوہرِ غلطاں کی خوبی خاک میں مل جائے گی گر رواں ہم نے بھی پلکوں پر کوئی آنسو کیا

دل سے جو موج اُٹھی میرے، اس کو نازِ عشق نے چین پیشانی بنایا، یا خمِ ابرو کیا

حلقۂ در سے رہیں آنکھیں لگی، دو دوپہر ہم نے جب اس کو تصوّر حلقۂ گیسو کیا

اس چمن سے ہم نہیں شرمندہ اک گل کے نسیم گو کہ اوروں نے دماغِ آرزو خوشبو کیا

چین سا جاتا رہا ہے دل سے، میں حیران ہوں اس نے کل آنکھیں لڑائیں مجھ سے، یا جادو کیا

موڑ دیں صف کی صفیں اک آن میں اے مصحفی
اُس صفِ مژگاں نے اپنا جس طرف کو رو کیا

54

جس کے نہ لگا زخم تری کج نظری کا کیا ہووے الم اُس کو خراشِ جگری کا

یہ کس کی ہے رفتار کہ صفحے پہ زمیں کے ہر نقشِ قدم خاکہ ہے تصویرِ پری کا

کل قافلۂ نکہتِ گل ہوگا روانہ مت چھوڑیو تو ساتھ نسیمِ سحری کا

---

[1] ن۳: باب [2] ن۴: پہلو

کہتے ہیں جسے اہلِ جہاں شورِ قیامت سو پیشِ قدم ہے وہ تری جلوہ گری کا
ہے جی میں کہ یک چند خبر اپنی نہ لیجیے کہتے ہیں کہ عالم ہے عجب بے خبری کا
ازبس کہ عزیزوں نے مجھے دل سے بھلایا خط مجھ کو نہ آیا کسی یارِ سفری کا
پامال ہوا جائے ہے خورشیدِ درخشاں ہے کفش پہ ازبس کہ تری، کام زری کا
نت فرش زری بچھتے تھے دروازوں پہ جن کے سو اُن کو فلک نے کیا محتاج دری کا
اے مصحفی میں خط تو لکھوں لیک وہاں تک
ہر مرغ کو ہے حوصلہ کب نامہ بری کا

55

پونچھ کر آنکھوں کا کاجل، یوں نہ بالوں سے لگا اس سیاہی کو صنم ٹک اپنے گالوں سے لگا
آگہی کب تھی مجھے، اس کی کمر ہے جیسے مو ہاتھ یہ مضموں مرے نازک خیالوں سے لگا
رشک ہے جو اس کی سرخی پر لبِ سوفار کی کس کا لوہو ہے ترے تیروں کے بھالوں سے لگا
شعلۂ جوالہ ہو جیسے بلنہٹی پر کہیں آہ کا شعلہ پھرے ہے میرے میرے نالوں سے لگا
اس قدر بھی راحت و آرام کا دشمن نہ ہو
مصحفی مت دل کو ان ترکیب والوں سے لگا

56

کب میں نے کہا: تو مجھے دیدار دکھا جا ٹک آ کے پسِ پردہ ہی آواز سنا جا
ہے منزلِ مقصود ابھی دور، دوانے کیا دیکھے ہے سائے کو مغیلاں کے، چلا جا
مجروح تغافل نہ کر، اے شوخ تو ہم کو یوں جی میں جو آوے تو کوئی زخم لگا جا
کیا وضع ہے تیری کہ میں جب آؤں ہوں تجھ پاس منھ سے ترے سنتا ہوں یہی بات کہ جا جا

کر اپنے تئیں گم تو ذرا دشتِ جنوں میں　　شاید کہ کوئی آ کے تجھے راہ بتا جا
ناصح سے یہ کہہ دو کہ گریبان کو میرے　　پھر فصلِ بہار آئی ہے ٹک آ کے سِلا جا
اے مصحفی گردن کشی اس شوخ سے مت کر
جب کھینچے وہ تلوار، تو گردن کو جھکا جا

57

کوئی ہمیشہ گرفتارِ غم نہیں ہوتا　　ستم تو ہو وے، و لے یہ ستم نہیں ہوتا
کریں ہیں عشق تو سب، لیک نارسیدہ بکام　　مری طرح سے کوئی متہم نہیں ہوتا
ہمارے قتل کو کھینچے ہے جب وہ تیغ دو دم　　غرض کہ ہم میں تو اُس وقت دم نہیں ہوتا
ہے رُت بہار کی، اور باغباں کی مہلت[1] سے　　گلاب باغ میں اب تک قلم نہیں ہوتا
حرم تلک جو پہنچتے بھی ہیں بہ صد محنت　　تو ہائے ہم سے طوافِ حرم نہیں ہوتا
مرے مزار پہ دامن کشاں کب آوے ہے یار　　کہ میرے سینے سے شعلہ علم نہیں ہوتا
عدم وجود کے لازم ہے، پر جو سچ پوچھو　　وجودِ عاشقِ صادق عدم نہیں ہوتا
قدم دھرے ہے تو کب راہ میں کہ تیرا قد　　قدم قدم پہ، مری جان خم نہیں ہوتا
طبیب نسخے بدلتے ہیں سیکڑوں لیکن　　ہنوز دردِ دلِ خستہ کم نہیں ہوتا
ہمارے قتل کی تدبیر میں رقیب اس سے　　وہ شب ہے کون سی جو ہم قسم نہیں ہوتا
خدا کے واسطے اے مصحفی تو کچھ لکھ دے
کہ میرے ہاتھ سے نامہ رقم نہیں ہوتا

58

نظر آتا ہے یہ لونڈا، مجھے ہرجائی سا　　دیکھ اسے ہر کوئی ہو جائے ہے سودائی سا
کُنِ آب یہاں تک ہے جگر میں کہ اب اشک　　نوکِ مژگاں سے گرے ہے تو کھورائی سا

---

[1] مہلت بہ معنی تساہل استعمال ہوا ہے

دل جدھر جائے ہے میرا، تری صورت کا خیال ساتھ پھرتا ہے لگا اس کے تقاضائی سا
پھر بھی اے تیغ چمک جا کبھی بجلی سی، کہ ہے وا ہر اک زخم مرا چشمِ تماشائی سا
مصحفی سے تو میں واقف نہیں، پر کوئی شخص
صبح کا در پہ کھڑا ہے ترے، مجرائی سا

59

جن روزوں کہ رنگ آنکھوں کا اپنی جگری تھا ہر لختِ جگر روکشِ گل برگ طری[1] تھا
یوں جاتے ہوئے کر گیا پامال جو مجھ کو ہاں تھا تو وہ لڑکا ہی، پہ تصویرِ پری تھا
میں کر کے چلا باتیں، اور اُس شوخ نے وو ہیں پوچھا جو کسی نے تو کہا: رہ گذری تھا
گل رشک سے جلتے تھے پڑے عود کے مانند جن روزوں کہ جامہ ترے بر میں اگری تھا
وہ چھوڑ گیا مجھ کو پسِ قافلہ تنہا جس ساتھ مجھے داعیۂ ہم سفری تھا
شب جس سے رہا دل میں مرے دغدغہ، افسوس وہ صبح تلک مستِ مئے بے خبری تھا
پایا نہ تجھے مصحفی، میں صبح کے ہوتے اے سوختہ جاں کیا تو، چراغِ سحری تھا

60

جدھر دیکھو ادھر چرچا ہے ان ہنگامہ سازوں کا چلے فتنے کی یاں کیا، دور ہے دامن درازوں کا
قدیمی ناز بردار آپ کو اب کب خوش آتے ہیں پسند آتا ہے صاحب تم کو ملنا نو نیازوں کا
وہ کب محوِ تماشائے مرقع ہووے اے مانی نظر میں جس کی نقشا کھب گیا جادو طرازوں کا
رواں ہوں اشک جب پلکوں پہ میری تب ذرا دیکھے نہ دیکھا ہو تماشا گر کسی نے شیشے بازوں کا
وہ اوگھٹ راہ ہے اے مصحفی دشتِ محبت کی
کہ سُم لیتا ہے مرکب جس زمیں پر یکہ تازوں کا

---

[1] بمعنی تازہ، شاداب (اشٹین گاس)

61

آگے مرے، کسی نے ترا نام اگر لیا — اتنا میں مارے رشک کے تڑپا، کہ جی دیا
پیارے یہ رنگِ پاں ہے لبِ لعل پر ترے — یا تو نے ذبح کرکے کسی کا لہو پیا
اس پیرہن سے مجھ کو تو آتی ہے بوئے اشک — اے گل بتا تو، کس نے ترا پیرہن سیا
تو بھی کبھی عیادتِ بیمارِ عشق کر — کہتے ہیں تیرے واسطے مر مر کے وہ جیا

اے مصحفی تو جائے گا کیا اُس کے رو برو
تو نے تو اُس کے کوچے میں آتے ہی غش کیا

62

ہائے کیا کیجیے اس جامۂ عریانی کا — شوق دل ہی میں رہا چاک گریبانی کا
چاہ سے آج زلیخا کو یہ مژدہ پہنچے[1] — یعنی اب دلو مکاں ہے مہ کنعانی کا
شانہ زلفوں میں جو ہر دم تو، کیا کرتا ہے — یہی باعث ہے مرے دل کی پریشانی کا
بارہا اشک کا دریا مرے سر سے گذرا — لیک ہرگز نہ مٹا خط مری پیشانی کا
کج کُلاہ ہی نہ گئی تا سرِ مژگاں اُس کی — اشک ہے یا ہے یہ لڑکا کسی درّانی کا
ذبح کر رہتا ہے اک آدھ کو ہر صبح مدام — کس قدر شوق ہے اُس بُت کو بھی قربانی کا
کر سکے کیا کوئی اب جمع میاں مجھ کو کہ میں — ہوں پریشاں تری زلفوں کی پریشانی کا
اشک نے مجھ کو ڈبویا اسے تب چین آیا — تھا یہ اک عمر سے خواہاں مری ویرانی کا
ہم اسیروں کو قفس تنگ تر از بیضہ ملا — شوق جی ہی میں رہا بال و پر افشانی کا

چمنِ ہند میں بلبل ہیں ہزاروں لیکن
مصحفی شور ہے اب تیری غزل خوانی کا

---

[1] ن۳: پہنچا

63

زیادہ قصد نہ کر عاشق آزمائی کا کیا ہے کس نے بھلا امتحاں خدائی کا

یہ کیا ادا ہے کہ ہردم کمر سے بندھتا ہے کبھو دوپٹے کا پٹکا، کبھی دولائی کا

خدا کے واسطے اب منھ پہ چھوڑ دے برقع کہ بیش ازیں نہیں مقدور پارسائی کا

غرض کہ خوبرو سب بے وفا ہی گذرے ہیں میں تذکرہ کروں کس کس کی بے وفائی کا

بہت رکھا مجھے زنداں میں عشق نے لیکن علاج ہو نہ سکا اس سرِ ہوائی کا

رکھے ہے حکم خزف گو ہر اس زمانے میں ز بس کہ گرم ہے بازار ناروائی کا

مرے مزار پہ رکھ دیجیو گلِ مہندی کہ میں شہید ہوں اُس پنجۂ حنائی کا

رہے ہے گل خس و خارِ چمن سے چیں بہ جبیں دماغ ہے اُسے از بس کہ میرزائی کا

ہزار حیف، کہ یہ وہ زمانہ آیا ہے کہ آشنا کو نہیں پاس آشنائی کا

کسی سے مصحفی رکھتا نہیں میں دل میں غبار
کہ مثلِ آئینہ عالم ہے یاں صفائی کا

64

چھپایا تم نے منھ ایسا کہ بس جی ہی جلا ڈالا تغافل نے تمھارے خاک میں ہم کو ملا ڈالا

کہے تو کھیل لڑکوں کا ہے یہ، یعنی مصوّر نے جو نقش اس صفحۂ ہستی پہ کھینچا سو مٹا ڈالا

حجابِ عشق ہے ملنے سے مانع، ورنہ عاشق کو رہی پھر شرم کس کی دل سے جب خطرہ اُٹھا ڈالا

نہ اُٹھا حشر کو بھی اُس کی تیغ ناز کا مارا کیا خوں اُس نے اک عالم کا اور وہیں چھپا ڈالا

مرض تھا مصحفی کو صعب تر، یہ خوب وہ سمجھا
کہ جوں توں آپ کو اُس نے ترے کوچے میں لا ڈالا

65

قاصد جب اُس کے پاس مرا نامہ لے گیا — پوشیدہ کر کے سب سے وہ علامہ[1] لے گیا
پایا نہ اس چمن سے کسی نے لباسِ عیش — جو گل گیا سوخوں میں ڈوبا[2] جامہ لے گیا
مطرب پسر کی دست درازی کو عشق[3] ہے — باتوں میں شیخِ شہر کا عمامہ لے گیا
جو نالہ میرے دل سے اُٹھا شور کر کے رات — وہ چرخ پر ہی حشر کا ہنگامہ لے گیا

ہر چند مصحفی میں جواہر رقم نہیں
پر موتیوں کی آب مرا خامہ لے گیا

66

جوں سایہ اس کے پیچھے میں برسوں لگا پھرا — لیکن نہ اُس کا رُخ کبھی سوئے قفا پھرا
رویا چمن میں رات میں اتنا کہ جوں حباب — پانی میں آشیانۂ بلبل بہا پھرا
گردوں تمام جیسے کہ غربال ہوگیا — جب سے رُخ اُس کی پلکوں کا سوے ہوا پھرا
زور آوری نہ کر، کہ جو آیا غرور میں — مارا زمیں پہ اُس کو فلک نے پھرا پھرا
مجنوں کو عشقِ لیلیٰ نے آرام کب دیا — اک عمر کوہ و دشت میں روتا ہوا پھرا
مشتِ غبار اپنا تری جستجو کے بیچ — آوارہ ہو کے ہم رہِ بادِ صبا پھرا
میں جس کی راہِ شوق میں پامال ہوگیا — وہ بھول کر بھی خاک پہ میری نہ آ پھرا

مارا گیا گلی میں تری مصحفی، دریغ
اس کشتنی کے سر سے نہ حکمِ قضا پھرا

67

تو جس شب کہ جا غیر کے پاس سویا — میں تکیے سے تیرے گلے لگ کے رویا

---

[1] علامہ بہ معنی چالاک استعمال ہوا ہے [2] ڈوبا بدون واؤ پڑھا جائے گا۔ [3] عشق ہے یعنی آفریں ہے۔

کروں کیسے شکوہ کہ دریاے خوں میں مجھے دیدۂ تر نے میرے ڈبویا
اُٹھا کون سی صبح رنجور و خستہ کہ میں آنسوؤں سے منھ اپنا نہ دھویا
نہ ہر اک کو پیارے دکھا وضع اپنی کہ اس وضع کا ایک عالم ہے جویا
ترے ہاتھ دیکھے حنا سے بھی سادے دل اپنے کو میں ہاتھ سے مفت کھویا
نہ سبزہ ہوا واں سے زنہار پیدا میں جس خاک میں اشک کا دانہ بویا

گیا مصحفی تیرا شورِ فصاحت
فلک تک، تو ظالم فغانی ہے گویا

68

مرا دل گیا جب سے زلفوں میں کھویا میں کیا، ایک عالم ہے اس دل کا جویا
مجھے خوابِ آرام اُس رات آئی کہ خنجر ترا میرے پہلو میں سویا
تجھے جب کہ ہم زانوے غیر دیکھا سر[1] اپنا میں زانو پہ رکھ خوب رویا
نہ ہرگز ہوا سبز حرماں کے مارے میں اس مزرعِ دل میں جو تخم بویا

کہیں مصحفی گریہ موقوف کر اب
کہ اس گریے نے ایک عالم ڈبویا

69

منھ دیکھ کے یار، آرسی کا دشمن تو ہوا ہمارے جی کا
مشاطہ سمجھ کے شانہ کیجیو اُس زلف کا ہو نہ بال بیکا
سمجھے نہ وہ مومن اور نہ کافر دل چاہیئے اُس کو، ہو کسی کا
جی سے نہیں بھولتا ہے اب تک کہنا ترا ہنس کے وہ اجی کا

---

[1] ن ۳: منھ اپنا

تھا آئینہ ہاتھ میں کہ ناگہ قطعہ مغرور ہو اپنی نیکوی کا
شب ماہ کو دیکھ کر یہ بولا: ہے اِس کا بھی کتنا حُسن پھیکا
ظاہر میں ہے گو درست احوال
سی پارہ ہے دل تو مصحفی کا

70

زلفوں کی درہمی نے برہم جہان مارا　　پلکوں کی کاوشوں نے سینوں کو چھان مارا
ہرگز وہ دست و بازو ملتے کبھی نہ دیکھے　　جو تیر اُس نے مارا، سو بے کمان مارا
سچاّ تو ہوگیا میں، ٹک بارے عاشقوں میں　　صد شکر مجھ کو تو نے، کر امتحان مارا
کوئی کہاں تلک اب ان کی سنے نصیحت　　بک بک کے دوستوں نے اپنا تو جان مارا
تھی وصل کی شب، اور میں بے خود پڑا تھا قطعہ اتنے میں فوجِ غم نے تھانا سا آن مارا
جوں مرغِ صبح بولا، صدمہ یہ دل کو پہنچا　　جیسے کسو نے میری چھاتی پہ بان مارا
تم کو بھی کچھ خبر ہے جب رات ہم نے آ کر　　سر سنگِ آستاں سے، اے میری جان مارا
جو جامہ زیب گذرا مثلِ صبا اُدھر سے　　آتش پر اس نے دامن میری ندان مارا
بریک نگاہ تو نے تیغِ جفا علم کر قطعہ جس دن سے مصحفی کو اے بدگمان مارا
لاشے پر اس کے ہردم کہتے ہیں لوگ آ کر
کیا مفت میں گیا ہے یہ نوجوان مارا

71

ذرا ہم سے بھی ملتے جایئے گا　　کبھو تو اس طرف بھی آیئے گا
ہمارا دل ہے قابو میں تمھارے　　بھلا جی کیوں نہ اب ترسایئے گا

جو ہم رونے پہ آویں گے تو، اے ابر	بجائے آب، خوں برسایئے گا
بہار آئے، تو اب کی ناصحوں کو	گریباں پرزے کر دکھلایئے گا
کہا اے مصحفی میں اُس سے اک دن قطعہ	کہ بوسہ آج تو دلوایئے گا
جواب اس نے دیا مجھ کو کہ صاحب
کوئی یہ وقت ہے؟ پھر آیئے گا

72

یہ قطرہ اشک نے مژگاں سے تار باندھ دیا	کثوت میں گہر آب دار باندھ دیا
دھوئیں نے آہ کے میری کبھی جو سر کھینچا	زمیں سے تا بہ فلک اک غبار باندھ دیا
نہیں یہ آبلہ کامِ جرس میں آویزاں	کسی نے اپنا دلِ بے قرار باندھ دیا
نکلتے گھر سے کیا خون ایک عالم کا	کمر سے اس کی یہ کن نے کٹار باندھ دیا
فغاں کہ مرہمِ کافور کی جگہ ہم نے	نمک بہ روئے دلِ داغ دار باندھ دیا
ہر اشک کو مری مژگاں سے یوں علاقہ ہے	کہ جوں ستار کی کھونٹی سے تار باندھ دیا
دَر اُس کا مجھ سے چھپا ہی رہا، کبھی تو نے	اُٹھا کے پردہ، نہ اے پردہ دار باندھ دیا
ترے تماشے کو خلق اتنی آئی عید کے دن	کہ اک پرا سا سرِ رہ گذار باندھ دیا
فلک کو دیکھ تو اے مصحفی کہ صانع نے
عجب طرح کا یہ نقش و نگار باندھ دیا

73

بس کہ ہر دم چاکِ تازہ میں گریباں میں دیا	مجھ کو سودائی سمجھ، یاروں نے زنداں میں دیا
موسمِ گل سچ ہے، مرجانے کی جا تھی صحنِ باغ	اس لیے بلبل نے اپنا جی گلستاں میں دیا

ایک عالم مجھ کو پیارے زیرِ تیغ آیا نظر
سرمہ جس دم تو نے اپنی چشمِ فتاں میں دیا

کچھ بھی جمعیت ہوئی حاصل نہ ہم کو، ہم نے ہائے
رائیگاں، دل خواہشِ زلفِ پریشاں میں دیا

اس کی طاقت تھی نہ ہرگز، بن کے شعلے کا حریف
مفت پروانے نے جی اپنا چراغاں میں دیا

جوں سرِ منصور، یہ سر خود سزائے دار تھا
ہم نے اپنے سر کو ناحق عشقِ خوباں میں دیا

خاک گلیوں کی، رہا بھر عمر سر پر چھانتا
ہاتھ سے دل جس نے بازی گاہِ طفلاں میں دیا

عشق کی وادی سے کوئی سالم نہ آیا مصحفی
ہم نے سب اسباب اپنا اس بیاباں میں دیا

74

درمیاں میں نقاب کس دن تھا
میرے اُس کے حجاب کس دن تھا

لطف کرتے تھے مجھ پہ تم ہر دم
جانِ من یہ عتاب کس دن تھا

آہ جاتی تھی سعی سے لب تک
نالہ پا در رکاب کس دن تھا

حادثے ہوتے تھے زمانے میں
اس قدر انقلاب کس دن تھا

کشورِ بختِ تیرہ روزاں میں
جلوہ گر آفتاب کس دن تھا

کون رویا ہے، گُل کے چہرے پر
اس قدر آب و تاب کس دن تھا

مصحفی آج تو قیامت ہے
دل کو یہ اضطراب کس دن تھا

75

خط ترا مشک تاب کس دن تھا
ابر میں آفتاب کس دن تھا

چاندانی تھی تمام شب گھر میں
ماہ، زیرِ نقاب کس دن تھا

رات دن اپنے خوش گذرتے تھے
عشق، خانہ خراب کس دن تھا

ا کوئی بروزن فع

یوں تو تم مجھ سے منہ چھپاتے تھے   یہ کشش، یہ حجاب کس دن تھا
تو ہی انصاف کر، بھلا اے عشق   ہم پہ اتنا عذاب کس دن تھا
اُس کو ہم مستِ حسن پاتے تھے   مستِ جامِ شراب کس دن تھا
زلف کی طرح اینٹھتے ہو کیوں   تم میں یہ پیچ و تاب کس دن تھا
موجد اس کام کا تو' ہے، ورنہ   قتلِ عاشق، ثواب کس دن تھا
جس طرح تو نے منہ چھپایا، یوں   لب بام آفتاب کس دن تھا

مصحفی تھا تو شیعہ مذہب لیک
نعرۂ بوتراب کس دن تھا

76

دل چرانا، یہ کام ہے تیرا   لے گیا ہے، تو نام ہے تیرا
ہے قیامت بپا، کہ جلوے میں   قامتِ خوش خرام ہے تیرا
جس نے عالم کیا ہے زیر و زبر   یہ خطِ مشک فام ہے تیرا
دید کرنے کو چاہئیں آنکھیں   ہر طرف جلوہ عام ہے تیرا
کس کا یہ خوں کیے تو آتا ہے   دامن افشاں تمام ہے تیرا
ہو نہ ہو تو، ہماری مجلس میں   تذکرہ صبح و شام ہے تیرا
تیغ ابرو ہمیں بھی دے اک زخم   سر پہ عالم کے دام ہے تیرا

تو جو کہتا ہے مصحفی ادھر آ
مصحفی کیا غلام ہے تیرا

77

میرا زانو، دبا کے اُٹھ جانا   صدقے میں، اس ادا سے گرمانا
اب نہ فرہاد ہے نہ مجنوں ہے   رہ گیا عاشقوں کا افسانا

رات کیا کیا صنم کی سیر ہوئی　　نظر آتا تھا ایک بت خانا
نگۂ آشنا نے اس کی کیا　　ایک عالم سے مجھ کو بیگانا
قہر ہے اک تو ان کڑوں کی صدا　　تس پہ پھر پانوْ کا بھی تھپکانا
میں گیا کل تو اس نے، دست بخیر[1]　　میرے اک پیش قبض گذرانا

مصحفی ہوں، یہ کام ہے میرا
تیری ایک اک ادا پہ مر جانا

78

ہے لالہ گوں شفق سے، دامن جو آسماں کا　　سب ماجرا ہے اپنی یہ چشمِ خوں فشاں کا
سرخی میں اس کے رُخ کی زردی سی مارتی ہے　　اس سال کچھ سنہرا ہے رنگ گلستاں کا
کہتے ہیں آتشِ گل بھڑکے ہے پھر چمن میں　　کیا جانے رنگ کیا ہو بلبل کے آشیاں کا
گہ دل میں گہ جگر میں وہ پیرتی رہے ہے　　ہے سیرگاہ میرا سینہ، تری سناں کا
بانگِ رسیدگاں سے گوشِ زمانہ کرّ ہے　　منزل پہ شور دوُنا ہوتا ہے کارواں کا
جو تیر پھینکے ہے تو' جاتا ہے دائیں بائیں　　رُخ پھر گیا ہے ہم سے ازبس تری کماں کا
اک دار پر چڑھا ہے، اک تیغ تک رہا ہے　　ہے گرم اس گلی میں بازار امتحاں کا
صیّاد سے کہو ٹک، ظالم ذرا خبر لے　　احوال اب بتر ہے اِس صیدِ نیم جاں کا
زردی کو میرے رُخ کی جو دیکھے ہے کہے ہے:　　دیکھا نہیں ہے ہم نے یہ رنگ زعفراں کا

پاتا ہوں مصحفی کو میں ان دنوں مشوش
کیا جانے آ گیا[2] ہے دل کس پہ اُس جواں کا

---

[1] کسی چوٹ یا زخم کی جگہ بتاتے ہوئے، اپنے یا دوسرے کے جسم پر ہاتھ رکھیں تو بدشگونی کے احتمال سے بہ طور جملہ دعائیہ معترضہ، دست بخیر یا دستم بخیر کہا جاتا ہے۔
[2] ن ۳: جانیے گیا

79

عالم ہمیں خوش آیا ازبس کہ اس جہاں کا — آ کر عدم سے بھولے نقشا ہم تو واں کا
کس کس کے سر پہ دیکھیں آتی ہے اب قیامت — نکلا ہے پانو باہر اس فتنۂ زماں کا
قبضے کی اوجھڑیں تو میں کھائیں سیکڑوں پر — دیکھا نہ ہاتھ اُٹھتا[1] اُس نازنیں جواں کا
پردے میں منھ چھپانا، چتون بھی پھر دکھانا — قربان ہوں میں تیرے اس عشوۂ نہاں کا
گر دستِ تیغِ خوباں بے صرفگی[2] پہ آوے — آمادہ ہے یہ سینہ صد زخمِ خوں چکاں کا
کس زندگی کے اوپر فکرِ معاش کیجیے — پڑتا نہیں بھروسا اس جسمِ ناتواں کا
چاروں طرف سے آتش دے دے تو مجھ کو اے عشق — کیا کام ہے جلانا اک مشت استخواں کا

البتہ مصحفی کو ہے ریختے میں دعویٰ
یعنی کہ ہے زباں داں، اردو کی وہ[3] زباں کا

80

مشتاق ہی دل برسوں اُس غنچہ دہن کا تھا — یارو مرے اور اُس کے کب ربطِ سخن کا تھا
واں بالوں میں وہ مکھڑا جاتا تھا چھپا کم کم — یاں حشر مرے دل پر اک چاند گہن کا تھا
تھے خطِ شکستہ کی رخسار ترے تعلیم — ازبس کہ ہجوم اُن پر زلفوں کی شکن کا تھا
پروانے کی ہمت کے صدقے میں، کہ دی شب وہ — اس بے پر و بالی پر قربان لگن کا تھا
آخر کو ہمیں ظالم پامال کیا تو نے — اندیشہ ہمیں دل میں تیرے ہی چلن کا تھا
میں اُس قد و عارض کو کر یاد بہت رویا — مذکور گلستاں میں کچھ سرو و سمن کا تھا
جوں اشکِ سرِ مژگاں ہم پھر نہ نظر آئے — ازبس کہ یہاں وقفہ اک چشم زدن کا تھا

---

[1] ن ۳: اُٹھا [2] بے صرفگی: بے جھجک پن [3] مصحفی غالباً پہلا شاعر ہے جس نے 'اُردو' کا لفظ اس زبان کے لیے استعمال کیا ہے، یہ غور طلب ہے کہ 'اردو' کی زبان، کہا ہے۔

دو پھول کوئی رکھ کر گذرا تھا جو کل یاں سے — تربت پہ مری بلوا مرغانِ چمن کا تھا
جس مرغِ چمن کو میں دیکھا تو چمن میں بھی — حسرت کشِ نظارہ اُس رشکِ چمن تھا
شب دیکھ مہِ تاباں، تھا مصحفی تو حیراں
کیا اس میں بھی کچھ نقشا اس سیم بدن کا تھا

81

بھٹکا پھرے ہے تیری، دل اک ادا کا مارا — کہہ کس طرف کو جاوے اب یہ خدا کا مارا
زلفوں سے اس کی، اے دل، ہے مجھ کو کیا سروکار — پھرتا ہوں میں تو آپ ہی اپنی بلا کا مارا
ہم حالِ دل کی اپنے تقریر کر رہے ہیں — وہ بولتا نہیں کچھ ہرگز حیا کا مارا
وہ صیدِ خوں گرفتہ جیتا بچا نہ ہرگز — جو صید گہ میں تیری آیا قضا کا[1] مارا
دیکھا جو خوں میں غلطاں مجھ کو تو لوگ بولے — یہ کشتہ ہے کسی کے رنگِ حنا کا مارا
پھٹکار سی کسی کی اس دل کو لگ گئی ہے — کیا جانے یہ پھرے ہے کس کی دعا کا مارا
کل مصحفی کو میں نے کوچے میں اُس کے دیکھا
ٹکڑے ہوا پڑا تھا تیغِ جفا کا مارا

82

عارض، نہ تری زلفِ پریشان میں دیکھا — یوسف کو زلیخا کے میں زندان میں دیکھا
سر کھینچے تھا شعلہ سا مرے دل سے فلک تک — میں طرفہ تماشا شبِ ہجران میں دیکھا
ہرگز نہ رہا ہاتھ مرا، جامہ دری سے — اک چاک نیا روز گریبان میں دیکھا
میں کوئی پسِ مرگ بھی آسودہ نہ پایا — عالم کے تئیں خوابِ پریشان میں دیکھا
گر تو بھی کرے سیر بیاباں کی، تو سمجھے — اک جذب عجب میں نے بیابان میں دیکھا

---

[1] ن ا: آیا تیر قضا

عارض پہ ترے صلِّ علیٰ کیوں کہ نہ کہیئے — اس رنگ کا اک گل نہ گلستاں میں دیکھا
کاہے کو تعب کھینچے ہے اس دل کی صفا پر — آئینے نے کیا دیدۂ حیران میں دیکھا
جس کشتے کا دنیا میں کہیں کھوج نہ پایا — وہ کشتہ ترے چاہِ زنخدان میں دیکھا
باراں کی ہوا، آبِ رواں، لالے کا کھِلنا — یہ رنگ سب اس دیدۂ گریان میں دیکھا
ہو اشک، ان آنکھوں سے گرے صبح کے تارے — موتی کے تئیں جب سے ترے کان میں دیکھا
کس رنگ کا تھا کشتہ، کہ ایامِ بہاراں — بلبل کو تڑپتا میں خیابان میں دیکھا

اے مصحفی افسوس، کہاں تھا تو دوانے
کل اُس کے تئیں ہم نے عجب آن میں دیکھا

83

آویزۂ لعل اس کے جو میں کان میں دیکھا — صد لختِ جگر دیدۂ گریان میں دیکھا
اللہ رے ترے حسن کے شعلے کی تجلّی — یہ جلوہ نہ خورشیدِ درخشان میں دیکھا
پھر جائے دل اُس بت سے مرا پڑھتے ہی جس کے — ایسا تو کوئی سورہ نہ قرآن میں دیکھا
چھوٹا نہ تری قید سے جیتا کوئی، ظالم — لاکھوں کو سسکتا ترے زندان میں دیکھا
مجنوں نے کیا آپ کو گم، مارے خوشی کے — جب ناقۂ لیلیٰ کو بیابان میں دیکھا
مارے گئے اتنے کہ ہوئے لاشوں کے تودے — گھمسان پڑا عشق کے میدان میں دیکھا
دل قطرۂ خوں ہو کے بہا چشم سے میری — جب تکمۂ لعل اس کے گریبان میں دیکھا
جس گل سے کہ دیتا میں ترے رنگ کو تشبیہ — ایسا تو کوئی گل نہ گلستان میں دیکھا
دل، لڑکوں کے پتھروں سے جو پاوے تھا ہمیشہ — وہ ذوق، ترے تیروں کے پیکان میں دیکھا
جز سبز خطاں، کی نہ نظر اور کے اوپر — جب سبزے کو میں نے مہِ شعبان[1] میں دیکھا

---

[1] قدیم شگون کے مطابق شعبان کا چاند دیکھ کر سبزہ دیکھا جاتا ہے۔

تجھ سا تو کوئی کج کُلہ، اے کافرِ ہندی شیراز میں دیکھا نہ صفاہان میں دیکھا
اے مصحفی کہتا تھا میں، تو اس سے نہ لگ چل
دل لے ہی گیا تیرا نہ اک آن میں، دیکھا

84

آتا ہے یاد مجھ کو خوں خوار کا لپٹنا اور اس گلے سے اس کی تلوار کا لپٹنا
تم نازنیں جواں ہو، مت چھیڑو دل جلوں کو بگڑے تو پھر ستم ہے دوچار کا لپٹنا
رکھتا ہے میرے دل کو، نت پیچ و تاب ہی میں زنّار سی کمر سے، زنّار کا لپٹنا
اس سادگی کے اوپر، اک قہر ہے، بلا ہے برقع میں اُس پری کے رخسار کا لپٹنا
مشاطہ دیدنی ہے، موے کمر سے جاکر اُس زلفِ عنبریں کے ہر تار کا لپٹنا
مانندِ زلفِ خوباں ازبس دراز ہے وہ مشکل ہے عاشقوں کے طومار کا لپٹنا
لپٹے تو ہے تو مجھ سے، اے زلف لیک اک دن جی لے رہے گا تیرا[1] یہ پیار کا لپٹنا
زلفِ سیہ سے اس کی تو پُر حذر ہی رہیو
اے مصحفی بلا ہے اِس مار کا لپٹنا

85

ہجومِ گریہ، زبس رات چشمِ تر میں رہا سحر کے ہوتے، نہ اک قطرہ خوں جگر میں رہا
کبھی جو یار نے دزدیدہ مجھ کو دیکھا، تو میں امیدوارِ نظارۂ دگر میں رہا
دل و جگر ترے پیکانِ تیر کا گھر تھا کبھو وہ دل میں رہا اور کبھو جگر میں رہا
خلش گئی نہ پس از مرگ بھی الم کی ترے موئے بھی ہم تو وہی نیشتر جگر میں رہا
نہ دیکھا اُس نے کبھی مجھ کو آنکھ اُٹھا اور میں تمام عمر تمنائے یک نظر میں رہا

---

[1] ن ا: رہا ہے

قلم سے کھینچ کے، مانی تجھے دکھاویں گے
کسی کے حسن کا نقشا اگر نظر میں رہا

زبس کہ نالے کو، شب اضطراب تھا تجھ بن
تمام رات دعاے اثر اثر میں رہا

ادھر سے میری نظر سیر ہی رہی کرتی
اُدھر اگرچہ ترا ہاتھ چاکِ در میں رہا

رہے گا تا بہ کمر خوں تری گلی میں میاں
اسی ادا سے جو خنجر تری کمر میں رہا

گرا جو شمع پہ پروانہ، جل کے یوں بولا:
اُڑوں میں کاہے سے کیا خاک بال و پر میں رہا

تم اُٹھ گئے جو میاں، مصحفی کی بالیں سے
تمام رات بڑا ماتم اُس کے گھر میں رہا

86

وہ حسن جاتا رہا اُس کا، وہ گلو نہ رہا
وہ رنگ و بو نہ رہا اور وہ رو و مو نہ رہا

بہت کہا میں کہ اس شب تو رہ تو میرے پاس
مرے کہے کو نہ سمجھا وہ تند خو نہ رہا

پھر آفتاب بھلا روبرو ہو کس منھ سے
کہ آفتاب کا حُسن اُس کے روبرو نہ رہا

دماغ نے ہمیں سیرِ چمن کی رخصت دی
گلوں کے چہرے پہ، وقتے کہ رنگ و بو نہ رہا

دیا فشار مرے دل کو عشق نے یاں تک
کہ اس میں خون تو کیا، رنگِ آرزو نہ رہا

نہ روے خوب پہ بھول اس قدر کہ دنیا میں
کوئی ہمیشہ مری جان، خوب رو نہ رہا

مری اور اُس کی یہ صحبت رہی، کہ جب آیا
کبھو رہا وہ مرے پاس اور کبھو نہ رہا

وہ زخم کون سا آیا مرے، کہ رات [illegible]
میاں کشمکش [illegible] نہ رہا

میں مصحفی تجھے پاس اس کے چھوڑ آیا تھا
کچھ اس نے تجھ کو کہا کیا میاں جو تو نہ رہا

87

وہ عشق و ولولہ و شورِ ہائے و ہو نہ رہا
ہوئے ضعیف ادھر ہم، اُدھر وہ تو نہ رہا

ہزار بار ہوا آئینہ مقابلِ یار پہ تا بدیر کبھی اُس کے روبرو نہ رہا

گیا جو باغ میں تو سیرِ گل کو، دیکھ تجھے چمن میں گل نہ رہا، گل میں رنگ و بو نہ رہا

ہزار جا سے ہوا بس کہ یہ گریباں چاک کہ جیبِ گل کی طرح قابلِ رفو نہ رہا

میں بس کہ گریے سے گل مشقِ آب پاشی کی کہ لوحِ دل پہ کوئی حرفِ آرزو نہ رہا

میں تیرے روئے مخطط پہ سخت حیراں ہوں خط آئے پر کوئی اتنا تو خوبرو نہ رہا

بہارِ عمر میں اے مصحفی تو، پی لے شراب

کہ کو کنار کے کاندھے پہ نت سبو نہ رہا

88

ہو کیوں نہ تشنۂ خوں، وہ ہم سے بے کسوں کا ہے تیغ کا سا جوہر، سبزہ تری مسوں کا

ناخن بہ دل زن از بس، تھیں انگلیاں صنم کی[1] سینے پہ میرے نقشا ہے اب تلک دسوں کا

زلفوں نے اس کی ہم کو زنجیر کر رکھا ہے بس کیا چلے ہے ان سے ہم جیسے بے بسوں کا

ہے تختہ بند انساں ہیکل میں استخواں کی کم از رسن نہیں کچھ یہ جال سا، نسوں کا

جیتا تری گلی میں پہنچا نہ مصحفی ہائے

آخر ہوا وہ طعمہ صحرا میں[2] کرگسوں کا

89

دیدۂ بے دید، دشمن ہوگیا مجھ کو اک نظّارہ رہ زن ہوگیا

ہم جہاں روئے ذرا، خوں بیٹھ کر اس زمیں کا تختہ گلشن ہوگیا

صبح ہوتے، جب دیا منہ اس نے کھول مطلعِ خورشید روشن ہوگیا

میں وہ دوزخ ہوں کہ آتش پر مری آب بھی چھڑکا تو روغن ہوگیا

---

[1] ن ۳: جن کی [2] ن ۳: صحرا کے

کس کی مژگاں شب خدنگ اندازتھیں سینۂ افلاک روزن ہوگیا
وسعتِ دستِ جنوں کے ہاتھ سے اب گریباں جیسے دامن ہوگیا
مصحفی پھر جان کا کیا ہے دریغ
جب فدائے دوست تن من ہوگیا

90

دوست تھا اپنا، سو دشمن ہوگیا راہ بر قسمت سے رہ زن ہوگیا
سنگِ دل تیرے کی، سختی سے میاں اب تو دل اپنا بھی آہن ہوگیا
شمع پردے میں جلی تو کیا ہوا ہم پہ سب احوال روشن ہوگیا
پردۂ دل میرا چھلنی کی طرح چھن کے ان پلکوں سے روزن ہوگیا
آتے آتے تک مرے لب پر دریغ نالۂ شادی بھی شیون ہوگیا
جب دیا چاکِ گریباں اُس نے کھول دامنِ نظارہ گلشن ہوگیا
مصحفی تھا تو' تو دریا نوش، واہ
اک ہی پیالے میں اٹیرن ہوگیا

91

میاں تم ہم سے نت کرتے ہو رَم کیا تمھیں ایسے بُرے لگتے ہیں ہم کیا
ستم کرتے رہے تم، اور ہم نے نہ جانا یہ کہ ہوتا ہے ستم کیا
قدِ نازک نہال، اُس شاخِ گل کا ہَوا سے دیکھیو کھاتا ہے خم کیا
رگِ گل کر دیا موے کمر کو کرے کام اِس سے زیادہ[1] موٗقلم کیا
تری آنکھوں کی کیفیت کے آگے مری آنکھوں میں ٹھہرے جامِ جم کیا

---

[1] ن ا: نازک

صمد سے پھر گئیں زاہد کی آنکھیں　　نظر آیا کوئی کافر صنم کیا

بہت دم باز میں دیکھے ہیں ایسے　　مجھے باتوں میں تم دیتے ہو دم کیا

قسم کھاتے ہو میرے سر کی جھوٹی　　میاں جاؤ بھی جھوٹوں کی قسم کیا

نہیں آتے جو اب پلکوں پہ آنسو　　جگر، سب ہوگیا[1] اے چشمِ نم کیا

نہیں آتا سرِ تیر اب جو کوئی　　سبھی مارے گئے صیدِ حرم کیا

جوقہ[2] ہیں مصحفی شاعر ہیں وے لوگ

ہماری شاعری کیا اور ہم کیا

92

ترچھے قدم کے پڑتے کل جوں قد اس کا لچکا　　پہنچا تلے زمیں کے مُردوں کے دل کو دھچکا

کہیئے جو جھوٹ، تو ہم ہوتے ہیں کہہ کے رسوا　　سچ کہیئے تو، زمانہ یارو نہیں ہے سچ کا

اب دیکھو تو قلعی[3] سی ان کی اُدھڑ گئی ہے　　تھا جن عمارتوں پر دلّی کی، کام گچ کا

گھوڑے کی ٹاپ اُس کے جس دم لگی زمیں پر　　زیرِ زمیں کلیجا گاوِ زمیں کا دھچکا

تا زیست، مصحفی کے چھوڑی نہ دل کی جانب

دیوانہ ہوں میں یارو زلفوں کی اس کی پیچ کا

93

خط گرد ہے چہرے کے ترے، نادِ علی[4] سا　　منہ لال ہے پانو سے ترا گل کی کلی سا

اللہ رے تری شان کہ با ایں ہمہ شوکت　　پیدا نہ کیا پھر یدِ قدرت نے علی سا

ہونا بہت آسان ہے شیطان سے مشہور　　پر ہو تو لے اوّل کوئی دنیا میں ولی سا

---

[1] ہوگیا = ختم ہوگیا　[2] قہ = مسخرے　[3] قلعی: یہ قوطعین ظم ہوا ہے

[4] ایک مشہور دعا "نادِ علیاً مظہر العجائب" الخ کی تلمیح

گر مصحفی دل بیچے، تو مت چھوڑیو اُس کو
مجھ کو نظر آتا ہے یہ مصحف بغلی[1] سا

94

برہم زنِ تقریر نہیں پیر و جواں کا — جوں غنچہ، میں عقدہ ہوں، پر اپنی ہی زباں کا
مت بھول، بہارِ رخِ گل رنگ پر، اتنا — یاں رنگ کی گردش ہی میں موسم ہے خزاں کا
پیدا ہے کہ حلقوم پہ ہم تشنہ لبوں کے — ہے حکم تری تیغ کے تیئں، آبِ رواں کا
بے نام و نشاں ہوگئے جوینده، ولیکن — پایا نہ عدم میں بھی نشاں اُس کے دہاں کا
از بس کہ تعب کھینچے ہے، اب دل کو ہمارے — نے آہ کی طاقت ہے، نہ زہرہ ہے فغاں کا
سو بت کدے اور دَیر ہوئے خاک برابر — پر دل سے ہمارے نہ مٹا نقش بتاں کا
پیراہنِ شبنم سے، بدن کو ترے، اے گل — گر دیکھتے تو رابطہ ہے ماہ و کتاں کا
تعریف بیاں کرتے ہو، تم حُسن کی اپنے — واللہ کہ کشتہ ہوں، میں اس حسنِ بیاں کا
جوں ریگِ رواں رہتے ہیں، دن رات سفر میں — کیا جانیے، ہے اپنے تیئں قصد کہاں کا
رسوائی عشق اپنی بہت دور گئی[2] ہے — اندیشہ ہمیں کچھ نہیں اب سوُد و زیاں کا
کیا جانیے ہے منتظر آنے کی وہ کس کے — نرگس میں ہے نقشا مری چشمِ نگراں کا
یہ خون میں کس کشتے کے، سرڈوب[3] ہوئی ہے — کیا رنگ چمکتا ہے تری نوکِ سناں کا

اے مصحفی، جاتے ہیں تہی، دیکھیے کیا ہو
کچھ کام ہوا ہم سے نہ یاں کا نہ وہاں کا

95

جب کوہ و بیاباں میں، جا ہم نے قدم مارا — فرہاد نہ کچھ بولا، مجنوں نے نہ دم مارا
تنہا نہ دل اپنا ہی، میں زیر و زبر دیکھا — اُس جنبشِ مژگاں نے عالم کو بہم مارا

---

[1] بغلی = بفتح دوم، بغل میں رکھنے کے لائق [2] ن م: دور کھنچی [3] سرڈوب = غرق

باتوں پہ کوئی اُس کی، بھولے سو دوانہ ہو — کتنوں کو یوہیں اس نے کھا جھوٹی قسم مارا
وہ نوچہ[1] کشتی گیر اترا جو ہیں میداں میں — تیاری[2] کو دیکھ اس کی، رستم نے نہ دم مارا
اُن کی، جو زمیں پر تھے محسود زمانے کے — آخر کو فلک تو نے کر جور و ستم مارا
تھا صید افگن میرا، از بس کہ ستم پیشہ — کعبے گیا تو واں بھی سو صیدِ حرم مارا
میں تیرے تغافل کا کشتہ ہوں، کہ عاشق کو — معشوق کی آنکھوں نے، اس لطف سے کم مارا

اے مصحفی جو میرے، اشعار بیاضی[3] تھے
میں صاد کیا اُن پر اور سب کو قلم[4] مارا

96

دشنام سوسنیں لبِ خوباں[5] سے، کیا کیا — گر ہم ذلیل ہو گئے طفلاں سے، کیا کیا
لشکر کشی پر اپنی تو منعم نہ بھولیو — اک مور نے، سنا کہ سلیماں سے کیا کیا
دیر و حرم تک آ تو، کہ معلوم ہو تجھے — الفت نے تیری گبر و مسلماں سے کیا کیا
جو ہاتھ اُس کے گوشۂ داماں سے دور تھا — اُس ہاتھ نے، ہمارے گریباں سے کیا کیا
یہ خوں، سنجافِ سرخ سے کچھ کم نہ تھا میاں — کیوں دھویا میرے خون کو داماں سے کیا کیا
جو قیدی اس کی تیغ سے محروم ہی رہے — ان قیدیوں نے چھوٹ کے زنداں سے کیا کیا
گاہے سلام تو مرا کہہ دے[6] تھا، یار سے — افسوس کیوں بگاڑی میں درباں سے کیا کیا

اے مصحفی نہ کُوھ کہ جگر میرا چھن گیا
ہم نے کسی کے ناوکِ مژگاں سے کیا کیا

97

گر اور بھی مری تربت پہ یار ٹھہرے گا — تو زیرِ خاک نہ یہ بے قرار ٹھہرے گا

---

[1] نوچہ = نوسیکھ پٹھا۔ شاگرد [2] پہلوانی کی اصلاح، مراد جسم کی فربہی [3] بیاضی = صاف کیے ہوئے، (مسودے کی صاف نقل) [4] فارسی محاورہ قلم زدن کا ترجمہ [5] ن۴: لب جاناں [6] ن۴: کہتا تھا

نہ بولو کوئی مرے جھگڑے میں، میں سمجھ لوں گا مرے اور اس کے جو دارومدار ٹھہرے گا
اگر یہ ہے ترے دامن کی حشر و نشر میاں زمیں پہ خاک ہمارا غُبار ٹھہرے گا
چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ، نسیم کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا
یہی ہے دل کا دھڑکنا مرے اگر تہِ خاک تو کیا مزار پہ سنگِ مزار ٹھہرے گا
نگاہِ لطف سے تیرے ہمیں توقع ہے کبھی تو وعدۂ بوس و کنار ٹھہرے گا
تمھارے ناوکِ مژگاں کے سامنے خوباں کہاں تلک یہ دلِ داغ دار ٹھہرے گا
یہی ہے لوٹ تُو شانے کے ہاتھ سے پیارے نہ ایک بھی تری زلفوں کا تار ٹھہرے گا
تمھارے وعدوں پہ ہم کو تو اب نہیں ٹھہراؤ مگر نیا کوئی امیدوار ٹھہرے گا
جو سیر کرنی ہے کر لے، کہ جب خزاں آئی نہ گل رہے گا چمن میں، نہ خار ٹھہرے گا
خدنگ خوردہ، دل آگے سے اُس کے جاتا ہے خبر نہیں کہ کہاں یہ شکار ٹھہرے گا
شتاب آئیو ٹھہرا رکھیں گے ہم اس کو جو جاں لبوں پہ شبِ انتظار ٹھہرے گا
اسے نہ دفن کرو، سمجھو تو کوئی، یارو
زمیں میں مصحفی بے قرار ٹھہرے گا؟

98

جو رنگ بدلے ٹک اس چرخِ آب نوسی کا یہ رنگ کیوں ہو مرے اشکِ سندروسی کا
رچے ہی رہتے ہیں مہندی سے دست و پا شب و روز زبس کہ اس کے تئیں شوق ہے عروسی کا
ملاحت ایک تو ترے حُسن کی قیامت ہے کرے ہے تس پہ ستم، رنگ شالِ طوسی[1] کا
میں وہ نہیں ہوں کہ سر بر ہو مجھ سے خصمِ رکیک کہ خامہ ہاتھ میں میرے، عصا ہے موسیٰ کا
نہ پہنچے مصحفی ہم اس کے در تلک گاہے
نت اشتیاق رہا آستانہ بوسی کا

---

1. نسبتِ مکانی شہر طوس کی طرف

99

نہیں زلفوں کی تری بے سروپائی کا گلا ہے ہمیں اپنے نصیبوں کی رسائی کا گلا

اُس سے، جس کے تئیں مانندِ حنا مل ڈالا نہ سنا ہم نے ترے دستِ حنائی کا گلا

دور کھینچے ہے زبس، اپنے تئیں مجھ سے وہ شوخ وصل میں بھی مجھے رہتا ہے جدائی کا گلا

دشتِ پُرخارِ محبت سے اگر ہو وے گذار مردِ عاشق کو نہیں برہنہ پائی کا گلا

مصحفی کیا ہوئے ہو جان کے اپنے دشمن
کرتے پھرتے ہو جو تم ساری خدائی کا گلا

100

کتنوں کو تو نے شوخ کماں کش الٹ دیا جس وقت اپنے تیروں کا ترکش الٹ دیا

خورشید ہوگیا، خجل اپنے عذار سے پردہ، جو تو نے اے بتِ مہ وش الٹ دیا

واقسمتا کہ سر پہ مرے آفتاب نے ہوتے ہی صبح طشتِ پُر آتش الٹ دیا

حسرت یہ ہے کہ ضد سے مری، کل زمین پر ساقی نے شیشۂ مئے بے غش[1] الٹ دیا

اے مصحفی تو کیوں کے بچے اُس نگاہ سے
جس نے کہ رستموں کو بہ ابرش[2] الٹ دیا

101

فسانہ اک طرف شبہائے ہجراں کی درازی کا قیامت ماجرا نالوں کی ہے ہنگامہ سازی کا

نہ مہر و لطف، نے گاہے نگہ، اور نے کبھی ملنا بیاں کیا کیجیے اللہ تیری بے نیازی کا

وہ روزِ عید جب چھب[3] کو بنا، مسجد میں آتا ہے ڈھلا[4] جاتا ہے اس کی ہی طرف دل ہر نمازی کا

---

[1] بے غش = صاف [2] ایک گھوڑا جس کے جسم پر چتیاں ہوں = چتلا، چتکبرا

[3] ن۲،۳،۴ = سج کو بنا [4] ڈھلنا بہ ضمِ اول = مائل ہونا

بھری مجلس میں روتی شمع کیوں، میری طرح اُس کو — جو ہوتا حوصلہ بے طاقتی اور جاں گدازی کا
نہ پہنچا دے خدا سنگیں[1] دلوں تک شیشۂ دل کو — کہ چرچا سخت ہے عالم میں اب بے امتیازی کا
زبس ہر لحظہ اشکِ تازہ، آ مژگاں پہ ناچے ہے — مری آنکھوں میں عالم جلوہ گر ہے شیشہ بازی کا
نہ چھوڑ اے مصحفی تو آستانِ حضرتِ دل کو
سب اس سرکار سے پاتے ہیں خلعت سرفرازی کا

102

ٹک دیکھتا تو جا، ترا بسمل کدھر چلا — کر ذبح اس کو، ہائے تو قاتل کدھر چلا
شرطِ وفا یہی تھی بھلا کوے یار میں — تنہا تو مجھ کو چھوڑ کے اے دل، کدھر چلا
مانندِ گرد باد، ہے کچھ روٗ بہ آسماں — آوارگانِ شوق کا محمل کدھر چلا
آنکھوں سے بحرِ اشک کو ہونے دے موج زن — ہم تجھ سے تب کہیں گے کہ ساحل کدھر چلا
دل تک پہنچ کے، تو نے کیا سوے کعبہ روٗ
اے مصحفی تو چھوڑ کے منزل کدھر چلا

103

کس سے سیکھا ہے، میاں تم نے مٹک کر چلنا — آتشِ خفتہ پہ، دامن کو جھٹک کر چلنا
شاخِ گل صدقے ہے، اس تیرے قدِ نازک کے — اُس نے پایا ہے کہاں ایسا لچک کر چلنا
اس کی رفتار کے بل سمجھے کوئی کیا طاقت — برق بھی سیکھ گئی جس سے چمک کر چلنا
فتنۂ تازہ، زمانے میں ہوا ہے پیدا — اُس کے آگے سے تو اے فتنے[2] دبک کر چلنا
مصحفی چاہے ہے گر حسنِ تجلّی دیکھے
اک ذرا اس کی گلی سے تو ٹھٹک کر چلنا

---

[1] ن۴ = سنگیں دلاں [2] فتنہ = مرادفتنۂ قیامت

104

کس رات میں اس فکر سے، تا صبح نہ جاگا　　کب شوخ تصوّر ترا آگے سے نہ بھاگا
کیا ڈھونڈے ہے اسبابِ رفو، زخمِ جگر کا　　یاں سوزنِ عیسیٰ کو میسّر نہیں تاگا
رکھ آیا ہے اک نانڈ کا جیسے کہ کنارا　　تم دیکھیو زاہد کی ذرا پگڑی کا آگا
کس شب میں نہ کی، فکرِ خوش اندازِ سخن میں　　کس روز نشانے پہ مرا تیر نہ لاگا
گر تارِ محبت نہ دوتا ہو کے بٹا جائے　　ہے بیم گسستن اسے، کچّا ہے وہ دھاگا

گہ فارسی کہتا ہوں گہے مصحفی ہندی
یعنی کہ مری طبع کا گھوڑا ہے دو باگا

105

کل دیکھ کے مجھ کو جو سر رہ سے وہ بھاگا　　میں کوچہ بدل، دوڑ کے اُس کا لیا آگا
خوابیدہ رہا خون مرا، کوے بتاں میں　　سو فتنے اُٹھے خاک سے، پر ایک نہ جاگا
کچھ ٹوٹے پھٹے سینے کو، ساتھ اپنے سفر میں　　کیا وہ بھی مسافر جو نہ رکھے سوئی تاگا[1]
ایک طرفہ بلا تھی شبِ ہجراں کی سیاہی　　جو دیوِ سپید اُس کے تئیں دیکھ کے بھاگا

کل مصحفی نے دیکھا جو وہ جوہری بچہ
رکھ ہاتھ میں فیروزۂ دل بیچنے لاگا

106

آ کے جب پاس مرے وہ گلِ تر بیٹھ گیا　　جوش کھا کھا کے مرا خونِ جگر بیٹھ گیا
تھا کھڑا بام پہ شب، مجھ کو جو دیکھا اس نے　　منھ چھپا شرم سے، وہ رشکِ قمر بیٹھ گیا

---

[1] مصحفی نے گفتگوے عام کا لحاظ رکھتے ہوئے یہاں سوئی کے ساتھ تاگا استعمال کیا ہے اور یہی فصیح ہے مگر شعر ۸۱۶ میں دھاگا نظم کیا ہے وہاں اس کا محل تھا۔ زبان کی انھیں معمولی جزئیات سے تو قدرتِ کلام ظاہر ہوتی ہے۔

اے مصوّر، تجھے ہم لکھ کے دکھا دیویں گے   اپنے دل میں بھی کوئی نقش اگر بیٹھ گیا
اشک آ پہنچے بہت جلد، بڑی خیر ہوئی   شعلہ اُٹھا ہی تھا اس سینے سے، پر بیٹھ گیا
بزم میں اس کی جو شب شمع کو روتے دیکھا   میں بھی اک کونے میں، لے دیدۂ تر بیٹھ گیا
شام اس قاتل خوں خوار نے جوں جھاڑا ہاتھ   رکھ کے خورشید، منھ اپنے پہ سپر، بیٹھ گیا
مصحفی جائے تھا گھر اپنے، ولیکن ناگاہ قطعہ تیرِ مژگاں جو ترا، اُس کے دو سر بیٹھ گیا

اک قدم چل نہ سکا کوچے سے تیرے وہ غریب
دونوں ہاتھوں سے پکڑ اپنی کمر بیٹھ گیا

107

ناتوانی نے کیا اب تو ہمیں بے دست و پا   دست و پا ماریں تھے ہم بھی جب تلک تھے دست و پا
جب سے آئے ہیں نظر یارو، ہمیں وے دست و پا   ہم در و دیوار سے ماریں ہیں دے دے، دست و پا
تیرا اسلوبِ بدن یوں دیکھ کر کہتی ہے خلق: "دیکھیو پائے ہیں اس نے کیا ہی اچھے دست و پا"
گر نہ تھا چورنگ میں تیغِ جفائے چرخ کا   کاٹ کر ٹکڑے کیے کیوں اُس نے میرے دست و پا
حیف ہے تم کو نہیں اپنے تنِ زیبا کی قدر   لوگ پردے میں چھپا رکھتے ہیں ایسے دست و پا

رات سے اے مصحفی کچھ خون ہی روتا ہے تو
سچ تو کہہ، کس کے حنائی تو نے دیکھے دست و پا

108

پس گئے اہلِ زمیں، یوں آسماں کے زیرِ پا   مور چے[1] آ جاویں جوں پیلِ دماں کے زیرِ پا
چونک اُٹھا میں سادہ، اُس کو جان کر پائے نگار   آ گیا تھا سر مرا، شب پاسباں کے زیرِ پا
دیکھیے، اک دم میں یہ سر جاوے یا سالم رہے   اب تو ہم بیٹھے ہیں تیغِ امتحاں کے زیرِ پا

---

[1] چیونٹیاں

شاخِ گل کا جھکنا ہم تجھ کو دکھاویں گے نسیم — آ گیا دامن گر اُس سروِ رواں کے زیرِ پا
کیجیو[1] تربت مری، دیرِ مُغاں کی راہ میں — شاید آ جائے کسی مستِ چماں کے زیرِ پا
ہر قدم پر فرش ہوتی آتی ہے دامن کی طرح — زلف بھی اس کیفیٔ دامن کشاں کے زیرِ پا
کیا مزہ ہو، میں پڑا رہتا ہوں، اور آنکھیں مری — وقتِ شب آ جاویں اس آرامِ جاں کے زیرِ پا
دیکھ کر رنگِ کفِ کو اُس کے، یوں کہتی ہے خلق: — خوں کسی کا آ گیا ہے اس جواں کے زیرِ پا
لذّتِ محمل کشی میں کچھ نہ سوجھا اس کو ہائے — گرچہ تھا صحرا ہی نشتر سارباں کے زیرِ پا
کیا درازی زلف کی کہیئے کہ ہنگامِ خرام — سانپ سی آ جائے ہے، اُس مہ میاں کے زیرِ پا
سرگذشت اپنی کہوں کیا ہائے، اس گلشن کے بیچ — سبزۂ بیگانہ ہوں میں رہ رواں کے زیرِ پا

اب لگا کانٹوں پہ چلنے مصحفی، ہے کل کی بات
آبلہ پھوٹے نہ تھا اس ناتواں کے زیرِ پا

109

رو کے ان آنکھوں نے دریا کر دیا — ابر کو پانی سے پتلا کر دیا
حسن ہے اک فتنہ گر اُس نے وُہیں — جس کو چاہا اُس کو رسوا کر دیا
تم نے کچھ ساقی کی کل دیکھی ادا — مجھ کو ساغر مے کا چھلکا کر دیا
بیٹھے بیٹھے پھر گئیں آنکھیں[2] مری — مجھ کو ان آنکھوں نے یہ کیا کر دیا
اُس نے جب مجھ پر چلائی تیغ ہائے — کیوں میں اپنا ہاتھ اُونچا کر دیا

مصحفی کے دیکھیوں چہرے کا رنگ
عشق نے کیا اس کا نقشا کر دیا

---

[1] یعنی بنائیو [2] آنکھیں پھرنا = غشی طاری ہونا

110

اُس نے جب بندِ قبا وا کردیا خلق کو محوِ تماشا کر دیا
تجھ سے شکوہ ہے، مجھے اے چشمِ تر تو نے رازِ عشق افشا[1] کر دیا
جنبشِ پا نے تری، اے سروِ ناز ایک عالم جا سے بے جا کردیا
حشر کے دن، اک بڑا ہنگامہ تھا آتے ہی کچھ اس نے پرچھا کر دیا[2]
دی ملا[3]، ساقی نے مجھ کو صاف و دُرد اک ذرا ساغر نہ ٹھہرا کر دیا[4]
بے کسی برسے ہے میری خاک پر مرگ نے عالم میں تنہا کر دیا
مصحفی رنگِ کفک نے یار کے
اک جہاں میں فتنہ برپا کردیا

111

جب عارضِ گل رنگ سے، خط اُس نے نکالا بلبل نے کہا: سملہٗ اللہ تعالیٰ
ناداں ہے، جواب دل کو کوئی تجھ سے لگاوے زلفوں کو دکھا تو نے، کسے مار نہ ڈالا
کیا عاشق و معشوق میں ہوتی ہے لڑائی واں خنجر مژگاں ہے تو یاں آہ کا بھالا
روٗ بات کا ہرگز نہیں اُس بزم میں مجھ کو جوں آئینہ اک میں بھی ہوں منھ دیکھنے والا
ہو وے نہ کبھی غسلِ شہیدانِ محبت جب تک کہ نہ اس کوٗ میں بہے خون کا نالا
کرنے کو ترے حسن سے گلشن میں گدائی ہر پھول، لیے ہاتھ میں نکلے ہے پیالا
تدبیر تو سو کرتے ہیں ہم لیک کسی طرح ہوتا نہیں اس دردِ محبت کا امالا
ہر حرف میں ہو جس کے کجی، راست تو یہ ہے مانندِ نگیں . ایسے کا منھ کیجیے کالا
بیتاب ہی رہتا ہوں سدا جوٗں دُرِ غلطاں دیکھا ہے میں، جس دن سے ترے کان کا بالا
جو میری طرح سیر کرے، سو وہی جانے قطعہ اس باغ میں، اب سوجھے ہے مضمون نرالا
ہر غنچہ ہے، دل بستگیٔ طبع کا مکتوب ہر گل ہے پریشانیٔ خاطر کا رسالہ

---

[1] ن۳. رسوا [2] منتشر کردینا [3] ن۳و۴ دی ملی [4] ٹھہرا کر دینا، جس تلچھٹ نیچے بیٹھ جانا

اس چشم کی گردش تو مجھے لے ہی گئی تھی
پر مصحفی میں اپنے تئیں زور سنبھالا

112

ہر اشک، ہے مری چشم پر آب میں، دریا
بہ وقتِ گریہ ہے یاں کس حساب میں دریا

صدف کی طرح لگیں رہنے اب وے پانی میں
جن آنکھوں نے کہ نہ دیکھا تھا خواب میں دریا

گیا ہے شور مرے بحرِ اشک کا واں تک
تبھی تو ہے شب و روز اضطراب میں دریا

ظہورِ حق سے نصیب اپنے جز تپش نہ ہوا
رکھے ہے موج کو نت پیچ و تاب میں دریا

کرے عطش پہ مری گر نگاہ، ساقیٔ بزم
بجائے مے، بھرے ظرفِ شراب میں دریا

نقاب رخ سے جو کھولے تو خلق جاوے ڈوب
رکھا ہے باندھ کے اُس نے نقاب میں دریا

حباب و موج کا کیا حادثہ بیاں کیجیے
کہ آگیا ہے عجب انقلاب میں دریا

ڈرا کرو، مرے طوفانِ اشک سے یارو
نعوذُ باللہ، گر آوے عتاب میں دریا

نظر بہ اصل جو کیجے، تو موج ہے نہ حَباب
چُھپا ہے کسوتِ موج و حباب میں دریا

زمانہ جذب رطوبت نہ کر گیا ایسی
کہ جلوہ گر ہو لباسِ شراب میں دریا

اک اشک پر نہ تصرّف رہا ان آنکھوں کا
چلے تھا جن کے ہمیشہ رکاب میں دریا

تو جاکے بحر پر اے مصحفی نہ رویا کر
کہ تیرے رونے سے، ہے اک عذاب میں دریا

113

گذر ہو کیوں کے وہاں صبح و شام، عاشق کا
ہے مدّعی وہ محلّہ تمام عاشق کا

کچھ آج ہی نہیں عاشق کُشی ہوئی ایجاد
زمانہ تشنۂ خوں ہے مدام عاشق کا

جدا نہیں کسی حالت میں عشق سے عاشق — کہ ساتھ عشق کے ہے التزام عاشق کا
نہ روزِ بد سے گلہ کیجیے کہ دنیا میں — ہمیشہ کوے بلا ہے مقام عاشق کا
کریں ہیں آن کے نت اُس کو نیک و بد مجرا — نہیں قبول سو کیا، اک سلام عاشق کا
صبا نے بھی نہ کہا اُس سے ڈر کے مارے کچھ — گیا بہ باد ہی آخر پیام عاشق کا

ستم گری کا جنھیں مصحفی سلیقہ ہے
وہ اک نگاہ میں کرتے ہیں کام عاشق کا

114

کبھی تو ہنس کے لیا کر، تو نام عاشق کا — زباں ہلائے سے، نکلے ہے کام عاشق کا
جز آہ و نالہ نہیں یاد، آہ کچھ دل کو — یہی وظیفہ ہے اب صبح و شام عاشق کا
غرور و ناز ترا جس جگہ کہ ساقی[1] ہو — سفالِ سگ سے بھی بدتر ہے، جام عاشق کا
جب اس نے مکھڑے سے اپنے اُٹھا دیا پردہ — رہا کہاں سے بھلا ننگ و نام عاشق کا
صبا جو اس کی گلی کی طرف تو جا نکلے — تو ایک ایک سے کہیو سلام عاشق کا
سمجھ کے زلف کو ٹک اپنی کیجیو شانہ — کہ بال بال میں یاں ہے مقام عاشق کا
ہمیشہ چال پر اپنی، پڑے ہے اس کی نگاہ — رقیب ہے وہ بتِ خوش خرام عاشق کا
خدا ہی جانے یہ آئینہ کس کا حیراں ہے — کہ اس سے نکلے ہے نقشہ تمام عاشق کا
تری خرام، تری چال، اور تری رفتار — مَلے ہے تلووں تلے دل مُدام عاشق کا

ہمیشہ مصحفی اُس کا ہی ذکر کرتا ہے
ہے اب تلک وہی سودائے خام عاشق کا

---

[1] ن۳: ساقی

115

تیرے ہاتھوں سے میاں دل مرا بن کر ٹوٹا — حیف صد حیف کہ یہ شیشہ مکرّر ٹوٹا

حال کیا پوچھتے ہو ہم سے تباہی زدوں کا — کشتی طوفانی ہوئی بہہ گئی، لنگر ٹوٹا

کھل پڑا نامہ مرا اس کے پَروں سے یارب — یا ہوا بیچ کوئی بالِ کبوتر ٹوٹا

حیف صد حیف کہ اک پیاسے نے لب تر نہ کیے — بیچ مجلس کے، کشاکش ہی میں ساغر ٹوٹا

جس طرح آہِ شرر بار مری گذرے ہے — اس طرح تو کبھی تارا نہ فلک پر ٹوٹا

وہ جو خود بینی کا ساغر تھا مرے ہاتھوں میں — کیا کہوں میں، کہ بڑے زور سے کافر ٹوٹا

آسماں دیتا رہا مجھ کو ہی ہر روز شکست — نہ سنا میں نے کہ دشمن کا مرے سر ٹوٹا

وہی مجروح تو سمجھے گا الم کو میرے
مصحفی زخم میں جس کے دمِ خنجر ٹوٹا

116

آج کیا جانے مری کون نظر سے گذرا — ناوکِ آہ جو یک بار جگر سے گذرا

پیچ و تابِ کمر و زلف سے گھبرا کے وہ شوخ — اب یہ کہتا ہے: میں اس زلف و کمر سے گذرا[1]

شمع اس چہرۂ پُرنور سے کیا روکش ہو — رتبۂ حسن میں جو شمس و قمر سے گذرا

سینہ سوراخ تو ہے لیک یہ معلوم نہیں — آہ سینے سے کہ یہ تیر سپر سے گذرا

مُند گئیں آنکھیں مری، راہ ہی تکتے تکتے — لیک کافر نہ کبھو ہو کے اِدھر سے گذرا

ہم تو دیوانے ہیں اُس شخص کے، جس نے شبِ ہجر — سر رکھا خشت پہ اور بالشِ سر سے گذرا

ہم بھی اے ابرِ بہاری تجھے دکھلا دیں گے — گر کوئی لختِ جگر دیدۂ تر سے گذرا

مصحفی شمع کے مانند میں اُس بزم میں رات
یاں تلک رویا کہ دریا مرے سر سے گذرا

---

[1] فارسی محاورہ کا ترجمہ۔ یعنی باز آیا

117

اس راہ سے جو ہوکر، کل تو ذرا نہ گذرا — کیا کیا ہمارے جی میں، اے بے وفا نہ گذرا

کشتوں کے تیرے، جس جا کچھ استخواں پڑے تھے — اُڑتا ہُوا ہُوا میں واں سے ہُما نہ گذرا

شب کون سی وہ میں نے باتوں میں سب نہ کاٹی — دن کون سا وہ مجھ پر بے ہُو و ہا نہ گذرا

قاصد کا مُنھ تو دیکھو، رکھے وہاں قدم کو — جس کی گلی میں اب تک پائے صبا نہ گذرا

اے مصحفی وہ شب تو تنہا ملا تھا تجھ سے
کم بخت تو ہی چوکا، جو جی چلا[1] نہ گذرا

118

کیا دخل ہے جا کر ہمیں اُس کوُ میں بھٹکنا — رونا وہی راتوں کو، وہی سر کو پٹکنا

تم جتنا چھڑاؤ میں نہ چھوڑوں گا، مری جان — ہاتھوں سے مرے، فائدہ دامن کو جھٹکنا

اے برقِ جہاں سوز ٹک اک دم تو لیا کر — یہ کس نے سکھایا ہے تجھے اتنا مٹکنا

ہیں ایک تو آفت ترے رخسارِ دلآویز — پھر تس پہ قیامت ہے یہ زلفوں کا لٹکنا

جب دیکھوں ہوں گلبن کو، تو آتا ہے مجھے یاد — ہر شاخِ دل آویز سے بلبل کا لٹکنا

وقتے کہ پتا یار کا ملتا نہیں، اے دِل — پھر فائدہ کیا رکھتا ہے گلیوں میں بھٹکنا

اے مصحفی کر شکر کہ تو جی سے بچا ہے
دیوانے کہیں ایسی جگہ پھر نہ اٹکنا

119

کی آہ ہم نے لیکن اُس نے اِدھر نہ دیکھا — اس آہ میں تو ہم نے کچھ بھی اثر نہ دیکھا

کیا کیا بہاریں آئیں، کیا کیا درخت پھولے، — نخلِ دعا کو لیکن میں باروَر نہ دیکھا

---

[1] یعنی جی نہ چلا گذرا۔ شوخی نہ کر بیٹھا

ہرگز ہوا نہ یارو، وہ شوخ یار اپنا زیں پیش ورنہ ہم نے کیا کیا کہ کر نہ دیکھا
رہتے ہیں کیا بھلا واں آفت زدے ہی سارے اُس کوچے میں کسی کا آباد گھر نہ دیکھا
پہنچا گلی تک اُس کی، جب تک تو تھا نظر میں آگے قدم کے رکھتے، پھر نامہ بر نہ دیکھا
دو دو پہر تک اُس کے آگے کھڑا رہا میں پر اُس نے ضد کے مارے بھر کر نظر نہ دیکھا
کیا فائدہ رکھے ہے، بس اب زیادہ مت رو رونا ترا کسی نے، اے چشمِ تر نہ دیکھا
کل یار کی گلی میں ڈھونڈا جو مصحفی کو
اک لاش تو پڑی تھی پر اُس کا سر نہ دیکھا

120

اب اوروں سے کی گرم صحبت، بھلا بھلا بے وفا، بے مروّت، بھلا
کبھی یار بھی ہم[1] سے سمجھیں گے خوب کرو جتنی چاہو عداوت، بھلا
جو برداشت تیری جفا کی کریں کہاں ہم میں وہ تاب و طاقت، بھلا
سنا، بس کہیں چپ رہو شیخ جی کہو گے سو کیجیے گا حضرت[2]، بھلا
اب اس زیست سے مر ہی جانا ہے خوب کوئی کھینچے کب تک اذیّت، بھلا
کہوں میں تو سو بات، پر اب مجھے کہاں بات کہنے کی فرصت، بھلا
ترے غم سے ہے نزع میں مصحفی
ٹک اک دیکھ جا اس کی صورت، بھلا

121

دیر تک اپنے شہیدوں پہ نظر کرنا تھا سرسری تم کو نہ مقتل سے گذر کرنا تھا
گر لبِ جام کے شایستہ نہ تھا، اے قاتل لبِ خنجر تو مرے خون سے تر کرنا تھا

---

[1] ہم سے۔یعنی ہم جیسے [2] یعنی جو تمھارا قول ہے وہی فعل بھی یا نہیں؟

کیوں خبر یار کے آنے کی میں کی یاروں کو — کیا کیا ہائے کسی کو نہ خبر کرنا تھا
بچ رہا شب مرے قابو سے وہ، میں ہی چوکا — دونوں ہاتھوں کو مجھے طوقِ کمر کرنا تھا
لے گیا دل کو مرے یار ہنر سے جس وقت — ہائے کچھ مجھ کو بھی اس وقت ہنر کرنا تھا
جوں صبا ہر طرف آوارہ پڑا پھرتا ہوں — میری قسمت میں مگر خاک بہ سر کرنا تھا

تیغِ قاتل کو میں کیوں ہاتھ پہ روکا افسوس
مصحفی میرے تئیں سینہ سپر کرنا تھا

122

اک برق کا سا جھمکا، اُس مہ لقا سے دیکھا — میں کیا کہوں کہ اُس کو، کل کس ادا سے دیکھا
کاہے کو اس قدر تھے سفاک، ہاتھ سادے — عالم کا خون ہوتا، رنگِ حنا سے دیکھا
یوں تو رہا ہمیشہ وہ میرے روبرو ہی — پر روئے دل نہ ہرگز اس بے وفا سے دیکھا
یا داغ یا کہ مرہم، یا سوز یا کہ ماتم — جو کچھ کہ ہم نے دیکھا اُس مہ لقا سے دیکھا
یہ جانتے نہیں ہم، اس میں بدن ہے کیا ہے — شعلہ سا اک جھمکتا زیرِ قبا سے دیکھا
کب ہم سے راستی پر، آیا یہ چرخِ کج رو — ہم نے تو نت ستم ہی اس فتنہ زا سے دیکھا
ہم گبر و ہم مسلماں، ہم جمع، ہم پریشاں — ایک سلسلہ بندھا اُس زلف دوتا سے دیکھا
تاروں کی آنکھیں اُس سے کیوں کر لڑیں، الہیٰ — سوئے فلک نہ ہرگز جس نے حیا سے دیکھا

اے مصحفی ہمیں تو کچھ درد ہی میں ہے چین
یعنی ضرر ہی ہم نے اکثر دوا سے دیکھا

123

کل اُس کو باتیں کرتے، اک آشنا سے دیکھا — پر وہ بھی دیکھتا تھا، ہم نے دغا سے دیکھا
غرفے سے کل میں اپنی آنکھیں ملا دیاں تھیں — اُس نے بھی کیا کہوں میں کس کس ادا سے دیکھا

فردوس میں بھی شاید اپنے نصیب ہووے　　جو لطف اس چمن کی آب و ہوا سے دیکھا

صحبت رہی یہ اس سے، اپنی کہ مل گئے جب　　اس نے جھکا دیں آنکھیں، میں نے حیا سے دیکھا

پاکیزگی کا عالم اُس کی، میں کیا بتاؤں　　کانوں اُس کے موتی کل جس صفا سے دیکھا

غیرت پہ باغباں کی پتھر پڑیں کہ ہم نے　　سو بار گل کہ ہنستے بادِ صبا سے دیکھا

اے مصحفی بتوں میں ہوتی ہے یہ کرامت

دل پھر گیا نہ تیرا آخر خدا سے دیکھا

124

پانو بے طرح پھر اُس شوخ پسر کا نکلا　　شام گھر آنے لگا، اب وہ سحر کا نکلا

کر گئی سنتے ہی جان اپنی تو دنیا سے سفر　　منھ سے اُس بُت کے، جو ہیں نام سفر کا نکلا

گرچہ محتاج تو غازے کا نہ تھا، پر جو مَلا　　اور ہی حسن کچھ اُس رشکِ قمر کا نکلا

خار خار اپنے تئیں عشق کا ہے ویسا ہی　　مر گئے تو بھی تو کانٹا نہ جگر کا نکلا

دید بازی سے مری کچھ اسے نقصاں نہ ہوا　　دن بدن اور ہی رنگ اُس گلِ تر کا نکلا

نیشکر اس لبِ شیریں سے ہو کیوں کر روکش　　جس کے آگے نہ کبھی نرخ شکر کا نکلا[1]

گرچہ بلدار ہی پٹکوں سے رہی نت بندھتی　　تو بھی زنہار نہ بَل اُس کی کمر کا نکلا

آتشِ غم میں دل و جان و جگر سب ہی جلا　　کچھ بھی اسباب غرض ہم سے نہ گھر کا نکلا

لال ڈوروں کو تری آنکھوں کے دکھلا دیں گے　　اب کے ناخن میں اگر تار جگر کا نکلا

مصحفی شام گھر آیا تو اچنبھا کیا ہے

اب بھی کیا آ نہ پھرے، آٹھ پہر کا نکلا

---

[1] نرخ نکلنا= مہنگا ہونا

125

عاشق ہوں، مجھ کو ڈر نہیں روزِ وفات کا
اور بیش و کم جو ہے بھی، تو ہجراں کی رات کا

اللہ رے تیرے سلسلۂ زلف کی کشش
جاتا ہے جی اُدھر ہی کھنچا کائنات کا

بوسہ جو میں نے مانگا تو کہنے لگا کہ واہ
جاؤ جی آشنا نہیں میں ایسی بات کا

یک لختِ دل ہماری بھی جانب سے اے صبا
آخر تو لے چلی ہے تو خط پات پات کا

نامحرموں کے آگے، نہ آیا کرو میاں
پاجامہ اس پھبن سے پہن محرمات کا

سو رخنے ہو ہے پردۂ ناموس مصحفی
جب مجھ کو یاد آئے ہے چاک اُس قنات کا

126

مجھ کو زلفوں سے تری پیار وہی ہے جو تھا
اب تلک تو یہ گرفتار وہی ہے جو تھا

دن بدن رنگ کو میں اپنے ہی پاتا ہوں تغیر
ورنہ اُس کا گلِ رخسار، وہی ہے جو تھا

تنگ چشمی سے تری کیوں کے نہ فریاد کروں
اب تلک رخنۂ دیوار وہی ہے، جو تھا

آج کیا بھول گئے مجھ کو، ادھر تو دیکھو
جان میری، یہ گنہ گار وہی ہے جو تھا

اور تو پہنے بھی کچھ کھا کے غذائیں کم و بیش
پر تری چشم کا بیمار وہی ہے جو تھا

ہاں کسی اور کو رو' اُس نے دیا ہووے گا
ہم سے تو وعدۂ دیدار وہی ہے جو تھا

اس میں تو کچھ بھی ترے ہجر میں باقی نہ رہا
دیکھ تو تو' یہ دلِ زار وہی ہے جو تھا

اب تو کچھ مجھ کو یہ پھیکا سا نظر آتا ہے[1]
مصحفی دیکھ تو تو' یار وہی ہے جو تھا

---

[1] ن ا: پھیکا سا مجھ کو یہ

127

صورت کو تیری دیکھ کے مانی نے رو دیا — یاں تک کہ خوں میں اپنا مرقع ڈبو دیا

ہرگز رہے نہ ہم تو کسی کام کے دریغ — سب کام سے ہمیں تری الفت نے کھو دیا

کیا دشمنی تھی مجھ سے، کہ یوں روزگار نے — میرے ہی نام کو تری خاطر سے دھو دیا

اس اشکِ خوں سے مجھ کو یہی بحث ہے، کہ ہائے — سلکِ گہر میں لعل کو لے کیوں پرو دیا

اودھر گیا تو غسل کو حمام کی طرف — یاں اشکِ گرم نے مرے دریا سمو دیا

اُگنے کی کچھ خبر نہیں، پر دشت دشت میں — میں دانہ ہائے اشک سے اک کھیت بو دیا

گالی تلک بھی اُس سے نہ مُنھ پھیر مصحفی
ہے مفت وہ، کریم نے سائل کو جو دیا

128

معالج ہو سکے اب کیا، کوئی غمخوار رونے کا — کہ ان آنکھوں کو اک مدّت سے ہے آزار، رونے کا

میں آنسو پونچھتا ہوں اس کی مجلس میں بہت اپنے — ولے چھپتا ہے کوئی دیدہ و رخسار رونے کا

نصیحت کام کیا آتی ہے مردم کی، خدا حافظ — مزہ تم کو پڑا اے دیدۂ خوں بار رونے کا

مجھے روتا سنا لیکن نہ اتنا بھی کہا اس نے — کہ ہے یہ شور سا کیسا پسِ دیوار رونے کا

خدا جانے کہ رشتہ بند ہے کس موجِ دریا سے — جو ان آنکھوں میں اب تک بندھ رہا ہے تار رونے کا

سرشک آنکھوں سے ہیں بہتے، پہ تو بھی ان کے ساتھ اے دل — چلا چاہے تو چل، ہے قافلہ تیار رونے کا

ہنسی آتی ہے تیری بات پر اے مصحفی مجھ کو
نہ کر تو ذکر میرے روبرو ہر بار رونے کا

129

ازل کے روز سے سررشتہ گم تھا، زار رونے کا — ان آنکھوں ہی نے آخر کو نکالا تار رونے کا

خدا جانے یہ آنسو کیوں بہے جاتے ہیں آنکھوں سے — نہیں معلوم ہوتا کچھ ہمیں اسرار[1] رونے کا

مرے نالے کو سن کر کوئی صاحب دل ہی رووے گا — بنایا سنگ دل جس کو، نہیں زنہار رونے کا

میں سو سو بار دن میں ہم نشیں، کاہے کو پھر روؤں — نکل جاوے بخار اس دل سے گر اک بار رونے کا

بھلا اے دوستاں، منھ بند کر وہ کس طرح رووے — طفولیت سے خوگر ہو، جو داڑھیں مار رونے کا

گہے اشک اور گاہے خونِ دل آنکھوں سے ٹپکے ہے — نہایت گرم ہے کچھ ان دنوں بازار رونے کا

کسی دن مصحفی گذرے ہے، جو کچھ تجھ پہ، کہہ اُس سے
بھلا کیا فائدہ پیشِ در و دیوار رونے کا

130

تری کو سے مر کر یہ بے جان نکلا — بھلا تیرے جی کا تو ارمان نکلا

میں اس آن کے کیوں نہ ہو جاؤں صدقے — کہ ٹک یاد کرتے ہی، تو آن نکلا

کھماچی بجانی، گئے بھول مطرب — وہ زاہد پسر جب بھویں تان نکلا

زمینِ چمن کس کا مدفن ہے یا رب — جو گل چاک کرکے گریباں نکلا

وہ کافر جب آیا ٹک اک امتحاں پر — نہ مسجد سے کوئی مسلمان نکلا

جسے رات پکڑا تھا عاشق سمجھ کر — بڑی خیر گذری، وہ دربان نکلا

غرض صلح کے وقت، سینے سے میرے — دلِ خوں چکاں تھا جو پیکان نکلا

یہ مشتِ غبار اپنا، آخر کو ہیہات — تری کو سے ہوکر پریشان نکلا

میں سمجھا تھا کوئی قطرہ ہووے گا ان میں — جو دیکھا تو آنکھوں سے طوفان نکلا

جہاں شیخ جی روز سجدہ کریں تھے — وہاں شیخ سدو کا اک تھان نکلا[2]

---

[1] سر کی جمع، مگر اردو میں واحد بھی استعمال ہوتا ہے [2] اس تلمیح کی تفصیل کے لیے رک: محمود احمد عباسی: تاریخ امروہہ جلد اول (طبع ۱۹۳۰ء) صفحات ۱۳۳ و بعد

ہوئے مصحفی خون کتنوں کے دم میں
وہ جب اپنے گھر سے چبا پان نکلا

131

اس دل میں تیرے ملنے کا ارمان رہ گیا — یہ دل تڑپ تڑپ کے مری جان رہ گیا
سمجھے وہ مرغِ خستہ مرے اضطراب کو — سینے میں جس کے ٹوٹ کے پیکان رہ گیا
تھا نزع میں، کہ ذبح کیا مجھ کو یار نے — گردن پہ میری اس کا یہ احسان رہ گیا
دیکھا ہزار بار تجھے ہم نے ہر کہیں — اے جانِ من، تو اب تلک انجان رہ گیا
پھر بھی ہمیشہ اُس کو وہی آرزو رہی — پیارے جو ایک شب ترے مہمان رہ گیا
مل قافلے میں صاحبِ حشمت چلے گئے — ہم سا ہوا جو بے سرو سامان رہ گیا
آیا جو اس جہاں میں سو برباد ہی گیا — نے جامِ جم نہ تختِ سلیمان رہ گیا
نازاں تھا اپنے حسن و صفائی پہ آئینہ — صورت کو تیری دیکھ کے حیران رہ گیا
آیا بکارِ بخیۂ زخم، اپنے ہاتھ سے — ثابت جو کوئی تارِ گریبان رہ گیا
دنیا سے ہم چلے گئے ناچار مصحفی
اک یادگار اپنا یہ دیوان رہ گیا

132

کل میں جو راہ میں اُسے پہچان، رہ گیا — کچھ وہ بھی مجھ کو دیکھ کے حیران رہ گیا
شہرِ عدم کو قافلے لاکھوں گئے ولے — چل چل کے نت میں بے سروسامان، رہ گیا
شوخی تو دیکھ تیر کو سینے سے کھینچ کر — کہتا ہے: میرے تیر کا پیکان رہ گیا
دیکھ اس کی تنگ پوشی کو، خجلت سے باغ میں — ہر ایک غنچہ، سر بگریبان رہ گیا

مارے خوشی کے کود پڑا میں تو مصحفی
شب پاس میرے اُس کا جو زوالمیان[1] رہ گیا

133

جس کشتے کا زخموں میں، ہو چور، بدن سارا
خوں میں نہ بھرے کیوں کر پھر اس کا کفن سارا

یوں اُس کی صفِ مژگاں، بھالے ہی دکھاتی ہیں
چڑھ آیا ہے عاشق پر، گویا کہ دکن[2] سارا

زلفِ ہمہ مشک اُس کی خوشبوئی میں کیا کم ہے
جس زلف کے حلقوں میں بستا ہے ختن سارا

گر شمع کے رونے میں، ہے ایسی ہی رنگینی
بھر جائے گا لوہو سے تا صبح لگن سارا

اُس گل کا پتا واں بھی، ہرگز نہ ملا مجھ کو
جوں بادِ صبا ڈھونڈا ہر چند چمن سارا

اے مصحفی تو واں سے کیوں روٹھ کے اُٹھ آیا
دیوانے تری خاطر کُڑھتا ہے وطن سارا

134

آ پھی دمِ شمشیر ہے، یاں ہم پہ دم اپنا
کس واسطے کرتا ہے تو تیغا علم اپنا

درگذرے ہم ان باتوں سے، یہ ہم پہ غضب ہے
پاس اپنے ہی تم رہنے دو لطف و کرم اپنا

چوکیں نہ زباں آوری سے، پیچھے زباں کے
کٹ جاوے اگر سر بھی بہ رنگِ قلم اپنا

شوریدگی ہوتی ہے فزوں، جلوے کی مقدار
رخ اب سے دکھایا کرو تم ہم کو کم اپنا

اس شکل سے کعبے کو نہ جا، ورنہ مری جاں
سر پیٹ نکل جاویں گے اہلِ حرم اپنا

جو حرف کہ کرتا ہے جواہر کی رقم ہے
ہم نام رکھیں کیوں نہ جواہر رقم اپنا

سر کاٹ کے یوں چاہے کوئی پھینک دے لیکن
اُس کو سے نہیں بڑھنے کا آگے قدم اپنا

جو ہے سو گرفتار ہے یاں تازہ الم میں
لے جاویں سو کس پاس، کہو تم، الم[3] اپنا

---

[1] بمعنی پٹکا [2] دکن سے فوج مرہٹہ مراد لی ہے

[3] غالب: ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی — وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

نے جینے کی شادی ہے، نہ کچھ مرنے کا غم ہے　　عاشق کو برابر ہے وجود و عدم اپنا

اے مصحفی مدّت سے غمِ عشقِ بتاں میں
مشغول ہیں اتنے کہ نہیں ہم کو غم اپنا

135

شمع پر، پروانہ شب جس وقت جل کر رہ گیا　　دیکھ کر اُس کو میں اپنے ہاتھ مل کر رہ گیا

کیا کہوں برگشتگی اپنے نصیبوں کی میں ہائے　　کل کنار اُس کی کمر سے کچھ اُگل کر رہ گیا

آتشِ سوزاں پہ میں نے رکھ دیا تھا دل کو رات　　جوں سپند آخر کو وہ کوُد اور اُچھل کر رہ گیا

کھینچ کر تلوار جوں میرے وہ آیا سامنے　　میں ستم نادیدہ اُس ساعت دَہل کر رہ گیا

دور سے بوسے کے خاطر، جوں ہی میرے لب ہلے　　دیکھ کر میری طرف، تیوری بدل کر رہ گیا

میں یہ جانا تھا، بہے گا موجِ آبِ اشک ہو　　دل، مرے سینے میں ہی، ہے ہے پگھل کر رہ گیا

کاش میں اس کو نظر آیا نہ ہوتا مصحفی
گھر سے باہر آج وہ کافر نکل کر رہ گیا

136

وائے وہ زخمی، کہ سنبھلا اور سنبھل کر رہ گیا　　مرغِ بسمل کی طرح، دو گام چل کر رہ گیا

کل اُسے میں لے چلا تھا، سیرِ گلشن کی طرف　　کچھ سمجھ کر، ساتھ سے میرے وہ ٹل کر رہ گیا

میں نے چاہا تھا لے آؤں اُس کو ساتھ اپنے، وہ شوخ　　گھر کے دروازے ہی پر، آخر مچل کر رہ گیا

عشق کا شعلہ گیا جو دل کے دامن کو لپٹ　　محوِ آتش ہو کے وہ، ناچار جل کر رہ گیا

جس جگہ ڈوبا تھا کل دریا کے اندر مصحفی
اس جگہ کہتے ہیں پانی سا اُچھل کر رہ گیا

137

قدم اِس دھج سے کچھ پڑتا ہے اُس غارت گرِ جاں کا
کہ دل ہر اک قدم پر لوٹ ہے گبر و مسلماں کا

اس آبِ اشک میں یوں لختِ دل بہتے نظر آئے
کہ جیسے وقتِ شب دریا میں عالم ہو چراغاں کا

وہ تیرے آستانے پر قدم اپنا رکھے، ہے ہے
سر اپنا پیٹ لیتا ہوں یہ رتبہ دیکھ درباں کا

اگر اب کے بہار آئی تو ہم ان جامہ زیبوں کو
دکھاویں گے تماشا دھجیاں کر کے گریباں کا

نوائے بلبلانِ قدس کا میں سننے والا ہوں
خوش آتا ہے مجھے کب زمزمہ مرغِ گلستاں کا

اگر کچھ زلف کا مذکور اُس کے درمیان آیا
فسانہ طول کھینچے گا بہت شب ہائے ہجراں کا

نہ ہم مرہم سے واقف اور نہ ہم پھاہے کو کچھ سمجھیں
ہمارے زخم پر احسان ہے تیرے نمک داں کا

اگر انداز رونے کا یہی ہے، جیسے فوارہ
تو سر کھینچے گا اک دن، ماجرا اس چشمِ گریاں کا

مرا دریائے اشک اس زور سے بہتا ہے ان روزوں
کہ چلتا ہے جلو میں جس کے اکثر شور طوفاں کا

جو یہ دنبالہ داری ہے، تو اک دن سر پہ مردم کے
بَلا لاوے گا پیارے، سرمہ تیری چشمِ فتّاں کا

کیا زندانیوں کو حکمِ قتل، اس واسطے اُس نے
کہ راتوں کو اُسے ناخوش رکھے تھا، شور زنداں کا

جنھوں کی چشمِ دل روشن ہیں، وہ اس کو سمجھتے ہیں
کہ ہر ذرّے میں جلوہ ہے اُسی خورشیدِ تاباں کا

جسے منظور ہو اس لب کا بوسہ کیوں ذقن چومے
کنویں پر بھی کہیں جاتا ہے پیاسا آبِ حیواں کا

غزل اک اس زمیں میں اور بھی اے مصحفی کہہ جا
کہ ہے شور آسماں پر تیری طبعِ برق جولاں کا

138

خدا جانے یہ دل کشتہ ہے کس اندازِ داماں کا
کہ ہے چاکِ کفن کی شکل، چاک اس کے گریباں کا

کوئی یاں مجھ سے پوچھے، حضرتِ مجنوں کی تربت کو
کہ میں آوارہ، اک مدت سے زائر ہوں بیاباں کا

شبِ مہتاب میں کیا کیا سمیں[1] ہم کو دکھاتا ہے
بکھرنا چاند سے مکھڑے پہ اُس زلفِ پریشاں کا

---

[1] ہندی لفظ سے کی جمع، بمعنی مناظر۔

کٹاری مار کے میں اپنے، مر جاؤں گا کیا حاصل
نہ لینا نام میرے روبرو تم اس کی مژگاں کا

شفق میں جس طرح جھمکیں ستارے، جلوہ دیتا ہے
جو سُرخی میں لبوں کو دیکھے عکس اس کے دنداں کا

کہے ہے تو' جو بھائے عشق تجھ کو، رہ بیاباں میں[1]
بیاباں میں لگے ہے دل بھلا کس خانہ ویراں کا

ہمارے دل پہ، یار اب تیر بے پیکاں لگاتا ہے
کہ پُر دشوار ہوتا ہے، نکلنا دل سے پیکاں کا

بہار آئی خدا جانے کہ کیا گذری اسیروں پر
نہیں معلوم کچھ اب کے برس احوال زنداں کا

بھلا اے چشمِ گریاں، تجھ سے ہم[2] یہ چشم رکھتے تھے
ہمارے زخم پر، کیوں تو نے مُنھ کھولا نمک داں کا

تبھی ہم تم پہ گل کھائے پھریں تھے، او میاں لڑکے
سبق تم جن دنوں مکتب میں پڑھتے تھے گلستاں کا

کیا ہے تیغِ بے جوہر کو جوہر دار قاتل نے
خمِ ابرو پہ یہ عالم نظر آتا ہے افشاں کا

بگولے سے ہماری خاک کے ہوتا ہے یہ روشن[3]
مگر کچھ سر پھرا ہے ان دنوں گردونِ گرداں کا

گلے سے لگ گیا میں دوڑ کر اس سروِ مائل کے
کہ اک انداز تھا اس میں مرے سروِ خراماں کا

تبسم سا کرے ہے کچھ لبِ زخمِ جگر میرا
مگر پھر آج اس کا کوئی ڈھیلا ہو گیا ٹانکا

تجھے اے مصحفی کب ہے خبر دردِ محبت کی
نہ لے تو میرے آگے، نام اے بے درد، درماں کا

139

ان آہوں سے، حجاب اس آسماں کا اُٹھ نہیں سکتا
غضب یہ ہے کہ پردہ درمیاں کا اُٹھ نہیں سکتا

ہوا ہوں ناتواں اتنا میں غم میں اُس کی ابرو کے
کہ میرے ہاتھ سے قبضہ کماں کا اُٹھ نہیں سکتا

ہم اس گلشن سے اک دن آشیاں اپنا اُٹھاویں گے
کہ اب ہم سے دماغ اس باغباں کا اُٹھ نہیں سکتا

عجب یہ ہے کہ بعد از مرگ میری، میرے یاروں سے
جنازہ مجھ سے مشتِ استخواں کا اُٹھ نہیں سکتا

وہاں مارے گئے ہیں، ہم کسی کی تیغِ ابرو سے
بروزِ حشر بھی، مارا جہاں کا اُٹھ نہیں سکتا

---

[1] ن ۱: کہے ہے تو جو بھائی عشق مجھ کو نیز ن ۳: تو جونت اے عشق مجھ کو [2] ن ۳: تجھ سے ہم امید

[3] ن ۳: یہ روشن ن ۴: یہ یارب

جسے لغزش ہوے خانے کے در پر، پھر وہ کیا سنبھلے — کہ کہتے ہیں، گرا، اس آستاں کا اُٹھ نہیں سکتا
یہ کس کی تیغ سے سیراب ہو کر ایسے سوئے ہیں — جو سر بالیں سے ان آسودگاں کا اُٹھ نہیں سکتا
نہ باندھ اب آشیاں اپنا، تو شاخِ گل پر اے بلبل — کہ اس سے بوجھ تیرے آشیاں کا اُٹھ نہیں سکتا
حکایت زلف کی تیری، عجب پُر پیچ لکھی ہے — کسی سے ایک حرف اس داستاں کا اُٹھ نہیں سکتا
غرور اور ناز تم جو کچھ کرو ہم کو قبول، اے[1] جان — پہ نکتوڑا تمھارے پاسباں کا اُٹھ نہیں سکتا
نہ اسبابِ تعلق سے دل اپنا باندھ، کہتے ہیں — کہ اُٹھتے وقت اسباب اس جہاں کا اُٹھ نہیں سکتا
ہوا ہوں ناتواں اتنا کہ میرا نام اگر لکھیں — تو پھر صفحے سے نام اس ناتواں کا اُٹھ نہیں سکتا

مزاج اپنا زبس نازک بڑا ہے، مصحفی ہم سے
غرور اور ناز اس رعنا جواں کا اُٹھ نہیں سکتا

140

یہ خیال، اک دن اسی صورت، فزوں ہو جائے گا — رفتہ رفتہ، مجھ کو سوجھے ہے جنوں ہو جائے گا
اس قدر بھی کوچہ گردی مت کر، اے دل باز آ — دیکھ، میں کہتا ہوں تو رسوا کہوں[2] ہو جائے گا
خدمتِ پیرِ مغاں سے مُنھ نہ موڑ، اک جام میں — صاف جوں آئینہ، بیرون و دروں ہو جائے گا
ان حنائی ہاتھوں کو، پردے میں رکھ بہرِ خدا — مفت میں ظالم، کسی کا ورنہ خوں ہو جائے گا
تابشِ خورشید میں تو گھر سے باہر مت نکل — پھول سا رخسارہ تیرا لالہ گوں ہو جائے گا
گردبادِ آہ، آیا گر کبھی چکّر کے بیچ — خیمۂ افلاک دیکھو گے نگوں ہو جائے گا
کب یقیں تھا ہم کو اے پیارے کہ ہنگامِ عتاب — لب کا ہلنا بھی ترے، ہم پر فسوں ہو جائے گا

گو کہ اب پاتے نہیں ہم اُس کا کوچہ مصحفی
شوق اگر یہ ہے تو اک دن رہنموں ہو جائے گا

---

[1] ن ۳: اما [2] کہیں کی عوامی شکل۔ روہیل کھنڈ کی دیہاتی بولی میں آج بھی بولا جاتا ہے۔

141

ساقی شراب لایا، مطرب رباب لایا — مجھ پر تو اک قیامت عہدِ شباب لایا
دل دردِ وغم کی اُس کے آخر نہ تاب لایا — یہ ہر گھڑی کا رونا، اور اک عذاب لایا
کیا دوُر ہے جو پردہ رخ سے ترے اُٹھادے — عرصے میں مہر و مہ کو جو بے نقاب لایا
کہتا نہ تھا میں اے دل مت جا تو، اُس گلی میں — آخر تو مجھ پر آفت خانہ خراب لایا
میں سر کو اپنے، رکھ کر زانو پہ خوب رویا — نامے کا میرے قاصد جس دم جواب لایا
نامے کے میرے پرزے لا ڈالے میرے آگے — نامے کا میرے قاصد اچھا جواب لایا
اے عاشقو، مبارک ہو تم کو عید قرباں — پھر نیچے کو اپنے دے کر وہ آب لایا
دورِ فلک سے ہرگز شاکی نہیں میں اب تک — گردش میں گو کہ مجھ کو جوں آفتاب لایا
آئینہ کیا کہ ہم نے پتھر پہ گر نظر کی — چہرے پر اپنے وہ بھی اک آب و تاب لایا

اے مصحفی تو اب مُنہ کیا دیکھتا ہے، پی بھی
ہو یار آپ ساقی، جامِ شراب لایا

142

جی رات لبوں پہ آ رہا تھا — مرنے میں ہمارے کیا رہا تھا
بارے ترے عہد میں وہ نکلا — خورشید بہت چھپا رہا تھا
کیا جانے کہ دل کا کیا ہوا حال — کوچے میں ترے وہ جا رہا تھا
تھے جن دنوں ہم کسی کے عاشق — سودا ہمیں سالہا رہا تھا
کیا وقت تھا وہ بھی جب کہ ہم تم — مے پیتے تھے، ابر چھا رہا تھا
واں چغد کا آشیانہ ہے اب — اک عمر جہاں ہُما رہا تھا
میں نے شبِ وصل اُسے نہ چھوڑا — ہرچند کہ وہ کھنچا رہا تھا

آنکھوں نے تری بہت چھکایا　اک عمر میں پارسا رہا تھا
میں سینے سے دل نکال ڈالا　یہ مجھ کو بہت ستا رہا تھا
مارا گیا دل گلی میں تیری　اپنا یہی آشنا رہا تھا
میں تاب نہ لا سکا، وہ مجھ سے　آنکھیں تو بہت ملا رہا تھا
شاید ہ شب گذشتہ اس کا قطعہ معشوق اس سے جدا رہا تھا
میں صبح جو مصحفی کو دیکھا
آنکھوں سے ندی بہا رہا تھا

143

آساں نہیں ہے تنہا در اُس کا باز کرنا　لازم ہے پاسباں سے اب ہم کو ساز کرنا
گر ہم مشیر ہوتے اللہ کے، تو کہتے　یعنی، وصال کی شب یا رب دراز کرنا
اس کا سلام مجھ سے اب کیا ہے، گردش رو　طفلی میں مَیں سکھایا جس کو نماز کرنا
ازبس کہ خون دل کا، کھاتا ہے جوش ہر دم　مشکل ہوا ہے ہم کو، اخفائے راز کرنا
بایک نیاز اس سے کیوں کر کوئی بر آوے　آتا ہو سو طرح سے جس کو کہ ناز کرنا
کرتے ہیں چوٹ آخر، یہ آہوانِ بدمست　آنکھوں سے اس کی، اے دل ٹک احتراز کرنا
اے آہ اس کے دل میں، تاثیر ہو تو جانوں　ہے ورنہ کام کتنا پتھر گداز کرنا
ہووے گی صبحِ روشن اک دم میں وصل کی شب　بندِ قبا کو اپنے، ظالم نہ باز کرنا
اے مصحفی ہیں دو چیز اب یادگارِ دوراں
اُس سے تو ناز کرنا، مجھ سے نیاز کرنا[1]

---

[1] قائم: دو چیزیں ہیں یادگارِ دوراں　تیرا ستم اپنی جاں فشانی

144

یہ چہرۂ بل دار نہ دیکھا تھا، سو دیکھا بانکوں میں طرح دار نہ دیکھا تھا سو دیکھا
دل لے کے مرا کر گیا انکار بدیہی اس طرح کا عیاّر نہ دیکھا تھا، سو دیکھا
بن دیکھے ترے، رہنے لگیں خون میں ڈوبی آنکھوں نے یہ آزار نہ دیکھا تھا، سو دیکھا
مت پوچھ حقیقت شبِ ہجراں میں یہ اپنی جو ہم نے کبھی یار نہ دیکھا تھا، سو دیکھا
پامالِ حسد جس نے کیا برگِ گلِ تر اس رنگ کا رخسار نہ دیکھا تھا، سو دیکھا
زخموں سے تری تیغ کے میں، اے مرے قاتل ہر عضو کو گلزار نہ دیکھا تھا، سو دیکھا
جاوے تو صبا کہیو: جدائی میں تمھاری مرغانِ گرفتار، نہ دیکھا تھا، سو دیکھا
اک جنبشِ مژگاں میں تری ہم نے مری جاں جو حادثہ زنہار نہ دیکھا تھا، سو دیکھا

شب مصحفی مارا گیا، جا بزمِ بتاں میں
خوں ریزوں کا دربار نہ دیکھا تھا، سو دیکھا

145

قاصد کبھی ہمارا دلدار تک نہ پہنچا اُلٹا ہی نت پھر آیا، خط یار تک نہ پہنچا
ہم اک طرف، کہ ہے ہے اس نو بہار میں تو اک پر بھی اپنا اُڑ کر، گلزار تک نہ پہنچا
تیرِ مژہ سے اُس کے دل بندھ کے رہ گیا حیف ابروے راست خم کی تلوار تک نہ پہنچا
آنکھوں سے اشک ڈھل کر مژگاں تلک تو آیا مژگاں سے پر ڈھلک کر رخسار تک نہ پہنچا
اس سر میں بھی تو آخر رکھتا تھا شورِ منصور حیراں ہوں میں کہ یہ سر، کیوں دار تک نہ پہنچا
لختِ جگر میں اپنے، کر جمع گل بنایا سو وہ بھی گل، بتاں کی دستار تک نہ پہنچا
طفلِ سرشک میرا یوسف سے کم نہ تھا کچھ پر حیف مصر کے یہ بازار تک نہ پہنچا
چاہا تھا رات میں نے، گھر اس کے کود جاؤں یہ دستِ کوتہ اپنا، دیوار تک نہ پہنچا

دلِ مرغِ ناتواں تھا بعد از رہا ہوئے بھی   اُڑ کر درِ قفس سے دیوار تک نہ پہنچا

روزِ اجل، بہ سختی دی جان مصحفی نے
یٰسین خواں کوئی اس بیمار تک نہ پہنچا

146

کریں گے خواب راحت یا یہی جنجال ہووے گا   خدا جانے کہ بعد از مرگ کیا احوال ہووے گا

اگر اس شمع کے شعلے میں یہ کچھ جگمگاہٹ ہے   تو ہر پروانہ اس کا مرغِ زرّیں بال ہووے گا

قدم اس دھج سے مت رکھا کرو، وقتِ خرامیدن   اگر تم یوں چلو گے، اک جہاں پامال ہووے گا

پس از مردن ہمارا داغِ دل ضائع نہ جاوے گا   کسی لالے کے رُخسارے کا یہ بھی خال ہووے گا

ترے ملنے سے پیارے اور بیتابی ہوئی دونی   غلط سمجھے تھے ہم اس دل کو استقلال ہووے گا

میں جس دم دیکھوں ہوں اپنی طرف، ہنس کر یہ کہتا ہوں   کوئی مجھ سا بھی دنیا میں پریشاں حال ہووے گا

لگا جوں ہی مرے پہلو پر، اک جھنکار سی نکلی   کٹار اُس خونی بے رحم کا اک ڈال ہووے گا

ہماری اشک ریزی کا تماشا دیکھیو اس دم   ہمارے ہاتھ میں جب نامۂ اعمال ہووے گا

غلط ہے مصحفی مجلس میں اس کی شعر پڑھتا تھا
کسی گوشے میں بیٹھا با زبانِ لال[1] ہووے گا

147

ہجراں میں بس کہ مجھ پہ عذابِ الیم تھا   ہر شعلہ آہ کا مری، نارِ جحیم تھا

کرتے تھے گل مزار سے میری شگفتگی   یعنی کبھی ادھر بھی گذارِ نسیم تھا

میں بے کسی پر اپنی جو روتا تھا روزِ ہجر   ہر قطرہ اشک کا مرے درِّ یتیم تھا

---

[1] زبان لال = گنگ

افشائے عشق بعد، خدا جانے کیا بنے جب تک حجاب تھا یہی امید و بیم تھا
کرتا تھا کون شب ترے کوچے میں آہ آہ شعلہ بلند تا سرِ عرشِ عظیم تھا
کس زلفِ مشک فام کی بو تھی جو باغ میں ہر ایک غنچہ نافۂ عنبر شمیم تھا
پردوں میں چشم کے تھی مرے ہیئتِ فلک یاں تک کہ تارِ اشک خطِ مستقیم تھا
چلتی تھی تیغ واں سرِ دشمن پہ مصحفی
اور میرا مارے رشک کے یاں دل دونیم تھا

148

نام مت لے تو گھر کے جانے کا فائدہ کیا مرے کُڑھانے کا
رگِ گل سا چبھے ہے جی میں مرے خارِ بلبل کے آشیانے کا
آئینہ پاس رکھ، جو تیرے تئیں شوق سے انکھڑیاں لڑانے کا
جو ملا، اُس نے بے وفائی کی کچھ بھروسا نہیں زمانے کا
تیرے نازک لبوں سے سیکھا ہے غنچہ، انداز مسکرانے کا
یار کیسا شتاب جاتا ہے کشتہ ہوں ان قدم اُٹھانے کا
تیغ ابرو کو اُس کی رکھ تو عزیز
مصحفی ہے یہ پھل ٹھکانے کا

149

اُٹھائے زخم اتنے کس نے، میرا سا جگر کس کا ہوا یوں معرکے میں عشق کے سینہ سپر کس کا
ادھر تو دیکھ، دیکھے ہے ترے مُنھ کو کھڑا عالم تو مُنھ دیکھے ہے آئینے میں اے رشکِ قمر کس کا
صدائے الفراق آوازِ آبِ جو سے آتی ہے خدا جانے، سحر گلشن سے تھا عزمِ سفر کس کا
سر اپنا پیٹا پھرتا ہوں مدت سے میں گلیوں میں کوئی جو مجھ کو کہتا ہو کہ ہے یہ نوحہ گر کس کا

کسی کی جب نظر ترچھی پڑے ہے، آہ کرتا ہوں　　کھبا ہے دل میرے آہ، اندازِ نظر کس کا
گریبانِ سحر کو چاک دیکھا میں نے، کیا جانے　　گریباں کھل گیا تھا نیند سے اُٹھتے سحر کس کا
خدا کے واسطے کافر کی ٹک رفتار تو دیکھو[1]　　قدم پڑتا ہے وقتِ جلوہ اس انداز پر کس کا
ہلالِ عید میں اک صورتِ آغوش نکلے ہے　　نظر تو کیجیو یارو، یہ ہے طوقِ کمر کس کا
چلا ہے سیکڑوں خط لے کے ظالم، مجھ سے سچ کہیو　　بھلا دے گا تو اُس کو پہلے خط اے نامہ بر کس کا
ہزاروں آرزوے کشتہ میرے دل میں پنہاں تھیں　　خدا جانے یہ خوں تم سے بہا، اے چشمِ تر کس کا
بھلا ہم بھی تو دیکھیں کون وہ دل خواہ ہے تیرا　　کیا کرتا ہے اے دل ذکر تو شام و سحر کس کا
تمھیں میاں مصحفی کیا ہو گیا ہے بیٹھے راتوں کو
یہ قصہ تم کہا کرتے ہو اب دو دو پہر کس کا

150

پانو گر رکھ نہیں سکتا ہے تو در پر، اپنا　　مُنھ تو غرفے سے دکھا دے کبھو چھپ کر اپنا
جب نہ تب اس سے ہی ہم کرنے لگیں ہیں پنجہ　　زور چلتا ہے گریباں ہی پر اکثر اپنا
مفت میں خون مرا ہوگا ترا دامن گیر　　پونچھیوں گوشۂ دامن سے نہ خنجر اپنا
ہم کو کیا کام ہے عالم کے بد و نیک سے یار　　ہیں تو عالم میں پہ ہے عالمِ دیگر اپنا
سُرخیٔ رنگِ حنا یہ ہے تو ان ہاتھوں سے　　خون ہووے گا کسی روز مقرر اپنا
زیورِ حسن ترا، دیکھ کے اے رشکِ بہار　　گل نے برباد دیا، سب زر و زیور اپنا
کوئی اس میکدے میں ہم کو نہیں دیتا مے　　ہر طرف خالی لیے پھرتے ہیں ساغر اپنا
سانس سینے سے کچھ اوپر کو چڑھی آتی ہے　　آن پہنچا ہے مگر وقت برابر اپنا
مصحفی ایک غزل اور بھی لکھ آخر تو
کھولے بیٹھے ہیں سب اس بزم میں دفتر اپنا

---

[1] ن ا: کو دیکھو

151

سینہ جلتا ہے تب عشق سے اکثر اپنا ہاتھ رہتا ہے اسی واسطے دل پر اپنا
وہ جو آتے تھے چلے پیچھے، گری اُن پر برق مُنھ پھرایا جو کل اُس شوخ نے ہنس کر اپنا
جلوہ گر زلفِ سیہ سے نہیں اُس کے دُرِ گوش شبِ تاریک میں چمکے ہے یہ اختر اپنا
خس سمجھ کر بھی کسی نے نہ جلایا اس کو اتنے بھی کام نہ آیا تنِ لاغر اپنا
رسم تا نامہ بری کی نہ رہے عالم میں سب سے پہلے میں کیا ذبح کبوتر اپنا
بت تراشی پہ میں آؤں تو مری صنعت دیکھ تیشہ رکھ دیوے وہیں ہاتھ سے آزر اپنا
آؤ جی آرزوے قتل میں ہم مرتے ہیں کس طرف اُٹھ گئے تم نیمچہ لے کر اپنا
مصحفی نقشِ قدم وار، میں جم بیٹھا ہوں
نہیں اُٹھنے کا اب اس کوچے سے بستر اپنا

ب

152

نوح کا یہ نہیں طوفاں کہ زمیں جاوے ڈوب میں کروں گریہ تو تا عرشِ بریں جاوے ڈوب
رنگِ لعلیں کو ترے لب کے جو دیکھے، تو وہیں عرقِ شرم میں، خجلت سے نگیں جاوے ڈوب
خونِ عشاق کے دریا میں، تو گھوڑے کو نہ ڈال پھر غضب ہے جو ترا دامنِ زیں جاوے ڈوب
عین برسات میں، قاصد اسے بھیجوں ہوں، تو وہ یہ دعا مانگے ہے، رستے میں کہیں جاوے ڈوب
جی میں آتا ہے کہ کر اپنے نوشتے کو یاد روئیے اتنا، کہ سجدے میں جبیں جاوے ڈوب
دیدے تیورا گئے ہیں، اور غش آتا ہے چلا مجھ کو یہ ڈر ہے، مرا جی نہ کہیں جاوے ڈوب
اس غضب سے، تو مجھے ذبح نہ کرنا کہ میاں خوں میں تا قبضہ، ترا خنجر کہیں جاوے ڈوب

تا وہ پر آوے جو وہ حسن، تو جل جاوے چگل[1] لہر پر آوے جو وہ زلف تو چیں جاوے ڈوب

مصحفی چاہِ زنخداں میں گرا ہے تیرے
کھا کے دو غوطے، مزہ ہے جو وہیں جاوے ڈوب

153

شب کیا میں نے، جو اک نالۂ زار آخرِ شب سوتے سوتے اُٹھے ہمسائے پکار، آخرِ شب
یار بن، سیرِ گلستاں سے میں مجروح آیا تیری دل میں لگی، صوتِ ہزار آخرِ شب
وصل کی شب ہے دلا، اتنی نہ بے ہوشی کر ورنہ اس مے کا، تو کھینچے گا خمار آخرِ شب
کم نصیب ایسے سے، کیا وصل کا پوچھو ہو مزہ جس کو مر مر کے ملا، بوس و کنار آخرِ شب
ہم نے مضمون، ترے دزدِ حنا کا باندھا لگ گیا ہاتھ ہمارے، یہ شکار آخرِ شب
اوّلِ شب سے مجھے، نیند نہ آئی جس دن اُس نے مجھ سے کیا، ملنے کا قرار آخرِ شب
آہ وہ آتشِ سوزاں ہے، کہ ہمسایوں کو شبہ میں ڈالے ہے، نت اس کا شرار آخرِ شب
مل گئے خاک میں ہم، صبح کے ہوتے شبِ وصل اُٹھ چلا جھاڑ کے دامن کو جو یار آخرِ شب
جاگتے تھے یہ نصیب[2] اپنے، تو اُس کوچے میں کبھی یاروں کا بھی، ہوتا تھا گذار آخرِ شب
شب ترے کاکلِ مشکیں کی مسیحائی سے کر گئی زندہ ہمیں بادِ بہار آخرِ شب
وے بھی کیا دن تھے، کہ جب آنکھ کھلے تھی اپنی چمنِ وصل کی لوٹیں تھے بہار آخرِ شب
کانپ اُٹھتا ہوں میں جس وقت ترے کوچے میں نالہ کرتا ہے کوئی زار و نزار آخرِ شب

مصحفی دیکھتے تھے ہم بھی سرِ شعلۂ شمع
جب کیا جی کو پتنگے نے نثار آخرِ شب

---

[1] چگل بکسر تین وکاف فارسی، شہریست در ترکستان، حسن خیز۔ در جہانگیری بفتح اول وکسر ثانی۔ (غیاث)

[2] ن ا: جو نصیب

154

مجھ کو صحبت ہے سرِ زلف سے اب آخر شب — ہے یہی جاگنے کا میرے سبب، آخر شب

کھل گئی آنکھ مری سوتے سے جب آخرِ شب — تہِ دنداں نظر آئے مجھے لب، آخرِ شب

اے دل اب تو کہیں شیون کے تئیں کر موقوف — تعزیہ دار بھی سو رہتے ہیں سب، آخرِ شب

یہ وہی جانے اُٹھ اُٹھ کے کبھی جاگا ہو — لذّت اک وصل میں ہوتی ہے عجب آخرِ شب

اوّلِ شب تو بڑی بھیڑ ہے اُس مجلس میں — ہووے تو ہووے کہیں ملنے کا ڈھب آخرِ شب

جیسے اس نالۂ جاں سوز نے سر کھینچا ہے — آگ اس طرح کہیں بھڑکے ہے کب آخرِ شب

شورِ بلبل سے میں شاکی نہیں اس گلشن میں — مجھ پہ نالے مرے لائے ہیں غضب آخرِ شب

درو دیوار سے آواز بگیر آتی ہے — یار کے کوچے میں ہم جاتے ہیں جب آخرِ شب

نہ کھلی مصحفی اس کافرِ بے درد کی آنکھ
میں نے نالے کیے، ہر چند کہ شب آخرِ شب

155

پانو اس دھج سے تو رکھّو نہ زمیں پر، صاحب — پھسلے کیا پڑتے ہو ہر لحظہ ہمیں پر، صاحب

ہے غرض غصّے کی صورت بھی تمھاری پیاری — کیا بھلے لگتے ہو اس چینِ جبیں پر، صاحب

دیکھتے کیا ہو جگر خستگی میری کیجے — اک نظر اپنے بھی لعلِ نمکیں پر، صاحب

گر تمھاری ہے یہی چال، تو تم دیکھو گے — آفت آوے گی کسی خاک نشیں پر، صاحب

کس کا سر کاٹ کے فتراک سے باندھا تھا جو، آج — ہے بہار آپ کے اس دامنِ زیں پر، صاحب

آؤ، مت دیر کرو، آرہی ہے اپنی اب — زندگانی نفسِ باز پسیں پر، صاحب

ہم نہ کہتے تھے میاں مصحفی، دل اس کو نہ دو
تم بلا لائے نہ اس جانِ حزیں پر، صاحب

156

صاد سے چشم، تو ہے زلفِ دوتا دال سے خوب
حق نے یہ چہرہ بنایا ہے خط و خال سے خوب

ابرِ رحمت، میں توقع پہ تری آیا ہوں
دھو سیاہی کو مرے نامۂ اعمال سے خوب

اک ذرا اور بھی اٹھکھیلیاں کرتے چلیے
آپ نظروں میں مری لگتے ہیں اس چال سے خوب

کیسری شال کو سر سے نہ جدا کر اپنے
چمپئ حسن ترا لگتا ہے اس شال سے خوب

میں دل آزردہ، یہی جانِ حزیں رکھتا ہوں
دشمن اور دوست، ہیں واقف مرے احوال سے خوب

تھی گرفتاریٔ ایام، بڑا الجھیڑا
مر کے ہم چھوٹ گئے زیست کے جنجال سے خوب

مصحفی حال پریشاں ہے ترا، وصل نہ چاہ
منھ اُسے اپنا دکھانا،نہیں اس حال سے خوب

157

یہ خستہ تمام ہو چکا اب
بس، اپنا تو کام ہو چکا اب

سب ناظمِ ملک، سو رہے ہائے
دنیا کا نظام ہو چکا اب

روٹھا رہا وہ یوہیں تو اپنا
اے یارو سلام ہو چکا اب

زلفوں میں پھر اُس نے مُنھ چھپایا
بس وعدۂ شام ہو چکا اب

ہم مل گئے خاک میں ہی، ہم سے
ملنے کا پیام ہو چکا اب

چل سو رہیں ٹک، کہ شب ہے آخر
دورِ مے و جام ہو چکا اب

قاصد، اگر اس گلی میں جاوے
کہیو: کہ غلام ہو چکا اب

سیرِ شب ماہ یار تک تھی
لطفِ لبِ بام ہو چکا اب

دنیا ہے سرائے فانی، اس سے
چلیے کہ مقام ہو چکا اب

رکھا تہِ خاک مصحفی کو
آرام تمام ہو چکا اب

158

بال و پر باز کیا چاہیے اب　　یاں سے پرواز کیا چاہیے اب
بس بہت ضبطِ غم عشق کیا　　گریہ آغاز کیا چاہیے اب
اب جانے لگی اپنی اُس تک　　فکرِ غمّاز کیا چاہیے اب
فرش پر اُس کے قدم ہے، اے دل　　عرش پر ناز کیا چاہیے اب
سخت مشکل ہے، ترا بھی شکوہ　　بختِ ناساز کیا چاہیے اب
کیا ستم ہے کہ تصور کو ترے　　اپنا ہم راز کیا چاہیے اب
مصحفی دل کوئی لیتا ہی نہیں
خاک انداز کیا چاہیے اب

159

لو اب اس دل کو تمھیں آگ لگاؤ، صاحب　　جھوٹی باتوں سے مرا جی نہ جلاؤ، صاحب
جلوہ ہر ایک کو اپنا، نہ دکھاؤ صاحب　　کیا غضب کرتے ہو، ٹک منھ تو چھپاؤ صاحب
کون مشتاق تھا، آنے کا تمھارے ایسے　　جاؤں جاؤں ہی جو کرتے ہو تو جاؤ صاحب
ہم سے کیا کہتے ہو، پکڑے نہیں کچھ ہم نے ہاتھ　　دل کے تیئں ڈھونڈھ لو، سینے میں جو پاؤ صاحب
یہ کوئی طور ہے، منھ ڈھانپ چلے جانے کا　　کس طرف جاتے ہو، ٹک تو اِدھر آؤ صاحب
کل سرِ راہ میں، تم غیر سے کیا کہتے تھے　　تم کو میری ہی قسم ہے، نہ چھپاؤ صاحب
اور مذکور کو جانے دو، خفا بیٹھے ہیں
مصحفی اب تو کوئی شعر سناؤ صاحب

160

بات میں ہو گئے، خفا صاحب　　یہ بھی کوئی بات تھی بھلا، صاحب

اب جو یوں تم نے مُنھ تھتھایا ہے — پھر نہ بولو گے ہم سے کیا صاحب
صدقے ہیں ہم تمھاری صورت کے — زور بیٹھے ہو منھ بنا صاحب
ہیں کھلے گل کی طرح بندِ قبا — کیا تمھیں بھی لگی ہوا صاحب
ہم سے ملتے ہی بے وفائی کی — یہی ہوتی ہے کیا وفا صاحب
وو ہیں کچھ تم نکل ہی بھاگے، ولے — قطعہ میں کوئی تم کو چھوڑتا صاحب
بچ گئے رات میرے ہاتھوں سے — دو نصیبوں کے تیئں دعا، صاحب

پوچھتے کیا ہو مصحفی کا نشاں
خاک میں وہ تو مل گیا صاحب

161

صبح کر کے جو آج آئے ہیں شمشیر و سپر آپ — فرمائیے یہ بارے، کہ جاتے ہیں کدھر آپ
کچھ خانہ خرابی کا نہیں اُن کی میں باعث — ہیں دشمنِ جاں اپنے تو یہ دیدۂ تر آپ
مانگا جو میں بوسہ، تو کہا تند ہو مجھ کو — یہ شوخیاں مجھ سے نہ کریں بارِ دگر آپ
مت جائیو قاصد تو مری بے خبری پر — میں، گم شدہ دل اپنے کی، رکھتا ہوں خبر آپ
اپنی تو نہیں خواہشِ دل گریہ پہ لیکن — کیا کیجیے، جو آنکھوں سے گریں لختِ جگر آپ
چھپ جاتے ہیں پھر وو ہیں مہِ عید کے مانند — آجاتے ہیں آنکھوں میں کسی کی جو نظر آپ

اے مصحفی اس کوچے سے جوں چاہیے توں اب
ہے خیر اسی میں کہ کریں عزمِ سفر آپ

ت

162

ہو جس جگہ نہ ناوکِ تقدیر کی نشست
خاطر نشاں کرے ہے، ترے تیر کی نشست

از بس کہ اُس کی بزم میں ہے ازدحامِ خلق
میں اک طرف، کہ واں نہیں تدبیر کی نشست

دنیا سے دل نہ باندھ، کہ اس بزم گاہ میں
گاہے جوان کی ہے، گہے پیر کی نشست

ربطِ گل و بنفشہ سے دیتی ہے مجھ کو یاد
عارض پہ اُس کے زلفِ گرہ گیر کی نشست

کیا بیٹھے نقشِ لالہ وگل، اس ورق کے بیچ
خاکے پہ جس کے ہو تری تصویر کی نشست

اب حلقہ حلقہ بیٹھتے ہیں، واں جنوں زدہ
جس در پہ تھی، نہ حلقۂ زنجیر کی نشست

کیا مارے دست و پا، وہ ستم کشتہ بعد قتل
ہر استخواں پہ جس کے ہو شمشیر کی نشست

دنیا سے دوں نہ جائے اقامت ہے مصحفی
ہم اس درے پہ بیٹھے ہیں رہ گیر کی نشست

163

ہو جس کے دل میں داغِ غمِ یار کی نشست
کیا خوش کرے اُسے گل وگلزار کی نشست

بیٹھے ہے جب کہ خانۂ زیں میں وہ طفلِ شوخ
عالم کو ذبح کرتی ہے، خوں خوار کی نشست

جیتے تو گوشت پوست مرا، اس کا وقف تھا
اب ہڈیوں پہ ٹھہری ہے تلوار کی نشست

بیٹھا ہوں دست بستہ، میں یوں اُس کے روبرو
ہو محکمے میں جیسے گنہ گار کی نشست

پھر ہم جو تیری بزم میں آویں تو کیا کریں
واں تو ہمیشہ رہتی ہے دو چار کی نشست

یہ ظرفِ تنگ، اور وہ دریائے بیکراں
اس دل میں کیوں کے ہو غمِ بسیار کی نشست

کیا بِک گیا ہے ہاتھ کسی کے تو، مصحفی
اب پھر شروع کی ہے جو بازار کی نشست

164

دل جانے ہے اس ابروئے خم دار کی نشست کردی ہے پست جن نے کہ تلوار کی نشست
دیکھے سے اُس کے دل تو مرا داغ ہوگیا کیا پوچھتے ہو خالِ رُخِ یار کی نشست
اس تفرقے میں، حیف کہ موقوف ہوگئی تھی میری اُس کی وہ جو کبھی پیار کی نشست
اتنا تو اچپلا ہے، کہ مانی نہ لکھ سکا جوں برق، اک جگہ تری رفتار کی نشست
جس نے سرِ بریدہ کو کرسی کیا، اُسے کم تختِ سلطنت سے نہیں دار کی نشست
سوزن نہ مارو کوئی، کہ ہر زخم پر مرے سوزن زن آپ ہے، مری منقار کی نشست
سطحِ زمیں ہے صفحۂ صورت گراں، کہ ہے جس پر، ہزار بے خود و ہشیار کی نشست
گل چیں یہ کب روا ہے، کہ ایسی بہار میں برخاست ہووے گل کی، رہے خار کی نشست
گریے سے میرے، موسمِ برسات لگ گیا یارو عجب نہیں، در و دیوار کی نشست
اس صفحے پر برائے خدا دیکھیو ذرا قطعہ تیرے قلم کی اور مرے اشعار کی نشست

دو چار گرچہ بستہ و آوردہ ہیں و لے
نقشِ نگیں ہے مصحفی دو چار کی نشست

165

ایسا بھی کوئی کرے ہے خلل ملک دیں میں بت ہرگز میں اُس کی شکل کا دیکھا نہ چیں میں بت
مذہب میں، میرے شیخ کے اتنا ہی فرق ہے میں ہاتھ میں رکھوں ہوں تو وہ آستیں میں بت
دیں ہوگیا، بہ کفر بدل یاں تلک، کہ خلق رکھّے ہے جائے قبلہ نما اب نگیں میں بت

سجدہ کرے خدا کو تو کیجیو سمجھ کے شیخ　　اب بھی گڑے ہوئے ہیں ہزاروں زمیں میں بت

جاؤں طواف کرنے کو کیوں کر میں مصحفی
کعبے کے طاق میں ہے، مرے ہے نگیں میں بت

166

رہا یہ دل تو بیمارِ محبت　　گیا اس سے نہ آزارِ محبت

ہیں عاشق اور بھی لیکن نہ ہوگا　　کوئی مجھ سا گنہ گارِ محبت

نہ دیکھا جس نے روے دانہ و دام　　سو میں ہوں وہ گرفتارِ محبت

ہمارے نالۂ آتش فشاں نے　　کیا پھر گرم بازارِ محبت

نظر کرتے ہی اُس کافر مژہ پر　　چبھا دل میں مرے خارِ محبت

اُسے کیا دوش، رسوا ہوگیا ہوں　　میں آپہی کرکے اظہارِ محبت

بہ چشمِ کم نہ دیکھو مصحفی کو
ہے دولت خواہِ سرکارِ محبت

167

جگر میں کھٹکے ہے خارِ محبت　　خلش کرتا ہے آزارِ محبت

نگاہوں سے نگاہیں جب ملیں ہیں　　بٹا جاتا ہے تب تارِ محبت

مرا دل دامِ زلفِ عنبریں سے　　نہ چھوٹا، تھا گرفتارِ محبت

محبت میں موئے ہم، تو بھی ہم سے　　رہا پوشیدہ اسرارِ محبت

زیانِ جاں، وہاں اوّل قدم ہے　　نہ پوچھو سُودِ بازارِ محبت

اُسے کیا کام ہے دیر و حرم سے　　جو کافر، ہو پرستارِ محبت

نپٹ احوال بد ہے مصحفی کا
بچے گا کیا یہ بیمارِ محبت

168

برا ہوتا ہے اظہارِ محبت — نہ کیجیے، گاہے اقرارِ محبت
وہ مجرم ہوں کہ یاروں نے رکھا ہے — لقب میرا، زیاں کارِ محبت
بس اب اقرار کے ثمرے کو دیکھا — میں اور مِن بعد، انکارِ محبت
نہ آیا شام بھی گھر پھر کے اپنے — تماشائیِ بازارِ محبت
میں ہر دم خوں میں تڑپوں ہوں کہ مجھ کو — یہی ہے سیرِ گلزارِ محبت
بہت اے مصحفی آنکھوں نے کھایا قطعہ فریبِ — حسنِ تکرارِ محبت
خدا کے واسطے تو' چھوڑ اب تو
یہ استبداد و اصرارِ محبت

169

نہ کر تو' مجھ سے انکارِ محبت — کوئی چھپتا ہے آزارِ محبت
مرے چہرے کا رنگِ زعفرانی — کرے ہے آپ اظہارِ محبت
بایں نازک تنی، اے وا مصیبت — ہوا تو' ناز بردارِ محبت
صراحی سی تری گردن ہوئی ہائے — اسیرِ تارِ زنارِ محبت
بھلا میری طرح، صد شکر اے شوخ — ہوا تو' بھی، گرفتارِ محبت
کسی کے نشترِ مژگاں سے، بارے — چُبھا دل میں مرے، خارِ محبت
تری آنکھوں سے،لب سے،رنگ رُخ سے — عیاں ہیں سارے آثارِ محبت

ستم یہ ہے کہ تو بھی میرے آگے نہیں کرتا، تو اقرارِ محبت
نہ کر یہ بات پنہاں مصحفی سے
کہ جانے ہے وہ تیمار محبت

170

اُس کی ابرو سے کچھ آئی نہ تھی دو چار کی موت
کتنے اس شبہ میں مارے گئے تلوار کی موت

روبرو میرے، کوئی بات بھی اُس سے نہ کرو
ہائے اس بات میں ہے میرے دلِ زار کی موت

مارے بے طاقتیوں کے یہ موا جاتا ہے
کاش آجاوے شتابی ترے بیمار کی موت

آب و دانے کا گلہ تجھ سے نہیں، اے صیّاد
ہے مگر قیدِ قفس مرغِ گرفتار کی موت

عشق کا جس کو مرض ہو، وہ یہی کہتا ہے
نہ ہو دشمن کی بھی قسمت میں اس آزار کی موت

مصحفی، ہل کے بہم جاتے ہیں اُس کوچے میں
جب کبھی آتی ہے اس شہر میں دو چار کی موت

171

جب سے کافر نے سُنی ہے کسی بدذات کی بات
تب سے کرتا ہی نہیں لطف و عنایات کی بات

جنبشِ چشم سے اس کی کوئی واقف نہ ہوا
کون بیمار کے سمجھے ہے اشارات کی بات

اک ہمیں ہیں کہ نہیں آتے زباں پر اُس کی
درمیاں رہتی ہے یوں سب سے ملاقات کی بات

دن کو اب شیخیاں کرنے لگے میرے آگے
چلو جاؤ بھی میاں، بھول گئے رات کی بات

مصحفی شوق ہوا ہے سببِ طولِ کلام
ورنہ کیا، ہے سخنِ عشق تو اک بات کی بات

172

زبس کہ گریہ سے فرصت ہمیں نہیں دن رات
رہے ہے دیدۂ گریاں پہ آستیں دن رات

ہزار حیف، بہ ایں چہرۂ شگفتہ چو گل
خراب و خوار پھرے تجھ سا نازنیں دن رات

نہ ہووے کیوں کے مجھے دردِ سر کہ کافر کی
لپی ہی رہتی ہے صندل سے کچھ جبیں دن رات

زمیں کا پیٹ نہیں اب تلک بھرا، تب تو
چلا ہی جاوے ہے عالم تہِ زمیں دن رات

درازیٔ شبِ ہجراں سے ظلم ہے مجھ پر
خدا کرے کہ برابر بھی ہو کہیں دن رات

کبھو جو پھر گیا پلکوں کا اس کا مُنھ ایدھر
مرے جگر کے اُپر برچھیاں چلیں دن رات

شکستِ زلف بتاں، ہو اگر ذرا بھی درست
دلِ شکستہ مرا کیوں رہے حزیں دن رات

سیاہ بختی پر اُس کی نہ جائیو ہرگز
کہ زیرِ مُہر ہے عاشق کے جوں نگیں دن رات

خوشی کا نام نہ دیکھا کہیں زمانے میں
جیے تو ہم پہ رہے مصحفی غمیں دن رات

173

ہم کو گر رکھا زمیں میں، دیدۂ گریاں سمیت
روزِ محشر خاک سے اُٹھیں گے ہم، طوفاں سمیت

ہائے رے وہ شرمگینی، اور مُحرّف دیکھنا
دل میں پھرتی ہیں وہ نظریں، سایۂ مژگاں سمیت

وہ جو تھے پلکوں پہ میری، چند قطرے اشک کے
جھڑ پڑے دامن میں آخر، حسرت و حرماں سمیت

اُن ستم کشتوں میں ہوں تیرے، کہ میری خاک سے
تیر بھی نکلیں ہیں گر اے شوخ تو پیکاں سمیت

حشر کے فریادیوں پر عرصہ ہو جاوے گا تنگ
ہم بھی آ نکلے اگر واں اس دلِ نالاں سمیت

جس نے دیکھا ہو ترا چاکِ قبا، اے سروِ ناز
کیوں نہ وہ پھاڑے گریباں مثلِ گُل داماں سمیت

عالمِ زیرِ زمیں بھی حسن سے خالی نہیں
خاک سے گُل تب تو نکلے ہے لبِ خنداں سمیت

اس ادا سے کل وہ آیا باغ میں، دامن کشاں
ہو گئے گُل فرش سارے سنبل و ریحاں سمیت

مصحفی گر یہ غزل میں لکھ کے بھیجوں لکھنؤ
میر رحمتِ تازہ گوئی تہ کرے دیواں سمیت[1]

174

اشک سے میرے بچے ہمسایہ کیوں کر گھر سمیت — بہ گئی ہیں کشتیاں، اس بحر میں لنگر سمیت
چشم زخم، آنکھیں لڑانے سے اُسے پہنچا مگر — رہتے ہیں جو رخنۂ دیوار بند اب در سمیت
مت گلہ داری پہ نازاں ہو کہ اک گردش کے بیچ — مل گئے ہیں خاک میں یاں کتنے سر، افسر سمیت
کس کے کانوں کی صفا کا شور دریا میں گیا — جو پڑا بیتاب پھرتا ہے صدف گوہر سمیت
یا تو لکھتے ہی نہ تھے یا آئے جب لکھنے اُپر — صفحے کے صفحے سیہ ہم کر گئے مسطر سمیت
ایسے قاتل پر کوئی اثباتِ خوں کیوں کر کرے — خاک میں جس نے سلائے سیکڑوں خنجر سمیت
بے طرح سے آ پھنسے ہیں چنگلِ صیّاد میں — دیکھیے چھوٹیں گے کیوں کر یاں سے بال و پر سمیت
کس کی مژگاں کا میں کشتہ ہوں کہ ہنگامِ بہار — سبزہ میری خاک سے اُگتا ہے پر نشتر سمیت

عشق کی رہ، وہ بُری رہ ہے کہ جس میں مصحفی
صاحبِ طبل و علم حیران ہیں، لشکر سمیت

175

بس کہ گرمِ گریہ تھا دل، رات چشمِ تر سمیت — لختِ دل، دامن میں گرتے تھے مرے، اخگر سمیت
تو سہی ناصح، کہ میں اپنے گریباں کے تئیں — دھجیاں کر کے اڑاؤں، دامنِ محشر سمیت
کس کے تئیں مارے ہوئے آتا ہے، ظالم سچ تو کہہ — بھر رہا ہے ہاتھ تیرا، خون میں خنجر سمیت
اس ہوا میں، کر رہے ہیں ہم ترا ہی انتظار — آ کہیں جلدی سے ساقی، شیشہ و ساغر سمیت

---

1 اس سے ظاہر ہے کہ یہ غزل میر کے لکھنؤ جانے کے بعد ۱۱۹۶ھ میں لکھی گئی ہے، اور مصحفی خود بھی اسی زمانے میں لکھنؤ پہنچے ہیں۔ ان کا پہلا دیوان وہیں مرتب ہوا تھا۔

میں ہی جانوں ہوں کہ جیسی لے کسی سے شمع پر جل کے خاکستر ہوا پروانہ، بال و پر سمیت

جب سے دیکھا ہے، ترا روئے عرق آلودہ جان آسماں پھرتا ہے تیرے گرد، اختر سمیت

مصحفی چرخِ مقرنس[1] ہے وہ فانوسِ خیال[2]

جس میں شاہانِ جہاں، گردش میں ہیں لشکر سمیت

176

کچھ مجھ سے ان دنوں، نہیں اُس کی نظر درست پہنچی ہے میرے عشق کی اُس کو خبر درست

صیاد سے کہو، پر و پیکاں کو آب دے اب ہم نے پھر کیے ہیں، ذرا بال و پر درست

نت پرزے پرزے کرکے، اڑاتا رہا وہ شوخ لایا نہ واں سے، ایک بھی خط نامہ بر درست

روتا ہوں جب میں، یاد کر اُس رشکِ بدر کو ہر اشک سے، بنے ہے زمیں پر قمر درست

دوکھے[3] جو کوئی ہم کو، تو کیوں مانیں ہم بُرا اس عہد میں، خراب ہیں اہلِ ہنر، درست

میرے دلِ شکستہ کو، کہتی ہے دیکھ خلق کیا زور آئینہ ہے یہ، ہووے اگر درست

کٹ کٹ کے اب تو سینے سے نکلے ہے مصحفی

وے دن گئے کہ تھا، کبھی اپنا جگر درست

177

سو دل سے، تیرے تیر کا گذرا ہے سر، درست پیکاں نے تیرے، کس کا رکھا ہے جگر درست

واحسرتا، کہ قافلہ یاروں کا لد چلا اور ہم سے ہو سکا بھی، نہ سازِ سفر درست

ہوتی نہیں درست، شکن اُس کی زلف کی کرتا رہے ہے گرچہ وہ شام و سحر درست

---

[1] مقرنس = سیڑھی کی طرح منزل بہ منزل بنی ہوئی۔ [2] فانوسِ خیال = وہ فانوس جس پر مختلف تصاویر بنی ہوئی ہوتی ہیں اور وہ شمع پر گردش کرتا رہتا ہے۔ اس پر عموماً ہاتھی، گھوڑے یا لشکر کی تصاویر ہوتی ہے۔

[3] دوکھنا = ملامت کرنا

ہے ہے کہ آشیاں پہ مرے برق ہی گری ۔۔۔ جب فصلِ گل میں مَیں نے کیے بال و پر درست
مرغانِ میوہ خوار سے فریاد ہے کہ ہائے ۔۔۔ اس نخل سے گرا نہ کبھی اک ثمر درست
جب نیمچے کو اس نے، میاں سے علم کیا ۔۔۔ خورشید کی رہی، نہ فلک پر سپر درست

میرا دلِ شکستہ وہ شیشہ ہے مصحفی
جس شیشے کو کرے، نہ کوئی شیشہ گر درست

178

اور یاں پیرو جواں جتنے ہیں، ہیں پیر پرست ۔۔۔ میں وہ کافر ہوں، جسے کہتے ہیں تصویر پرست
سجدہ کرتا ہوں میں، محراب سمجھ کر اس کو ۔۔۔ عشق نے تیرے، کیا ہے مجھے شمشیر پرست
در و دیوار کی صورت کا تماشائی ہوں ۔۔۔ میں ترے کوچے میں جوں مردمِ تعمیر پرست
عکسِ خوباں سے ہوا آبِ رواں بت خانہ ۔۔۔ جس کی ہر موج ہے اک ہندوے تصویر پرست
زلفِ مشکیں کے تری، گرد ہے یوں اک عالم ۔۔۔ خانۂ کعبہ میں جوں خلق ہو زنجیر پرست

مصحفی کیوں نہ تکے، روے نکویاں کی طرف
چشمِ صیاد سدا رہتی ہے نخچیر پرست

179

گرچہ جوں آئینہ، اوّل تھا یہ دل حیرت پرست ۔۔۔ دیکھ اس کی شکل، آخر ہو گیا صورت پرست
سرو پہ قمری ہے عاشق، اور گل پر عندلیب ۔۔۔ ہے ہر اک مرغِ چمن اس باغ میں الفت پرست
جان دینے سے، نہیں اس کے تئیں ہرگز دریغ ۔۔۔ عشق بازی میں یہ دل ہے زور ہی ہمت پرست
نت جن آنکھوں میں رہے تھا، تیری صورت کا خیال ۔۔۔ اب وہ آنکھیں صورتِ آئینہ ہیں حیرت پرست

مصحفی مے خانۂ گلشن میں ہنگامِ بہار
ایک ہی پیالے پہ ہے گل کی طرح عشرت پرست

180

جب سے جدا ہوا ہے، تو اے مایۂ حیات — آہ و فغاں میں گذرے ہے مجھ کو تمام رات

عاشق تمام عمر ہے قیدِ فرنگ میں — ممکن نہیں کہ ہووے غمِ عشق سے نجات

آپس میں دوستوں کا نہ ہو جاوے خوں سپید — ہووے ذرا بھی رنگِ محبت کو گر ثبات

زلفوں نے تیری پھینکی ہے خورشید پر کمند — رخ نے ترے کیا ہے مہِ چاردہ کو مات

اللہ رے کافری، ترے طرزِ خرام کی — نقشِ قدم سے کر دیا کعبے کو سومنات

دریا تمام، لہروں سے آغوش ہے ہنوز — دیکھی تھی ایک دن کہیں اُس سیم تن کی گات

اس سے زیادہ اور ہوں کیا خوار شیخ جی — کعبے گئے تو واں بھی کسی نے نہ پوچھی بات

زخم اپنے دیکھ دیکھ نہ رو اتنا مصحفی

کیا ڈر ہے، بچ رہے گا اگر ہے تری حیات

181

مرے خوں کا پیاسا، وہ قاتل رہا نت — گلے اُس کے تیغا حمائل رہا نت

نہ تنہا میں عاشق ہوں خوش قد پہ تیرے — دلِ سروِ مائل بھی، مائل رہا نت

جگر کو مرے، تم سراہو، عزیزو — کہ مژگاں کے اُس کی مقابل رہا نت

ز بس کشتے پر کشتے تڑپا کیے واں — گلی میں تری، رقصِ بسمل رہا نت

کبھی میں نے بے پردہ اس کو نہ دیکھا — مرے اس کے اک پردہ حائل رہا نت

نہ سویا کوئی، میرے عہدِ جنوں میں — کہ راتوں کو شورِ سلاسل رہا نت

نہ دی بھیک 'تو' نے کبھی مصحفی کو

ترے در پہ پیارے، وہ سائل رہا نت

182

بدنام کیا میں نے عبث نامِ محبت
مجھ سے نہ ہوا کچھ بھی سر انجامِ محبت

یہ مے کدہ وہ ہے، کہ نہ پھر ہوش میں آیا
اس مے کدے سے جس نے پیامِ جامِ محبت

میں سیکڑوں خط اُس کو لکھے اُس نے نہ بھیجا
قاصد کی زبانی کبھی پیغامِ محبت

اے عشق اب اس دل کو ذرا چین دے ظالم
اس دل نے اُٹھائے بہت الزامِ محبت

اُس طائرِ وحشی کے نہ درپے ہو، تو صیّاد
جو چھوڑ کر آیا قفس و دامِ محبت

میں آپ کو بدنام کیا میوہ خوروں میں
اس باغ میں چُن چُن، ثمرِ خامِ محبت

کیا سحر ہے آنکھوں میں تری، جس نے مری جان
کر رکھا ہے عالم کے تئیں رامِ محبت

کیا صوم و صلوٰۃ اس سے ہو، جو شخص ہُوا ہو
مصروف بہ دین داریِ احکامِ محبت

مارا گیا شب مصحفی اس بت کی گلی میں
سچ ہے کہ بُرا ہوتا ہے ابرامِ محبت

183

جس میں ہم دیکھیں تھے ہر آن، خدا کی قدرت
سو وہ دل یوں ہوا حیران، خدا کی قدرت

پیرہن، لوٹے مزے تیری ہم آغوشی کے
ہم کریں چاک گریبان، خدا کی قدرت

جن سے ہم رکھتے تھے سو چشم، وہ کل دیکھ ہمیں
ہو گئے جان کے انجان، خدا کی قدرت

جب میں روتا ہوں تو دامن میں مرے گرتے ہیں
جاے اشک آنکھوں سے پیکان، خدا کی قدرت

گو نہ مشاطہ بناوے خط و خال اس رخ کا
کام میں اپنے ہے بڑا ان، خدا کی قدرت

چشم بینندہ کہاں ہے جو تماشا دیکھے
ہے ''الی الآن کما کان''[1] خدا کی قدرت

ابھی چاہے تو اک ادنیٰ کے تئیں کر دیوے
مالکِ ملکِ سلیمان خدا کی قدرت

---

[1] خدا کی قدرت آج بھی وہی ہے جو پہلے تھی۔

دل کو لے جا کے مرے ہر گھڑی دکھلاتی ہے — اُس کی ہر زلفِ پریشان خدا کی قدرت

پیکرِ نور فرشتوں کو ملے، اور ہووے — خاک سے خلقتِ انسان، خدا کی قدرت

مصحفی سا بشر، اے شوخ ترے کوچے میں
یوں پھرے خوار و پریشان، خدا کی قدرت

184

عاشق وہی کہ جس کے آنسو بہا کریں نت — رومال اشکِ خوں میں ڈوبے رہا کریں نت

مجلس تلک رسائی اس کی نہیں وگر نہ — ہم ساری رات بیٹھے قصے کہا کریں نت

اک ملنے والے ہم تھے، سو ہو چکے ہیں صاحب — اب آپ جس سے چاہیں، اُس سے ملا کریں نت

مکتب نشین لڑکے، کتنے غضب ہیں، ہے ہے — کس نے کہا انھوں سے مشقِ جفا کریں نت

خورشید و مہ نے نقشا دیکھا نہیں وگرنہ — دن رات جستجو میں تیری پھرا کریں نت

جس خاک سے تو گذرے آبِ حیات کی طرح
تا روزِ حشر مردے واں سے اُٹھا کریں نت

ث

185

نہیں آیا ہمارے پاس اب تک یار، کیا باعث — گیا کیوں بھول، کر کے ملنے کا اقرار کیا باعث

ٹھہرتا ہی نہیں سینے میں دل زنہار، کیا باعث — چوئے ہی پڑتے ہیں کچھ دیدۂ خوں بار کیا باعث

دُکھا کرتا ہے دل، سینے میں میرے روز و شب، یارو — نہیں معلوم ہوتا اس کا کچھ اسرار، کیا باعث

نکل بھی جا کہیں اے دل، شتابی ساتھ آنسو کے — مرے سینے میں تو کیوں کھینچے ہے آزار، کیا باعث

کبھو آنکھو میں سرمہ، اور کبھی ابرو پہ وسمہ ہے سجی جاتی ہے واں ہردم نئی تلوار، کیا باعث
جوکوئی شیخ صنعاں کی طرح عاشق ہو ترسا کا نہ پوچھو اس سے باندھی تو نے کیوں زنّار، کیا باعث
خموشی خوب ہے ایسی جگہ، اے مصحفی چپ رہ
کسو سے دردِ دل کا کیجیے اظہار کیا باعث

186

عنقا ملا ہے کس کو دلا، جستجو عبث پھرتا ہے ڈھونڈتا تو اُسے کوُ بہ کوُ عبث
اس چرخ خود مراد سے، اس کے وصال کی خواہش عبث، امید عبث، آرزو عبث
عادی بہ آہ و نالہ ہوں میں، آہ کیا کروں نت مانے ہے بُرا، وہ بتِ تند خو، عبث
اے دل گر اُس کے سامنے جاوے تو میں بدوں[1] کرتا ہے شیخیاں، تو مرے روبرو عبث
ہرگز نہیں یہ دوختنی، مثلِ جیبِ گل کرتے ہو چاکِ سینہ کو میرے رفو عبث
اے فصلِ نوبہار، پئے انبساطِ طبع قطعہ کرتی ہے مجھ پہ عرضِ گل و لالہ تو عبث
اپنی تو چشم میں چمنِ روزگار کا لطفِ بہار ہیچ ہے، اور رنگ و بو عبث
پیدا کر اوّل[2] عشق، جو چاہے ہے وصلِ دوست اے شیخ، ورنہ ہے یہ نماز و وضو عبث
اے مصحفی وہ جا ہے، تو جانے بھی دے اُسے
اپنی طرف سے اتنا لگا جا ہے تو عبث

ج

187

پڑتی ہی نہیں، اس دلِ بیتاب کو کل آج آرام و سکوں میں، نظر آتا ہے خلل آج

---

[1] یعنی شرط لگاؤں [2] اس مصرع میں عشق کی عین ساقط ہوگئی ہے۔

پھر صبح کو ہم اور وہی سیرِ خرابات
اس لغزشِ مستی سے، جو جاتے ہیں سنبھل آج

مدّت سے تو ہم تھا، ہمیں اُس کے دہن کا
جنبش میں ٹک اُس لب کی، یہ عقدہ ہوا حل آج

کی شانہ صفت، کس نے میاں دست درازی
کھاتی ہے تری زلف تو، کچھ زور ہی بل آج

ہمراہ مجھے دیکھ کے، کہتا ہے یہ قاتل
جاتا نہیں، شاید تری آئی ہے اجل آج

ہے تا سرِ دیوارِ چمن جوشِ بہاراں
گلگشتِ گلستاں کو، جو چلنا ہے تو چل آج

شاید کہ صبا آئی ہے، اس گُل کی گلی سے
جوں لالہ شگفتہ ہے مرے دل کا کنول آج

تھا ان کے بھی اوپر، کبھی تصویر کا عالم
ویراں نظر آتے ہیں جو یہ قصر و محل آج

ہے نعش پہ کشتے کی ترے، زور تماشا
اے آفتِ جاں، تو بھی ذرا گھر سے نکل آج

کیوں چپ ہو میاں مصحفی فرماؤ تو صاحب
پڑھتے نہیں ہو تم جو کوئی شعر و غزل آج

188

قاتل مرے یاروں کو نہ خط سادہ لکھا بھیج
بھیجے ہے تو' کاغذ کو ٹک اک لو ہو لگا بھیج

یا اپنے شتاب آنے کا خط، مجھ کو لکھا بھیج
یا مجھ کو ہی خط بھیج کے، پاس اپنے بلا بھیج

ڈرتا نہیں ہوں میں بھی، اب اے عشق بلا سے
جس طرح کی چاہے، تو مرے سر پہ بلا بھیج

واشد نہیں ہوتی ہے، مرے غنچۂ دل کو
اُس کو' سے الٰہی تو کہیں بادِ صبا بھیج

اسباب غم و غصہ فلک ہم پہ بہت ہے
جو چاہیئے تیرے تئیں تو یاں سے منگا بھیج

قسمت ہی سے یہ زخم کہیں ہاتھ لگے ہے
اے کشتہ تو قاتل کے تئیں اپنی دعا بھیج

جب میں نے کہا: دیتا ہوں دل، آن کے لے جا
بولا کہ جو دینا ہے تو گھر بیٹھے دلا بھیج

دے ڈالیں ہم اس دل کو، ابھی نیم نگہ پر
بینا کوئی اس دل کا اگر دیوے خدا بھیج

اے مصحفی گل بھیجیں ہیں غیر اس کو تو بھیجیں
تو لختِ جگر کا اُسے گلدستہ بنا بھیج

189

بڑھ گئی بیماریِ دل، کیجے یارب کیا علاج
اب تو مرنا ہی پڑا، اس غم سے ہم کو لا علاج

تو نے اے جراح، کیوں مرہم لگایا کیا کیا
سودہ لماس اس زخمِ کہن کا تھا علاج

اُٹھ سرِ بالیں سے میری، جا بھی گھر کو اے طبیب
اب دمِ آخر ہے یاں، کیسی دوا کیسا علاج

صعب تھا ازبس مرض، میرے دلِ بیمار کا
چپ رہا، میں نے مسیحا سے اگر پوچھا علاج

جان بے کل ہے جدی، اور دل جدا کرتا ہے درد
کیجیے اے مصحفی افسوس کس کس کا علاج

190

رکھتا ہوں ایک میں تو' ترے غم کی احتیاج
کافر ہو جس کو ہو، دلِ خرم کی احتیاج

کھائے ہزار زخم، تری تیغ کے دلے
عیسیٰ سے ہم نے رکھی، نہ مرہم کی احتیاج

اتنا ہوں غم رسیدہ کہ تیرے فراق میں
ہرگز رہی نہیں مجھے ماتم کی احتیاج

رہتا ہے روز و شب انھیں ہر ماہ تعزیہ
کب اہلِ درد کو، ہے محرّم کی احتیاج

پڑھنا تھا جو کہ ہم کو سو تحصیل کر چکے[1]
مسلم[2] کی اب ہوس، نہ مسلّم کی احتیاج

عشاق اک نگہ سے تری قتل ہوگئے
اب تجھ کو کیا ہے تیغِ تبر دم کی احتیاج

ہے ظلم، اس پہ خنجرِ کم دم لگایئے
جس صید کو ہے تیغ تبر دم کی احتیاج

اُٹھ جائے مصحفی سو کہاں[3] یاں سے یا علیؑ
اس در سے رفع ہوتی ہے، عالم کی احتیاج

---

[1] ن ۳: سو آگے ہی پڑھ چکے۔ [2] مسلم حدیث کی اور مسلّم منطق کی مشہور کتابوں کے نام ہیں۔
[3] یعنی اُٹھ کر کہاں جائے۔

191

روزم دیتا ہے اس کے رخ کو باج شام سے، زلف نے لیا ہے خراج
ایک نالے پہ ہے، معاش اپنی ہم غریبوں کی، ہے یہی معراج
سلطنت، اور ہی معنے رکھتی ہے یوں تو سر پر خروس کے بھی ہے تاج
عاشقی کیوں نہ مبتذل ہووے کارِ پروانہ جب کرے درّاج
تابِ موئے کمر بھی اُس کو نہیں بس کہ نازک بڑا ہے اس کا مزاج
ہے دوا اُس مریض کی تجھ پاس جس کا عیسیٰ بھی کر سکے نہ علاج
مصحفی فارسی کو طاق پہ رکھ
اب ہے اشعارِ ہندوی کا رواج

چ

192

تجھ سے میں یہ نہیں کہتا کہ تو تلوار نہ کھینچ اپنے دامن کو، مرے ہاتھ سے اے یار، نہ کھینچ
رہ لگا آئینہ خانے میں تو' اے آئینے میرے اور یار کے بیچ، آن کے دیوار نہ کھینچ
نہ بٹھا حلقۂ ماتم میں گرفتاروں کو نیلگوں خط، تو بہ گردِ گل رخسار نہ کھینچ
لٹ پٹی چال، تو چل شوق سے اے مستِ شراب لیک دامن تو زمیں پر گہِ رفتار نہ کھینچ
شوق ہوتا ہے فزوں مجھ کو ہم آغوشی کا یوں تو خمیازہ مرے سامنے ہر بار نہ کھینچ
اے نسیمِ سحری، رہنے دے زنداں میں مجھے دامنِ شوق مرا، جانبِ گلزار نہ کھینچ

تیر کو کھینچ، میں مانع نہیں، پر تیر کے ساتھ　　دل تو سینے سے مرے، اے بتِ خوں خوار نہ کھینچ

مصحفی جانے بھی دے اس بتِ ہرجائی کو
اس قدر اُس کے تجسس میں تو آزار نہ کھینچ

193

یوں ہے عارض کی جھلک زلفِ پریشان کے بیچ　　شمع روشن ہو کہیں جیسے شبستاں کے بیچ

چمکے پھرتے تو ہو بازار میں مانندِ نگیں　　دیکھیو، حرف نہ آجائے کہیں شان کے بیچ

دلِ سی پارہ میں یوں عشق کے داغوں کی ہے شان　　پرِ طاؤس ہوں جیسے کسی قرآن کے بیچ

ہے مگر رطب مزاجی سے خطر ریزش کا　　شیشۂ مے نے جو رکھی ہے روئی کان کے بیچ

شور مرزائی کا بیجا نہیں[1] اپنی کہ یہاں　　جائے گل لختِ جگر رہتے ہیں گلدان کے بیچ

مصحفی، یہ تو تلاشی تھی[2] اب اپنے ڈھب کی
اک غزل اور لکھا چاہیئے دیوان کے بیچ

194

کب کا اک عمر سے جھگڑا تھا دل و جان کے بیچ　　کام دونوں کا کیا یار نے اک آن کے بیچ[3]

جب کہ چہرے سے اُٹھاتا ہے تو اے شوخ نقاب　　برق پڑتی ہے ہمارے سر و سامان کے بیچ

شب کہیں گوشۂ ابرو کو ترے دیکھا تھا　　سر، مہِ عید کا، اب تک ہے گریبان کے بیچ

خواب سے چونکے تو یاں ہم کو سفر پیش آیا　　آنکھ کھلتے ہی پڑی بانگِ جرس کان کے بیچ

ہم سیہ بخت، نہ کیوں خاک[4] میں لوٹیں کہ وہاں　　ربط اک تازہ ہوا ہے مسی و پان کے بیچ

---

[1] ن۳: شور بے جا نہیں مرزائی کا۔　[2] یعنی ایسی غزل جس کے قوافی اور مضامین تلاش کیے گئے ہیں۔

[3] غالب: دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی　　دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

[4] ن۳: خون میں

میں وہ بلبل ہوں کہ منقار سے اپنی جس نے رخنے کر ڈالے ہیں دیوارِ گلستان کے بیچ

مجھ کو گلگشتِ گلستاں کی نہ تہمت کیجیو
مصحفی، لختِ جگر ہیں مرے دامان کے بیچ

195

اک دن جو لے گئی، مجھے وحشت چمن کے بیچ چھپتا پھرا میں، سایۂ سرو و سمن کے بیچ
کیا چہچہے کریں تھے[1] ہم اپنے چمن کے بیچ ہوگا وہ دن، جو پہنچیں گے پھر بھی وطن کے بیچ
اب جس سے چاہے، اس سے میاں انکھڑیاں لڑا یاں کام ہو چکا، مژہ برہم زدن کے بیچ
تن تو کہاں ہے، شعلۂ فانوس کی طرح اک آگ سی بھری ہے، مرے پیرہن کے بیچ
اُگلی[2] پڑے ہے جیسے کہ شمشیرِ خوش غلاف اب یہ زباں ٹھہرتی نہیں ہے دہن کے بیچ
وہ آپ سا بتا وے ہے، وہ آپ سا، تجھے جھگڑا پڑا ہے رنگ کا گل اور سمن کے بیچ
رسمِ دیارِ عشق کا، کشتہ ہوں میں کہ واں جیتے کو گاڑ دیتے ہیں، رکھ کر کفن کے بیچ
غافل تو آنکھ کھول کے سیرِ جہاں تو کر جلوہ کیا ہے یار نے کس کس برن کے بیچ
مارے حیا کے، ہم سے وہ کل بولتا نہ تھا ہم چھیڑ چھیڑ کر اُسے، لائے سخن کے بیچ
پروانہ ہو کے زخمی، بہ تیغ[3] زبانِ شمع ایسا گرا کہ جان ہی دی شب لگن کے بیچ

میں شمعِ بزمِ دہر ہوں، ان روزوں مصحفی
میرا ہی ذکر گرم ہے ہر انجمن کے بیچ

196

دھجیاں پاؤوں سے باندھیں، ہم نے اس منزل کے بیچ یہ خبر پہنچے اُسے، جو جاوے ہے محمل کے بیچ
میں وہ بسمل ہوں، کسی کی تیغِ تیز شرم کا قطرۂ خوں بھی نہیں، کہنے کو جس بسمل کے بیچ

---

[1] ن ا: تھے کرتے [2] ن ۳: نکلی [3] ن ۳: زخمی تیغ

اس نگر کے رہنے والے، کیا سبھی ہیں بے نوا　　خاک بھی یاں تو نہ دیکھی، کاسۂ سائل کے بیچ

رشک ہے اس مرغِ بسمل پر مجھے، جو بعدِ ذبح　　آپ کو پنہاں کرے ہے دامنِ قاتل کے بیچ

حق کے کہتے، دار پر کیوں کھینچتے منصور کو　　کچھ ممیّز[1] اگر کرتے، حق و باطل کے بیچ

کیا خدائی ہے کہ اب در تک نہیں ہے اس کے بار　　جس سے ہم، زانو بہ زانو بیٹھیں تھے محفل کے بیچ[2]

اُس سے ہم اک بات بھی کہنے نہ پائے مصحفی
مرتے مرتے، رہ گئی دل کی ہمارے، دل کے بیچ

ح

197

دیکھ اس رشکِ پری کے باغ میں آنے کی طرح　　گل گریباں پھاڑتے ہیں اپنا[3] دیوانے کی طرح

تار رونے کا بندھا جب سے، مرا ہر ایک اشک　　رشتہ دار آپس میں ہے تسبیح کے دانے کی طرح

گر چھوا ہو میں نے اس کی زلف کو، تو ہم نشیں　　ہاتھ ساعد سے جدا ہووے مرا، شانے کی طرح

میں بھی ہوں اُس شعلۂ سرکش کا عاشق، آسماں　　رات دن پھرتا ہے جس کے گرد، پروانے کی طرح

تیشۂ فرہاد، میرے ہاتھ آیا چاہیئے　　کس قدر دشوار ہے سر سے گذر جانے کی طرح

مُنھ چھپاتے ہو جو ہر دم مصحفی کو دیکھ کر
کس سے سیکھی ہے میاں یہ تم نے شرمانے کی طرح

198

سحر ہے، رخ پر تری زلفوں کے بل کھانے کی طرح　　سیکھے کوئی تجھ سے، پیارے دل کے لے جانے کی طرح

---

[1] اسم فاعل، تمیز کرنے والے　[2] ن ۳: محمل کے بیچ　[3] ن ۱ اپنے

اس میں گو جل جاویں یا مر جاویں ہونا ہو سو ہو ۔۔۔ چوما مُنھ شعلہ رُو کا ہم کو پروانے کی طرح

پان کھانے پر کرو ہو اس کے یارو کیا نگاہ ۔۔۔ اک ذرا دیکھو مرے بھی خونِ دل کھانے کی طرح

سن کے میرا ماتمی قصہ لگا رونے وہ رات ۔۔۔ مرثیے سے بس کہ مانا تھی اس افسانے کی طرح

گاہ جھٹے میں مرے گا ہے بہ کامِ دیگرے ۔۔۔ ساری اس کی چشم میں نکلے ہے پیمانے کی طرح

جب مرا دل، دام میں زلفوں کے اُس کی پھنس گیا ۔۔۔ اور کچھ آئی نظر تب خویش و بیگانے کی طرح

یار کے وقتِ تماشا، قابلِ تصویر ہے ۔۔۔ مثلِ آئینہ مرے حیران رہ جانے کی طرح

گہ شگافِ در سے، گہ روزن سے کرتا ہے نگاہ ۔۔۔ یاد ہیں کتنی ہی اس کو آنکھیں پھڑکانے کی طرح

شیخ جی تم بھی عجب خر ہو، بھلا سمجھو تو بات ۔۔۔ دانۂ انگور کھاتا ہے کوئی دانے کی طرح

پھر گئیں کیا جانے کیوں ہم سے وہ زلفیں مصحفیؔ
ہم تو رکھتے تھے دل ان کا ہاتھ میں شانے کی طرح

199

شہر آتا ہے نظر پُر گرد، ویرانے کی طرح ۔۔۔ رہ گئی یاں، کون سی اب جی کے بہلانے کی طرح

تھی بلا گردانِ شمع روے گُل، شب تا سحر ۔۔۔ آخر آخر جی دیا، بلبل نے پروانے کی طرح

کیا سمجھ کر ہم نے یا رب سالہا سجدہ کیا ۔۔۔ جس جگہ کعبے کی صورت تھی نہ بت خانے کی طرح

کل جو رستے میں وہ ناگہ مل گیا، تھی دیدنی ۔۔۔ میرے رہ جانے کی وضع اور اُس کے رُک جانے کی طرح

رنگ گُل کرتا ہے آخر، یاد اگر ہوتی تمھیں
خاک اور خوں میں کسی بسمل کے تڑپانے کی طرح

200

شاخِ گل گو کہ لچکتی ہے قدِ یار کی طرح ۔۔۔ پر کہاں اس میں بہار اُس گُلِ رخسار کی طرح

کس کے مقتولوں کا یا رب یہ چمن مشہد ہے ۔۔۔ نظر آتے ہیں جو گل سینۂ افگار کی طرح

دیکھیے اب کی تبِ عشق سے کیوں کر بچیے		بے طرح سی نظر آتی ہے اس آزار کی طرح
کیا چرایا تھا ترا اس نے، قفا پر پیارے		ہاتھ کیوں باندھے ہیں کاکل کے، گنہگار کی طرح
غیر سے، شب اُسے خلوت رہی، اور ہم تا صبح		رہے حیران کھڑے، صورتِ دیوار کی طرح
تھا گھمنڈ ابرِ بہاری کو بہت رونے کا		پر نہ رویا وہ مرے دیدۂ خوں بار کی طرح
ہو چکا کب کا گریباں تو، مگر ہیں باقی		تار دو چار گلے میں مرے زنار کی طرح
دام میں زلف کے، کیا پوچھو ہو نقشا دل کا		کیا کہیں دیکھی نہیں مرغِ گرفتار کی طرح

ہیں طرح دار تو دنیا میں بہت پر واللہ
مصحفی آفتِ جاں ہے مرے خوں خوار کی طرح

خ

201

کہتا ہے کون، ہاتھ ہیں اس کے حنا سے سرخ		میں دیکھتا ہوں ان کو، تو ہیں ابتدا سے سرخ
آتے ہی کچھ خزاں کے، عجب زرد ہو چلے		چہرے گلوں کے، ہو کے چمن کی ہوا سے سرخ
دریائے خونِ خلق میں، پیرا ہے تیرا رخش		پانو اُس[1] کے سینے تک، نہیں رنگِ حنا سے سرخ
ہم مارے انفعال کے کل آب ہو گئے		دیکھا جو رنگ، چہرے کا اُس کے، حیا سے سرخ
اے بت ہزار شکر، کہ ہم اپنے خون میں		چاہیں تھے دست و تیغ کو تیری، خدا سے سرخ
دل جی اُٹھے ہے جنبشِ دامن سے یار[2] کی		جیسے دہک کے ہو کوئی[3] اخگر ہوا سے سرخ
یہ بھی عجب مزہ ہے کہ تڑپوں میں خون میں		دشمن کا مُنھ نہ ہو تری تیغِ جفا سے سرخ

---

1 یہاں پانو کا تلفظ غور طلب ہے یعنی بروزن فاع نظم ہوا ہے۔ 2 ن ا: میں 3 ن ا: کبھی

خوں ریزیوں سے ہاتھ اُٹھا، اب تو اے فلک　　صحرا کے صحرا ہیں تری تیغِ جفا سے سرخ
کشتہ ہوں میں، حنائی سرانگشت کا تری　　فندق کہاں ہے غنچے کی، ایسی ادا سے سرخ
یہ کیا بلا ہے، دیدۂ خوں بار میں مرے　　جو ہوگیا ہے رنگِ فلک اس گھٹا سے سرخ
گریے کا رنگ اپنے، تو معلوم ہو ہمیں　　دو چار قطرے اشک کے ٹپکیں بلا سے سرخ
رہتی ہے خونِ دل پہ معاش اپنی مصحفی
ہے رنگِ چہرہ اپنا تو اس کیمیا سے سرخ

202

لگائے ہاتھ کوئی اس بدن کو کیا گستاخ　　نہ جس بدن کو لگی ہو کبھی ہوا گستاخ
میں چھیڑتا ہوں جو اُس کو، کہے ہے کٹ کے رقیب　　قدیم سے، ہے تمھارا یہ آشنا گستاخ
یہ برگِ گل نہیں، ہیں بلبلوں کے لختِ جگر　　قدم نہ رکھیو خیاباں میں، اے صبا گستاخ
میں دیکھتا ہوں جو شانے کو، اس کی زلفوں میں　　کہوں ہوں: یوں ہی کبھی میرا ہاتھ تھا گستاخ
کبھی لپٹتی ہے، گاہ اُس کے بوسے لیتی ہے　　ہے تیرے رخ سے تیری زلف بھی بلا گستاخ
میں رکھ دیا جو سر اپنا شب اُس کے زانو پر　　کہا یہ ہنس کے: تو اب اتنا ہوگیا گستاخ
مجھے یہ ڈر ہے کہ صحبت بگڑ نہ جائے کہیں　　ہوئی ہے اُس کفِ نازک سے پھر حنا گستاخ
سُنا ہے مصحفی میں جب سے شعرِ عرفی کا　　ہمیشہ ہاتھ گریباں سے ہے مرا گستاخ
بساعتے کہ کشائی قبا بیاد آور
کہ می کشاد کسے بندِ ایں قبا گستاخ

203

مہندی سے دستِ یار، سپید و سیاہ و سرخ　　ہیں برگِ لالہ وار، سپید و سیاہ و سرخ

کیا رنگ تھا یہ تجھ سے کہ آنسو گریں تھے رات — اے چشمِ اشک بار، سپید و سیاہ و سرخ
اُس چشمِ پر خمار کے صدقے کہ اک جگہ — دیکھی نہ تھی، بہار سپید و سیاہ و سرخ
نکلی جو تیغِ قہر تری، آہوے حرم — لاکھوں ہوئے شکار، سپید و سیاہ و سرخ
یہ صدمے گذرے دل پہ، کہ ہو ہو گیا مرا — چہرہ ہزار بار، سپید و سیاہ و سرخ
دیکھا نہ تیرے رنگ کا ایک اس چمن کے بیچ — یوں پھول ہیں ہزار، سپید و سیاہ و سرخ

اے مصحفی زمانہ وہ مارِ سہ رنگ ہے
ہیں جس کے نت نگار سپید و سیاہ و سرخ

204

آتے ہی جب مچائی ہے اُس نے چمن میں چخ — دیکھ اس کو ہو گیا ہے گُلِ تر کا رنگ فخ[1]
جب تک کہ آنسوؤں کا ہمارے ہے افشرہ[2] — ان منعموں کے ہم نہیں محتاجِ آبِ یخ
نازک کمر کو اس کی، رگِ گل تو کیا کہوں — شرمندہ ہو ہے جس کی نزاکت کو دیکھ نخ[3]
کرتا ہوں جب بیاں میں کبھی اس کی زلف کا — شانہ ہر ایک بات میں گاوے ہے نخ کی شخ[4]

مردودِ آسمان و زمیں ہے وہ مصحفی
لاشے کو جس کے بو نہ کریں مور اور ملخ

د

205

تھی آب، دم اُس کے میں میاں بس کہ بلا سرد — بسمل ترا لگتے ہی تو خنجر کے ہوا سرد

---

[1] آج کل کے محاورے میں رنگ فق ہونا بولا جاتا ہے۔ [2] یہ غالباً ''آبشورہ'' کی تحریف ہے، اگر افشردن سے ہو تو افشردہ ہونا چاہیے۔ [3] نخ = کچا دھاگا، بہت باریک اور نازک۔ [4] اس محاورے کا استعمال غریب ہے۔

گرمی سے تپ عشق کی، آ جی پہ بنی ہے — الفت سے بتاں کی کرے اب دل کو خدا سرد
اس دستِ نگاریں سے ہوا سوزِ دل افزوں — مشہور غلط ہے یہ کہ ہوتی ہے حنا سرد[1]
ہم جس سے ملے جا کے، خنک ہی اُسے پایا — ہے آج کل ازبس کہ زمانے کی ہوا سرد

اے مصحفی کیا کہیئے دلِ گرم کی تیرے
اتنا تو مری جان یہ زنہار نہ تھا سرد

206

ہر چند، رہی نت ترے کوچے کی ہوا سرد — تو بھی ترے ملنے سے دل اپنا نہ ہوا سرد
دل جلتا ہے، لاؤ وہی کھا جاؤں بلا سے — کافور کو کہتے[2] ہیں کہ ہوتا ہے بلا سرد
میں آنکھوں میں لا کر وو ہیں کل پی گیا آنسو — ہر چند کہ اتنا بھی تو یہ آب نہ تھا سرد
دیکھا ہے مگر صبح دم اس گل کو چمن میں — جو آج نپٹ بھرتی ہے دم بادِ صبا سرد
گرمی پہ نہ آیا دِل افسردہ ہمارا — ہرگز نہ کرے بندے کو اتنا بھی خدا سرد
کیوں تب میں مجھے خونِ جگر غم نے پلایا — تب والوں کو دنیا میں تو دیتے ہیں دوا سرد
ہاتھوں نے ترے، اُس کو ذرا گرم کیا ہے — تھی ورنہ مری جان، طبیعت میں حنا سرد

اے مصحفی تھا ہم کو بڑا تیرا بھروسا
اک زخم کے لگتے ہی میاں تو تو ہوا سرد

207

غیر سے آشنائیاں تا چند — دیکھیں یہ بے وفائیاں تا چند
نالہ پُر بے اثر ہے، ہم بیمار — آہ، تیری رسائیاں تا چند
ہنس کے بولو کبھی تو ہم سے میاں — جھڑکیاں اور رُکھائیاں تا چند

---

[1] ازروے طب حنا اور کافور کا مزاج درجہ سوم میں بارد ہے۔

میرے اور اُس کے، دیکھیں رہتی ہیں　　درمیاں میں جدائیاں تا چند
میری طاقت پہ، کر نگاہ اے دوست　　نت کی زور آزمائیاں تا چند
بھوں چڑھاؤ نہ مصحفی پہ میاں
اُس سے یہ کج ادائیاں تا چند

208

دانتوں کے روبروٗ ہوئی سلکِ گہر سپید　　آگے لبوں کے جس کے نہ ہووے شکر سپید
کاغذ سمجھ کے اُس پہ بھی ہم کچھ کریں رقم　　ہوں مرغِ نامہ بر کے اگر بال و پر سپید
کرتا ہے ماہ، مثلِ کتاں چاک پیرہن　　جب بر میں کپڑے پہنے ہے وہ سیم بر سپید[1]
اے شامِ ہجر، اب تو کہیں روٗ سیاہ کر　　بس روتے روتے ہوتو گئیں چشمِ تر سپید
بے رنگ ہو گئے ہیں، کچھ اس کا عجب نہیں　　لالہ ہماری خاک سے پیدا ہو گر سپید
اوّل سیاہ روئی کا کر شیخ کچھ علاج　　صابن سے دھو دھو داڑھی کو اتنا نہ کر سپید
روکش جو ہووے صبح بنا گوشِ یار سے　　ہے برگِ نسترن تو کہاں اس قدر سپید
چہرے پہ ایک کے بھی نہ پایا وفا کا رنگ　　اہلِ جہاں کا خون ہوا سر بسر سپید
ہوکر سپید پوش، تو آ پشتِ بام پر　　ہے چاندنی سے، دیکھ تو کیا بحر و بر سپید
سنتا ہے مصحفی تو نہ کھو ان کو رائگاں
تیرا ہر اشک، لعل ہے اے بے خبر سپید[2]

---

[1] یہ مشہور ہے کہ کتاں ایک قسم کا نہایت نازک ریشمی کپڑا ہوتا ہے اور یہ چاندنی میں تار تار ہو جاتا ہے یعنی ماہتاب کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس سے شعرا نے یہ مضمون پیدا کیا ہے کہ کتاں چاند پر عاشق ہے مگر عبدالحلیم شرر نے ''مشرقی تمدن کا آخری نمونہ'' میں لکھا ہے کہ نواب آصف الدولہ نے کتاں کے تھان منگوا کر چاندنی میں پھیلوا دیے۔ ان پر چاندنی کا مطلق کچھ اثر ظاہر نہ ہوا۔ بس یہ نری شاعری ہی ہے اس کا حقیقت سے کچھ سروکار نہیں۔

[2] لعل کا اصلی رنگ سرخ ہوتا ہے، لیکن سفید رنگ کا لعل نہایت کمیاب ہے اور اس لیے بہت قیمتی سمجھا جاتا ہے۔

209

اے دل، سپیدی آئی، ہوئے موئے سر سپید — رو رو کے اب، تو نامۂ اعمال کر سپید

خوں خشک ہو گیا مرا یاں تک کہ وقتِ فصد — نکلا رگِ جگر سے مری نیشتر سپید

یعقوب یوں کہے ہے کہ یوسف سے یہ کہو — ہیں اے پسر، ترے لیے چشمِ پدر سپید

گویا کہ قطرہ خون نہیں اس میں دیکھیو — چہرہ مریض کا ہے ترے کس قدر سپید

تجھ بن یہ رنگ ہے، مری چشمِ پُر آب کا — ہووے کسی کا جیسے سپیدی سے گھر سپید

از بس سیاہی اُس کی نہ اُس سے جدا ہوئی — دیکھا نہ میں کبھی رخِ داغِ جگر سپید

اے اشکِ سرخ کیجیو ٹک اور بھی مدد — تھوڑا سا رہ گیا ہے یہ تارِ نظر سپید

ہم رفتہ رفتہ غم میں ترے پیر ہو گئے — اہلِ سفر کو جیسے کہ کر دے سفر سپید

تعریف کیا کروں ترے دانتوں کی آب کی — اس آب و تاب پر نہیں آبِ گہر سپید

ہو جاویں کل کو لال تو اس کی خبر نہیں — اب تک تو میرے اشک ہیں جیسے گہر سپید

اے مصحفی فراق میں مت ڈھونڈ روشنی
دیکھی ہے کس نے وصل کی شب کی سحر سپید

210

نہ تو ہے لعلِ یار کے مانند — نہ گُل اُس کے عذار کے مانند

گرچہ گل ہے ہزار کے مانند — پر کہاں گل عذار کے مانند

ہے خوش آیند یار کا آنا — موسمِ نو بہار کے مانند

خوں میں تڑپا ہے کون سا بسمل — اس دلِ بے قرار کے مانند

پھر گئیں ہم سے یار کی آنکھیں — گردشِ روزگار کے مانند

جگرِ لالہ داغ ہے، میرے — جگرِ داغ دار کے مانند

رختِ ہستی پہ خوش نہ ہو، کہ یہ ہے — جامۂ مستعار کے مانند

کوئی ناخن لگا جگر پہ مرے　　تو وہ بولے گا تار کے مانند
مل کے دشمن مرے چڑھ آئے ہیں　　مجھ پہ سارے کُمہار کے مانند
میری آنکھوں میں سروِ اُس قدبن　　نظر آتے ہیں دار کے مانند
گرچہ ہے زلف لامِ نستعلیق　　خط ہے خطِ غبار کے مانند
نہیں عاشق کے حق میں لذتِ وصل　　لذّتِ انتظار کے مانند
دیکھ اُس گل کو جب میں کرتا ہوں　قطعہ　گریہ ابرِ بہار کے مانند
اشک آنکھوں سے میری گرتے ہیں　　دانہ ہائے انار کے مانند
مصحفی خاکِ راہ کس کا تھا
اُڑ گیا جو غبار کے مانند

211

زلف ہے گرچہ مار کے مانند　　رخ ہے نقش و نگار کے مانند
یا الٰہی دعا میں کس کی ہے　　ہاتھ میرا چنار کے مانند
اس میں کشتی نہ لا، کہ ہیں یہ سرشک　　قلزمِ بے کنار کے مانند
دلق آتش پہ رکھ، کہ ہوجاوے　　حُلّہٗ زر نگار کے مانند
نہیں تیغِ ولایتی کا خم　　خمِ ابروے یار کے مانند
آخر عیشِ لذتِ دُنیا　　ہے نشے کے اُتار کے مانند
وہ ہے عاشق جو رکھ دے سرتہِ تیغ　　عاشقِ سر گذار کے مانند
چھیڑیو مت کہ یہ دلِ صد چاک　　کھِل رہا ہے انار کے مانند
دل سلگتا ہے کیا مگر میرا　قطعہ　اندک شرار کے مانند
جو دھواں سا جگر سے اُٹھتا ہے　　ناتواں سے غبار کے مانند

نوک سبزے کی اس چمن کے، مرے — دل میں چبھتی ہے خار کے مانند

تربتِ مصحفی کو دیکھا کل
ڈھیر تھا اک مزار کے مانند

212[1]

کیے جس ڈھب سے اس نے چاکِ در بند — وہ کرتا کاش یہ چاکِ جگر بند

بتاں کاوش سے پلکوں کی تمھاری — ہے یاں رگ رگ میں میری نیشتر بند

زبس خونِ غلیظ آنکھوں سے آیا — ہوئیں آخر بہم مژگانِ تر بند

ہم اور دل یوں گرفتارِ بلا ہیں — بہم دو مرغ کے ہوں جیسے پر بند

غرورِ اُس کو لفافے پر نہ لایا — لکھا بھی خط، تو کر بھیجا کمر بند[2]

کئی دن سے پھر اب کچھ ہوگئی ہے — رہِ آمد شُدِ پیغام بر بند

بہ صد خوبی دہانِ تنگ اُس کا — رہا پیوستہ جوں دُرجِ گہر بند

تری بالیں پہ بیٹھا ہے مسیحا
ابھی اے مصحفی آنکھیں نہ کر بند

213

کیا عالم کے مُنھ پر جس نے در بند — فراغت سے وہ بیٹھا چشم کر بند

گئے وے دن، کہ اشک آتے تھے اب تو — گرے ہے کٹ کٹ آنکھوں سے جگر بند[3]

نہیں ہوتا جو دل، تو چٹکیوں میں — مَلا کرتا ہے وہ دو دو پہر بند[4]

بہار آئی، خبر لے اُن کی صیاد — قفس میں تھے ہمارے مشتِ پر بند

---

[1] اس ردیف میں چھ غزلیں ہیں ان میں لفظ بند (ردیف) کس کس طرح استعمال ہوا ہے یہ ملاحظہ طلب ہے۔

[2] کمر بہ معنی پٹکا (یعنی پٹکے میں باندھ کر)۔ [3] جگر بند = جگر کا ٹکڑا [4] بند بہ معنی تکمہ، گرہ

اجابت تک دعا کس رہ سے جاوے — درِ افلاک ہیں شام و سحر بند
کہیں کل چاکِ در سے جھانکتا تھا — رہی تا دیر واں میر نظر بند[1]
مجھے اے مصحفی لکھنے ہیں اشعار قطعہ ذرا اس تاؤ کے، تو لے کے کر، بند[2]
ولیکن قطع میں چھوٹے نہ ہوویں
برابر ہاتھ کے ہو راست[3] ہر بند

214

بہت کیں ہم نے اپنی چشمِ تر بند — ہوا لیکن نہ خوں نابِ جگر بند
مرے سینے میں دل بے تابیوں سے — پھڑکتا ہے پڑا، جوں مرغ پر بند[4]
کیا جب ٹکڑے ٹکڑے اُس نے ہم کو — پڑا تڑپا کیا لوہو میں ہر بند[5]
کمر باندھے ہے میرے خوں پہ ہردم — وہ کافر کرکے زلفوں کو کمر بند[6]
کیا کیوں پرزے پرزے، اس نے قاصد — مرے نامے کا تو تھا مختصر بند[7]
چلی ہے شب جہاں اس زلف کی باؤ — سحرواں رہ گئے ہیں گھر کے گھر بند
مری آنکھوں سے باہر کیوں کے جاوے — کہ طفلِ اشک ہے میرا نظر بند[8]
دمِ شمشیر و تیغِ ناز اُس کا — ہوا ہے دل پہ میرے آن کر بند[9]
دریغ اے مصحفی ہم نے شبِ وصل
نہ کی راہِ شب[10] خونِ سحر بند

215

پھڑک کر کیا کرے وہ مرغِ پر بند — قفس کا جس کے نت رہتا ہو در بند

---

[1] یعنی نظر ٹھہری رہی [2] تاؤ بمعنی کاغذ کا تختہ، اور بند = ٹکڑے [3] راست = ٹھیک
[4] جس کے پر بندھے ہوں [5] ہر عضو [6] کمر میں لپیٹ کر [7] کاغذ کا ٹکڑا [8] اسیر، جس کی نگرانی کی جائے [9] بند ہونا = رک جانا [10] غالباً بہ طور اضافت مقلوبی آیا ہے۔ اس طرح جائز ہے۔

ہے گل دامِ نگاہِ عشق بازاں — یہ بلبل چشم کا تیرا کمربند
مری آنکھوں میں یوں پھرتا ہے وہ شوخ — کسی کو جیسے رکھتے ہیں نظر بند
تری پلکوں کی نازک کاریوں[1] سے — منبت[2] ہے تمام اپنا جگر بند
لگائی جب حنا ہاتھوں پر اُس نے — کیا عالم کا دل خوں، مشت کر بند
یہ بسمل کس کا کشتہ ہے کہ جس کا — تڑپتا ہے پڑا لوہو میں ہر بند
کھلے بندوں گر آ بیٹھے وہ در پر — عجب کیا ہے کہ ہو جا رہ گذر بند
فسانہ رہ گیا دنیا میں باقی — نہ اسکندر رہا، نے اس کا دربند[3]

نہیں زلفوں کے حلقوں میں وہ رخسار
ہوئے ہیں مصحفی شمس و قمر بند

216

اگر کھولے چمن میں اپنے تو بند — وہیں بہنے سے ہوجا آب جو بند
زمیں صیدِ قمرغہ[4] کا ہے میداں — سفر کی راہ ہے یاں چار سوٗ بند
شگفتہ ہی نہیں ہوتا کسی طرح — کہے تو' دل مرا پارہ ہے بو بند[5]
کہیں ہیں، دل میں عاشق کے گرہ ہے — غلط، ہو وے گی کوئی آرزو بند
نہیں مقدور یاں دم مارنے کا — زباں اپنی ہے تیرے روبرو بند
کوئی تیرا گریباں گیر ہوگا — دراز اتنے نہ رکھ جامے کے تو بند
کی اُن نے، روزنِ در کر، گلِ اندود[6] — نگاہوں کی بھی راہِ جستجو بند

---

[1] نازک کاری کتنا بلیغ لفظ ہے۔ [2] بمعنی پھول بوٹے والا۔ [3] دربند = سکندر کے ایک قلعے کا نام جو بحر قزوین کے ساحل پر واقع تھا۔ [4] شکار کا ہانکا۔ یہ غالباً ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اشٹین گاس اسے قمرگاہ کی بگڑی ہوئی شکل بتاتا ہے۔ [5] AIR-TIGHT کے لیے کتنا مناسب لفظ ہے۔ [6] گل اندود کرنا = مٹی سے بند کرنا۔

کیا تھا مصحفی کے زخمِ دل کو قطعہ ابھی جراح نے کر کے رفو بند
سو کروٹ میں وہ ٹانکا کھل گیا ہے
نہیں ہوتا ہنوز اس کا لہو بند

217

کیے اس گل نے جوں جامے کے وابند — چمن کا وو ہیں رستہ ہو گیا بند
چڑھی زنجیریں ہیں پانوؤں میں جن کے — دل ان لوگوں کی الفت کا ہے پابند
چمن میں کس کے آنے سے ہوئی ہے — رہِ آمد شد بادِ صبا بند
دعا میری بھی کیا بر وقت پہنچی — اجابت کا سحر در ہووے تھا بند
جو کوئی وصل کا طالب ہو، خوباں — کریں ہیں تیغ سے اُس کے جدا بند
ملے ڈالیں ہیں دل کو چٹکیوں میں — قیامت ہیں یہ طفلانِ حنا بند
چمن میں مصحفی سا دل گرفتہ
مگر آیا، جو ہو گئی ہے ہوا بند

218

کہاں تلک پھریں اُڑتے اِدھر اُدھر صیاد — تری ہی نذر ہیں اب، لے یہ مشتِ پر صیاد
جنھوں کے دل میں رہا تیری وضع سے کھٹکا — نہ سوئے سایۂ گل میں وہ نیند بھر صیاد
نہ ذوقِ شبنم و گل بھولیں ہم اسیری میں — بجائے دانہ کھلاوے اگر گہر صیاد
کہاں وہ سینہ، کہاں وہ دل اور کہاں وہ جگر — جو تیرے ناوکِ مژگاں کا ہو سپر صیاد
قزاولی[1] تری آنکھوں سے سیکھ جاتے ہیں — ہیں وے جو حق میں غزالوں کے فتنہ گر صیاد
وہ خوں گرفتہ ہوا کو نہ قابلِ فتراک — جو آج دامنِ زیں ہے بہار پر صیاد

---

[1] چھاپہ ماری، گوریلا جنگ، جنگِ گریز۔

خدا کے واسطے چوبِ قفس کو سرخ[1] نہ کر | ہمارے خون پہ باندھی ہے کیوں کمر صیاد
ہزار حیف ہے اُس عندلیب غافل پر | کہ آیا جس کے اوپر، وقتِ بے خبر[2] صیاد
طیور اب ترے ہاتھوں سے کیوں کے ہوں جاں بر | جفا و جور کرے جب تو اس قدر صیاد
چمن میں کون سا ہے آشیانۂ بلبل | کہ جس میں لوہو بھرے نئیں پڑے ہیں پر صیاد

پھر اور کیا ہے سبب مرغِ دل کی وحشت کا
نظر پڑا کوئی اے مصحفی مگر صیاد

219

کیا غم مجھے گو ہووے قفس کا مرے در بند | اُڑ جاؤں قفس لے کے، نہ ہوں گر مرے پر بند
نے جاوے کوئی یاں سے نہ واں سے کوئی آوے | ہے شہرِ بتاں کی رہِ پیغام و خبر بند
ممکن نہیں ہم دیکھ سکیں اور طرف کو | کر رکھا ہے آنکھوں نے تری ہم کو نظر بند
ہوتا ہوں تصور میں ترے جب کہ مُراقب | رہتی ہیں میاں آنکھیں مری دو دو پہر بند
موتی ہی نکالیں گے اگر کھولیں گے ان کو | مانندِ صدف اب تو ہیں یہ دیدۂ تر بند
آساں نہیں اس زلف کے حلقوں سے رہائی | جس زلف کے حلقوں میں کہ ہوں شمس و قمر بند

تنبیہ ہمیں کیوں کے نہ ہووے کہ نظر میں
لگتا ہے چھری سا یہ ترے جامے کا ہر بند

ذ

220

ہم نے بھیجا جو کبھی یار کو لکھ کر کاغذ | گیا برباد ہی مانندِ کبوتر کاغذ

---

[1] ن ۳: بندنہ کر [2] یعنی بے خبری کے وقت

کیا کروں یوں تو تو پڑھتا ہی نہیں خط میرا ہاں مگر لکھ کے لگا دوں ترے در پر کاغذ
نامہ قاصد نے دیا اس کو جو میرا تو کہا: ایسے رہتے ہیں پڑے راہ میں اکثر کاغذ
یوں پتنگوں میں لگا دیتا ہے تو تاؤ کے تاؤ خط ہی لکھنے کو نہیں تجھ کو میسّر کاغذ
نامۂ شوق جو ہردم ہی لکھا کیجیے گا لکھتے لکھتے یوہیں ہو جاوے گا دفتر کاغذ[1]
ہو گئے لختِ جگر آہ سے یوں آوارہ جنبشِ باد سے جوں گل کے ہوں ابتر کاغذ
مصحفی لکھ ورقِ دل پہ تو اس کی تصویر
اس سے دنیا میں نہیں اور کوئی بہتر کاغذ

221

شوق سے لکھیے اگر جانبِ جاناں کاغذ ہو کبوتر کی طرح آپ پَر افشاں کاغذ
ہم فقیروں کو تو کیا چاہیے افشاں کاغذ خط لکھیں اس کو اگر ہو کوئی بھگواں[2] کاغذ
پرزے پرزے جو کوئی ہو سو لکھے نامۂ شوق بھیجنا یار کو ایسا نہیں آساں کاغذ
لکھ کے رونے کا سخن، اُس کو اُڑا دیجیے اگر ابر کی طرح ہوا میں کرے طوفاں کاغذ
خط پہ خط نت جو لکھے جاتے ہیں معشوقوں کو شہرِ عشاق میں کیا ہو گئے ارزاں کاغذ
دردمندوں کا ترے نامہ جو پہنچے تجھ تک کھولے اس کو، تو کرے نالہ و افغاں کاغذ
خط لکھوں اس کو اور افسوس نہ ہووے تزئین خون رو رو کے کیا چاہیے افشاں کاغذ
ان پہ کیا کیا نہ حکایت میں لکھی سرخی سے لختِ دل کے ہوئے سب صرف گلستاں کاغذ
مصحفی نام ہے دیوان کا، ہاں ہیں تو سہی
ورقِ گل کی طرح چند پریشاں کاغذ

222

کہتے ہیں وصل کی شب جس کو ہو وہ رات ہے شاذ ساتھ عاشق کے غرض اُس کی ملاقات ہے شاذ

---
[1] ن۳: ہو جاویں گے [2] بھگواں = پیلے رنگ کا (مراد معمولی)

رہ میں ہر چند کہ مل جاوے، ولے از رہِ لطف　　پوچھے وہ بات مری گاہے، سو یہ بات ہے شاذ
مدّعی پھر کبھی عرصے میں نہ آنا ہرگز　　یار پلییں، اسے[1] کہتے ہیں، کہ یہ مات ہے شاذ
شور ہے اشک کے باراں کا مرے، عالم میں　　چشم وا کیجے تو البتہ یہ برسات ہے شاذ

مصحفی صرف نہ کر اُس پہ تو اوقات کہ واں
مطّرد[2] ہے ستم اور لطف و عنایات ہے شاذ

223

بہارِ گل نہ رہی اس قدر چمن میں دیر　　کہ بیٹھے دل زدہ کوئی سایۂ سمن میں دیر
ہوا تو آکے سب اسبابِ غسل آمادہ　　شہیدِ عشق کے پھر کیا ہے اب کفن میں دیر
مری مجال ہے مل کر اُٹھو نہ واں سے شتاب　　ملک نہ بیٹھ سکے جس کی انجمن میں دیر
میں لکھ کے خط کوئی قاصد وطن کو گر بھیجا　　لگائی اس نے بھی جا کر بہت وطن میں دیر
بھلا تمیز تو کر بوے مشک و گیسو میں　　رہی ہے، بادِ صبا تو بھی تو ختن میں دیر
میں اس پتنگ کے جی دینے کا ہوں دیوانہ　　جو گر کے شمع سے تڑپا کیا لگن میں دیر
میاں نہ تیغ علم کیجو، کہ کہتے ہیں　　ابھی جراحتِ دل کے ہے بہ شدن[3] میں دیر
میں سینہ چاک کی گل، تجھ کو دیکھ لیتا ہائے　　رہا نہ ہاتھ مرا چاکِ پیرہن میں دیر
یہ عشق وہ ہے کہ جب اپنے وعدے پر آیا　　ہوئی نہ تیشے سے پھر قتلِ کوہکن میں دیر
خط آئے پر بھی نہ چھوٹا مرا دلِ قیدی　　رہا اسیر تری زلفِ پُر شکن میں دیر

---

[1] پلییں = شطرنج کی اصطلاح، یعنی وہ مات جو پیل کی شے سے ہوتی ہے۔ [2] مطّرد = قاعدے کے مطابق معمولاً
[3] اچھے ہونے میں۔

رفوے چاکِ گریبانِ گل کر، اے ناصح　　ابھی ہمارے تو ہے چاکِ پیرہن میں دیر

گئے کہاں تھے میاں مصحفی، بتاؤ تو
لگائی رات بہت تم نے انجمن میں دیر

224

اس تیغ زن کو یارو، مرے دل سے کیا خبر　　قاتل کو بے قراریٔ بسمل سے کیا خبر

بے دل جو کوئی ہوا تو اُسے دل سے کیا خبر　　ڈوبے ہوئے کو بحر کے ساحل سے کیا خبر

ہم کو تو یار[1] ذبح کیا، اُس کے ہجر نے　　قاصد تو کہہ تو لایا ہے قاتل سے کیا خبر

مُنھ اُٹھ گیا جدھر کو، اُدھر ہی چلے گئے　　آوارگانِ شوق کو منزل سے کیا خبر

پوچھو نہ جا کے شیخ سے یہ مسئلہ کوئی　　اُس بے تمیز کو حق و باطل سے کیا خبر

مجنونِ دشت گرد ہی واقف جو ہو تو ہو　　ہر راہ رو کو لیلیٰ کے محمل سے کیا خبر

شمعِ شبِ فراق بنے ہم تو مصحفی
ہم دل جلوں کو عیش کی محفل سے کیا خبر

225

آخر گئے ہی تجھ کو وہ بے وفا سمجھ کر　　تیری گلی میں عاشق آئے تھے کیا سمجھ کر

کافر مجھے نہ کہیو، اے مومنانِ صادق　　کرتا ہوں بت کو سجدہ، میں تو خدا سمجھ کر

نامے کو اُس کے پڑھ کر، اوّل تو خوش ہوا تھا　　آخر کو رو دیا میں، کچھ مدّعا سمجھ کر

ایسا نہ ہو کہ جاوے برباد خاکِ عاشق　　رکھیو گلی میں اُس کی، پانو اے[2] صبا سمجھ کر

بیگانگی سے اس کی واقف نہ تھا میں ہرگز　　میں اُس کو دل دیا تھا، یار آشنا سمجھ کر

---

[1] ن ا: مار ذبح کیا۔　[2] یہاں بھی پانو کا املا ملاحظہ طلب ہے، اگر یہ بروزن فعلن ہوتا تو 'اے' کی ضرورت نہ تھی "پانو اے" کا وزن فعلن ہو رہا ہے۔

ہم نے تو حال دل کا سبب خوب ہی لکھا ہے — من بعدِ مرگ لیکن کس نے پڑھا سمجھ کر
نظروں میں ایک بوسہ مانگا تھا ہم نے اس سے — اس نے بھی زیرِ لب ہی کچھ کچھ کہا سمجھ کر
زلفوں سے اس کو مل کر، شانے نے حظّ اٹھایا — ہم ڈر کے دوُر بھاگے اُن کو بلا سمجھ کر
اے مصحفی وہاں سے جیتا نہ کوئی آیا[1]
اس کی گلی میں پیارے، جاہے تو جا سمجھ کر

226

راتوں کو تو گلیوں میں نہ اے ماہ لقا پھر — باز آ کہیں، ان چالوں سے از بہرِ خدا پھر
اپنا بھی یہ چہرہ گلِ خورشید کے مانند — رُخ یار کا جیدھر گیا، اُودھر ہی گیا پھر
گر رخصتِ یک آہ میں لی دل سے تو یارو — دیکھو گے کہ جاوے گی زمانے کی ہوا پھر
یہ دیدۂ تر روے ہیں کہ گر جوش پر آویں — دریا کو کہیں: تو مری لہروں میں بہا پھر
اے مصحفی رسوائی ہے ان باتوں میں ناداں
جوں سایہ تو اُس شوخ کے پیچھے نہ لگا پھر

227

سر کھول کے کافر نہ نہا نہر کے اوپر — ان باتوں سے آوے گی بلا شہر کے اوپر
دیکھو گے یہ سب سلسلے ہو جائیں گے برہم — کر آ گئی وہ زلفِ سیہ لہر کے اوپر
بے طرح جھڑی باندھی ہے اِس دیدۂ تر نے — طوفان نہ نازل ہو کہیں دہر کے اوپر
یہ بھی کوئی غصہ ہے، مری جان کھپے ہے — کم بخت پڑے قہر، ترے قہر کے اوپر
اے مصحفی ہے لذتِ دنیا سمِ قاتل
کس واسطے مرتا ہے تو اس زہر کے اوپر

---

[1] ن ۴: جیتا کوئی نہ آیا ع ۲ جاے تو جا

228

ہے اُس کی، آئینے میں خط و خال پر نظر
کرتا ہے کب، ہمارے وہ احوال پر نظر

اٹھکھیلیوں سے کتنوں کو پامال کر دیا
کیجیو خدا کے واسطے اس چال پر نظر

گر دیکھیے بہار، دلِ داغ داغ کی
طاؤس کے نہ کیجیے پر و بال پر نظر

اک حشر تازہ ہووے گا دیوانِ حشر میں
جب ہم کریں گے نامۂ اعمال پر نظر

قلیاں ہوا ہے جب سے لبِ یار کا ندیم
مشتاقِ بوسہ رکھتے ہیں: مُہنال[1] پر نظر

رو رو کے خونِ دل، شفقی اُس کو کر دیا
ٹک چشمِ تر کے کیجیو رومال پر نظر

اتنا یہ دل غنی ہے، کہ بندے کی مصحفی
نے چشم جاہ پر، نہ زر و مال پر نظر

229

یار یہ دونوں اگر کم ہوں، تو کم ہی بہتر
نہ ترا پیار بھلا، اور نہ ستم ہی بہتر

راستی خوب تو ہے، لیک نہ ہر جاے دل
اُس کی وہ زلفِ گرہ گیر تو خم ہی بہتر

سر بچا کر جو تری تیغ کا لے ہاتھ پہ وار
واۓ اُس ہاتھ پہ، وہ ہاتھ قلم ہی بہتر

وصل میں ہجر کا دھڑکا ہی لگا رہتا ہے
ایسی شادی سے دلا، ہم کو وہ غم ہی بہتر

یک دو دَم بیش نہیں، گلشنِ ہستی کی بہار
اِس سے تو، سیرِ گلستانِ عدم ہی بہتر

اور نافہم کوئی، جان مری کیا سمجھے
کہ سمجھتے ہیں تری بات کو ہم ہی بہتر

مصحفی، خارِ گلستاں میں کہاں ایسی بہار
اشکِ گلگوں سے تری، ہر مژہ نم ہی بہتر

---

[1] حقے کی نے کا وہ حصہ جسے منھ میں لے کر کش لیا جاتا ہے۔

230

مقتل میں لائی جب مجھے تقدیر کھینچ کر — جلّاد سر پہ آگیا شمشیر کھینچ کر
تھا دیدنی ہی حال مرا، تب[1]تو رہرواں — اُس کو سے لے گئے مری تصویر کھینچ کر
کیا جانیں یہ سلوک، مریدوں کو راہ پر — لاوے نہ جب تلک کشش پیر کھینچ کر
ان کی بھی کچھ خبر ہے تجھے، وے جو مر گئے — کوچے میں تیرے نالۂ شب گیر کھینچ کر
اُس خوش مژہ کے سامنے جو کوئی آگیا — مارا کمانِ ابرو سے اک تیر کھینچ کر
پھر اس طرف کوئی نہ گیا، جب کہ لے گئے — اس کو سے میری لاش بہ تشہیر کھینچ کر

جاتا تھا اپنے پانو میں کاہے کو مصحفی
زنداں میں لے گئی مجھے زنجیر کھینچ کر

231

لائی تو یاں تلک مجھے تقدیر کھینچ کر — پھر دیر کیا ہے، آیئے شمشیر کھینچ کر
صانع نے، ہاتھ سے قلمِ صنع رکھ دیا — اُس حسنِ لایزال کی تصویر کھینچ کر
میں کس قطار میں ہوں، جہاں مجھ سے سیکڑوں — مرمر گئے اذیّتِ زنجیر کھینچ کر
مت کھینچ سر کو تیر کے یوں ورنہ تو، میاں — پچھتائے گا، جگر سے مرے تیر کھینچ کر

اس دشتِ پُر خطر میں بہت ہم سے ناتواں
رہ رہ گئے ہیں دامنِ رہ گیر کھینچ کر

232

اس قدر بھی تو، مری جان نہ ترسایا کر — مل کے تنہا تو گلے سے کبھی لگ جایا کر
دیکھ کر ہم کو، نہ پردے میں تو چھپ جایا کر — ہم تو اپنے ہیں میاں، غیر سے شرمایا کر

---

[1] ن۳: تب

یہ بری خو ہے دلا تجھ میں، خدا کی سوگند — دیکھ اُس بت کو، تو حیران نہ رہ جایا کر
ہاتھ میرا بھی جو پہنچا[1] تو میں سمجھوں گا خوب — یہ انگوٹھا تو کسی اور کو دکھلایا کر
گر تو آتا نہیں ہے عالمِ بیداری میں — خواب میں تو کبھی اے راحتِ جاں آیا کر
اے صبا اوروں کی تربت پہ گل افشانی چند — جانبِ گورِ غریباں بھی کبھی آیا کر
ہم بھی اے جانِ من اتنے تو نہیں ناکارہ — کبھی کچھ کام تو ہم کو بھی تو فرمایا کر

تجھ کو کھا جائے گا اے مصحفی یہ غم اک روز
دل کے جانے کا تو' اتنا بھی نہ غم کھایا کر

233

یوں کہہ کے گیا دل تو مجھے یاد کیا کر — بیٹھا ہوا غم میں مرے فریاد کیا کر
یک بار اڑا دینے میں کیا لطف ہے صیاد — تو پوچھ کے ہم سے، ہمیں آزاد کیا کر
کیا ایسی حیا ہے، نہ تبسّم، نہ نگاہے — گاہے تو ہمارا بھی تو دل شاد کیا کر
ظاہر نہ کہا کر تو، مرے قتل کو اُس سے — آنکھوں میں اشارہ سوے جلّاد کیا کر
کیا خو ہے تری باد صبا یہ بھی پرے ہو — مت خاک ہماری کو تو' برباد کیا کر
کیا ذکر ہے، ہم شیخ تری باتوں میں آویں — تو اپنے مریدوں ہی کو ارشاد کیا کر

ڈرتا ہوں کہ تیرا کہیں سینہ نہ تڑق[2] جائے
اے مصحفی اس طرح نہ فریاد کیا کر

234

باندھ آیا تھا کمر وہ دشمنِ جاں کھینچ کر — کتنا پچھتائے ہیں ہم، کل اس کا داماں کھینچ کر

---

[1] ہاتھ پہنچا = دسترس ہوئی، شعر میں صرف ہاتھ، پہنچا اور انگوٹھے کی رعایت ہے۔
[2] یہ تڑقنا خالص اردو کی بولی ہے۔

میں لگا سر پیٹنے کو، رات جس دم لے چلی ... دل کو میرے خواہشِ زلفِ پریشاں کھینچ کر

آج اُس وحشی نے، پھر لی راہ صحرا، ہم جسے ... کل بہ خواری لے گئے تھے تا بہ زنداں کھینچ کر

رحم کر گورِ غریباں کی بھی مشتِ خاک پر ... چل نہ یوں دامن کو اے سروِ خراماں کھینچ کر

اُڑ نہ جاوے ہاتھ سے تیرے مرا یہ مرغِ دل ... باندھیو ٹک اُس کے پر، اے طفلِ ناداں کھینچ کر

کچھ نہیں معلوم ہوتا ہم کو جرمِ مصحفی
لے چلے ہیں یار کیوں اس کا گریباں کھینچ کر

235

کندن سے نورتن کی پھبن دیکھ ڈنڈ پر ... پھر آ گیا ہے وہ بتِ کافر گھمنڈ پر

از بس خضاب دوست ہیں شدت سے شیخ جی ... رہتی ہے اُن کے ہاتھوں سے آفت ارنڈ[1] پر

اچھا ہو کس طرح سے مرا داغِ دل، کہ یاں ... ناخن سے نت خراش رہے ہے کھرنڈ پر

کر دل کے آئینے کو مرے صاف اینٹ[2] سے ... موقوف کچھ جلا نہیں اس کی کُرنڈ پر[3]

اے مصحفی میں بیٹھ کے کیا واں غزل پڑھوں
جائے کہ لاکھوں گردنیں ہلتی ہوں کھنڈ[3] پر

236

مُنھ سے برقع کو مری جاں نہ اُتارا آخر ... کام در پردہ کیا تم نے ہمارا آخر

موجِ دریا کی طرح اینٹھو ہو اب کاہے کو ... لو جی ہم نے ہی کیا تم سے کنارا آخر

---

1. خضاب میں استعمال ہوتا ہے۔ 2. پہلے آئینے لوہے پر قلعی کر کے بنائے جاتے تھے، اس لیے ان کی صفائی بھی اینٹ سے رگڑ کر ہوتی تھی، یہ لفظ آئینہ بھی غالباً آہن ہی سے مشتق ہوا ہے۔ سان کا پتھر۔

3. کھنڈ، مقامی بولی میں نظم کی ہوئی طویل اور مسلسل داستانیں ''کھنڈ کاویہ'' کہلاتی ہیں جیسے آلھا اودل کی داستان بھی کھنڈ ہے۔ یہاں مراد سامعین کی بدذوقی ہے۔

اوّل عمر میں دیکھا اُسے جس نے یہ کہا　　　کام آتش کا کرے گا یہ شرارا آخر
جس سے دیں آنکھیں ملا اُس صنمِ کافر نے　　　اتنا گھورا کہ اُسے جان سے مارا آخر
دوستاں مصحفیؔ خستہ کا کیا کیجے علاج　　　قطعۂ غمِ خوباں سے مُوا ہے یہ بچارا آخر
سوچ کر بہرِ خدا تم بھی تو کچھ بتلاؤ
کار افتادہ باین قوم شمارا آخر

237

جس بت نے نہ باندھا کبھی زنّار کمر پر　　　اُس بت کے بھی[1] رہتی ہے تلوار کمر پر
شملہ وہی، جو ہووے باندازۂ شیخی　　　پھر دُم ہے، جو لٹکا سرِ دستار کمر پر
کب شاخِ گُل اس طرح لچکتی ہے ہوا سے　　　کرتا نظر اُس کی دم رفتار کمر پر
کیا دخل ہے بھلے کا، مجھے رشک ہے یارو　　　اپنا بھی دھرے ہاتھ اگر یار کمر پر
شوریدہ سری اس کی تو بے وجہ نہیں ہے　　　عاشق ہے تری زلف کا ہر تار کمر پر
اتنا ہے وہ آوارہ کہ جب دیکھوں ہوں اُس کو　　　ہے پیچ گلے میں، سرِ دستار کمر پر
اے مصحفیؔ مو چشم میں سوزن کی تبر ہے
مت آنکھ کو سی اُس کی تو، زنہار کمر پر

238

تیروں پہ تیر کھا کر زخموں پہ زخم اُٹھا کر　　　آئے تری گلی سے ہم خون میں نہا کر
ہے ٹھوکروں سے تیری مُردوں کے دل کو صدمہ　　　محشر خرام میرے ٹک راہ سے چلا کر
پیارے یہ دشمنی ہے، کچھ دوستی نہیں ہے　　　پلکوں کو پھیر لینا، یوں انکھڑیاں ملا کر

---

[1] ن ۳: اب اس کے

ٹک گھور کر جو دیکھا ظالم نے، ڈر کے مارے کل وو ہیں پی گیا میں، آنکھوں میں آنسو لا کر
مت اس چمن کے، یارو تم گل کا رنگ پوچھو آئے ہیں جس چمن سے ہم آشیاں جلا کر
پیارے یہ دیدہ بازی تم کو نہیں ہے اچھی مُنھ دیکھ آئینے میں اپنا ٹک اک حیا کر
اے مصحفی یہ آنسو ضائع نہ ہونے پاویں
پلکوں سے گر گریں تو دامن میں لے لیا کر

239

یہ دلّی کا نقشا سنوارا زمیں پر قطعہ کہ لا عرش کو یاں اُتارا زمیں پر
قسم ہے سلیماں کی، پیشیں زماں میں یہیں پریوں کا تھا گذارا زمیں پر
میں وہ سنگِ رہ ہوں کہ جو ٹھوکروں میں پھرے ہر طرف مارا مارا زمیں پر
فلک نے جو اپنے تئیں دور کھینچا یہ حرکت[1] ہوئی ناگوارا زمیں پر
زمیں کٹ نہ جاوے مرے آنسوؤں سے چلے ہے سدا یہ دو دھارا زمیں پر
میں آنکھوں کا تیری عجب رنگ[2] دیکھا نظارہ فلک پر، اشارا زمیں پر
سرِ خصم ہو زیبِ فتراک، ہے ہے پھرے لوٹتا سر ہمارا زمیں پر
جو چاہے کرے فکر، اچھی زمیں میں نہیں ہے کسی کا اجارا زمیں پر
جہاں سُم پڑا تیرے گھوڑے کا، اُس جا ہوا جلوہ گر چاند سارا زمیں پر
کیا بے ستوں میں، جو میں جا کے نالہ بہا آب ہو سنگِ خارا زمیں پر
چلا شب وہ مجلس سے اُٹھ کر تو وو ہیں قیامت ہوئی آشکارا زمیں پر
گیا ہاتھ سے دل جو میرا، تو پھر وہ پھرا لوٹتا جیسے پارا زمیں پر
ترے کشتے کہتے ہیں آنکھوں سے تیری نظر کیجیو ٹک خدا را زمیں پر

---

[1] حرکت بہ تسکین دوم نظم ہوا۔ [2] ن ۳: ڈھنگ

کوئی مصحفی کو اُٹھاتا نہیں ہے
پڑا ہے موا یہ بچارا زمیں پر

240

گرداب کی ہو جیسے گل و سرو و سمن سے دور
وہ نالہ کھینچے کہ جو پہنچے چمن سے دور

غیروں سے اختلاط رہا اس کو تا سحر
ہم ساری رات بیٹھے رہے انجمن سے دور

ہر اک گلی میں ہوویں اگر سیکڑوں کے خوں
نامِ خدا کہ کچھ نہیں اس بانکپن سے دور

کیا گردشِ فلک سے گلہ ہے، کہ لے گئی
ہم کو تو تیری چشم کی گردش وطن سے دور

چاہا تھا چٹکی لوں میں، کہ اتنے میں بول اُٹھا:
چل بے، رکھ اپنے ہاتھ کو میرے بدن سے دور

اے شمع جائے رحم ہے حال اُس پتنگ کا
پابوس کی ہوس میں مُوا جو لگن سے دور

مدفوں کا تیرے کھوج نہ ثابت ملا، مگر
اک چند استخواں تو پڑے تھے کفن سے دور

اُس بت کو مصحفی سے ملا دے مگر[1] خدا
کیا لطف ہے جو ہووے صنم برہمن سے دور

241

پتھر پہ جب گرے ترے ہاتھوں سے چھوٹ کر
روو ے نہ کیوں کے شیشہ بھلا پھوٹ پھوٹ کر

اس آہِ شعلہ بار کو یا رب یہ کیا ہوا
اک بار رہ گئی جو ہوائی[2] سی چھوٹ کر

غافل خبر لے جلد، کوئی تیری راہ میں
کہتے ہیں، رہ گیا ہے ابھی سینہ کوٹ کر

مدّت سے شہرِ دل کا مرے، بے چراغ ہے
کیا جانے لے گیا ہے اسے کون لوٹ کر

---

[1] ن۳: کہیں خدا۔ [2] ایک طرح کی آتش بازی، جسے ''نری'' بھی کہتے ہیں۔ یہ زمین سے چھوٹ کر آسمان کی طرف جاتی ہے۔

مت مصحفی کے دل کو پٹک اپنے ہاتھ سے
وہ آئینہ نہیں کہ بنے پھر یہ ٹوٹ کر

242

زلف کا چھٹنا ترے رخسار پر　　ہے گھٹا کا جھومنا گلزار پر
سیکڑوں کے، دم میں ہو جاتے ہیں خون　　اُس گلی میں، سایۂ دیوار پر
اس چمن میں اپنی ہستی کی مثال　　قطرۂ شبنم ہے نوکِ خار پر
مصحفی کرتا ہے کوئی نالہ فاش
آستیں رکھ دیدۂ خونبار پر

ز

243

شاید ہوئی نہیں مری حاجت روا ہنوز　　سوے فلک دراز ہیں دستِ دعا ہنوز
اُس گل کو سینہ چاکیٔ عاشق سے کیا خبر　　اس باغ کی لگی نہیں اس کو ہوا ہنوز
اک دن ہلا دیا تھا کسی کی نگاہ نے　　آیا نہیں ہے تب سے مرا دل بجا ہنوز
گو دور ہوں میں تجھ سے، تو مجھ کو جدا نہ جان　　کم بخت دل مرا، ہے ترا مبتلا ہنوز
بیگانگی میں کیوں کے کروں، ہائے دل کے بیچ　　کرتی ہے سیر وہ نگہِ آشنا ہنوز
دیکھا تھا ایک دن کہیں اُس گل کو باغ میں　　آوارۂ چمن ہے نسیمِ صبا ہنوز
ہاتھوں سے اُس کے رنگِ حنا اُڑ گیا، ولے　　تڑپیں ہیں خوں میں کشتۂ رنگِ حنا ہنوز
اے دیدہ خوب رو لے[1] کہ اس نو بہار میں　　ہر اک پلک سے تیری نہیں خوں بہا ہنوز

---

[1] ن۳: رو تو

دیکھا تھا مصحفی نے کہیں اُس کو ایک دن
پھرتا ہے کوچہ کوچہ وہ سر پیٹتا ہنوز

244

ہے دلبروں میں تو ہی عاشقوں کا اک خوں ریز
لہو بھرا ترا دامن ہے ہم کو دستاویز

ہو جیسے جامِ بلّوریں میں بادۂ گلگوں
قدح ہر اشک کا یاں خونِ دل سے ہے لبریز

اُٹھا غبار تو وہ بھی ہوا مشابہٗ خط
سوائے ہند کے دیکھی نہ خاکِ قاتل خیز

لگیں نہ کیوں لبِ معشوق دل میں عاشق کے
کہ اُس کے ناوکِ مژگاں تو ہیں بھی سر تیز

شفا نصیب مرے کیوں کے ہو کہ اے یارو
رحیم دل[1] ہے طبیب اور میں ہوں بد پرہیز

گیا تھا لے مجھے دل، رات کوے جاناں میں قطعہ جو واں میں بیٹھ گیا پڑھ کے شعرِ درد آمیز

پکڑ کے ہاتھ یہ کہنے لگا کہ اے ظالم
یہ کون جاے نشستن ہے، مصحفی برخیز

245

بادل سے برستے ہیں مرے دیدۂ تر روز
ساون کا سا گذرے ہے، میاں مجھ پہ تو ہر روز

اغیار کی مجلس میں جو تم جاتے ہو شب کو
آ رہتی ہے اس بات کی ہم تک بھی خبر روز

باتوں میں لگائے ہی مجھے رکھتا ہے ظالم
وعدے وہی جھوٹے ہیں وہی، شام و سحر، روز

میں اپنی ہی کچھ زیست سے جیتا ہوں وگرنہ
بندھ رہتی ہے قاتل کی، مرے خوں پہ کمر روز

اے غیرتِ خورشید یہ روپوشی کہاں تک
برقع کو اُٹھا، میری شبِ تار کو کر روز

اے مصحفی اس کوچے میں دل بس کہ لگا ہے
جاتے نہیں، اور کرتے ہیں ہم عزمِ سفر روز

---

[1] رحیم دل بمعنی رحم دل

246

وہی ٹھوکر ہے اور وہی انداز　　اپنی چالوں سے تو نہ آیا باز

کس طرف کو کرم کیا کوئی دم　　آیئے بیٹھیے نہ، بندہ نواز

دیکھتے ہی پرِ گلہ اُس کا　　ہوش عنقا کے کر گئے پرواز

اس کا آہستہ بولنا ہے غضب　　تس پہ ہے قہر نرمیٔ آواز

قصۂ عشق ہے وہ طول و طویل　　جس کا انجام ہے نہ کچھ آغاز

کہیں مطلوب کا نشاں نہ ملا　　ہم نے عالم میں کی بہت تگ و تاز

رازِ دل کس سے کہیئے حیراں ہوں　　نظر آتا نہیں کوئی ہم راز

آنکھیں جب کھل گئیں، زمانے کے　قطعہ　ہم نے دیکھے بہت نشیب و فراز

نہیں معلوم آگے آگے ہمیں　　کیا دکھاویں یہ طالعِ ناساز

مرتبہ دیکھ کر سخن کا مرے　　رہے حیراں سبھی سخن پرداز

جب سے ہم مانگنے لگے ہیں دعا　　در اجابت کا ہوگیا ہے فراز

یہ بھی قسمت کہ تیری مجلس میں　　ہم ذلیل اور غیر ہوں ممتاز

تیری صورت کو جب سے دیکھا ہے　　خاک شو ہوگئے ہیں آئینہ ساز

زلف جھک کر سلام کرتی ہے　　رخ کو، اور رخ کہے ہے عمر دراز

میری تربت پہ آ خراماں ہو　　سرکشی چھوڑ، اے بتِ طنّاز

تیغ سے ایک کو نہ مارا ہائے　　میں تو ہوں ان بتوں کا کشتۂ ناز

اے صبا اُس گلی میں گر جاوے　　کہیو میرا بھی تو سلامِ نیاز

مصحفی لکھنؤ میں دلّی سے　قطعہ　آیا طے کرکے راہِ دور و دراز

لیکن اس خاک میں بھی اُس نے کہیں
کچھ نہ دیکھا بہ جز نشیب و فراز[1]

---

[1] لکھنؤ کے محلّوں میں نشیب و فراز بہت ہیں، بعض علاقے بلندی پر واقع ہیں، بعض پستی میں۔

247

آچکا خط پہ سرِ مو نہ گیا ناز ہنوز — ہے اُسی ڈھب پہ نگاہِ غلط انداز ہنوز

دل و دیں لے تو چکے اب کہو کس کی خاطر — سرمہ آلودہ ہیں یہ چشمِ فسوں ساز ہنوز

کوچۂ یار سے آئی ہے مگر صبح نسیم — باغ میں گل کے جو ہیں بندِ قبا باز ہنوز

بے پر و بال کیا، تو بھی قفس میں مجھ کو — چین دیتی ہی نہیں شوخیِ پرواز ہنوز

لگ گیا تھا کہیں ہاتھ اُس کا ذرا مستی میں — پردۂ دل سے مری آتی ہے آواز ہنوز

ان کے ہاتھوں سے کہاں جاؤں کہ اُس مجلس میں — ذکر میرا ہی کیے جاتے ہیں غمّاز ہنوز

گرچہ اس کوچے میں جاتا نہیں میں تو بھی ولے — کچھ نہ کچھ بات لگا[1] رہتے ہیں غمّاز ہنوز

ہوں میں اے مصحفی آئینہ تہِ زنگ ولے
مجھ سے غافل ہے مرا آئینہ پرداز ہنوز

س

248

روکش ہے ترے حسن سے، نے زُہرہ نہ برجیس — کی حق نے عطا تیرے تئیں صورتِ بلقیس

کچھ کم نہیں پھوڑے سے یہ دل میری بغل میں — گر راتوں کو کُلتا[2] ہے، تو ہے دن کی وہی ٹیس

جس دن سے میاں عید کا تو چاند ہوا ہے[3] — روتے ہی گزرتے ہیں تری یاد میں دن تیس

باخاک برابر تو ہوئے ہاتھ سے تیرے — ہم سوختہ جانوں کو فلک، اتنا بھی مت پیس

اس سینے میں جو چاک ہے بے صرفہ دیا ہے — اس سینے میں کیا کام کرے سوزنِ ادریس[4]

---

[1] ن ۱: پڑھا رہتے ہیں۔ (تصحیح از ن ۳)۔ [2] کُلنا، زخم میں درد کی تپک۔ [3] عید کا چاند ہونا = بہت کم نظر آنا، غائب رہنا۔ [4] نام پیغمبر، لیکن سوزن کی تلمیح حضرت عیسیٰ کے ساتھ آتی ہے۔

دل لے گیا ہے ہاتھ سے کل میرے جو لڑکا ڈرتا ہوں کہ رسوا نہ کرے، ہے وہ اک ابلیس

جاتے ہیں اگر پیر و جواں سیرِ چمن کو
اے مصحفی جاویں، ہمیں اس بات سے کیا ریس

249

پہلو ہے مرا گرم بہ فرشِ پرِ طاؤس ہوں داغوں کی کثرت سے میں ہم بسترِ طاؤس

ہے شعلۂ پُر دود، دل اپنا کہ ہوا ہے گہ تاجِ خروس اور گہے افسرِ طاؤس

اُڑتے ہیں ان آہوں سے جو راتوں کو شرارے آتا ہے ہوا بیچ نظر لشکرِ طاؤس

کیا نام رکھوں اس کا کہ یہ داغ دل اپنا فلسِ پرِ ماہی ہے، نہ فلسِ پرِ طاؤس

نیرنگیِ افلاک کو جس دن سے لکھوں ہوں ہے خامہ مرا نقش کشِ پیکرِ طاؤس

سو مُہر سے داغوں کو مزیّن ہے وہ سارا محتاج گواہی نہیں کچھ مُحضرِ طاؤس

یوں اس دلِ سی پارہ میں ہیں، داغ بتاں کے جس طرح کہ مصحف میں دھرے ہوں پرِ طاؤس[1]

آنے کی ترے سن کے خبر، صحنِ چمن میں جاروب کشی کرتے پھریں ہیں پرِ طاؤس

گلشن میں نہ رہتا وہ، اگر کوئی ذرا بھی ہوتا ترے کوچے کی طرف رہبرِ طاؤس

صوفی ہے تو ہنگامِ خوشی گریہ کیا کر کہتی ہے گہہ رقص یہ چشمِ ترِ طاؤس

کیا ذکر کرے پھر کوئی زیبائی کا اس کی جاے کہ ترا جلوہ ہو غارت گرِ طاؤس

اے مصحفی رعنا نہیں محتاجِ تکلّف
بال و پرِ طاؤس ہیں خود زیورِ طاؤس

250

نیرنگی ہے کس کی یہ چمن گسترِ طاؤس لائے ہیں جو یہ رنگ ہزاروں پرِ طاؤس

---

[1] مور کے پر قرآن شریف میں بہ طور نشانی رکھنے کا رواج قدیم سے رہا ہے۔

گل کھائے ہیں[1] ازبس کہ ترے عشق میں، میں نے ساعد نظر آتا ہے مرا شہ پرِ طاؤس
کیوں آنکھ اُٹھاوے کوئی آئینوں سے اس کے کچھ جوہرِ آئینہ نہیں جوہرِ طاؤس
رکھتا ہے جو کچھ، جوں زرِ گل اس کو اُڑا دے پر سو جگہ گانٹھ نہ دے جوں زرِ طاؤس
کب نکلا میں نیرنگیٔ رفتار سے اُس کی ہر نقشِ قدم جس کا ہے غارت گرِ طاؤس
شیطاں سے نہ غافل ہو کہ یہ تا درِ فردوس[2] گہ مار کی صورت ہے گہے پیکرِ طاؤس
گر وہ بتِ طنّاز ہو گلشن میں خراماں کیا دوٗر، کرے اُس کی جلو[3] لشکرِ طاؤس
فانی نہیں جس چیز کا محکم ہو علاقہ برباد میں جاتا نہ سُنا افسرِ طاؤس
طاؤس کا خوں مفت کیا، جس نے بنایا دستہ ترے خنجر کا برنگِ سرِ طاؤس
اے مصحفی اک وضع نہیں رنگ فلک کا
ہے دن کو پرِ زاغ تو شب کو پرِ طاؤس

251

یار کرتا نہیں، نگاہ افسوس چشم پوشی سے اُس کی آہ افسوس
میں نہ دیکھا رُخ اُس کا آہ افسوس کر گیا جھانک کر نگاہ، افسوس
تو نے میری طرف کو، اے گمراہ نہ غلط کی کبھو بھی[4] راہ، افسوس
ایک خط بھی نہ یار تک پہنچا مفت کاغذ کیے سیاہ، افسوس
دل مرا اُس کو چاہتا ہے، ولے اُس کو میری نہیں ہے چاہ، افسوس

---

[1] گل کھانا = محبت کی نشانی کے طور پر انگوٹھی یا چھلے کو آگ میں گرم کر کے داغ لگایا جاتا تھا۔ اس کا ذکر واجد علی شاہ کی تصنیف ''پری خانہ'' میں بھی متعدد جگہ ملے گا۔ اسی سے ''گل چھرے اڑانا'' اردو کا محاورہ بنا ہے۔ رے اور لام کی آوازیں متبادل ہیں، چھلے کا لام یہاں رے بن گیا ہے۔

[2] یہ ایک تلمیح ہے جس کی تفصیل قصص الانبیاء قسم کی کتابوں میں حضرت آدم کے جنت سے نکالے جانے کے ذیل میں ملے گی۔ [3] جلو کرنا = ہم رکاب چلنا [4] راہ غلط کردن = راستہ بھول کر کسی طرف نکل جانا۔

جوں مہِ عید چھپ گیا وونہیں جلوہ کرکے وہ کج کلاہ، افسوس
اُس کے جور و جفا سے دنیا میں ایک عالم ہے داد خواہ، افسوس
مصحفی دست و تیغِ خوباں سے
ہوگیا قتل، بے گناہ افسوس

252

اُٹھ گیا بن کہے ہی یار، افسوس جی کی جی میں رہی، ہزار افسوس
تا دمِ نزع، اپنی آنکھوں کی تھا تمھارا ہی انتظار، افسوس
دستِ اندازِ خلق سے، اے گل لٹ گئی تیری سب بہار، افسوس
ہوگیا رازِ عشق فاش تمام تجھ سے اے چشمِ اشک بار، افسوس
اُڑتے ہی اس کے تیرِ مژگاں کا مرغِ دل ہوگیا شکار، افسوس
نہیں قسمت میں تشنہ کاموں کی تیری شمشیرِ آب دار، افسوس
دیکھ کر مصحفی کو غرق بہ خوں قطعہ مجھ کو آتا ہے باربار، افسوس
داغ ہے دل پہ اُس کی صورت کا
کیا ہی مارا گیا ہے یار، افسوس

253

کیوں ترا مُبتلا کیا افسوس کیا کہیں دل نے کیا کیا، افسوس
مجھ سے، اے گردشِ فلک تو نے یار میرا جدا کیا، افسوس
چھوڑ کر میری آشنائی کو اُس نے اور آشنا کیا، افسوس
آئینہ دیکھنا، ہے کیا معنی تو نے ترکِ حیا کیا، افسوس
مصحفی اُس کے پان کھانے نے
خوں مرا برملا کیا، افسوس

254

نقصِ طالع سے دیجے کس کو دوس[1]　　ہم سے وہ بھاگتا ہے لاکھوں کوس

اشک مژگاں پر آکے کہتے ہیں　　اپنی ہستی ہے کانٹے کی سی اوس[2]

یہ بھی قسمت، کہ میں پریشاں ہوں　　اور زلفیں تری کریں پابوس

چیت غافل کہ اب کوئی دم میں　　بجتا ہے کوچ کا یہاں[3] سو، کوس

مصحفی اب تو گریہ کر موقوف

آستینوں کے خوں میں ڈوبے کوس

255

کیوں نہ یہ زلف پھبے اب ترے رخسار[4] کے پاس　　کہ طرح دار ہے زیبندہ طرح دار کے پاس

یہ اسیرانِ قفس لطفِ چمن کیا جانیں　　کون لے جاتا ہے ہم کو گل و گلزار کے پاس

تجھ سے طمّاع سے پیارے بنے کیوں کر سودا　　جب کہ جز جان نہ ہو تیرے خریدار کے پاس

رستموں نے میاں ابرو سے تری منھ موڑا　　دے ہمیں ہیں کہ چلے جاتے ہیں تلوار کے پاس

اب تلک چشمہ و سیلاب بہے جاتے ہیں　　ایک دن روئے تھے ہم بیٹھ کے کہسار کے پاس

جو مرے حال کو سنتا ہے وہ رو دیتا ہے　　ہائے لے جاؤں یہ غم کون سے غم خوار کے پاس

حق تو یہ ہے کوئی کم ہووے گا ہم سا جاں باز　　شوق سے آپ چلے جاتے ہیں، ہم دار کے پاس

اُس کی ٹک خاطرِ نازک ہی کا ڈر ہے، ورنہ　　مُنھ تو سرگوشی میں لے جاتا ہوں رخسار کے پاس

مصحفی اک غزل اب اس سے بھی بہتر لکھ اور

جا کے پڑھنی ہے، ہمہ بیٹھ کے دو چار کے پاس

---

[1] دوس = دوش بہ معنی قصور۔ [2] کانٹے کی سی اوس، یعنی جیسے سرِ خار پر قطرۂ شبنم ہو۔

[3] یعنی یہاں سے اور کوس بمعنی نقارہ۔ [4] ن ۳د۳: پھبنے

256

کون آتا ہے، عیادت کو دلِ زار کے پاس — لوگ سب جمع ہیں[1] اُس نرگسِ بیمار کے پاس
رشکِ[2] معشوقیِ صیاد کا میں بندہ ہوں — جس نے رکھا نہ قفس کو مرے گلزار کے پاس
پاسِ عصمت اُسے اتنا ہے کہ وہ طفلِ حسیں — بیٹھتا ہی نہیں، ٹک اپنے گنہ گار کے پاس
ہم پہ وہ مایہ کہاں، لیک زر دے تقریب — جا کھڑے ہوتے ہیں ہم، اُس کے خریدار کے پاس
روسیہ زلف کو کیوں کر نہ کہوں، اپنا رقیب — دیکھتا ہوں اُسے ہر دم، ترے رخسار کے پاس
ایسے ظالم سے کوئی کیوں کے بچے خورد و بزرگ — جس کے خنجر بھی کمر بیچ ہو تلوار کے پاس
لے تو خوش رہ کہ میاں ہم نے ہی آنکھیں موندیں — دیکھتے کب تئیں ہر دم تجھے اغیار کے پاس
ہم بہ منت اُسے اب گھر میں جگہ دیتے ہیں — جس نے ہم کو، نہ دیا بیٹھنے دیوار کے پاس
لعلِ لختِ جگر و گوہرِ ہر اشک، غرض — کون سا تحفہ کہ ہم لے نہ گئے یار کے پاس
کیوں نہ ہر روز خرابی مری مہماں ہووے — کہ میں گھر مول لیا، خانۂ خمار کے پاس

مصحفی چشم سے ساقی کو نہ رکھ تو، صحبت
بیٹھنا خوب نہیں صوفی کو مے خوار کے پاس

ش

257

نہیں دل دار کوئی، ہووے دل آزار ہی کاش — گُل تو معلوم، لگے ہاتھ مرے خار ہی کاش
جس کی میں حسرتِ دیدار میں جاں دیتا ہوں — ایک ذرہ[3] وہ دکھا دے مجھے رخسار ہی کاش
گرچہ عشاق ترے سارے ہیں گردن زدنی — علفِ[4] تیغ ہو لیکن یہ گنہ گار ہی کاش

---

[1] ن ۴: جمع ہوئے نرگس [2] یعنی صیاد خود معشوق ہے اور وہ عاشق (اسیر) کا قفس از راہ رشک گلزار کے پاس بھی نہیں رکھتا۔ [3] یعنی ذرا سا [4] علف = چارا

لطف سے اُس بتِ خوں خوار کے ہم درگذرے — آ کے غصّے میں لگا دے کوئی تلوار ہی کاش
نظر آتا ہے مجھے دوٗر سے جو طفلِ حسیں — میں یہ کہتا ہوں کہ یہ ہووے مرا یار ہی کاش
درِ گلزار تو کب مُنھ پہ مرے کُھلتا ہے — کھول دے بادِ صبا، رخنۂ دیوار ہی کاش

مصحفی دیکھنا ہے اس کے خریداروں کو
آج وہ جلوہ نما ہو سرِ بازار ہی کاش

258

کرے ہے جوں جوں اپنے حسن کی وہ شوخ آرایش — ہمارے عشق کی ہوتی ہے یاں ویسی ہی افزایش
تبسّم اُس دہانِ تنگ میں کیوں کر کے رہ پاوے — کہ جس کے بیچ تنگی سے نہیں تنکے کی گنجایش
مرا دل عشق کے گلشن کا اے یارو وہ بلبل ہے — نہ آوے جس کو غیر از سایۂ گل [illegible] مالش
جو نوکر سروقد تیرے کے ہیں سرکارِ عالی میں — سوائے نقدِ غم ان کو، ہے بالائی بھی پیدایش[1]

نہیں کچھ مصحفی اتنا تو مفلس سوچتے کیا ہو
بطورِ امتحاں کیجیے کبھی اس پر بھی فرمایش

259

وقفہ اے پیکِ نگہ، دیدۂ تر ہے درپیش — دن ہیں برسات کے، اور رہ میں خطر ہے درپیش
بزمِ ہستی میں کچھ آسودہ نہیں بیٹھے ہم — جوں چراغِ سحری ہم کو سفر ہے درپیش
دلِ حیراں کی مرے دیکھیو کیا صورت ہو — اب تو واں آئینہ ہی آٹھ پہر ہے درپیش
امتحاں باتوں میں کرتے ہو ہمارا، اے واہ — کھینچیے تیغ کو واللہ، یہ سر ہے درپیش
مثلِ آئینہ وہ حیرانِ تماشا ہے ترا — جس کے صورت تری، اے رشکِ قمر ہے درپیش
زلف و رخسار کا اُس آئینہ سیما کے خیال — اپنی آنکھوں کے غرض شام و سحر ہے درپیش

---

[1] پیدایش بہ معنی آمدنی استعمال ہوا ہے۔

کیوں نہ دک دک کے گریں دیدۂ تر سے اب اشک
مصحفی دل کے مرے لختِ جگر ہے درپیش

260

بھڑکے ہے تپِ عشق کی دل میں غضب آتش
اے گریہ چھڑک آب، کہ ٹک جاوے دب آتش

کیا کام کیا تو نے مرے دل کو جلایا
کعبے کو لگاتا ہے، کوئی بے ادب آتش

شاید کہیں گذرا ہے تو دامن کو جھٹک کر
دبکی نہیں سینے میں مرے بے سبب آتش

جھکا تھا وہ اپنی ہی تو اس آتشِ دل کا
موسیٰ کو جو آئی تھی نظر وقتِ شب آتش

کس ساعتِ بد ہوگی[1] بنا خانۂ دل کی
لگتی ہے اسی گھر کے تئیں جب نہ تب آتش

جلنے کے سوا کام نہیں اس کو، رکھی ہے
اللہ نے پروانے کے دل میں عجب آتش

برق اس کے دمِ گرم سے کس طرح بر آوے
ہو ہر نفسِ سرو کا جس کے لقب آتش

جل جائے گا عالم، مجھے مت خوف میں لاؤ
ہے برق کے مانند مرے زیرِ لب آتش

کیوں کر کہوں ہجراں میں ترے اب نہیں جلتا
ویسی ہی تپش اور وہی روز و شب آتش

انگارے سے دہکیں ہیں مرے سینے میں اب تک
کس روز بجھا شعلہ، ہوئی سرد کب آتش

اے مصحفی پوچھ اس کی نہ کچھ نرمی و گرمی
ظالم گہِ لطف آب ہے، وقتِ غضب آتش

261

دانستہ کیا جس نے مرا نام فراموش
ہوتا نہیں مجھ سے وہ دل آرام فراموش

یاد آتا ہے جس وقت ترے کوچے کا جانا
ہو جاتے ہیں اُس وقت تو سو کام فراموش

ہم سے سبقِ عشق مسلّم نہیں ہوتا[2]
گر صبح کو ہے یاد، تو پھر شام فراموش

---

[1] یعنی ہوئی ہوگی۔ [2] مسلّم ہونا، نئی ترکیب ہے اور پھر رواج پانے کے قابل۔

اللہ رے تری شوکت و شاں دیکھ کے جس کو — قاصد نے کیا خوف سے پیغام فراموش

اک مرتبہ دیکھی جو تری چشم کی گردش — لے ہاتھ پہ[1] ساقی نے کیا جام فراموش

میں ہوں وہ گرفتار کہ صیاد نے جس کو — کر صید، کیا ہووے تہِ دام فراموش

چھڑکا ہے نمک اس نے مرے لختِ جگر پر — ہو کیوں کے تری لذتِ دشنام فراموش

اے مصحفی کیا بھیج کے خط یاد دلاؤں
اُس نے تو کیا مجھ کو بہ ابرام[2] فراموش

262

جنت کی تمنا ہے نہ گلزار کی خواہش — رہتی ہے ہمیں اک ترے دیدار کی خواہش

دل دام میں زلفوں کے جو پھڑکے ہے تو پھڑکو — کام آتی ہے کیا مرغِ گرفتار کی خواہش

مُنھ موڑ نہ قاتل دلِ کم ذبح[3] سے میرے — ہے اس کے تئیں اور بھی اک وار کی خواہش

جی دوڑے ہے اس کا تو نت اک تازہ ہوس پر — ہو ایک، تو کہیئے دلِ بیمار کی خواہش

بوسے کی طلب ہم بھی کریں اس کے لبوں سے — نکلی ہو کبھی اس سے جو دو چار کی خواہش

مت جانو موئے پر گئی زاہد کی بزرگی — ہے ویسی ہی اب تک اُسے دستار کی خواہش

ہے ظلم اُسے مرہمِ کافور[4] لگانا — جس زخم کو ہو مرہمِ زنگار کی خواہش

ہم بھی نہیں رکھتے ہیں دریغ اُس سے سر اپنا
اے مصحفی ہے یوں ہی اگر یار کی خواہش

ص

263

رکھتا ہوں میں تجھ سے جی سے اخلاص — ہرگز نہیں اور کسی سے اخلاص

---

[1] ن۳: لے ہاتھوں پہ [2] سختی سے بھلا دیا ہے۔ [3] یہ کم ذبح بھی اچھوتی ترکیب ہے۔ [4] مرہم کافور زخم ٹھنڈک پیدا کرنے کے لیے اور مرہم زنگار عفونت سے روکنے کے لیے لگایا جاتا ہے۔

کیا جانے وہ قدرِ صافیٔ دل[1]   ہے اُس کو تو آرسی سے اخلاص
دشمن کو بھی دوست جانتے ہیں   ہے اپنے تئیں سبھی سے اخلاص
دشمن تمھیں کون جانتا ہے   تم بانٹتے ہو سبھی سے اخلاص
اے مخلصِ بے ریا کسی کے   موقوف کیا ابھی سے اخلاص
رکھتا ہے وہ دشمنِ محبت قطعہ یوں   اور تو ہر کسی سے اخلاص

کیا جانیے کیا خطا ہے اُس کی
جو ترک ہے مصحفی سے اخلاص

264

پاس اپنے تو اے یارو، نے سیم نہ زر خالص   یا اشکِ مصفاً ہیں، یا خونِ جگر خالص
تیرے لبِ شریں کا وہ نرخ نہیں پاتی   ہر چند فروشندہ رکھتا ہو شکر خالص
کیا عیب ہمارے کو، بتلا وے[2] کوئی یارو   ہیں عاشقِ صاف اُس کے رکھتے ہیں نظر خالص
قطرات سے آنسو کے، ہیں تارِ نظر روشن   میں اُس میں پروئے ہیں از بس کہ گہر خالص

اُٹھ مصحفی مسجد سے مے خانے میں آیا ہے
پیمانے میں اسے ساقی مے لا کے تو بھر خالص

265

کچھ خط ہی نہیں فدائے عارض   ہے زلف بھی مبتلائے عارض

---

[1] یعنی آئینہ صافیٔ دل = اخلاص   [2] ن۳: کوئی دیکھ کے بتلاوے

لغزش سے نظر نہیں ٹھہرتی اللہ ری تری صفائے عارض
پھر گل کی طرف کبھو نہ دیکھے بلبل کو جو تو دکھائے عارض
جوں زلف ہوں گو کہ دل پریشاں جانے ہے تری بلائے عارض
ہر حلقۂ زلف میں ترے، یار خالی ہے ہمیشہ جائے عارض
کم حوصلہ تھا، کسی کو جوں خال میں دل نہ دیا سوائے عارض
مُنھ پیٹتا دیکھ مصحفی کو
دل نے بھی کہا کہ ہائے عارض

266

دیکھ آئینے میں اپنی وہ بہارِ عارض پیار کی نظروں سے ہوتا ہے نثارِ عارض
مل گئے خاک میں گل چہرہ ہزاروں ایسے کہ نہ جھاڑا کسی نے اُن کا غبارِ عارض
آئینہ صدقے گیا تھا ترے مکھڑے کے میاں اس میں کا ہے کو تھے یہ نقش و نگارِ عارض
زلف کو دیکھ کے تیری مجھے رشک آتا ہے کہ میسّر ہے اِسے بوس و کنارِ عارض
گل کا یہ مُنھ ہے، کرے حسن کا اس کے دعویٰ مہر و مہ ہو نہ سکیں جس کے دوچارِ عارض
اب وے عارض کے تلے ہاتھ دھرے سوتے ہیں کبھی گل تکیوں پہ تھا جن کا قرارِ عارض
عالمِ نیم رُخی[1] کو تری تصویر کے دیکھ مل گئی خاک میں، سب گل کی بہارِ عارض
کیا بُرے لوگ ہیں وہ بھی جو مرے گل رُو کا نگہِ گرم سے کرتے ہیں فشارِ عارض
مصحفی محو ہوں کس کا میں، جو رہتی ہیں سدا
پُتلی آنکھوں کی مری آئینہ دارِ عارض

---

[1] عالم نیم رُخی، یہ بھی نئی ترکیب ہے اور PROFILE FACE کا بہترین ترجمہ ہے۔

ط

267

کس دن لکھا تھا آپ کو میں عاشقانہ خط	جو سَو سَو گالیاں مجھے دیتے ہو بے نقط

بغدادِ حسن بھی ہے عجب جا کہ جس کے بیچ	دیتے نہیں خلیفہ کو اک جُرعہ آبِ شط[1]

ہم کب سزائے نکہتِ بادِ بہار تھے	ایدھر بھی ہوگئی رہِ پیکِ صبا غلط

کھینچا ہے بس کہ سر بہ فلک بحرِ اشک نے	ہے نسرِ طائر[2] اُس میں شناور بسانِ بط

وے دن گئے کہ پیتے تھے جامِ شرابِ سُرخ	اپنی معاش، خونِ جگر پر ہے اب فقط

اُفغاں کہ نامہ بر کے مجھے اضطراب سے	مہلت ہوئی نہ اتنی کہ دے لوں قلم کو قط

مغشوش[3] ہاتھ آیا تھا دیوانِ مصحفی

لکھتے ہوئے چلے گئے ہم بھی غلط سلط

268

رکھتا ہے بس کہ ہاتھ گریباں سے اختلاط	جوں گل ہے چاکِ جیب کو داماں سے اختلاط

کیا جانے خواب بند کیا کس کی چشم نے	مژگاں کو ایک پل نہیں مژگاں سے اختلاط

جوں گل، سوائے شبنمِ الماس ریزہا[4]	رکھتا ہے کون سینہ فگاراں سے اختلاط

مذہب میں اپنے، دوستیِ تنگ[5] کفر ہے	کیوں کر کریں نہ گبر و مسلماں سے اختلاط

وے دن گئے کہ تھا دلِ صد چاک کو مرے	جوں شانہ اُس کی زلفِ پریشاں سے اختلاط

---

1. شط = نہر 2. دو ستارے جنھیں نسران کہا جاتا ہے۔ ان میں ایک کو "النسر الطائر" اور دوسرے کو النسر الواقع کہتے ہیں۔ نسر کے معنی عربی میں عقاب کے ہیں، یہاں مصحفی نے نسر طائر کو بط کی طرح بحرِ اشک میں تیرا کر اغراق تو کیا ہی ہے، ایہام بھی پیدا کرنا چاہا ہے۔ 3. مغشوش = کٹا پھٹا، جس میں الفاظ صاف نہ پڑھے جاتے ہوں۔ 4. اضافت توصیفی ہے، یعنی ہیرے کی کنی جیسی اوس۔ 5. دوستیِ تنگ = محدود دوستی، فرقہ پرستی کی جگہ آج کل بھی یہی لفظ رائج ہونا چاہیے۔

بن سازش اس کی بزم میں پاوے نہ بار شمع　　کرنا ہمیں ضرور ہے درباں سے اختلاط

امرد پرست تو نہیں اتنا میں مصحفی
پر بیش و کم ہے فرقۂ نسواں سے اختلاط

ظ

269

عالَم ہے مرے بیاں سے محظوظ　　میں عشق کی داستاں سے محظوظ

سینے پہ لگی سناں جو اس کی　　دل خوب ہوا سناں سے محظوظ

کیا جانے وہ لذتِ قفس کو　　جو مرغ ہو آشیاں سے محظوظ

تو ساتھ نہ ہو، تو ہم نہ ہوویں　　سیرِ گل و گلستاں سے محظوظ

ہم لذتِ زخم پر مریں ہیں　　وہ ہوتے ہیں امتحاں سے محظوظ

بلبل کی فغاں تو بے اثر ہے　　کیا ہووے گل اس فغاں سے محظوظ

اک زخم بھی کارگر نہ آیا　　ہوں کشتے ترے کہاں سے محظوظ

جو مردہ پسند لوگ ہوویں قطعہ اے مصحفی رفتگاں سے محظوظ

میں عیسیٰ وقت ہوں تو ہرگز[1]
ہوں وے نہ مری زباں سے محظوظ

ع

270

میں کیا گریہ دن اور رات شروع　　پھر ہوا موسمِ برسات شروع

---

[1] مردہ پرستی کی شکایت غالب کو بھی تھی:

تو اے کہ محوِ سخن گستران پیشینی　　مباش منکرِ غالب کہ در زمانہ تست

میری تربت پہ کوئی شعر پڑھو نہ کرو مصحف و آیات شروع

یار مل کر وو ہیں جاتا بھی رہا کرنے پائے بھی نہ ہم بات شروع

میں گیا بزم میں اُس کی، تو بہ غیر کیں وو ہیں اُس نے اشارات شروع

دیکھیں پایان محبت کیا ہو ہیں ابھی عشق کی آفات شروع

عشق کی پڑھتے ہیں جو شخص حدیث وے نہیں کرتے ہیں[1] مشکاۃ شروع

مصحفی دیکھیے کیا ہو اس نے

کی ہے غیروں سے ملاقات شروع

271

ہر اک کی معاش کی ہے اک وضع تدبیر و تلاش کی ہے اک وضع

ہے سروِ چمن اگرچہ خوش ڈول[2] پر تیری تراش کی ہے اک وضع

اب تک دمِ آخریں میں میرے نالے کی خراش کی ہے اک وضع

ہے گل کا قماش سرخ[3] اور زرد بلبل کے قماش کی ہے اک وضع

اے مصحفی دیکھ، ماہِ نو میں

اُس زین کی قاش کی ہے اک وضع

272

جن کے مکاں چمن ہیں وے لوٹیں بہارِ شمع ہم غم زدوں کی بزم میں کب ہے گذارِ شمع

تاریک گو ہو راہِ عدم، جاویں گے چلے کچھ دے نہیں ہیں ہم، کہ کریں انتظارِ شمع

کیا صبح ہوتے بجلی پڑی[4] اس پہ کیا ہوا کیوں سرد ہو گیا نفسِ شعلہ بارِ شمع

---

[1] مشکوٰۃ، حدیث کی مشہور کتاب ہے۔ [2] یہ خوش ڈول کی ترکیب بھی خوب ہے۔

[3] قماش = لباس [4] بجلی پڑنا = آفت نازل ہونا

صحبت اگر یہی ہے تو اس انجمن کے بیچ　　کچھ گل کھلا رہے گا دلِ داغ دارِ شمع

ہے رشک مجھ کو اس کے نصیبوں پہ کیا کہوں　　پروانہ کس طرح سے ہوا ہے نثارِ شمع

بے داغ ایک تارِ گریباں نہیں مرا　　گر سوختہ میں اُن کو بنایا ہے تارِ شمع

ہر شب تصورِ رخِ پُرنور میں ترے　　تا صبح میری آنکھیں رہیں ہیں دوچارِ شمع

منعِ قلق[1] بہ تیغ بھی عاشق کو ہے محال　　کچھ سر کٹے سے کم نہ ہوا اضطرارِ شمع

روکش نہ مجھ سے دشمنِ کم مایہ ہو سکے　　کیا آگے آفتاب کے ہے اعتبارِ شمع

لے کر گیا ہوں، داغِ سہی قامتاں بہ خاک　　کیجو مرے مزار پہ روشن قطارِ شمع

دیکھا تھا اُس کو پردۂ فانوس سے کہیں　　تھمتے نہیں ذرا مژۂ اشک بارِ شمع

شوخی تو دیکھ، ہاتھوں سے مکھڑا چھپا لیا　　لے کر گیا میں رات جو اُس کو دوچارِ[2] شمع

پروانہ سر پٹک کے لگن ہی میں مرگیا　　ایسے کہاں نصیب کہ ہو ہم کنارِ شمع

دیکھا ہے جب سے اُس مہِ تاباں کو مصحفی
کچھ زرد ہوگیا ہے تبھی سے عذارِ شمع

غ

273

باندھے ہے جب کمر سے مرا خوش خرام تیغ　　کرتی ہے خونِ بے گنہاں، گام گام تیغ

یوں بے دریغ ذبح کیا کس کو جو تری　　تا قبضہ بھر رہی ہے لہو سے تمام تیغ

لڑنے لگی ہیں پھر تری آنکھیں ہر ایک سے　　چلتی ہے دوستوں میں پھر اب صبح و شام تیغ

کہتے ہیں یوں کہ قطعِ ہوا و ہوس کرو　　دیکھیں ہیں یہ جو بر رُخِ ماہِ صیام[3] تیغ

---

[1] منعِ قلق = اندوہ کا رک جانا　[2] بالمقابل　[3] قدیم شگون کے مطابق رمضان کا چاند دیکھ کر تلوار یا چھری وغیرہ دیکھی جاتی تھی۔

کیا جانے کس کو قتل کیا آج مضطرب — آتا ہے، ہاتھ میں وہ لیے بے نیام تیغ

صیاد نے کیا ہے عجب ظلم اختراع — کرتا ہے جاے دانہ نہاں، زیرِ دام تیغ

اس کی ہر ایک وضع کے کشتے ہیں ہم، کہ ہے — دستِ کشیدہ خنجر و طرزِ سلام تیغ

کیا رحم تجھ کو میری جوانی پر آگیا — لی وقتِ قتل تو نے جو کل تھام تھام تیغ

کیا جانے کس کے خوں کا وہ پیاسا ہے مصحفی
رکھنے لگا ہے ہاتھ میں اپنے[1] مدام تیغ

274

کبھی جو غصے کے وقت اس کے ہاتھ آئی تیغ — تو اس نے کھینچ کے میرے ہی اک لگائی تیغ

اگر یہ ہاتھ ہیں تیرے، تو ایک دن ہم کو — دکھا رہے گی ترے ہاتھوں کی صفائی تیغ

نہ بچ کے آیا کوئی اس کے ابرو و مژہ سے — کسی کے تیر لگا اور کسی نے کھائی تیغ

اسے بھی سخت تمناے سرخ پوشی تھی — بھلا ہوا کہ مرے خون میں نہائی تیغ

وہ خانہ جنگ پھکیتوں میں ہے بڑا ہتھ چھٹ[2] — سر اس کا دو ہی کیا جس کے اک لگائی تیغ

میں چاندروزے کا دیکھے تھا شب کھڑا سرِ بام — کہ اتنے میں تری ابرو نے لا دکھائی تیغ[3]

وہ بیچ چوک کے کل مصحفی سے بگڑا تھا
لپٹ کے یاروں نے ہاتھ اس کے سے[4] چھٹائی تیغ

275

جب اس نے قبضہ پکڑ ہاتھ میں اُٹھائی تیغ — قیامت ایک غریبوں کے سر پہ لائی تیغ

---

[1] ن۳: اب پھر [2] ہتھ چھٹ = مارنے کے لیے جلدی سے ہاتھ اُٹھانے والا، جلد حملہ آور ہونے والا۔
[3] دیکھیے شعر ۲۱۸۴ کا حاشیہ۔ [4] چھڑانے کی جگہ چُھٹانا بھی استعمال کیا ہے اور روہیلکھنڈ کے علاقے میں آج بھی بولا جاتا ہے۔ نسخہ ۳ میں چھنائی ملتا ہے۔

ہمارے ساتھ بڑی اس نے کج ادائی کی | تری کمر پہ میاں جس نے کج لبندھائی تیغ
میں شب جو سر بہ فلک کھینچنے کا قصد کیا[2] | تو کہکشاں نے مجھے دور سے دکھائی تیغ
تو' سادگی تو ذرا دیکھ میرے قاتل کی | کہ قتل کر مجھے دامن میں کل چھپائی تیغ
اُٹھایا سر جو میں گاہے، تو دستِ قاتل سے | چمک کے سر پہ مرے برق سی کچھ آئی تیغ
میں ہاتھ چوم لیے اُس کے دوڑ کر دو ہیں | جب اس نے سر پہ مرے پیار سے لگائی تیغ
سنا ہی ہوگا یہ قصہ، کہ مر گیا قابیل[3] | قطعہ جب اس غریب کے ہابیل نے لگائی تیغ
مقامِ عشق میں ایسے ہی خون ہوتے ہیں | عجب نہیں ہے جو بھائی پہ کھینچے بھائی تیغ

کٹے وہ کیوں کے نہ دل میں کہ مصحفی شب دوش
میں خالی دے گیا[4] وار اس نے جب چلائی تیغ

276

مرے سینے کا بن سرخی نہیں داغ | بہ رنگِ لالہ ہے یہ آتشیں داغ
فلک پر بھی ترے خالِ جبیں نے | کیا ہے، ماہ کو اے مہ جبیں داغ
ہوئے تھے جل کے خاکستر جہاں ہم | عجب کیا ہے وہاں کی ہوز میں داغ
ترے بندِ حنا کا کشتہ ہے دل | تبھی تو یہ کہیں خوں ہے، کہیں داغ
بہ رنگِ لالہ جس پہلو کو دیکھو | ہمارے دل کا ہے پہلو نشیں داغ
دُھلایا دست و تیغ اُس نے تو کیا، پیچ | رکھے ہے خوں کے اب تک آستیں داغ

مرا دل مصحفی خاتم بنا ہے
ہے اس خاتم پہ نیلم کا نگیں داغ

---

[1] یعنی باندھی۔ [2] فارسی محاورہ سر بفلک کشیدن کا اردو ترجمہ کر دیا ہے یعنی غرور کرنا۔ [3] خرافی حکایت کے مطابق قابیل اور ہابیل دونوں آدم کے بیٹے تھے۔ قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تھا اور یہ اس دنیا میں پہلا قتل سمجھا جاتا ہے۔ یہ مخاصمت کسی عورت سے شادی کرنے کے معاملے میں ہوئی تھی۔

[4] وار خالی دینا= وار سے بچ جانا۔

277

آتا ہے عجب سج سے وہ کاندھے پہ دھرے تیغ   کیا جانے علم[1] قتل کو اب کس کے کرے تیغ

بیٹھے ہیں ہوس[2] کشتہ کئی آج سرِ راہ   جی دینے پہ، مت لائیو ظالم تو وَرے[3] تیغ

قاتل جو لگانا ہے تو ٹک ہٹ کے لگانا   ڈرتا ہوں ترا خون میں دامن نہ بھرے تیغ

اے صیدِ دل اس کوچے سے جاوے گا کدھر کو   مژگاں کے وَرے تیر ہیں، ابرو کی پَرے[4] تیغ

اے مصحفی اُس گل کی نہ ہو طبع شگفتہ
جب تک کہ مرے خوں میں وہ رنگیں نہ کرے تیغ

ف

278

تھے جو جنوں زدہ، گئے زنجیر کی طرف   ہم کو قضا جولائی تو شمشیر کی طرف

ہر اک کشش میں اس کی کھنچا جا ہے جی مرا   دیکھوں کمان کی کہ ترے تیر کی طرف

ہاتھوں سے اپنے اب کی بن آیا جو کچھ، تو ہم   پیکِ دعا کو بھیجیں گے تاثیر کی طرف

جب کر چکا تمام، تو پھر آہ رہ گیا   نقاش دیکھ کر تری تصویر کی طرف

قاصد جواب خط کا مرے خاک لائے گا   روتا گیا ہے اُس بتِ بے پیر کی طرف

مشتاقِ دید میں ہی نہیں تیرے تیر کا   تکتی ہے چشمِ صید بھی رہ گیر کی طرف

دلّی پہ رونا آتا ہے، کرتا ہوں جب نگاہ   میں اس کہن خرابے کی تعمیر کی طرف

سب عقدے کھول دیجیو اس کے تو اے صبا   جاوے کہیں جو زلفِ گرہ گیر کی طرف

یوں قتل کر نہ ڈالیے باتوں میں میری جان   ٹک آدمی کی دیکھیے تقصیر کی طرف

---

[1] علم کرنا = کھینچنا (تلوار)۔ [2] ن ۳: بجاں آمدہ [3] ورے = اِدھر کو [4] پرے = اُدھر

جب لعلِ لب سے اپنے تو ہوتا ہے دُرفشاں[1] رہتا ہوں دیکھ میں تری تقریر کی طرف
مانی نے ہاتھ سے قلمِ صنع رکھ دیا خطِّ بتاں کی دیکھ کے تحریر کی طرف
اپنی ہی تیغِ کاری کی تعریف اُس نے کی دیکھا نہ سخت جانیِ نخچیر کی طرف
رسوا کریں ہیں یار مجھے ورنہ مصحفی
اپنا مزاج تو نہیں تشہیر کی طرف

279

دیکھا ہے جب سے اُس بُتِ خودکام کی طرف خاطر کو میل ہی نہیں آرام کی طرف
ہم اُس شکار گاہ کے صیّاد ہیں جہاں آیا نہ پر بھی اڑ کے کبھی دام کی طرف
اوروں نے، جا خُموں سے منہ اپنے بھڑا دیے کم ظرف ایک ہم ہی گئے جام کی طرف
گردش تمھاری چشم کی دیکھیں کدھر کو ہو تکتی ہے ساری بزم اسی جام کی طرف
پروانہ وار تو، جو نہ آیا تو جل گیا میں دیکھ کر چراغِ سرِ شام کی طرف
یہ آئینے میں آنکھ ہی پھرنے پہ کی نگاہ دیکھا مری بھی گردشِ ایّام کی طرف
آغازِ خط میں حسن کا کھاتے نہیں فریب مدِّ نظر جنھوں کی ہے، انجام کی طرف
ترکیب والے اور بھی دلّی میں ہیں، ولے غالب ہے دل برانِ خوش اندام کی طرف
جو اس گلی سے گذرے ہے دیکھے ہے باربار دَر کی طرف گہے، تو گہے بام کی طرف
میرے نوشتے پر نہ ہنسو، دیکھو ٹک[2] میاں اپنے رقیب کے بھی سرانجام کی طرف
دیکھا جو پختہ میوہ کوئی میں نے مصحفی
دل لے گیا مجھے طمعِ خام کی طرف

---

[1] ن ۳: جب لعل لب سے ہو ہے تو اپنے گہرافشاں

[2] ن ۳: برگشتہ بختی پر نہ ہنسو میری دیکھو تم اپنے رقیب کے بھی میاں نام کی طرف

280

دو زلفیں رہیں مکھڑے پہ کُھل، اک اس طرف اک اُس طرف
موتی رہے کانوں میں ڈُھل، اک اس طرف اک اُس طرف

میں ہوں وہ مے کش، اے مغاں، مجلس میں جس کی حوریاں
کف پر لیے ہیں جامِ مُل، اک اس طرف اک اُس طرف

ساعد کا میرے پُشت و رو، کہنی تلک سب داغ ہے
کھاتا رہا ہوں بس کہ گل، اک اس طرف اک اُس طرف

گر تیری یکتائی کرے شمشیرِ غیرت کو علم
ہو جاویں دو ہیں جزو و کل، اک اس طرف اک اُس طرف

جاؤں کدھر اے مصحفی، تیغیں نکالے ہاتھ میں
ابرو رہیں قاتل کے تُل، اک اس طرف اک اُس طرف

281

افعی سیاہ ہے تری زلف — یا میری اک آہ ہے تری زلف
سنبل پہ پڑے ہے آنکھ کس کی — تا پیشِ نگاہ ہے تری زلف
رخسار ترا ہے گل، و لیکن — اُس گل کی گیاہ ہے تری زلف
گردِ گل، مار حلقہ زن ہے — یا ہالۂ ماہ ہے تری زلف
کیوں کر کوئی اس سے بچ کے نکلے — مارِ سرِ راہ ہے تری زلف
دل چاکی و خستگی پہ میری — باشانہ گواہ ہے تری زلف

آنکھ اُس سے بندھی ہے مصحفی کی
زنجیرِ نگاہ ہے تری زلف

282

ساتھ ساقی کے گیا اپنا تو مے پینے کا لطف
اس سے مرنا ہی بھلا، اب کیا رہا جینے کا لطف

سبزۂ نوخیزِ خط کا حسن کچھ پنہاں نہیں
لعل سے لب سے ترے پیدا ہے اس مینے کا لطف

تو نے منھ پھیرا اور اس کا نور سا جاتا رہا
تھا تری صورت ہی تک اے یار آئینے کا لطف

ہم تو عاشق پیشہ ہیں، کیا جانیں ان باتوں کو آہ[1]
ایسے معشوقوں کے پوچھا چاہیے کینے کا لطف

صبح کے مانند، ہے چاکِ گریباں تک بہار
مصحفی پنہاں نہیں اُس شوخ کے سینے کا لطف

ق

283

کس سے کہیے آہ کیا ہوتا ہے عشق
کچھ نہ پوچھو، بد بلا ہوتا ہے عشق

ماجرائے عشق تو مجھ سے نہ پوچھ
سخت کافر ماجرا ہوتا ہے عشق

کام بیگانے سے کچھ اس کو نہیں
آشنا سے آشنا ہوتا ہے عشق

اِس کا مارا کوئی بچتا ہی نہیں
ہائے تیرِ بے خطا ہوتا ہے عشق

نظریں کس پرہیز سے کرتی ہے سیر
جب تلک باہم چھپا ہوتا ہے عشق

فسق کو کہتے نہیں ہم لوگ عشق
یعنی عشقِ باصفا ہوتا ہے عشق

گو کہ بے عشقی میں گذرے سال و ماہ
عاشقوں سے کب جدا ہوتا عشق

عشق مت کر عشق مت کر مصحفی
مان اے ناداں برا ہوتا ہے عشق

---

[1] ن۳: ان باتوں کے تئیں

284

کھیل جاتے ہیں جان پر عاشق — جان دیتے ہیں آن پر عاشق
کوئی ان گالیوں سے ٹلتے ہیں — ہم ہیں تیری زبان پر عاشق
خواری اُن عاشقوں کی، وے جو ہوئے — تجھ سے ناقدردان پر عاشق
تازہ آفت تو ایک یہ ہے کہ ہم — ہوئے اس نوجوان پر عاشق
جان دینے کو سود جانتے ہیں — ہم ہیں اپنے زیان پر عاشق
اس قدر گرتی ہے، کہے تو یہ برق — ہے مرے آشیان پر عاشق

مصحفی گر تو مرد کامل ہے
دل نہ رکھ اس جہان پر عاشق

285

کسی پر میں نہ یاں از خود کیا عشق — کچھ آپ ہی آپ پیدا ہو گیا عشق
یہ سب چُہلیں ہیں اُس کی ہی طرف سے — تکلف برطرف، کیا حُسن، کیا عشق
کیا رسوا عبث یاروں نے واللہ — مجھے اک دیکھنے کا اُس سے تھا عشق
کیا بندہ بتوں کا مجھ کو اس نے — ہے یارو سخت کافر ماجرا عشق
نہیں دل بستگی ہرگز کسو سے — مگر ہے مصحفی اک شعر کا عشق

286

عشق میں اس کے ہوئے ہیں بس کہ ہم رسوائے خلق — رات دن اکثر اُٹھایا کرتے ہیں ایذائے خلق
خلق اگر مجھ کو برا کہتی ہے تیرے عشق میں — گو کہے، میرے تئیں بھی کب ہے اب پروائے خلق
ہائے جس کوچے میں نالے کی ہمیں رخصت نہ تھی — اب اُسی کوچے میں ہے آٹھوں پہر غوغائے خلق

ایک یوسف جلوہ گر ہے مصر کے بازار میں　　　تس پہ اس کے ساتھ ہے یہ گرمیِ سودائے خلق

مصحفی کے سر پہ رہیو سایہ تیری زلف کا
آفتابِ حشر میں جس دن کہ ہووے جائے خلق

287

وے شخص جو کہتے ہیں کہ ہے ذاتِ خدا ایک　　　دیکھیں تو بتاں کو بھی بھلا آ کے ذرا ایک

ان خانگی معشوقوں سے نسبت نہیں اُس کو　　　وہ خانہ برانداز تو ہے طرفہ بلا ایک

ایمان سا جاتا رہے ہے شیخ کا دو ہیں　　　ہوتی ہے جو پانچوں میں نماز اس کی قضا ایک

اس کوچے میں آئے تھے کفن باندھ کے سر سے　　　جو یار، سو اُن میں سے تو جیتا نہ بچا ایک

قاتل، ہے تجھے تیغ کا گر اپنی بھروسا　　　تا دو ہی کرے مجھ کو تو ایسی ہی لگا ایک

شاید کہیں سر کھینچا مرے سروِ رواں نے　　　جو آج گلستاں کی طرف فتنہ اُٹھا ایک

جب مصحفیِ ریختہ گو ہو گیا[1] خاموش
مذکور ہوا سب میں کہ اس فن میں وہ تھا ایک

288

روتے روتے سو گیا ہے یہ دلِ رنجور ٹک　　　اے فغاں اس وقت تُو تو، مجھ کو رکھ معذور ٹک

زخم پر میرے نمک چھڑکا مرے جرّاح نے　　　کیا غضب ہوتا، جو رکھتا مرہمِ کافور ٹک

---

[1] ن ۳: ہو جا ہے

اب تلک خمیازہ کھینچیں ہیں پڑے اس باغ میں سو گئے تھے ہم بہ زیرِ سایۂ انگور ٹک[1]

آئینہ کیا، جس کو دل چاہے تمھارا دیکھیے پر میاں رکھیے ہماری بھی طرف[2] منظور ٹک

اب تلک نرگس کی آنکھیں، ہیں خجالت سے جھکی وا ہوئی تھی باغ میں وہ نرگسِ مخمور ٹک

بوسے لے لے بےادب کھودیتے ہیں رونق تمام آوے ہے اس طفل کے چہرے پہ جوں ہی نور ٹک

مرد و زن کا حشر ہے کوچے میں اس کے مصحفی
ماجرا کہیئے گا کم ہونے تو دے یہ شور ٹک

289

کہاں ہم اور وہ رونا سحر تک یہ باتیں ہو چکیں بس چشمِ تر تک

ادھر آ دیکھ چشمِ خوں فشاں میں بہارِ لالہ ہے داغِ جگر تک

وہ اب تلوار کھینچے کیوں نہ آوے دریغ اس سے نہیں یاں ہم کو سر تک

چہ جائے غیر، یا رب اس گلی میں مجھے ہے رشک اپنے نامہ بر تک

نہ اُڑ جاویں گے، اب تو چھوڑ صیّاد رہے دام و قفس میں بال و پر تک

چہ جائے زلف، اُس آئینہ رُو کو خیالِ سایہ ہے موئے کمر تک

گرے ہی مصحفی کوے بتاں میں
کوئی اب ہم سے پہنچا جا ہے گھر تک

---

[1] غلط یا صحیح، یہ مشہور ہے کہ انگور کی بیل کے سائے میں نہیں سونا چاہیے، اس سے کسل مندی پیدا ہوتی ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے خون کم ہوتا ہے، کیوں کہ انگور کی بیل کے لیے بہترین کھاد خون ہی ہے، یہ تو ہم بھی رہا ہے کہ اس کے سائے میں عموماً بھوت پریت رہتے ہیں، اسی لیے ریاضؔ نے کہا تھا:

سایۂ تاک میں واعظ کو جگہ دی ہم نے آج شیشے میں اُسے دیکھو اتارا کیسا

شیشے میں بھوت یا جن کو اُتارا جاتا ہے۔ [2] یعنی ہماری جانب بھی نظریں رکھیے۔

290

شب شوق لے گیا تھا ہمیں اس کے گھر تلک — پر غش سا آگیا وہیں پہنچے جو در تلک
گر ہم کو لگ گئی ہیں کبھی ہچکیاں تو ہم — آٹھ آٹھ آنسو روئے ہیں دو دو پہر تلک
ڈرتا ہوں میں یہ گم نہ کرے آپ کو کہیں — پھر جعد کو ہوئی ہے رسائی کمر تلک
پروانہ کیا اڑے ہے چراغاں میں، تو نہیں — پہنچا جو کوئی شعلہ ترے بال و پر تلک
صحرائے کشتگاں میں ترے کل گیا تھا میں — دیکھوں تو لالہ زار ہے حدِ نظر تلک
پھیلاؤ بحرِ اشک کا اپنے میں کیا کہوں — پہنچی ہے موج گریہ مری بحر و بر تلک
وے دن کدھر گئے کہ میں لکھ لکھ کے خطِ شوق — جاتا تھا آپ گریہ کناں، نامہ بر تلک
تیزی میں نوکِ نشترِ مژگاں کی کیا کہوں — دل میں اگر چبھے تو وہ پیر جگر تلک

شب اس کی بزم میں جو گئے ہم تو مصحفی
ایسے جمے[1] کہ واں سے نہ اُٹھے سحر تلک

291

لاوے تو لاوے اس کے تئیں میرے گھر تلک — پہنچا تو ہے یہ نالہ مقامِ اثر تلک
کالے کی لہر ہووے خجل جس کے سامنے — اللہ رے تیری زلف کا جھٹنا کمر تلک
گو دل میں بال ہے ترے، ہو جائے گا درست — پہنچا اگر یہ شیشہ کسی شیشہ گر تلک
نکلی ہے تیری تیغِ تغافل، عجب ہے یار — گر موجِ خوں نہ گذرے دو عالم کے سر تلک
ہو جاں گے[2] پتلیوں ہی پر آنسو توے کی بوند — گر کام کر گئی تفِ دل چشمِ تر تلک
آنسو وہ لعلِ بیش بہا ہے، کہ جوہری — قیمت میں جس کی دیتے ہیں لعل و گہر تلک

---

1 جمنا = دیر تک بیٹھنا 2 ہو جاں گے = ہو جائیں گے یا ہو جاویں گے اسی طرح آج بھی امروہہ اور اس سے نواح میں بولا جاتا ہے۔

اپنا چراغ عمر سرِ شام ہوگیا[1] جل کا اس کے کام نہ پہنچا سحر تلک

جاتا ہے گر تو، یار کے کوچے میں مصحفی
چل میں بھی تیرے ساتھ ہوں اس رہ گذر تلک

گ

292

کہتی ہے نمازِ صبح کی بانگ — اُٹھ صبح ہوئی ہے کچھ دعا مانگ
دیکھا میں چہار دانگِ عالم — پر ہاتھ لگا نہ کچھ بھی اک دانگ[2]
سیمیں بدن اس کا، چاندنی میں — ڈرتا ہوں پگھل نہ جاوے جوں رانگ
ٹوٹا جو ہمارا شیشۂ دل — پہنچے گی فلک تک اِس کی گل بانگ
بہروپ ہے یہ جہاں کہ جس میں — ہر روز نیا ہے اک سانگ
کرتا ہوں سوال جس کے در پر — آتی ہے یہی صدا کہ پھر مانگ[3]
دلّی میں پڑیں نہ کیوں کے ڈاکے — چوروں کی ہر ایک گھر میں ہے تھانگ[4]

اے شوخ یہ خونِ مصحفی ہے
چل بچ کے، نہ آتے جاتے یوں لانگ[5]

293

اس نے دیکھا صاف کیا اس دیدۂ پرخوں کا رنگ — کچھ مکدر سا نظر آیا مجھے جیحوں کا رنگ

---

[1] ہوگیا = ختم ہوگیا، بجھ گیا۔ [2] دانگ، ایک معمولی سکہ [3] یعنی چل پھر کر مانگ، آگے مانگ
[4] تھانگ = ٹھکانا، چوروں کو مخبری کرنا، اس کے سوا گھر میں کوئی محفوظ جگہ جس میں قیمتی اشیاء چھپا کر رکھی جاتی ہیں (دیکھو: فیلن) [5] لانگنا = اُلانگھنا، عبور کرنا

اس قدر کاہے کو چہرہ اس جواں کا زرد تھا عشقِ لیلیٰ نے کیا ہے ہائے یہ مجنوں کا رنگ
لالۂ خودرَو کی جا کر دیکھ ٹک اُس کے بہار جیسے کندن سا جھمکتا ہے پڑا ہاموں[1] کا رنگ
جس طرح ابرِ سیہ سے جلوہ فرما ہو شفق یوں مسی سے ہے نمایاں اس لبِ مے گوں کا رنگ
کب حنائے بستہ کے[2] باندھے سے حاصل ہو وہ لطف گو اُلٹ کر یار پھر باندھیں مرے مضموں کا رنگ
نیم بسمل کی طرح خوں میں تڑپ کر رہ گیا آخر آخر یہ ہوا پیارے ترے مفتوں کا رنگ
گرچہ سَو سَو بار دھویا اس نے آبِ گرم سے دامنِ قاتل سے پر چھوٹا نہ میرے خوں کا رنگ
آہ پر لختِ جگر کو کر دیا تو نے جو نصب
مصحفی کیا تھا یہی اس مصرعِ موزوں کا رنگ

294

رکھتی ہے جو عارض کی ترے جلوہ گری رنگ ویسا تو کہاں پاوے میاں حور و پری رنگ
دیکھا ہے تجھے جلوہ کناں جب سے چمن میں ہر گل کا اُڑاتی ہے نسیمِ سحری رنگ
رو کش ترے ہونٹوں سے جو ہوتا ہے وہ شاید ہے تشنۂ خوں اپنا عقیقِ جگری رنگ[3]
جو نالہ کہ آغشتہ بخوں سینے سے نکلا پایا نہ میں اس میں بھی بجز بے اثری رنگ
تربت پہ مری ہم نفساں[4] عود جلانا یعنی ہوں میں مقتولِ لباسِ اگری رنگ
یارو دمِ آخر ہے، مرا یاس کے مارے کیوں زرد نہ ہو، جیسے چراغِ سحری رنگ
بیداد ہے دینا، اسے نسبت رگِ گل سے رکھتی نہیں ہرگز تری نازک کمری رنگ
گذرا نہیں گر دل سے وہ خونیں جگراں کے رکھتی ہے ترے تیر کی پھر کیوں یہ سری[5] رنگ
عارض پہ ہوا خط کا غبار آ کے نمایاں اب کیوں کے نہ ہو حسن کا تیرے سفری رنگ

---

[1] ہاموں = صحرا [2] حنائے بستہ = لگائی ہوئی مہندی۔ [3] جگری رنگ = گہرے سرخ رنگ کا عقیق [4] ن ۳: جائے سپند عود جلانا۔ [5] سری = نوک، سر تیر اس میں یائے زائدہ ہے۔

اللہ رے اس تیرے بُنا گوش کا جلوہ — رکھتا نہیں ایسا کوئی گل برگِ تری[1] رنگ

تا دامنِ قاتل نہ ہو آلودۂ تہمت — زخموں میں چرایا ہے یہ خونِ جگری رنگ

گر دیکھیے جوں شمعِ سحر، بشرے کو اُن کے — ہے بزم نشینانِ جہاں کا سفری رنگ

ہم سنگ[2] کروں اس کا، اگر لختِ جگر کو — ہو جاوے سبک وو ہیں عقیقِ جگری رنگ

اے مصحفی جو گل کہ اُگا خاک سے میری
لایا نہ وہ آخر کو بجز بے ثمری رنگ

ل

295

اُمڈے ہیں عَین سے آج بادل — بھر جاویں گے روتے روتے جل تھل

اے عشق، جہاں ہے یار میرا — مجھ کو بھی اُسی جگہ تُو، لے چل

یارب کہ نہ چین سے وہ سووے — جس نے کہ کیا ہے مجھ کو بے کل

نت اپنی تو بوریے پہ گذری — دیکھا نہ بخواب، فرشِ مخمل

گر قتل کرے ہے عاشقوں کو — مجھ کو بھی تو ذبح کر لے اوّل

کیا فکر کریں کہ ہے ہمیشہ — دل منتشر و حواس مختل

سیدھا ہوا بارے مار کھا کر قطعہ نکلے ہی نہ تھا کبھی ترا بل

اے مصحفی اب سزا کو پہنچا
اس کوچے میں تو پھر آئیو کل[3]

---

[1] اس میں بھی یائے زائدہ ہے۔ [2] ہم سنگ = ہم پلّہ، یعنی اگر ساتھ تولوں۔

[3] یہ طنز اور تنبیہ کا لب ولہجہ ہے، یعنی آیندہ مت پھٹکنا

296

دامن کے تئیں ذرا اُٹھا چل ۔۔۔ یعنی یہ ہے عاشقوں کا مقتل

ہے عشق وہ بحرِ بے سر و بُن ۔۔۔ آخر ہے نہ جس کا کچھ نہ اوّل

کچھ اینٹھے ہی جائے ہے وہ ہم سے ۔۔۔ اللہ رے تیری زلف کا بل

صندل کا درخت ہے ترا قد ۔۔۔ اور ہاتھ ہیں جیسے[1] شاخِ صندل

کیا سرمے کی کچھ سیاہی[2] کم تھی ۔۔۔ آنکھوں میں دے آئے ہو جو کاجل

یہ حضرت مصحفی کا سر ہے
پانوؤں کے تلے تو اس کو مت مل[3]

297

چپ، بس بہت ہوئی تری فریاد مبتذل[4] ۔۔۔ اب آپ کو نہ کر دلِ ناشاد مبتذل

آیا نہ مرغِ تازہ، کبھی تیرے دام تک ۔۔۔ کھینچا بھی کوئی تو' نے، تو صیّاد مبتذل

آگے صفائے عارض وقد کے ترے میاں ۔۔۔ ہے حسن و جلوۂ گل و شمشاد مبتذل

بیداد یہ بڑا ہے کہ پانوؤں میں خلق کے ۔۔۔ ہوتا ہے تیرا کشتۂ بیداد مبتذل

اے خوں نہ جوش کیجیو اس نو بہار میں ۔۔۔ صد جا ہوا ہے نشترِ فصّاد مبتذل

ہو مرغِ دل نہ طائرِ رنگِ حنا کی طرح ۔۔۔ ہاتھوں میں تیرے طفلِ پری زاد مبتذل

یاروں کے فکرِ تازہ کی عالم میں دھوم ہے ۔۔۔ مضمون باندھتے نہیں استاد مبتذل

اور ہی ادا ہے تیغ لگانے میں یار کے ۔۔۔ ہے وضع قتل کی ترے جلّاد مبتذل

---

[1] ن ۳: اور ہاتھ ہیں دونوں [2] ن ۳: کیا سرمے کی کچھ نمود

[3] یہاں اور شعر ۲۳۶۸ میں پانوؤں بہ طور جمع استعمال ہوا ہے۔

[4] مبتذل کے کئی معنی ہیں، بازاری معمولِ عام، استعمالی، عامیانہ، فرسودہ وغیرہ، ان معنوں کا اثر ہر ردیف میں ملے گا۔

پہنچے ہے کب وہ داد کو عاشق کو دوستاں ہوتا، نہ خوب شیوۂ بیداد مبتذل[1]

دنیا نہ جائے دید ہے موند آنکھیں مصحفی
پاتا ہوں میں بہت یہ غم آباد مبتذل

298

آ کر ہماری خاک پہ اس نے چڑھائے گل آخر کو جذبِ عشق نے یاں بھی کھلائے گل[2]
گر یہ روش ہے تیری تو دامن کی جھونک[3] سے پامالِ ناز ہوویں گے سب تختہ ہائے گل
ہے دیدنی بہار، جنوں کی مرے کہ میں ٹکڑے جگر کے رکھے ہیں سر پر بجائے گل
آیا تھا صبح بند کھلے کون باغ میں جو آج چاک چاک ہے جیبِ قبائے گل
بھڑکے نہ کیوں کے فصلِ بہار آتشِ جنوں دامن جھپکتی[4] آتی ہے ہر دم ہوائے گل
خوبانِ ہفتہ دوست[5] کے ملنے سے درگذر آئے ہے ان کے رنگ[6] میں بوئے وفائے گل

ہم کو چمن میں جانے سے کیا ربط مصحفی
نے آشنائے بلبل و نے آشنائے گل

299

گو نہ ہاتھ آئے ہمارے ترے رخسار کا پھل ہم نے نظروں سے چنا گلشنِ دیدار کا پھل

---

[1] مراد یہ ہے کہ جب اس کی بیداد خوب عام ہو جائے گی تب عاشق کی طرف بھی رخ کرے گا۔

[2] گل کھلانا = نیا ماجرا دکھانا [3] دامن کی جھونک = تیزی میں چلنے سے دامن کی زد میں آنا، یہ بہت ہی لطیف مفہوم کا اظہار کر رہا ہے، ہماری طرف ''جھونک'' آج بھی بولا جاتا ہے اسے جھپا کا یا جھپٹا بھی کہہ لیجیے، مگر جھونک کا لطف ہی الگ ہے۔ [4] دامن جھپکنا = دامن کی ہوا دینا، یاد رہے کہ پنکھا جھلا جاتا ہے اور دامن جھپکا جاتا ہے۔ [5] ہفتہ دوست = ہفتہ بھر کے دوست یہ بھی نئی ترکیب ہے۔

[6] رنگ = وضع

بند کر لب کو نتیجہ ہے دعا کا دشنام
دوستی چھوڑ کہ یاں دشمنی ہے پیار کا پھل[1]

میوۂ خانہ رَسِ حسن[2]، زبس شیریں ہے
اُس کے خواہندہ نہیں کھاتے ہیں بازار کا پھل

غیر از سیب زنخداں نہیں درکار مجھے
باغباں تجھ کو مبارک رہے گلزار کا پھل

گو کہ وہ تلخ تر از طعمِ سمِ قاتل ہو
کامِ عشاق میں میٹھا ہے غمِ یار کا پھل

دیکھتا تو ہے مرے تب کو، ولے یہ ڈر ہے
ہاتھ کہیں جاوے پھپھولوں میں نہ غم خوار کا پھل[3]

مصحفی قبضے میں رکھوں گا میں اُس ابرو کو
زور ہی ہاتھ لگا ہے مرے تلوار کا پھل

300

کر دیا اس کی کمر نے ہم کو بیمارِ خیال
بیٹھے بیٹھے ہو گئے ہیں ہم گرفتارِ خیال

گر خیال اس کا کبھی آیا ہے اپنے خواب میں
خواب میں بھی ہم رہے ہیں ناز بردارِ خیال

یاد آیا ہے کہ میں راتوں کو جب بیدار تھا
تھی مری آنکھوں کی پُتلی خالِ رخسارِ خیال

وہ برہمن زادہ ہووے کیوں کے یار اپنا، کہ ہے
باندھنا مشکل کمر سے اُس کی زنّارِ خیال

جس گھڑی رفتار کا تیری تصوّر بندھ گیا
پھر، رہی آنکھوں ہی میں پھرتی وہ رفتارِ خیال

دیکھیے سودائے کاکل سے بچے گا کیوں کے دل
بے طرح پیچھے پڑا ہے اس کے آزارِ خیال

اُس کے آنے کا بھی اب وہ بے وفا مانع ہوا
ہم غنیمت جانتے تھے جس کا دیدارِ خیال

ہو چکے وہ دن، جو وہ رشکِ قمر تھا روبرو
مصحفی اب میں ہوں تنہا اور شب تارِ خیال

---

[1] پھل = ثمرہ، انجام [2] میوۂ خانہ رس = گھر میں پیدا کیا ہوا میوہ، یہ بھی نرالی ترکیب ہے اور لائق ترویج۔ [3] پھلنا = زخم کا پھیلنا

301

دھویا گیا تمام، ہمارا غبارِ دل — گریے نے، دل سے خوب نکالا بخارِ دل

اتنا نہیں کوئی، کہ خبر اُس کی آ کے لے — کب سے بجھا پڑا ہے چراغِ مزارِ دل

دل جس گھڑی کہ ہونے لگے صدقے یار کے — اُس وقت اپنی جان ہی کیجیے نثارِ دل

صبر و قرار کب کا ہمارا وہ لے گیا — سمجھے تھے جس کو مایۂ صبر و قرارِ دل

تیر و کماں کو لے کے وہ نکلا ہے ہاتھ میں — اُس بت کو پھر ہوئی ہے ہوائے شکارِ دل

کہتے ہیں داغِ عشق کسے، ہم کو کیا خبر — اک قطرہ خونِ گرم تو ہے ہم کنارِ دل

ہونٹوں تک آتے آتے، ہوئی وہ بھی سرد، آہ — اک آہِ سرد تھی جو مری غم گسارِ دل

مانندِ لالہ، اس چمنِ دہر میں مرا — یہ داغِ تازہ ہے سببِ افتخارِ دل

مجبور ہوں میں کیوں کے کروں ضبطِ گریہ آہ — نے اختیارِ چشم ہے، نے اختیارِ دل

دل داغِ غم سے جل کے ہوا خاک، یا نصیب — لائی یہ رنگ تیرگیٔ روزگارِ دل

آتا ہے جی میں، پہلو میں دل کو چھپا رکھوں — یاں تک، کہ وہ کیا ہی کرے انتظارِ دل

رازِ دل اپنا کس سے کہوں ہائے مصحفی
ملتا نہیں مجھے تو کوئی رازدارِ دل

302

یوں پڑا رہتا ہے اُس ابروے خم دار میں بل — جیسے ہوتا ہے پرانی کسی تلوار میں بل

پیچ پر پیچ ہی کھاتا ہے جو دیکھے ہے اُسے — ہیں پڑے بس کہ تری کجئ دستار[1] میں بل

لپٹی ہی جاتی ہے کچھ اُس کے بدن سے کافر — اُس برہمن بچے کی بس کہ ہے زنار میں بل

جو سہی سروِ گلستانِ خوش اندامی ہیں — ہر قدم چلتے ہوئے کھاتے ہیں رفتار میں بل

---

1. اس طرح تہ کیں پہلے جائز تھیں اب متروک ہو چکی ہیں۔

دل اُلجھتا رہا، تا صبح ہمارا شب کو　　پڑ گیا اس کے جو پھولوں کے ذرا ہار میں بل
پیچ پگڑی کے تری رشک سے بل کھاتے ہیں　　جب سے دیکھے ہیں ترے طرّۂ طرار میں بل
اینٹھی ہی جاتی ہے کچھ زلف تری عاشق سے　　تب تو پڑتا ہے میاں اس کے ہر اک تار میں بل
ہاتھ اے بہلہ نہ رکھ اُس پہ کہ میں ڈرتا ہوں　　پڑ نہ جاوے کہیں موے کمرِ یار میں بل

مصحفی جب کہ وہ مستانہ قدم رکھتا ہے
کیا غضب پڑتے ہیں اس کیفیٔ مے خوار میں بل

م

303

جب واقفِ راہ و روشِ ناز ہوئے تم　　عالم کے، میاں خانہ برانداز ہوئے تم
نسبت تمھیں کیا تازہ نہالانِ چمن سے　　اے نام خدا، سرو سر افراز ہوئے تم
میں تم سے نہ بولوں گا کبھی، اے لبِ تشنہ　　اُس بن بہ تبسّم بھی اگر باز ہوئے تم
وہ خاک مرقّع ہوئی اے دیدۂ خوں بار　　جس خاک کے صفحے پہ چمن ساز ہوئے تم
مرغانِ چمن کرتے ہو کیوں ہرزہ درائی　　کیا قہر ہوا کچھ جو خوش آواز ہوئے تم
پہنے سے میاں جامۂ گل دوز[1] کے بر میں　　طاؤس صفت اور بھی طنّاز ہوئے تم

اے مصحفی مرغانِ چمن رہ گئے خاموش
جب باغ میں جا، زمزمہ پرداز ہوئے تم

304

ہر چند ہے وہ نورِ نظر روبروے چشم　　تس پر بھی چین دیتی نہیں جستجوے چشم

---
[1] ایسا لباس جس پر پھول بوٹے کاڑھے گئے ہوں۔

تم اس میں اپنا پھول سا مکھڑا نہ دیکھیو　　آتی ہے آئینے سے میاں مجھ کو بوے چشم
جب دیکھتا ہوں گل کو تو اس مو کمر بغیر　　چبھتی ہے آنکھ میں رگِ گل، مثلِ موے چشم
جھمکیں ہیں آبِ اشک میں گل برگِ لختِ دل　　جوے چمن سے کم نہیں اپنی بھی جوے چشم
بن دیکھے روے خوب کے رہتی نہیں کبھی　　کیا کیجیے یہی پڑی اپنی تو خوے چشم
پیارے جو سَو طرح کا ادا فہمِ ناز ہو قطعہ سمجھے تو سمجھے وہ ہی تری گفتگوے چشم
یعنی کہ اس کی چشم کو دیکھا ہی کیجیے
ہے مصحفی مری[1] تو یہی آرزوے چشم

305

بے نام و نشاں بہت رہے ہم　　پردے میں نہاں بہت رہے ہم
کچھ بات چلی تھی شمع رو کی　　شب گریہ کناں بہت رہے ہم
اب جاتے ہیں اُس جہاں کو، تم میں　　اے اہلِ جہاں بہت رہے ہم
شب گھر سے وہ ماہ رو نہ نکلا　　در پر نگراں بہت رہے ہم
اُس بت کی کمر کبھو نہ دیکھی[2]　　چندے بہ گماں بہت رہے ہم
کیوں سوے عدم ابھی سے جاویں　　دنیا میں کہاں بہت رہے ہم
تم جاؤ چلے کہ تم سے پیچھے　　اے پیش رواں، بہت رہے ہم
مژگاں کی صفوں میں کل مقابل　　با تیر و سناں بہت رہے ہم
جاتا ہے اُچٹ دل اپنا وو ہیں قطعہ ٹک جم کے جہاں بہت رہے ہم
اب چلیے کہیں کو لکھنؤ سے
اے مصحفی یاں بہت رہے ہم

---

[1] ن۳: یہی تو مری　[2] ن۳: سنی نہ دیکھی

306

ایک سے آنکھیں لڑا بیٹھے ہیں ہم — ان دنوں پھر جی چلا[1] بیٹھے ہیں ہم
جب بہار آئی ہے، گل کے سامنے — کر گریباں چاک، جا بیٹھے ہیں ہم
دیکھ کر آشفتہ اس کی زلف کو — ڈر کے مارے مُنھ چھپا بیٹھے ہیں ہم
بے حواسی سے شب اُس کی بزم میں — حالِ دل اپنا سنا بیٹھے ہیں ہم
بن بلائے در پہ تیرے بارہا — جب ہوئی ہے صبح، آ بیٹھے ہیں ہم
چھیڑ مت، ہردم نہ آئینہ دکھا — اپنی صورت سے خفا بیٹھے ہیں ہم

دیکھ کر آنکھوں کو اس کی، مصحفی
ان دنوں سرمہ[2] سا کھا بیٹھے ہیں ہم

307

جب تک کہ میں ہوں، رہیو مرے روبروے چشم — مت مجھ سے مُنھ چھپائیو اے آرزوے چشم
دیکھا ہے جب سے رخنۂ دیوار کو ترے — رہتا ہے آفتاب کا اُودھر ہی روے چشم
کب چھوٹتا ہے دامنِ مژگاں سے داغِ خوں — جب تک نہ موجِ گریہ کرے شُست وشوے چشم
جانا میں تیرے رخنۂ دیوار سے کہ یار — تجھ کو بھی چین دیتی نہیں جستجوے چشم
سرخی سی اب تلک نظر آجائے ہے مجھے — اے گریہ تو نے خوب نہ کی شُست وشوے چشم
یاں تک کیا میں گریہ، کہ خوباں کے عشق میں — ساتھ آبرو کے اپنی، گئی آبروے چشم

---

[1] محمد حسین آزاد نے ''جی چلنا'' کو امروہے کا محاورہ بتایا ہے۔ اس کی بحث ہم نے مقدمہ کلیاتِ مصحفی میں تفصیل سے کی ہے۔ رجوع کنید باں۔

[2] سرمہ کھانا = خاموش رہنا کہتے ہیں کہ سرمہ کھا لینے سے گلا بیٹھ جاتا ہے، آواز نہیں نکلتی۔

نرگس نہیں یہ تربتِ یوسف پہ مصحفی
تھا خوب رُو ہے خاک پر اس کی علوے چشم

308

یوں چلتے ہیں لوگ راہ ظالم — کوئی چال ہے یہ بھی آہ ظالم
اوروں کی طرف تو، دیکھتا ہے — ایدھر بھی تو کر نگاہ، ظالم
ہے راست تو یہ کہ میں نہ دیکھا — تجھ سا کوئی کج کلاہ، ظالم
کچھ رحم بھی ہے، تری جفا سے — اک خلق ہے داد خواہ، ظالم
کس واسطے بولتا نہیں تو — کیا مجھ سے ہوا گناہ ظالم

اے مصحفی دل کہیں نہ دیجیے
ہوتی ہے بری یہ چاہ ظالم

309

ہے خطِ یار، شب کو نیا لکھ رکھیں گے ہم — قاصد تو صبح آئیو، جا لکھ رکھیں گے، ہم
مارے صفا کے دل میں ٹھہرتا نہیں وہ حسن — کاغذ اُپر یہ حُسن و صفا لکھ رکھیں گے ہم
ہیں یادگارِ عالمِ فانی یہ دونوں چیز — اُس کی جفا اور اپنی وفا لکھ رکھیں گے ہم[1]
پُرمبتذل[2] ہوا ہے تو اے شوخ، بعد ازیں — ہرجائیوں میں نام ترا لکھ رکھیں گے ہم
آتا نہیں سمجھ میں کہ کہتے ہیں کس کو عشق — اک پرزے پر یہ حرف جدا لکھ رکھیں گے ہم
عنابِ اشک سے تپِ دل دوٗر ہوگئی — کتنی مفید ہے یہ دوا لکھ رکھیں گے ہم

کرنا نہیں اسے قلم انداز مصحفی
یہ ریختہ ہوا ہے نیا لکھ رکھیں گے ہم

---

[1] ملاحظہ ہو شعر نمبر ۱۱۴۹ کا حاشیہ [2] پُرمبتذل بمعنی بہت زیادہ عام۔

310

غنچے نے ترے لب سے لیا دام تبسّم
اور آنکھوں سے سیکھا گلِ بادام تبسّم

لاکھوں کو کیا صید تری جنبشِ لب نے
گلشن میں ہزاروں کا ہوا دام تبسّم

زلفوں میں اچنبھا نہیں کچھ اُس کے بنا گوش
یاں کرتی ہے نت صبح تہِ شام تبسّم

گل رشک سے جلتے ہیں، جو کرتا ہے چمن میں
چولی کے مسکنے سے وہ اندام تبسّم

جس گھر میں ہو خورشیدِ رخِ یار کا جلوہ
موجود ہے واں تا بہ لبِ بام تبسّم

کون آج تری بزم میں آیا ہے جو ساقی
ہنستی ہے صراحی، کرے ہے جام تبسّم

اندازِ نزاکت ہے حد اس غنچہ دہن کو
کیوں کر نہ رگِ گل پہ رکھے[1] نام تبسّم

اس زیرِ لب[2] خندہ کے کشتوں میں ہوں جس کا
نزدیک ادا فہموں کے، ہے نام تبسّم

اے مصحفی میرے دلِ ناشاد کی خاطر
ایجاد کیا اس نے بہ دشنام تبسّم

311

سننے پائے نہ دہن اُس کے سے، دشنام تمام
جنبشِ لب ہی میں، اپنا تو ہوا کام تمام

تو وہ گل ہے کہ گلستانِ جہاں میں پیارے
محو ہیں تیری ہی سج دھج کے، گل اندام تمام

میں ہوں اس کفر کے صدقے، کہ بہ ایں حسنِ سیاہ
لے گئی زلف تری رونقِ اسلام تمام

بے تکلف، تری آنکھوں سے اُسے کیا نسبت
کیوں کہ سوزن زدہ ہے دیدۂ بادام تمام

کوئی صیّاد نہیں سوے چمن رو کرتا
اس برس ٹوٹے پڑے ہیں قفس و دام تمام

میں وہ گردن زدنی ہوں کہ تماشے کو مرے
شہر کے لوگ کھڑے ہیں بہ سرِ بام تمام

کبھو ساقی سے کوئی جاوے جو میخانے میں
کہ دعا دیتے ہیں تجھ کو یہ مے آشام تمام

---

[1] نام رکھنا = اعتراض کرنا
[2] اضافت توصیفی مقلوب ہے، یعنی خندۂ زیرِ لب۔

اتنا بے قدر تو ہوں میں کہ کسی نے ہرگز　　اُس کے مُنھ سے نہ سنا ہوگا مرا نام تمام

مصحفی اتنی سمیّت ہے کہاں کالے[1] میں
زہر کی گانٹھ ہے وہ زلفِ سیہ فام تمام

312

جوں شمع، داغِ غم نے جلایا بدن تمام　　نکلی نہ دل سے پَر ہوسِ سوختن تمام

وہ مرغِ نیم بسملِ نازِ بتاں ہوں میں　　رنگیں ہے جس کے خون سے صحنِ چمن تمام

ہیں کشتہ اُس کی تیغ کے کتنے، پر اس طرح　　لوہو میں شور بور ہے کس کا کفن تمام

مژگانِ چشمِ یار کی خنجر زنی نہ پوچھ　　ہیں معرکے میں عشق کے وے صف شکن تمام

اُس کے بدن سے حسن ٹپکتا نہیں تو پھر　　لبریز آب و رنگ ہے کیوں پیرہن تمام

شیریں بہت چڑھی تھی سر اُس کے سو آخرش　　کھا آپ زخمِ تیشہ ہوا کوہکن تمام

ازبس کہ ڈال رکھے ہیں واں کتنے مار کر　　لوہو سے بھر رہا ہے وہ چاہِ ذقن تمام

ہم کو قسم ہے یار کی لکنت کی مصحفی
گر اس کے مُنھ سے ہم نے سنا ہو سخن تمام

313

ہوتا نہیں ہے یار کا جور و ستم تمام　　اس منجھلے[2] میں کاش کے ہو جاویں ہم تمام

کاغذ نہ آیا واں سے کبھی ہائے اے ندیم　　خط لکھتے لکھتے گھِس بھی گیا یاں قلم تمام

سودا نہ کیوں کے کیجیے ابروے یار سے　　تیغِ ولایتی کی طرح ہے وہ خم تمام

اس بت کدے میں ہے کوئی تجھ سا بھی جلوہ گر　　حیراں ہیں جس کی شکل کے نت یہ صنم تمام

---

[1] محض کالے سے مراد مار سیاہ (ہفی، بھجنگ)۔ مصحفی نے سمیّت پر وزن طبیعت باندھا ہے اور اردو کی بولی میں یہی صحیح ہوگا۔ [2] منجھلے میں = کشمکش میں۔ امروہے میں منجھیلا بروزن سویرا بھی بولتے ہیں۔

سو بار تو نے وعدہ کیا اور نہ پھر ملا　　تیری تو یار جھوٹی ہی نکلیں قسم تمام
واماندگاں کی رہ سے کبھی پھر بھی کر گذر　　چشمِ پُر انتظار ہیں نقشِ قدم تمام
وہ شخصِ دل گداختہ ہوں میں کہ مصحفی
ٹپکے ہے گفتگو سے مری درد و غم تمام

314

وہ دن گئے کہ ہم کو کبھی تھا ریا سے کام　　کیا کیجیے کہ اب تو پڑا ہے خدا سے کام
پیدا کیا ہر ایک کو اک کام کے لیے　　اس کو جفا سے کام ہے، ہم کو وفا سے کام
بادِ صبا سے بیش ہے واں اپنی رفتگی　　تس پر بھی ہائے ہم کو ہے بادِ صبا سے کام
اتنا جو ہم سے رہتے ہو بیگانہ میری جان　　شاید پڑا ہے تم کو کسی آشنا سے کام
ٹک ان بتوں کی چشم کی گردش تو دیکھیو　　خانہ خراب، کرتی ہیں کس کس ادا سے کام
خائف ہیں تند خوئی سے تیری جو اہلِ ہوش　　تو دیکھ تو کہ لیتے ہیں کس التجا سے کام
اپنی مرادیں مانگنی ساری گئے ہیں بھول　　شام و سحر ہے اب ہمیں تیری دعا سے کام
خالی کروں ہوں ریختہ کہہ دل کو مصحفی
تحسیں سے مدعا ہے نہ کچھ مرحبا سے کام

315

یا تو گل دیتے تھے چن کر خویش و بیگانے کو ہم　　یا ترستے ہیں قفس میں باغ تک جانے کو ہم
مے اگر پی ہم نے بن ساقی تو خونِ دل پیا　　لائے گردش میں تو اپنے سر کے پیمانے کو ہم
یار دامن سے ترے کوئی شعلہ بھڑکا چاہیے　　جوں خس و خاشاک پھر آندھی ہیں جل جانے کو ہم
اپنا سر رکھنا، قدم پر تیرے، یاد آتا ہے یار　　دیکھتے ہیں جب کہ پائے شمع پروانے کو ہم

کچھ تو اے شیریں لبو انصاف بھی درکار ہے　　بوسہ لینے کو رقیب، اور گالیاں کھانے کو ہم
فوجِ طفلاں بر قفا اور اشکِ گل گوں در جلو　　روز ہی اک شان سے جاتے ہیں ویرانے کو ہم
شمع آسا قصۂ سوزِ دل اپنا ہے دراز　　صبح کر دیویں اگر چھیڑیں اس افسانے کو ہم
مصحفی ہرگز کسی کی بات کو سنتا نہیں[1]
کب تلک سمجھاویں یارب ایسے دیوانے کو ہم

316

کیا کریں جا کے گلستاں میں ہم　　ہیں بہ کنجِ قفس فغاں میں ہم
جانتے آپ سے جدا تجھ کو　　کرتے گر فرق جسم و جاں میں ہم
ہیں تجلّیٔ ذات کے تیری　　ایک پردہ سا درمیاں میں ہم
گل کا یہ رنگ ہے تو اب اک دن　　آگ رکھ دیں گے آشیاں میں ہم
واں تغافل نے اپنا کام کیا　　یاں رہے مہر کے گماں میں ہم
آسماں کو نشانہ کرتے ہیں　　تیر رکھتے ہیں جب کماں میں ہم
مر کے نکلے قفس سے، خوب ہوا　　تنگ آئے تھے اس مکاں میں ہم
گر یہی آہ ہے تو دیکھو گے　　رخنہ کر دیں گے آسماں میں ہم
شاخِ گل کے گلے سے لگ لگ کر　　روتے ہیں موسمِ خزاں میں ہم
باغ تک جاتے، ہاں اگر پاتے　　طاقت اس جسمِ ناتواں میں ہم
مصحفی عشق کر کے آخر کار
خوب رسوا ہوئے جہاں میں ہم

---

[1] ن۳: دل کی نافہمی سے اپنا جی تو اب گھبرا گیا۔

317

کچھ اس قدر نہیں سفرِ ہستی و عدم[1] گر پانو اُٹھایئے تو یہ عرصہ ہے دو قدم

شبنم تو دیکھ رات گلستاں کو لے گیا ٹکڑے جگر کے آپ میں دامن میں کر بہم[2]

ملنے کا ہم سے تو نہیں اے آرزوے جاں اک روز ہو چکیں[3] گے اسی آرزو میں ہم

وہ آفتاب چہرہ کہیں ہوگیا تھا صبح ہیں اس چمن میں سبزے کی مژگاں ہنوز نم

چھوٹے نہ دام زلف سے اُس صید بند کے سر کو پٹک پٹک کے موئے طائرِ حرم

شبنم سے آنسوؤں کی مرے دیکھیو صفا بلبل تجھے بہ پاکی دامانِ گل، قسم

کب اعتدالِ قد کو ترے پہنچے ہے میاں ہر چند سرو بھی ہے بہ خوش قامتی علم[4]

کیوں کر نہ حرف اس کے بھلا پیچ دار ہوں

لکھتا ہے مصحفی صفتِ زلفِ خم بہ خم

318

صیّاد نے ہمیں نہ کیا صید، ہے ستم آئے تھے شوقِ دام میں اڑ آشیاں سے ہم

کاغذ پہ میری چشم سے آنسو ٹپک پڑے جب کر چکا میں نامہ بہ صد آرزو رقم

اُگلی پڑے ہے اب تو تری تیغ خوش غلاف آگے تو اس قدر تو نہ تھا مائلِ ستم

کیا سر اُٹھاویں اب کہ مہِ نو کو دیکھ کر دھوکے میں تیغِ ابرو کے، مارے پڑے ہیں ہم

بےصرفہ[5] کیجیو نہ گریباں کو میرے چاک ناموسِ عشق کی ہے تجھے اے جنوں قسم

نومید مصحفی سے نہ ہو یارو وقتِ نزع

تم نے سنا نہیں ہے کہ اک دم ہزار دم

---

۱ سودا: ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

۲ بہم کر کے = جمع کر کے ۳ ہو چکیں گے = مر جائیں گے ۴ علم = نمایاں مشہور

۵ بےصرفہ = بےسبب، بےفائدہ

319

نقشِ نگیں ہے دل میں تو اپنے بتاں کا نام
گو یاد ہووے ان کو نہ مجھ خستہ جاں کا نام

ہوتا ہے دل شگفتہ کب اُس بن، مرے حضور
آ کر کے لو ہزار کوئی گلستاں کا نام

بتلائیو، کہ بھول گیا ہوں میں بوجھ کر
یارو کسی کو یاد ہے اُس دل ستاں کا نام

عنقا کی طرح کوچے میں عزلت نشیں ہوں لیک
مشہورِ روزگار ہے مجھ بے نشاں کا نام

یاں خار و خس کے آتشِ گل ہے سُراغ میں
مرغِ چمن تو لیجیو مت آشیاں کا نام

جانا تھا میں بہار ہے، کل باغباں سے
مُنھ زرد ہو گیا مرا، سنتے خزاں کا نام

سر دے چکا نہ مصحفی اس بات پر، میاں
مت لیجو ہر کسی سے کبھی امتحاں کا نام

320

جب تک کہ تری گالیاں کھانے کے نہیں ہم
اُٹھ کر ترے دروازے سے جانے کے نہیں ہم

جتنا کہ یہ دنیا میں ہمیں خوار رکھے ہے
اتنے تو گنہگار زمانے کے نہیں ہم

ہو جاویں گے پامال، گذر جاویں گے جی سے
پر سر ترے قدموں سے اُٹھانے کے نہیں سر

آنے دو اُسے جس کے لیے چاک کیا ہے
ناصح سے گریباں کو سلانے کے نہیں ہم

جب تک کہ نہ چھڑکے گا گلاب آپ وہ آ کر
اس غش سے کبھی ہوش میں آنے کے نہیں ہم

جاویں گے صبا باغ میں گلگشتِ چمن کو
پر تیری طرح خاک اُڑانے کے نہیں ہم

اے مصحفی خوش ہونے کا نہیں ہم سے وہ جب تک
سر کاٹ کے نذر اُس کو بھجانے[1] کے نہیں ہم

321

سر اپنے کو تجھ پر فدا کر چکے ہم
حقِ آشنائی ادا کر چکے ہم

---

[1] بھجانا = بھیجنا کا متعدی مصدر۔ اساتذہ نے کم استعمال کیا ہے، مگر گفتگوے عام میں آج بھی رائج ہے۔

تو سمجھے نہ سمجھے ہمیں، ساتھ تیرے　　جو کرنی تھی اے بے وفا کر چکے ہم

خدا سے نہیں کام اب ہم کو یارو　　کہ اک بت کو اپنا خدا کر چکے ہم

میں پوچھا: مرا کام کس دن کروگے　　تو یوں مُنھ پھرا کر کہا: کر چکے ہم

گھرس[1] لےتواب ان کو چیرے میں اپنے　　تماشاے زلفِ دوتا کر چکے ہم

تو جاوے نہ جاوے جو کرنی تھی ہم کو　　سماجت تری اے صبا کر چکے ہم

نہ بولیں گے پیارے، تری ہی سنیں گے　　تو دشنام دے اب، دعا کر چکے ہم

کبھو کام اپنا کسی سے نہ نکلا　　بہت خلق کی التجا کر چکے ہم

لڑی مصحفی آنکھ جس سے کہ اپنی
پر آخر اُسے آشنا کر چکے ہم

322

وہ چاندنی رات اور وہ ملاقات کا عالم　　کیا لطف میں گذرا ہے غرض رات کا عالم

جاتا ہوں جو مجلس میں شب اُس رشکِ پری کی　　آتا ہے نظر مجھ کو طلسمات کا عالم

برسوں نہیں کرتا تو کبھو بات کسو سے　　مشتاق ہی رہتا ہے تری بات کا عالم

کر مجلسِ خوباں میں ذرا سیر کہ باہم　　ہوتا ہے عجب ان کے اشارات کا عالم

دل اُس کا نہ لوٹے کبھی پھولوں کی صفا پر　　شبنم کو دکھادوں جو ترے گات کا عالم

ہم لوگ صفات اُس کی بیاں کرتے ہیں، ورنہ　　ہے وہم وخرد سے بھی پرے ذات کا عالم

وہ کالی گھٹا اور وہ بجلی کا چمکنا قطعہ وہ مینھ کی بَوچھاڑیں، وہ برسات کا عالم

دیکھا جو شبِ ہجر، تو رویا میں کہ اُس وقت　　یاد آیا شبِ وصل کے اوقات کا عالم

ہم مصحفی قانع ہیں بہ خشک و ترِ گیتی
ہے اپنے تو نزدیک مساوات کا عالم

---

[1] گھرسنا= یہ بھی بولی ہے، لپیٹ کر اندر کر لینا

323

کیا وصل کی شب کی میں کہوں رات کا عالم　　وہ رات تھی یا رب کہ طلسمات کا عالم

ہر چند کہ سیمیں بدناں خوب ہیں سارے　　پر سب سے جدا ہے یہ ترے گات کا عالم

اوقات بسر، خونِ جگر کھا کے کروں ہوں　　عالم سے جدا ہے مری اوقات کا عالم[1]

کیا کام ہے دل پھیرنا اس رشکِ پری کا　　تسخیر میں یاں اپنی ہے جنّات کا عالم

اے مصحفی چل تو بھی قُطب کو کہ کہیں ہیں[2]

آتا ہے بہت چھڑیوں میں میوات کا عالم

ن

324

ایک عالم میں کیا تو در بدر میرے تئیں　　بیش ازیں اے عشق اب رسوا نہ کر میرے تئیں

دن میں سو سو بار جانا اُس کے گھر میرے تئیں　　نت وطن ہی میں رہے ہے اب سفر میرے تئیں

دل گیا اُس کی گلی میں، ظلم مجھ پر کر گیا　　اپنے جانے کی نہ کی اُس نے خبر میرے تئیں

روبرو غیروں کے آنا، یہ بھی کوئی انصاف ہے　　مُنھ کو پردے میں چھپانا دیکھ کر میرے تئیں

وائے بے صبری کہ رک کر[3] جب کبھی روتا ہوں میں　　ہچکیاں لگ جاتی ہیں دو دو پہر میرے تئیں

چپ ہی رہنے دو مجھے پوچھو نہ کوئی میری بات　　کیوں کہ رونا آئے ہے ہر بات پر میرے تئیں

بعد مدّت کے لگی ہے صبح ہوتے میری آنکھ　　چھیڑ مت، سونے دے اے بادِ سحر میرے تئیں

رہ سکا ہرگز نہ دل بن دیکھے اس کے، مصحفی

شوق نے آخر بنایا نامہ بر میرے تئیں

۱؎ لفظ اوقات جب وقت کی جمع ہو تو مذکر ہو کر آتا ہے اور بہ طور واحد بہ معنی حیثیت آئے تو مؤنث بولا جاتا ہے۔

۲؎ مصحفی نے قطب بہ فتح دوم باندھا ہے، اور یہی فصیح ہے۔　۳؎ رُک کر = گھٹ کر، کڑھ کر۔

325

بوے گل لائی ہی آخر شور پر میرے تئیں — صبح گلشن میں نہ کرنا تھا گذر میرے تئیں
چندے اک آسودگی سے کیا ہی لگ جاتی تھی آنکھ — اب لگی دکھ دینے پھر بادِ سحر میرے تئیں
شب کوئی پیچھے یہ میرا دشمنِ جانی نہ ہو — اپنے سایے سے بھی اب لگتا ہے ڈر میرے تئیں
کر کے مجھ سے اختلاط آخر کو پچھتائے ہی تم — آپ نے عاشق نہ جانا تھا مگر میرے تئیں
خوئ قسمت تو دیکھو، ہو گیا ان سے بھی بیر — عمر جن لوگوں میں کرنی ہے بسر میرے تئیں
مجھ کو ہے صیاد سے شکوہ کہ اُس بے درد نے — موسمِ گل میں کیا بے بال و پر میرے تئیں

سرمہ آسا خاک میں اے مصحفی میں مل گیا
کھا گئی کیا جانیے کس کی نظر میرے تئیں

326

ازبس کہ نہیں قرار جی میں — سو گذریں ہیں باتیں یار جی میں
خط ہو کے ندان مُنھ پر آیا — تھا اُس کے جو کچھ غبار جی میں
جوں ناوکِ غمزہ اُس نے پھینکا — لگتے ہی ہوا دو سار[1] جی میں
ہے ہے کہ بھرے ہیں سو ملولے[2] — اس میرے امیدوار جی میں
میں دیکھ کے تجھ کو رو دیا جب — کچھ تیرے بھی آیا پیار جی میں
سن ایک[3] ہی سخن کدھر چلا تو — باتیں ہیں ابھی ہزار جی میں
سوزن سے کوئی نکالے کیوں کر — مژگاں کے چُبھے ہیں خار جی میں
اک بار تری گلی میں آؤں — آتا ہے یہ بار بار جی میں
میں تجھ سے کہی سب اپنے دل کی — اب تو بھی نہ رکھیو، یار جی میں

---

[1] دوسار = دو ٹکڑے [2] ملولے = یہ بھی خالص بولی کا لفظ ہے۔ ملاقات کے چاؤ، یا اشتیاق کا عند الملاقات اظہار [3] یہ بہ سقوط ہائے ہوز ''ایکی'' پڑھا جائے گا، اور ہماری بولی میں آج یوں ہیں ہے۔

اے مصحفی درد کا ادب کر
اُپجے[1] ہے جو کچھ، سو مار جی میں

327

کوئی مے بند کرے، کوئی پری شیشے میں
مخترع ہم ہیں کہ آتش ہے بھری شیشے میں

سبز جامے میں ترا لطفِ بدن گر دیکھے
دخترِ رز نہ کرے جلوہ گری شیشے میں

لختِ دل پھرتے ہیں یا ڈال گئی ہے لاکر
برگِ گل آج نسیمِ سحری شیشے میں

اُس نے مانگی تھی مئے سرخ ولیکن میں نے
بھر دیا بھول کے خونِ جگری شیشے میں

ٹکڑے ٹکڑے جو تڑق کر یہ ہوا، تھی ساقی
بند کس کی ہوسِ جامہ دری شیشے میں

موم ہو جاوے وو ہیں دیکھے اگر پتھر بھی
دخترِ رز کی یہ جادو نظری شیشے میں

خُم کے خُم ہو گئے خالی مرے مے پینے سے
نہ نمی جام میں اب ہے نہ تری شیشے میں

مصحفی آج تو ساقی کی خوشامد ہے ضرور
بھر کے لایا ہے مئے بے خبری شیشے میں

328

اور اگر پھول و پان دیتے ہیں
ہم تمھیں اپنا جان دیتے ہیں

ایک شب رہ ہمارے پاس، اے بت
ہم خدا درمیان دیتے ہیں

جان لینے میں اضطراب[2] ہے کیا
لیجیے مہربان دیتے ہیں

ہم نے چاہا بہت کہ بیٹھیں، ولے
بیٹھنے آسمان دیتے ہیں

وے ہمیں ہیں کہ دستِ دشمن میں
اپنا تیر و کمان دیتے ہیں

ہم تو بیرونِ باغ ہی کب کے
قطعہ مصحفی اپنا جان دیتے ہیں

---

[1] اُپجنا = پیدا ہونا [2] اضطراب بہ معنی ہچکچاہٹ نظم ہوا ہے۔

بخت اُس کے کہ جس کو گلشن میں
جاے یک آشیان دیتے ہیں

329

پردہ اُٹھا کے، مہر کو رخ کی جھلک دکھا کہ یوں
باغ میں جا کے، سرو کو قد کی لچک دکھا کہ یوں

آتشِ گل چمن کے بیچ، جب ہمہ سو، ہو شعلہ زن
اپنے لباسِ سرخ کی اُس کو بھڑک دکھا کہ یوں

جو کوئی پوچھے، جانِ من، شوخی و جلوہ کس طرح
لمعۂ برق کی طرح ایک جھمک دکھا کہ یوں

شیشے کے بیچ دختِ رز کرتی ہے شوخ چشمیاں
تو بھی ٹک اپنی چشم کی اُس کو بھڑک دکھا کہ یوں

نظریں ملاوے گر کوئی تجھ سے کبھی تو جانِ من
اس کے تئیں تو دوٗر سے آنکھیں تنک دکھا کہ یوں

کبک و تدرَوٗ گر کریں، آگے ترے خرامِ ناز
اپنے خرامِ ناز کی اُن کو لٹک دکھا کہ یوں

راتوں کو تجھ سے جاگنا گر کوئی پوچھے مصحفی
چشمِ ستارہ باز ہیں، اُس کو فلک دکھا کہ یوں

330

اور سب تم سے وَرے[1] بیٹھے ہیں
ایک ہم ہیں کہ پَرے[2] بیٹھے ہیں

پھٹ چکا جب سے گریباں تب سے
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں

شیشۂ مے کی طرح، اے ساقی
چھیڑ مت ہم کو، بھرے بیٹھے ہیں

قتل کا کس کے ارادہ ہے جو آپ
ہاتھ قبضے پہ دھرے بیٹھے ہیں

مصحفی یار کے گھر کے آگے
ہم سے کتنے نگھرے[3] بیٹھے ہیں

---

[1] ورے = قریب [2] پرے = دوٗر

[3] نگھرے = یہ بھی خاص مصحفی کی زبان ہے۔ اس عہد کے کسی شاعر کے ہاں شاید ہی ملے۔ کتنا بلیغ لفظ ہے۔ بے خانماں وغیرہ سب لفظ اس کے سامنے ہیچ ہیں۔

331

دنیا میں تیری شکل کا ہووے سو کوئی انساں کہاں ۔۔۔ یہ چشم کی گردش کدھر، یہ شوخیٔ مژگاں کہاں

دل جو تماشا دوست تھا، پاتا نہیں اُس کی خبر ۔۔۔ کیا جانے ہو کر رہ گیا وہ غم زدہ حیراں کہاں

دیکھ اُس کو جوں ہی غش کیا، یہ بھی نہ جانا ہم نے پھر ۔۔۔ ساقی کجا، مے کس طرف، مجلس کدھر، جاناں کہاں

بیمار تیرے عشق کا، چنگا ہو پیارے کس طرح ۔۔۔ یہ تو مرض ہے لادوا، اس درد کا درماں کہاں

عیش و طرب یک سو ہوا، غم آ کے ہم پہلو ہوا ۔۔۔ مُنھ بند کر بیٹھے ہیں ہم، اب وے لبِ خنداں کہاں

رنگینیٔ عشق اور ہی، رکھتی ہے آب و تاب کچھ ۔۔۔ رونا مسلّم ابر کا، پر چشمِ خوں افشاں کہاں

اس دم کہ ساقی وقفہ[1] ہے، دے لے تو کوئی جام مے ۔۔۔ کیا جانے لے جاوے مجھے، پھر گردشِ دوراں کہاں

تھا کون ایسا کشتنی، سچ بات کہہ کس سے ٹھنی ۔۔۔ لوہو میں بھر آیا ہے تو، ظالم زہِ داماں کہاں

شمشیر و ابرو کی ترے کرتے خریداری وے لے ۔۔۔ سودا زدوں کو ہم سے اب، سر ہے تو پھر ساماں کہاں

گلیوں کے اندر دھوم ہے میرے جنوں کی ہر طرف ۔۔۔ اس عشقِ شہر آشوب کو اب کیجیے پنہاں کہاں

میری طرح جامے میں تم ہرگز نہ ٹھہرو اک گھڑی ۔۔۔ دیکھا ہے لیک، اے دوستو تم نے اسے عُریاں کہاں

یہ تو گماں ہرگز نہ تھا تیری خرد پر مصحفی
دل تو نے اب جا کر دیا افسوس اے ناداں کہاں

332

ایک دو گالیاں اُس شوخ کی کھا رہتے ہیں ۔۔۔ اپنا جو روز[2] مقرر ہے سو پا رہتے ہیں

مثلِ خورشید تری کو سے، ہم اے غیرتِ ماہ ۔۔۔ شام کو جاویں تو پھر صبح کو آ رہتے ہیں

رہنے والوں نے ترے کوچے کے کیا دیکھا ہے ۔۔۔ مجھ سے کس واسطے وے آنکھیں ملا رہتے ہیں

بس کہ وہ طفل کچھ ان روزوں میں کُھل کھیلا[3] ہے ۔۔۔ بند جامے کے بھی گر دیکھو تو وا رہتے ہیں

---

[1] وقفہ = فرصت، مہلت ۔ [2] روز = روزینہ ۔ [3] کُھل کھیلنا = بے تکلف ہو جانا، حیا چھوڑ دینا

دن کے ہوتے تو کہاں بار ہمیں اُس کوُ میں | پر کبھی چوری چھُپے رات کو جا رہتے ہیں
نہیں معلوم کہ کیا ہم سے ہوئی ہے تقصیر | آپ کچھ اب تو نہایت ہی خفا رہتے ہیں
مجھ کو یہ سوچ ہے جیتے ہیں وے کیوں کر یارب | اپنے معشوقوں سے جو شخص جدا رہتے ہیں

جی رہو یا نہ رہو اُس کی گلی میں جانا
مصحفی ہم کوئی ان باتوں سے کیا رہتے ہیں[1]

333

آنسوؤں سے بس کہ یاں رہتا ہے کارِ آستیں | سلکِ گوہر ہوگیا ہے تارتارِ آستیں
دیکھتا ہے جب اُسے اِس دیدۂ خوں بار پر | حلقِ بسمل ہو نہیں سکتا دوچارِ آستیں
جس طرح ہو شاخِ گل پر غنچۂ گل خوش نما | اس کی ساعد پر ہے تکموں سے بہارِ آستیں
روتے روتے جا رہے ہم حلقۂ گرداب میں | اک ذرا یوں ہی کیا تھا کل فشارِ[2] آستیں

دیکھ کر طوفاں کو میرے اشک کے اے مصحفی
ابرِ دریا بار ہوتا ہے نثارِ آستیں

334

ابرو سے کہہ، میاں نہ کرے تیغ رانیاں | مُنھ موڑ دیں گی ورنہ مری سخت جانیاں
عشقِ بتاں میں کس سے کہوں کیا کیا حصول | تھیں میرے تئیں خدا کو یہ شکلیں دکھانیاں
ہم لطفِ سیرِ باغ کو کیا جانیں، ہم صفیر | ہم نے تو کیں قفس میں سدا پَر فشانیاں
نظّارہ دوست ہے یہ دل اتنا کہ نت اسے | وہی دیدہ[3] بازیاں وہی آنکھیں لڑانیاں
پانوؤں میں خار، چشم میں نم، دل پہ داغِ غم | رکھتا ہوں تیرے عشق کی کتنی نشانیاں

---

[1] کیا رہتے ہیں = بھلا رُکتے ہیں؟ [2] یعنی نچوڑا تھا [3] وہی پہلا بروزن فع (ب سقوط ہوز) دوسرا بروزن فعل۔

اے مصحفی تو عشق میں رسوا بھی ہو چکا
پر بے حیا گئیں نہ تری شعر خوانیاں

335

جس طرح سب جہان میں کچھ ہیں ہم بھی اپنے گمان میں کچھ ہیں
لختِ دل کچھ گرے ہیں دامن میں مژۂ خوں فشاں میں کچھ ہیں
یہ جو بسمل پڑا تڑپتا ہے حسرتیں اس کی جان میں کچھ ہیں
ہے زمیں فتنہ گر، ابھی شاید گردشیں آسمان میں کچھ ہیں
کم نہ جانو اِنھیں، یہ طفلِ سرشک دیکھو گے ایک آن میں، کچھ ہیں
تم جو نت امتحاں کرو ہو مرا خوبیاں امتحان میں کچھ ہیں
مصحفی دے تو داغِ دل کی خبر
پھول اس گلستان میں کچھ ہیں

336

ہم سے کیا کرو نہ میاں تم ٹھٹھولیاں[1] سنتے بھی ہو، جو بولتے ہیں لوگ بولیاں
ہم اُس تمام ناز کے کشتوں میں ہیں کہ ہائے مر مرگئی ہیں جس کی اداؤں پہ لُولیاں[2]
ٹک کسمساتے ہوتی ہو سو سو جگہ سے چاک ان [3]خوش چھبوں کی ہائے رے یہ تنگ چولیاں
ہم دل بہ کف نہادہ تبھی اُس کے گرد تھے وہ جن دنوں کہ کھیلتے تھا لڑکوں میں گولیاں[4]
اک ہم ہی خالی ہاتھ چلے اس چمن سے ہائے گل چیں تو پھول لے گئے بھر بھر کے جھولیاں
اس غش کے بیچ مصحفی ٹھنڈا ہی ہوگیا
اس نے تو اپنی آنکھیں بھی ہے ہے نہ کھولیاں

---

[1] ٹھٹھولی= دل لگی [2] شوخ حسینائیں [3] خوش چھب= یہ ترکیب میر نے بھی استعمال کی ہے یعنی جس کی وضع قطع، چھب تختی اچھی ہو۔ [4] گولیاں کھیلنا= بچوں کا معروف کھیل۔ ن۳: طفلوں میں گولیاں۔

337

حیراں ہوں اپنے کام کی تدبیر کیا کروں / جاتی رہی ہے آہ سے تاثیر، کیا کروں
شورِ جنوں ہوا ہے گلوگیر کیا کروں / ہے ٹوٹی جاتی پانو کی زنجیر، کیا کروں
ناگفتنی ہے حالِ دلِ ناتواں مرا / آتی ہے شرم، میں اُسے تقریر کیا کروں
دل مانگتا ہے مجھ سے، مجھے بھی دیے بنے / اتنی سی چیز پر اُسے دل گیر کیا کروں
دیکھا جو مجھ کو نزع میں قاتل نے یوں کہا: / اس جاں بہ لب پہ کھینچ کے شمشیر کیا کروں
بن دیکھے اُس کے، دل کو تسلّی نہیں مرے / نقاش اُس کی لے کے میں تصویر کیا کروں
اے یارو درد دل کی مرے بات ہے کڈھب / مت پوچھو، تم سے اُس کی میں تقریر کیا کروں

پوچھا میں مصحفی سے ہوا کیوں تو دربدر
بولا کہ یوں ہی تھی مری تقدیر، کیا کروں

338

اب نت کی سہے تری جفا کون / تجھ ساتھ کرے میاں وفا کون
تو شوق سے گالیاں دے ہم کو / ان باتوں کا مانے ہے بُرا کون
یہ عقدۂ دل ہے سخت عقدہ / دیکھیں تو کرے ہے اس کو وا کون
سو بار گیا میں اُس کے در پر / پُوچھا نہ کسی نے یہ بھی 'تھا' کون
کس واسطے پھر کے تیغ باندھی / جیتا ہوا اب یہاں رہا کون
جی جائے تو ہے چلا و لیکن / معلوم نہیں کہ لے چلا کون
ہم بہہ کے چلے ہیں بحرِ غم میں قطعہ اب ہاتھ پکڑ رکھے تھا کون
ہر چند سب آشنا ہیں لیکن / اس وقت میں اپنا آشنا کون

ہے مصحفی اور بزمِ خوباں
اس بزم میں اس کو لے گیا کون

339

کیا کہیئے کہ کیا ہے یہ دلِ زار بغل میں
اک حق نے دیا ہے ہمیں آزار بغل میں

آتا ہے یہی دل میں جو ملتا ہے وہ تنہا
لے بھاگیے کافر کو کہیں مار بغل میں

تسبیح پہ دیں داروں کی مت بھول کہ یہ لوگ
خرقے کے تلے رکھتے ہیں زنّار بغل میں

سامان مرے قتل کا کچھ کم نہیں اُس پاس
خنجر جو کمر میں ہے تو تلوار بغل میں

میں حسرتِ آغوش میں مرمر ہی گیا ہائے
اِک رات بھی آیا نہ مری یار بغل میں

اے مصحفی مت آپ سے اس دل کو جدا کر
شیشے کے تئیں رکھتے ہیں مے خوار بغل میں

340

عاشق ہو مصحفی بھی گر اُس کا عجب نہیں
آتا ہے دوڑ دوڑ جو یہ بے سبب نہیں

ہر دم پکارتے ہو کنائے سے کیا میاں
جاؤ جی بیٹھو 'او بے' ہمارا لقب نہیں

کیا تجھ سے شوخ چشم سے آنکھیں ملایئے
آنکھوں میں تیری شرم نہیں، کچھ ادب نہیں

جوں ہی کسی نے بات کہی ہم نے رو دیا
وہ حوصلہ کہ تھا ہمیں آگے، سو اب نہیں

کیا بیٹھے مُنھ میں پانی چُواتے ہو، دوستو
دیکھو گے ایک دم میں کہ یہ جاں بلب نہیں

پڑھتے ہیں تیرے واسطے ہم اسمِ ''یا عزیز''[1]
اے دوست سیم و زر کی ہمیں کچھ طلب نہیں

اک بات پر ہی اُس سے تسلّی کروں میں دل
پر کیا کروں کہ بات بھی کہنے کا ڈھب نہیں

شبِ قدر[2] و شب برات سے کیا ہم کو فائدہ
دنیا کے بیچ وصل ہی کی جب کہ شب نہیں

بن حکم کیوں کے بزم میں اس کی قدم رکھوں
عاشق تو ہوں میں مصحفی پر بے ادب نہیں

---

1. یعنی ''یا عزیزُ'' کا وظیفہ
2. شب قدر فک اضافت سے باندھا ہے اور شبِ براءت میں ہمزہ کا حذف ہے۔ بولی میں یہ اسی طرح ہے۔

341

آتا ہے کس کو پیارے راتوں کو خواب تجھ بن
وہی[1] لعنت کی آہ وزاری، وہی اضطراب تجھ بن

کیوں کر پیوں میں پیارے جام شراب تجھ بن
ہر قطرہ[2] مے گلو میں، ہے زہرِ ناب تجھ بن

اے میری جان سچ کہہ، کیدھر تو چھپ رہا ہے
سر پیٹتے پھریں ہیں یاں شیخ و شاب تجھ بن

پڑھنے کا حرف[3] کیا ہے از بہر فال کھولی
کھولی کبھی جو ہم نے پیارے کتاب تجھ بن

گہہ سینہ کوٹتا ہوں، گہہ سر کو پھوڑتا ہوں
یاں سو خرابیاں ہیں، خانہ خراب تجھ بن

یا رب وہ قطرہ مجھ کو الماس ہو کے لگیو
گر میں کبھی پیا ہو یک قطرہ آب تجھ بن

کب مصحفی کو پیارے، جینا بھلا لگے ہے
جو دم ہے زندگی کا سو ہے عذاب تجھ بن

342

نہ تنہا ہم ہی مثلِ گل گریباں چاک رہتے ہیں
جو تیرے ملنے والے ہیں سبھی غم ناک رہتے ہیں

ہر اک دورے میں حسن و عشق کا ہنگامہ برپا ہے
تکلف برطرف، گردش سے کب افلاک رہتے ہیں[4]

اگر جامہ نہیں تو خاک ہی پنڈے کو مل بیٹھے
کوئی آزادہ تن وابستۂ پوشاک رہتے ہیں

زبس ہم کو نہایت شوق ہے امرد پرستی کا
جہاں جاویں وہاں اک آدھ کو ہم تاک رہتے ہیں

گلی کوچوں میں پی پی مے، انھیں بدمستیاں کرنیں
کوئی بدمستیوں سے مردمِ بے باک رہتے ہیں

ہزار آلودہ دامن ہوں، نہیں ڈر اُن کو محشر کا
جنھوں کے دست و دل ریو و ریا سے پاک رہتے ہیں

پڑا ہے شیخ صاحب کو مزہ لکڑی چبانے کا
کوئی یہ مُنھ میں اپنے بن کیے مسواک رہتے ہیں[5]

کسی کو وہ نہاں[6] گل، رو تو کیا بو بھی نہیں دیتا
ہزاروں دیر و مسجد میں رگڑتے ناک رہتے ہیں

---

[1] ہر دو جگہ وہی بروزن فع [2] یہاں بھی فک اضافت ہے۔ [3] حرف کیا ہے = یعنی ذکر کیا ہے۔ [4] رہنا = رُکنا [5] یہ مضمون نہایت عامیانہ ہے اور مصحفی کے مُنھ سے زیب نہیں دیتا۔ مگر میر اور مرزا کی تقلید ہی جو کرنا ہے۔ [6] نہاں گل = گلِ نہاں

جوابِ نامہ کب لکھتا ہے وہ اے مصحفی ہم کو
عبث خط بھیج کر ہم منتظر بر ڈاک رہتے ہیں

343

آتشِ غم میں بس کہ جلتے ہیں — شمع ساں استخواں پگھلتے ہیں
وہی دشت اور وہی گریباں چاک — جب تلک ہاتھ پانو چلتے ہیں
دیکھ تیری صفاے صورت کو — آئینے مُنھ سے خاک ملتے ہیں
جوششِ اشک ہے وہ آنکھوں میں — جیسے اس سے کنویں اُبلتے ہیں
دیکھ عارض کو تیرے، گلشن میں — سیکڑوں رنگ گل بدلتے ہیں
شوخ چشمی بتاں کی مجھ سے نہ پوچھ — کہ یہ نظروں میں دل کو چھلتے[1] ہیں
دیکھیو شیخ جی کی چال کو ٹک — اب کوئی دم میں یہ پھسلتے ہیں

بن لیے کام دل کا اس کوُ سے
مصحفی ہم کوئی نکلتے ہیں

344

دن کو تو سن لو میری میں کچھ بات اگر کہوں — ہاں اس کا ڈر نہیں، نہ سنو رات[2] گر کہوں
ہر بیت میں کنایہ ہے ہر شعر میں ادا — پھر دو ٔر کیا ہے درسِ اشارات اگر کہوں
چپ ہی بھلی ہے، فائدہ کیا ہے، سنے ہے کون — میں اپنے دردِ دل کی حکایات اگر کہوں
کہتا ہے ہو کے چیں بہ جبیں، چل بے دور ہو — میں اُس سے گاہے بہرِ ملاقات اگر کہوں

---

[1] چھلنا= اڑانا، ٹھگنا [2] رات کا استعمال بغیر کو ہوا ہے، یہ ہماری بولی کے مطابق ہے۔ دہلی میں شام کو، رات کو، بولتے ہیں۔

آنکھیں جھکی ہی رہتی ہیں کچھ، ان کو مصحفی
بر جا ہے ابر موسمِ برسات اگر کہوں

345

عاشق کو ترے چاہیے کیا ہار گلے میں — بانہوں کے تئیں ڈال دے، اے یار گلے میں
اللہ رے نزاکت کبھی کھاتا ہے اگر پان — ہوتی ہے وو ہیں پیک نمودار گلے میں
یہ تو کہو کس کے ہو میاں خون کے پیاسے — جو ڈالے ہوئے پھرتے ہو تلوار گلے میں
لازم ہے کہ مقتل کی طرف تب مجھے لے جائیں — جب طوق ہو مانند گنہ گار گلے میں
ہے دل میں کروں یار کے کوچے میں گدائی — سیلی[1] کے تئیں ڈال کے اک بار گلے میں
جب زور سے زاہد کے میں اک دھول لگائی — سر پر سے اُتر آ رہی دستار گلے میں

اے مصحفی کیا مجھ کو کہیں اہلِ مذاہب
تسبیح گلے میں ہے نہ زنار گلے میں

346

کیجیے ظلم سزاوارِ جفا ہم ہی ہیں — کھینچیے تیغ کہ مدّت سے فدا ہم ہی ہیں
تفتہ دل، سوختہ جاں، چاک جگر، خاک بسر — کیا کہیں مصدرِ صد گونہ بلا ہم ہی ہیں
نہیں موقوف دعا اپنی تو کچھ بعدِ نماز — بیٹھتے اُٹھتے جو مانگیں ہیں دعا، ہم ہی ہیں
یہ بھی کوئی طور سے ٹک جلوہ دکھا چھپ جانا — اور بھی لوگ ہیں، ترسانے کو کیا ہم ہی ہیں
وہ جو کہلاتے تھے زیں پیش ترے یاروں میں — جانِ من اب تو ہمیں بھول گیا، ہم ہی ہیں
نہ برہمن کی مشیخت ہے، نہ رُہبان[2] کی قدر — اب تو اس دیر کدے میں نامِ خدا ہم ہی ہیں
عشوہ و ناز ترا ہم سے یہی کہتا ہے: — نہیں کرتے جو کبھی تیر خطا، ہم ہی ہیں

---

[1] سیلی = فقیروں کا کشکول۔ [2] رُہبان = راہب کی جمع۔ تارک دنیا۔ بفتحِ اوّل بھی صحیح ہوگا۔

بے نواؤں کی طرح آ کے ترے کوچے میں   وہ جو کر جاتے ہیں اک، روز صدا ہم ہی ہیں
آدھی رات آئے ترے پاس یہ کس کا ہے جگر   چونک مت اتنا، کہ اے ہوش ربا ہم ہی ہیں
مصحفی ٹل گئے سب معرکۂ عشق کے بیچ
وہ جو ٹھہرے رہے ہیں ایک ذرا، ہم ہی ہیں

347

آتا ہے یہی جی میں، فریاد کروں روؤں   رونے ہی سے ٹک اپنا، دل شاد کروں روؤں
کس واسطے بیٹھا ہے چپ اتنا تو، اے ہمدم   کیا میں ہی کوئی نوحہ بنیاد[1] کروں روؤں
یوں دل میں گذرتا ہے جا کر کسی صحرا میں   خاطر کو ٹک اک غم سے آزاد کروں روؤں
اس واسطے فرقت میں جیتا مجھے رکھا ہے   یعنی میں تری صورت جب یاد کروں روؤں
اے مصحفی آتا ہے یہ دل میں کہ اب میں بھی
رونے میں تجھے اپنا استاد کروں روؤں

348

اب میرے تیرے اور ہے کیا یار درمیاں   اِلّا کہ قصرِ تن کی ہے دیوار درمیاں
تھا دل میں آئینے کے تئیں توڑ ڈالیے   اتنے میں آ گیا رخِ دلدار درمیاں
زلفوں سے اس کی ہم نے جو سودا کیا کبھی   دو دو پہر تلک رہی تکرار درمیاں
مر جاوے گر رقیب تو جاوے خلش تمام   اُس گل کے میرے ہے یہی اک خار درمیاں
حلقوں کو تیری زلف کے اس وقت دیکھیے   جس وقت ہو وہ چاند سا رخسار درمیاں
کل اس کی میری نظروں میں تلوار چل گئی   مارا گیا سو مفت دلِ زار درمیاں
ہم روزِ عیش، دیکھ چکے صبحِ حشر بھی   یو ہیں رہا جو وعدۂ دیدار درمیاں

---

[1] بنیاد کرنا = فارسی ترکیب کا ترجمہ، آغاز کرنا۔

کیا اس کی چشمِ مست کی دیتا نہ کچھ بھی داد　　ہوتا جو کوئی مردمِ ہشیار درمیاں
بگڑا ہی تھا وہ مجھ سے و لے خیر یہ ہوئی　　اہلِ محلّہ آ گئے دو چار درمیاں
نہیں اُس کی صلح و جنگ سے خالی ہر ایک شب　　سوتا ہے ساتھ رکھ کے وہ تلوار درمیاں

کب وہ جواب نامے کا بھیجے گا مصحفی
قاصد کو کیوں کرے ہے عبث خوار درمیاں

349

از بس کہ چشمِ تر نے بہاریں نکالیاں　　مژگاں ہیں اشکِ سرخ سے پھولوں کی ڈالیاں
کیا جانے، ہے وہ طرّہ مقطوع کس کے ہاتھ　　آنکھوں میں کاٹتا ہوں میں نت راتیں کالیاں
خط آئے پر بھی یار کا بدلا نہیں مزاج　　وہ ہی ادا و ناز ہے، ویسی ہی گالیاں
صیّاد چاہتا ہے جو بلبل کی زندگی　　کنجِ قفس میں رکھ تو گلوں کی پیالیاں
کیا اعتماد، یاں کے دِلا عزل و نصب کا　　ایدھر تغیریاں[1] تو اُدھر ہیں بحالیاں
آنکھوں کا جوشِ اشک سے اب یاں وہ حال ہے　　جیسے کہ سیم خام سے پُر ہوں کُٹھالیاں[2]
میرا یہ طفلِ دل تبھی حلقہ بگوش تھا　　اے شوخ جن دنوں تری زلفیں تھیں بالیاں[3]

امرد پرست جان نہ کیوں دیں کہ مصحفی
دل مرد ہو کے لیتی ہیں یہ چیرے[4] والیاں

350

اپنی تو ہجر ہی میں کٹیں راتیں کالیاں　　بانہیں گلے میں یار نے کب آ کے ڈالیاں

---

[1] تغیری (بروزن نفیری) استعمال ہوا ہے بہ معنی تبدیلی، علیحدہ کرنا۔ [2] کٹھالی = سنار کا وہ ظرف جس میں رکھ کر سونا، چاندی گلایا جاتا ہے۔ [3] بالی = چھوٹی زلفیں (بچوں کے بال)۔ اور یہاں طفل، حلقہ اور گوش کی رعایت بھی ہے۔ بالیاں کانوں میں پہنی جاتی ہیں۔ [4] چیرے والیاں = وہ عورتیں جو سر پر چیرہ باندھ کر مردانہ لباس میں رقص کرتی ہیں۔

اس کی کمر تو کا ہے کو پتلی ہے اس قدر — یہ ہم سے شاعروں کی ہیں نازک خیالیاں
اُودھر سے شوقِ دید ہے اتنا کہ ہر طرف — دیواروں میں ہیں رخنے تو غرفوں میں جالیاں
لوہو بھرا ہے، ہاتھ حنائی نہ بوجھیو — ازبس کہ اس نے کتنوں کی جانیں نکالیاں
کرتی ہیں خون سیکڑوں تجھ کو بتاؤں کون — پانوں کی سرخیاں، ترے ہونٹوں کی لالیاں
کل کر رہا تھا غیر سے نظروں میں گفتگو — پر دیکھتے ہی کچھ مرے، آنکھیں چُرالیاں

اے مصحفی تو ان سے محبت نہ کیجیو
ظالم غضب ہی ہوتی ہیں یہ دلّی والیاں

351

اوروں کی دید بازیاں نظروں میں ٹالیاں — دیکھا جو ہم نے اُس کو تو آنکھیں نکالیاں
میرے جنوں کے خوف سے ہر صبح باغ میں — جوں شاخِ بید کانپیں ہیں پھولوں کی ڈالیاں
دیوانہ کون رقص کرے ہے جو ہر طرف — لڑکے بجاتے پھرتے ہیں گلیوں میں تالیاں
طوطی شکر شکن ہے، لبِ یار کچھ تو، بول — کیدھر گئیں وہ اب تری شیریں مقالیاں
معشوق تنگ چشم ملا ہم کو ہم نشیں — باور نہیں تو دیکھ لے برقع کی جالیاں
دل میں خیالِ زلف سے طوفاں نہ کیوں کے ہو — اکثر گھٹائیں اُٹھتی ہیں ایدھر سے کالیاں

کرتی ہیں خون سیکڑوں عاشق کے مصحفی
جس وقت پان کھاتی ہیں یہ چونے والیاں

352

کچھ ہماری بھی تمھیں فکر ہے اب یا کہ نہیں — جوں ہی یہ بات کہی اُس سے تو بولا کہ نہیں
اپنا سا ہم نے تو اس دل کو بہت سمجھایا — اُس کی خاطر میں بھی کیا جانے کچھ آیا کہ نہیں
وائے قسمت کہ جو کی وصل کی گاہے درخواست — در جواب اُس نے یہی نامے میں لکھا کہ نہیں

دست رس ہی جو نہ ہو اُس پہ تو ناچاری ہے　　کون سی ورنہ مرے دل میں تمنّا کہ نہیں

وہ ابھی برق کی سی جھمکی دکھا جاتا رہا
مصحفی غرفے سے تو نے اسے دیکھا کہ نہیں

353

دل تری بے قراریاں کیا تھیں　　رات وے آہ و زاریاں کیا تھیں

میرے پہلو میں اس کی مژگاں سے　　برچھیاں یا کٹاریاں کیا تھیں

سرمہ دینے میں اُس کی آنکھوں کی　　کیا کہوں آب داریاں کیا تھیں

اپنا عاشق نہ تھا تو آئینے میں　　نظریں وے پیاری پیاریاں کیا تھیں

جی کے دشمن بھلا یہ بتلا تو　　میرے دشمن سے یاریاں کیا تھیں

اپنی قسمت میں، آہ کس سے کہوں　　ذلّتیں اور خواریاں کیا تھیں

مصحفی گر نہ تھا تو عاشقِ زار
پھر[1] تو یہ جاں نثاریاں کیا تھیں

354

سدا خمیازہ ہی کھینچا، سدا کرتے رہے آہیں　　نہ سوئے ڈال کر اک شب گلے میں یار کے باہیں

قیامت تو غضب یہ ہے کہ یارو جس کو ہم چاہیں　　وہ اپنے روبرو ڈالے گلے میں غیر کے باہیں

غنیمت جان گلگشتِ چمن، زاہد بہشتوں میں　　کہاں یہ سبزہ، یہ آبِ رواں یہ تاک کی چھاہیں[2]

سرِ رہ روک کر گر اُس کا ہم بیٹھے تو کیا حاصل　　کوئی آتا ہے اس رستے سے وہ، اس کی ہیں سو راہیں

نشاں ہرگز نہ دلّی میں رہا صاحب کمالوں کا　　ہوئیں باخاک یکساں کیسی کیسی ہائے درگاہیں[3]

---

[1] پھر تو = بجائے تو پھر　[2] چھانو (بہ معنی سایہ) کی جمع مصحفی نے چھاہیں استعمال کی ہے۔ ہماری بولی بھی یہی ہے۔　[3] درگاہ سے مراد باوقار لوگوں کے محلات و دیوان خانے۔

عجائب رسم ہے بیہات اقلیمِ محبت کی وہ اُلٹا دشمنی کرتا ہے ہم سے جس کو ہم چاہیں

تو کس کی یاد میں اے مصحفی، جوں ابر روتا ہے
کہ بجلی کی طرح کوندیں ہیں، اے ظالم تری آہیں

355

کہتے ہیں مہر و وفا جس کو جہاں میں وہ نہیں وہ جو اک چیز ترحم تھی، بتاں میں وہ نہیں

اتنا پرہیز عبث کرتے ہو اس عاجز سے تم جو کچھ سمجھے ہو سو اپنے گماں میں وہ نہیں

بہہ گیا آنکھوں سے دل آب ہو، کیا جانے کدھر اشک تو ہیں مژۂ اشک فشاں میں، وہ نہیں

لالہ پژمردہ، گل افسردہ ہے، نرگس بیمار رنگ اس باغ کا ایّامِ خزاں میں وہ نہیں

وہ جو اک ناز خرامش میں تری نکلے ہے خوش خرامی روشِ آبِ رواں میں وہ نہیں

مصحفی بے رخیِ گل سے سبھی نالاں ہیں
کون وہ مرغِ چمن ہے کہ فغاں میں وہ نہیں

356

کون کافر یہ کہے: دیدار کی خواہش نہیں جی تو چاہے ہے ولیکن یار کی خواہش نہیں

حال پر اس تشنہ جاں کے اک نگاہِ لطف ہو مجھ کو ساقی ساغرِ سرشار کی خواہش نہیں

کیا دکھاتے ہو ہمیں مژگان و ابروٗ دم بدم یاں کسی کو خنجر و تلوار کی خواہش نہیں

اُس پہ یہ موے پریشاں بس ہیں سایے کے لیے اس سرِ شوریدہ کو دستار کی خواہش نہیں

جب تلک ہیں تازہ و تر داغ سینے کے، صبا ہم اسیروں کو گل و گلزار کی خواہش نہیں

فائدہ کیا ہے کہ اب صحرا سے آویں سوے شہر دین و دنیا سے گئے گھر بار کی خواہش نہیں

ہو چکا دل سیر جینے سے بہت، اے مصحفی
اب بجز مُردن کچھ اس بیمار کی خواہش نہیں

357

یا نہ ہوتی تھی کبھی اک مژہ تر پانی میں — یا پڑے بہتے ہیں اب لختِ جگر پانی میں

آج بے طرح تو روتا ہی چلا، اے قاصد — میرا مکتوب کہیں کیجو نہ تر پانی میں

کیوں نہ اس رشک سے میں ڈوب مروں یارو وہ شوخ — جاتا ہے پیرنے[1] کو شام و سحر پانی میں

گریہ یاں تک میں کیا ہے کہ کھڑے ہیں احباب — کوئی تا زانو کوئی تا بہ کمر پانی میں

جھاڑے بال اُس نے نہا کر تو گریں یوں بُوندیں — تو کہے ٹوٹ پڑی سلکِ گہر پانی میں

آسماں پر وہ دکھاوے وو ہیں دن کو تارے — جھانکے ہوکر عرق آلودہ اگر پانی میں

بیچ دریا کے بھی ہوتی نہیں کم سوزشِ دل — گرچہ رہتے ہیں کھڑے دو دو پہر پانی میں

گریہ عاشق کو نہیں مانعِ نظارۂ یار — سچ ہے ماہی کو سب آتا ہے نظر پانی میں

ہم نہ کہتے تھے کہ اے مصحفی تو اتنا نہ رو
عاقبت ڈوبا ہی ان آنکھوں کا گھر پانی میں

358

کھولی زلف اس نے جو ہیں تا بہ کمر پانی میں — تھرتھری پڑ گئی ہر لہر اُپر پانی میں

رنگ گریے کا نہیں ایک ترے عاشق کے — آستیں خوں میں تو رومال ہے تر پانی میں

سیرِ دریا کو جو اُس بن میں کبھی جاتا ہوں — لہریں تلوار سی آتی ہیں نظر پانی میں

داغِ دل وہ نہیں جو سینے سے منفک[2] ہووے — شست و شو کیجیے تا حشر اگر پانی میں

طرح مچھلی کے پڑا پیرے ہے یہ طفلِ سرشک — ہائے مطلق نہیں لگتا اسے ڈر پانی میں

کشتۂ عشق کے مٹتا ہے کوئی خوں کا نشاں — باندھ کر پوٹ[3] ڈبو دیویں اگر پانی میں

---

۱ پیرنا = تیرنا ۲ منفک ہووے = علیحدہ ہو، مٹ جائے۔ ۳ پوٹ = وزن، یعنی پتھر وغیرہ باندھ کر مقتول کو دریا کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔

ابھی سر پیٹ چلے جاویں گے سب ماہی گیر — سر کے بالوں کو پریشان نہ کر پانی میں
یہ وہ آنکھیں ہیں کہ گھڑیال کے[1] پیالے کی طرح — رہتی ہیں گریے سے اب آٹھ پہر پانی میں

مصحفی آج جو آنکھوں سے گرے آنسو گرم
آتشِ دل نے کیا شاید اثر پانی میں

359

ٹک سمجھ کر تو نہانے کو اُتر پانی میں — شکلِ آغوش ہے ہر ایک لہر پانی میں
دیدۂ تر میں عجب کیا ہے جو لہراوے وہ زلف — سانپ کا بھی کہیں ہوتا ہے گذر پانی میں
کبھی دیکھی بھی ہے دریا پہ چراغاں کی بہار — یوں جھمکتے ہیں مرے لختِ جگر پانی میں
دیدۂ تر سے ہو، جو یاے رموزِ فلکی — ماہِ نو گم ہو تو دیکھیں ہیں بشر پانی میں
گریے کے ہاتھوں سے کیا دل کی پھر آبادی ہو — طرح یونان کی، ڈوبا یہ نگر پانی میں
اشکِ جاری کے مرے منع کی اب وہ ہے مثال — جیسے بہتے کو کہے کوئی ''ٹھہر'' پانی میں
بحرِ گریہ سے نہ نکلیں کبھی یہ چشمِ پُر اشک — نت رہیں جوں صدفِ پُر زگہر پانی میں
جھلکے ہے یوں وہ بدن جامۂ شبنم سے تمام — شوخیاں جیسے کرے عکسِ قمر پانی میں
شعلہ رُو آگے ترے حسن کے ہو کر کے عرق — شمع خجلت سے ہوئی جاتی ہے تر پانی میں
ہم نے کیا دیکھا کہ جس دن سے کھلیں یہ آنکھیں — فرطِ گریہ سے رہیں آٹھ پہر پانی میں
قلزمِ عشق کا ڈوبا کوئی ہاتھ آتا ہے — سیکڑوں جال بھی واں ڈالیں اگر پانی میں
آئی رَو اشک کی ناگہ تو وو ہیں بیٹھ گئے — ہم سے کچھ ہو نہ سکا فکرِ دگر پانی میں

مصحفی اتنا بھی بے صرفہ نہ رو خانہ خراب
ایک عالم کے تئیں غرق نہ کر پانی میں

---

[1] غالباً پانی کی گھڑی مراد ہے اور مگرمچھ کا ایہام بھی ہے۔

360

جو کھولے بال اپنے وہ بتِ بے پیر پانی میں
عجب کیا ہے پریشانی کرے تاثیر پانی میں

مصوّر گر ترے چہرے کی دیکھے رنگ آمیزی
ڈبو دے لے کے اپنے کاغذِ تصویر پانی میں

فلاطوں گر یہ کیا کرتا ہے یوناں کی خرابی پر
یہاں ایسی ہزاروں بہہ گئیں تعمیر پانی میں

یہ دریا یا کہ اک رزمیۂ صورت نگاراں ہے
کہ لہروں سے کھنچی ہیں جابجا شمشیر پانی میں

مجھے دم لینے کب دیتا ہے یہ طوفان گریے کا
کروں کیا بن نہیں آتی ہے کچھ تدبیر پانی میں

مہوّس رنگ کُندن سا ترا گر اک جھلک دیکھے
بہا وے پھاڑ کر سب نسخۂ اکسیر پانی میں

بھنور سے عکسِ مہ نے گرد اپنے خط سا کھینچا ہے
پڑھے جیسے پری خواں دعوتِ[1] تسخیر پانی میں

وہ مجھ خشکی رواں[2] کی سختیِ منزل کو کیا جانے
جو ماہی کی طرح کرتا ہو نت شبگیر[3] پانی میں

مرا دریائے نیلِ گریہ اس شورش سے بہتا ہے
کہ پیلِ مست کھینچے جس طرح زنجیر پانی میں

اگر اے ماہیِ دریائے خوبی تجھ کو ٹک دیکھے
نہ پھینکے بارِ دیگر جال، ماہی گیر پانی میں

نہ دیکھی ایک دن صورت[4] یہ اُس نے، گرچہ پلکوں سے
میں خوں رو رو کے کھینچیں سیکڑوں تحریر پانی میں

مشبّک کر دیا[5] ہے بس کہ اُس کو تیری پلکوں نے
نظر آتا ہے عکسِ ماہ جوں[6] کف گیر پانی میں

صفا اس کے بُنا گوش اور موتی کہ میں کیا لکھوں
ملا رکھا ہے ہم رنگی سے اُس نے شیر پانی میں

نہ اس کی ناوکِ مژگاں کا کشتہ اک فقط میں ہوں
ہوئے ہیں مردمِ[7] آبی تلک نخچیر پانی میں

---

[1] جنّات وغیرہ کو تسخیر کرنے کے بعض جلالی عمل اور وظیفے کمر کمر پانی میں کھڑے ہو کر پڑھے جاتے ہیں اور ان کے جلالی اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے بعض طلسمات کا حصار اپنے گرد بنا لیا جاتا ہے۔ جس سے پڑھنے والا محفوظ رہتا ہے۔ پری خواں اس کو کہتے ہیں جو جنّات کو قید کرنے کے عمل پڑھتا ہے۔ [2] یہ خشکی رواں بھی نئی اور اچھی ترکیب ہے۔ یعنی خشکی کا سفر کرنے والا۔ [3] شب گیر = رات، اور رات کا سفر دونوں کے لیے آتا ہے۔ (مصطلحات) [4] یعنی بہتری کی صورت، یا اچھی صورت (مراد محبوب)۔

[5] مشبّک = جس میں سوراخ اور جال پڑے ہوں۔ [6] کف گیر وہ چمچا جس سے تلی ہوئی چیزیں کڑھائی سے نکالتے ہیں۔ [7] مردمِ آبی = انسان نما فرضی مخلوق جو قدیم تصورات کے مطابق پانی ہی میں رہتی ہے۔

نہ تھا میں مصحفی اتنا گنہ گار اس کا، کیا کہیے
ڈبویا مجھ کو چشمِ تر نے بے تقصیر پانی میں

361

ہماری طرف آپ کم دیکھتے ہیں — وے آنکھیں نہیں اب جو ہم دیکھتے ہیں
تو آوے نہ آوے ولے ہم تو ہر شب — تری راہ تا صبح دم دیکھتے ہیں
بہت جھوٹے وعدے کیے تم نے ہم سے — بھلا یہ بھی تیری قسم دیکھتے ہیں
ہمیں جستجو کس کی درپیش آئی — عرب ڈھونڈتے ہیں عجم دیکھتے ہیں
بہت دیکھا دنیا کو، جاتے ہیں یارو — ذرا اب تو ملکِ عدم دیکھتے ہیں
یہی خط نویسی ہے ہر دم کی اُس کو — تو ہاتھ اپنے اک دن قلم دیکھتے ہیں
بھروسا ہے کیا دم کا، یعنی کہ یاں کی — ہوا مختلف دم بدم دیکھتے ہیں

پڑے ہے نظر عیب ہی پر اُنھوں کی
ہُنر مصحفی یار کم دیکھتے ہیں

362

یا تو رہتا تھا وہ رخ شام وسحر آنکھوں تیں — یا اب اک جھپکی کو ترسے ہے نظر آنکھوں میں
جس پہ کی ایک نظر ہوگیا وہ دیوانہ — اُس پری زاد کی جادو ہے مگر آنکھوں میں
لے گیا آنکھ ملا دل کو مرے سب کے حضور — کر گیا وہ بتِ کافر تو ہُنر آنکھوں میں[1]
رنگ گریے کا ہم ان یاروں کو دکھلادیں گے — آن جھمکا جو کوئی لختِ جگر آنکھوں میں
کر کے صورت کو تری، یاد میں اے لختِ جگر — اتنا رویا ہوں کہ آیا ہے جگر آنکھوں میں
اک گھڑی یاد سے بھولا نہ خیالِ رخِ دوست — یاں وہی شکل رہی آٹھ پہر آنکھوں میں

---

1. آنکھوں میں ہنر کرنا (محاورہ) کھلم کھلا کرنا، جیسے آنکھوں سے کاجل چُرانا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

ہم سے ساغر کشیِ شب کا تم اخفا نہ کرو　　نشۂ مے کا ہے اب تک بھی اثر آنکھوں میں
میں نظر بھی نہ کروں ان پہ کبھی، گرمہ وسال　　پُتلیاں بن کے رہیں شمس وقمر آنکھوں میں
گریہ آنکھیں ہیں، تو اک روز بَلا لاویں گے　　اس قدر جان مری سرمہ نہ کر آنکھوں میں
مصحفی کسبیوں کا مُنھ نہ تک، اے خانہ خراب قطعہ ورنہ ریجھے[1] گا اگر کر گئے گھر[2] آنکھوں میں
ہیں یہ وے لوگ کہ دل کے تئیں لے جاتے ہیں
بہ کنایت، بہ اشارت، بہ نظر آنکھوں میں

363

عشق ہے آفت و بلا تو نہیں　　اس کا مارا کوئی جیا تو نہیں
دل کی تڑپوں میں آن نکلے ہے　　دیکھیو کشتۂ ادا تو نہیں
پوچھتا کیا ہے حال دل کا مرے　　او میاں تجھ سے کچھ چھپا تو نہیں
تو جو اُس کی گلی میں جاتا ہے　　کہیں اے دل، تری قضا تو نہیں
یعنی عاشق ہو اور ہرجائی　　اب تلک ہم نے یہ سنا تو نہیں
یوں جو تو مُنھ پھرائے بیٹھا ہے　　کیوں میاں مجھ سے کچھ خفا تو نہیں
بات پر اُس کی میں جو بولا کہ کیا　　کہا: کچھ ذکر آپ کا تو نہیں
کس طرح سجدہ کیجیے اس کو　　ہے وہ بت بت ہی کچھ خدا تو نہیں
شیشۂ دل کو بیچتے ہیں ہم قطعہ اک نگہ پر گراں بہا تو نہیں
سودا اچھا ہے گر میاں صاحب　　لے چکو تم تو کچھ بُرا تو نہیں
مصحفی سچ تو کہہ، تو رووے ہے کیوں
کچھ کسی نے تجھے کہا تو نہیں

---

[1] ریجھنا = مائل ہونا۔ [2] آنکھوں میں گھر کرنا = دل میں جگہ پیدا کر لینا، (محبت کرنا)۔

364

قرآں میں نے کسی کی ہم فال دیکھتے ہیں	اپنے ہی چاکِ دل کا احوال دیکھتے ہیں
سروِ رواں کی اپنے ہم چال دیکھتے ہیں	ہوتا ہے ایک عالم، پامال دیکھتے ہیں
کیا کیا ہمارے دل میں آتا نہیں، جب اُس کی	لپٹی ہوئی کمر سے اک شال دیکھتے ہیں
فتنے نے جن سے آگے ہرگز قدم نہ رکھا	ان محشروں کو اُس کے دنبال دیکھتے ہیں
بہتے ہیں اس گلی میں ہر سُو لہو کے نالے	رنگِ زمانہ اور ہی اس سال دیکھتے ہیں
معشوقِ سادہ، رُو پر دل دے گذرتے ہیں ہم	نے زلف دیکھتے ہیں، نے خال دیکھتے ہیں
یا دل کو دیکھتے تھے پہلو میں اپنے ہردم	یا ہم اب اُس کی جاگہ اک بھال دیکھتے ہیں

اے مصحفی تجھے کیا رونے کی خو پڑی ہے
آنکھوں پہ تیری اکثر رومال دیکھتے ہیں

365

مستی میں تفِ دل سے اگر نالہ کروں میں	ہر لبِ گردِ ساغر تب خالہ کروں میں
گر سحر طرازی کے اُپر آوَں، تو وہ ہیں	جو نقش کہ کھینچوں اُسے گوسالہ[1] کروں میں
اے لختِ جگر تیری مدد ہو وے تو شاید	مژگاں کے حوالے کوئی پرکالہ کروں میں
سینہ مرا داغوں سے گلستان ہوا ہے	ہے وقت کہ سیرِ چمنِ لالہ کروں میں

اے مصحفی اتنا بھی غنیمت ہے جو گاہے
دل خوش بہ سخن سازیٔ دلالہ کروں میں

366

کیوں کے ہر گل کے تئیں چاک گریباں دیکھوں	ہائے ان آنکھوں سے یہ رنگِ گلستاں دیکھوں

---

[1] گوسالہ = بچھڑا۔ یہ گوسالہ، سامری (عجل) کی تلمیح ہے جس کی پرستش قوم یہود نے شروع کر دی تھی۔ اس کا ذکر قرآن شریف میں بھی موجود ہے۔ (ملاحظہ ہو پ، ع ۶۔ ۱۱)۔

کیا مصیبت ہے کھلے آنکھ تو رونا آوے ۔۔۔ اور جو جھپکے تو وو ہیں خوابِ پریشاں دیکھوں
خط تو لکھا ہے، پہ تدبیر بتا اے قاصد ۔۔۔ صورتِ یار کو میں بھی کسی عنواں دیکھوں
کاش سوتا ہی رہوں میں کہ نہیں چاہتا دل ۔۔۔ ہر سحر اُٹھ کے رخِ گبر و مسلماں دیکھوں
درِ جنت پہ بھی زنہار نہ رکھوں میں قدم ۔۔۔ گر ذرا چیں بہ جبیں صورتِ یاراں دیکھوں[1]
یہ بھی قسمت ہے کہ جب اُس کی گلی میں جاؤں ۔۔۔ تلخیِ غیر و ترش روئیِ درباں دیکھوں
لا رکھو آگے مرے کوئی مرقع ہی ذرا ۔۔۔ تا میں اُس میں تو بہم صورتِ یاراں دیکھوں
کہتے ہیں جس کے تئیں وصل کا دن دنیا میں ۔۔۔ میں بھی وہ دن کبھی، اے گردشِ دوراں دیکھوں
چشمِ تر گوشہ[2] بہ امیدِ ترحم رکھوں ۔۔۔ تو جو آوے نہ نظر صورتِ حرماں دیکھوں
ہائے جن آنکھوں سے دیکھا ہوں میں روے شبِ وصل ۔۔۔ کیوں کے ان آنکھوں سے روے شبِ ہجراں دیکھوں
ہر بنِ مو پہ مرے داغ تھا، دل میں اس کے ۔۔۔ یہ نہ آیا کہ تماشاے چراغاں دیکھوں
ہائے وہ دل کہ جسے میں نے بغل میں پالا ۔۔۔ اب اُسے یوں ہدفِ ناوکِ مژگاں دیکھوں

مصحفی شہر سے دل سخت بہ تنگ آیا ہے
جی میں آتا ہے کہ ٹک جا کے بیاباں دیکھوں

367

دنیاے دوں کی اپنے تئیں چاہ ہی نہیں ۔۔۔ شکرِ خدا کہ آرزوے جاہ ہی نہیں

---

[1] اسی مضمون کو غالب نے یوں کہا ہے: ۔
تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم
گر بہ موج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

بلکہ غالب سے بھی پہلے عربی کا شاعر ابن سناء الملک کہہ گذرا ہے:

واظمأ إن أبدى لی الماء منّۃ ۔۔۔ ولو کان لی نھرُ المجرّۃ مَوردا

[2] چشم کے لیے نم دیدہ و آبدیدہ و اشک آلود وغیرہ تو استعمال ہوتا ہی ہے، یہ ''تر گوشہ'' کتنی پیاری اور نئی ترکیب ہے۔ اس کے مفہوم کی نزاکت سب ترکیبوں سے الگ ہی ہے۔

کرنے ہلاک تشنہ لبی مجھ کو لے گئی — اس سرزمین میں کہ جہاں چاہ ہی نہیں
یا تیرگی سے روے ہَوا ہو گیا سیاہ — یا آسماں پہ ہجر کی شب ماہ ہی نہیں رہا
بیٹھے ہیں چپکے، کس سے سرِ حرف[1] وا کریں — اس بزم میں کسی سے ہمیں راہ ہی نہیں
لکھا ہے اس نے خط میں ہر اک شخص کو سلام — ایک اس میں نامِ بندۂ درگاہ ہی نہیں
اتنے بہ خود گئے ہیں کہ اس انجمن کے بیچ — کوئی کسی کے حال سے آگاہ ہی نہیں
اے دل شبِ فراق سے مت ڈھونڈ روشنی — یہ ہے وہ شب کہ جس کی سحرگاہ ہی نہیں
ملنے کی تیرے، ہم کو بہت آرزو ہے یار — پر کیا کریں کہ مرضیِ اللہ ہی نہیں

اے مصحفی ہر اک کو سخن کا غرور ہے
طرزِ سخن سے پر کوئی آگاہ ہی نہیں

368

ہے نت سرِ شوریدہ مرا چاکِ قفس میں — بیتاب ہوں نظّارۂ گلشن کی ہوس میں
کم عمری میں جو دیکھے ہے حسن اُس کا کہے ہے — یہ طفلِ غضب ہووے گا دو چار برس میں
جوں شانہ نہ چھوڑوں گا کبھی ہاتھ سے اُن کو — زلفوں کے تری بال اگر آگئے بس میں
اغلب ہے کہ فریاد سے اک لحظہ نہ چپ ہو — اِس دل کو اگر تعبیہ کر دیجے جرس میں
مژگاں پہ مرے لختِ جگر جھمکیں ہیں جیسے — دیکھا نہیں یوں ربط کہیں شعلہ و خس میں
جو شمعِ سحر اتنا نہیں عمر کا وقفہ — یاں کام ہے اپنا تو تمام ایک نفس میں

اے مصحفی افسوس، ہے ان لوگوں سے شطرنج
جو فرق نہیں کرتے کبھو پیل و فرس میں

369

اب مرغِ دل اپنا تو ہے صیّاد کے بس میں — خواہی اسے ہاتھوں میں رکھے خواہ قفس میں

---

[1] سرِ حرف وا کردن = فارسی محاورے کا ترجمہ ہے۔

دیکھا نہ کبھی تو نے میاں آنکھیں اُٹھا کر اُن کو جو موئے جنبشِ مژگاں کی ہوس میں
پھرتا ہے اِدھر زلف میں شانہ تو اُدھر دل اک لاگ چلی جاتی ہے جوں دزد و عسس میں
نیّات اگر یہ ہیں تو دیکھو گے زمانہ اس سے بھی بتر ہووے گا ایک آدھ برس میں
کیا جانیے کیدھر کو گیا محملِ لیلیٰ وہ ہوش ربائی نہیں آوازِ جرس میں
گر ناخنِ فریاد کرے عقدہ کشائی سوز مزے پنہاں ہیں مرے تارِ نفس میں
اے مصحفی مشکل ہے غزل ایک سی کہنا
اک بیت کہیں اچھی بھی ہو جاتی ہے دس میں

370

نہ ہر دم ہر گھڑی اس ذلّت و خواری پہ روتا ہوں میں تھا آزادہ دل، اپنی گرفتاری پہ روتا ہوں
اُلٹ کر گر پڑا ساغر مرا کل دستِ ساقی سے تبھی تو طالعوں کی میں نگوں ساری[1] پہ روتا ہوں
مجھے وقتِ وداعِ دوست داراں یاد آتا ہے میں نت ناچار ہو کر اپنی ناچاری پہ روتا ہوں
مرا دل زلفوں کے حلقوں سے ہرگز چھٹ نہیں سکتا میں اس بیمار کی پُر پیچ[2] بیماری پہ روتا ہوں
زمانہ سیم و زر سے مصحفی ایسا تھا کب خالی
نہ اپنی مفلسی، عالم کی ناداری پہ روتا ہوں

371

جو عاشق ہیں مضموں نیا باندھتے ہیں ہر اک بات میں چٹکلا باندھتے ہیں
جو کرتے ہیں زلفوں کو اس کو حمائل گلے سے وہ اپنے بَلا باندھتے ہیں
میں کب سرمہ آنکھوں میں اُس کی دیا ہے یونہیں یار اک توتیا[3] باندھتے ہیں
خدا جانے نکلیں گے کب گھر سے باہر ابھی وے تو بندِ قبا باندھتے ہیں

---

[1] نگوں ساری = الٹا ہونا [2] پُر پیچ = پیچیدہ [3] توتیا باندھنا (محاورہ) = بے سروپا بات کرنا۔

غلط ہے کہ زلفوں سے اس کی بندھا ہے — مرے دل پہ یہ افترا باندھتے ہیں
فلک کی خبر کب ہے ناشاعروں کو — یوہیں گھر میں بیٹھے ہوا باندھتے ہیں
بلا پُر خرد ہیں یہ خوں خوار لڑکے — کہ چہرے میں زلفیں مِلا باندھتے ہیں
گلی میں تری آنے جانے سے اے گل — جو ہم ہیں، تو پاے صبا باندھتے ہیں
وہی ایک معنی ہیں اس نہ ورق[1] میں — کہ جس کو بہ چندیں ادا باندھتے ہیں
ہم اس باغ سے اب تو رختِ سفر کو — بہ تکلیفِ[2] بانگِ درا باندھتے ہیں

جو جیتے ہیں تو مصحفی آشیانہ
کسی شاخِ گل پر پھر آ باندھتے ہیں

372

اگر اے برقِ عالم سوز یہ ہیں تیری اچپلیاں[3] — تو ہم کو ٹھہرنے دیں گی نہ یک جا دل کی بے کلیاں
گُل اپنے دورِ پیراہن پر اس گلشن میں نازاں تھا — پہ ششدر رہ گیا دیکھیں جو کُرتے کی ترے کلیاں
کوئی ہندوستاں میں کم کسی کی داد کو پہنچا — موئے لاکھوں ہی عاشق اور ہزاروں ستیاں[4] جلیاں
قیامت ماجرا اس ناچ میں گذرا سحر ہوتے — کہ اک عالم کو کافر لولیاں پامال کر چلیاں
ملایا خاک میں یوں نوخطوں کو تیرے عارض نے — کسو نے لے کے جیسے چینٹیاں تلووں تلے ملیاں
بچا شمشیرِ ابرو اور کمندِ زلفِ پُر چیں سے — نہ پوچھو کیسی کیسی آفتیں سر سے مرے ٹلیاں

نہیں آساں ملا اے مصحفی دیدار عصمت کا
پھرا ہوں ڈھونڈتا مدّت تلک میں شہر کی گلیاں

373

آرام سے اک دن کبھی ہم بیٹھے نہ گھر میں — رکھا تری خواہش نے ہمیں روز سفر میں

---

[1] نہ ورق = مرادنہ ورق آسمان (نو طبقے) [2] یعنی بانگ درا کے مجبور کرنے پر باندھتے ہیں۔
[3] اچپلیاں = شوخیاں [4] ستی بغیر تشدید تاہے مگر مصحفی نے اس طرح نظم کیا ہے۔

صدقے ہوں میں پیارے ترے دانتوں کی چمک کے — یہ ہووے ہے شفافی کہاں سلکِ گہر میں
کیا تو بھی مری طرح سے عاشق ہے کسی کا — اے لالے بتا کیوں ہے ترے داغ جگر میں
اے لختِ جگر، روز تری راہ تکوں ہوں — رکھا نہ قدم تو نے کبھو دیدۂ تر میں
وعدہ نہ کیا وصل کا، باتیں ہی بنائیں — گر ہم سے کبھی مل بھی گیا راہ گذر میں
اے آئینے ہرچند کہ تو سادہ نما ہے — پر تیری نظر بازیاں ہیں اپنی نظر میں

اے مصحفی اتنا بھی کوئی سووے ہے غافل
اُٹھ صبح ہوئی صرفہ[1] ہے کیا خوابِ سحر میں

374

شاید کہ ہم سے پھر نگہیں یار کی پھریں — کچھ ان دنوں میں آنکھیں لگیں یار کی پھریں
دل کی طرف کو پلکیں جو ہیں یار کی پھریں — نوکیں جگر میں پیرتیاں خار کی پھریں
کس کا بیان تجھ سے کروں، تیرے عشق میں — کیا کیا نہ حالتیں کہ دلِ زار کی پھریں
کہہ کس سے رنگی ہوئی پیدا کہ ان دنوں — طرزیں تمام ہیں تری رفتار کی پھریں
لایا کبھی نہ رؤ بہ شفا عشق کا مرض — سو صورتیں اگرچہ اس آزار کی پھریں
لوٹے مرے اُسی نے یہاں، جس ذبیح کے — چھریاں گلے پر اس بتِ خوں خوار کی پھریں
گہہ سرخ، گاہ زرد ہوا سب ہَوا کا رنگ — کیا کیا ہوائیں اب کے چمن زار کی پھریں[2]
ٹھہرا نہ ایک وضع پہ تیرا مزاجِ شوخ — سو وضع بندشیں تری دستار کی پھریں
دل گم ہوا مرا تو تری زلف کی لٹیں — سینے میں دوڑی دوڑی طرح مار کی پھریں
مژگاں کی فوج نے وہیں گھوڑے اُٹھا دیے[3] — باگیں جدھر کو ٹک نگہِ یار کی پھریں
کس کی مریض ہے، یہ کہ کچھ دیکھتا ہوں میں — آنکھیں چمن میں نرگسِ بیمار کی پھریں[4]

---

[1] صرفہ = فائدہ [2] ہوا پھرنا = ہوا بدلنا [3] گھوڑے اُٹھانا = سرگرمی سے رجوع ہونا
[4] آنکھیں پھرنا = مریض کی آنکھیں نزع کے وقت پھر جاتی ہیں۔

گر آگیا زمانہ کبھی فربہی پہ تک | دیکھو گے صورتیں در و دیوار کی پھریں
کافر تو ہوگئے تری زلفوں کو دیکھ کر | ازبس کہ نیتیں اولی الابصار کی پھریں

اے مصحفی زمانہ بہ یک وضع ہی رہا
کج خوئیاں نہ چرخِ ستم گار کی پھریں

375

پیچھے لگی وہ زلفیں دلِ زار کے پھریں | یاں تک کہ آخرش کو اسے مار کے پھریں
من بعدِ مرگ میری، مرے دل کی خواہشیں | اک عمر گرد آرزوے یار کے پھریں
رم خوردہ صید کون ہے وہ جس کے شوق میں | زلفیں تری کمندیں بغل مار کے پھریں
مارِ سیاہ زلف کو دیکھا جو حلقہ زن | نظریں نہ گرد اس گلِ رخسار کے پھریں
کیا کیا نہ ماہ پارہ تری آرزو کے بیچ | پردے میں مُنھ چھپائے شب تار کے پھریں
دم عشق کا بھریں تھیں جو دو چار حسرتیں | وہ پاس بھی نہ آ دلِ بیمار کے پھریں
تھا قصدِ سیرِ عرش ان آہوں کو شب ولے | جب واں تلک پہنچ نہ سکیں ہار کے پھریں
گر اس نے گل رکھا کبھی چیرے پہ، بلبلیں | جوں پیچ گرد چہرۂ گلنار کے پھریں

کیا کیا نہ حور چہرہ کہ بالوں کو کھول کر
گردِ مزار مصحفی زار کے پھریں

376

نے محرمِ قفس نہ شناساے باغ ہیں | ہم اپنی بے نصیبی کے ہاتھوں سے داغ ہیں
اک دن ہم اس چمن سے اُٹھالیں گے آشیاں | بلبل کے چچھوں سے بہت بے دماغ ہیں
لائے ہیں پاے چرخ جو انجم سے آبلے | یہ ایسے کس کی راہ میں گرمِ سراغ ہیں

ہاتھوں سے جل رہا ہوں میں کس کے جو مصحفی
سینے کے داغ جیسے کہ روشن چراغ ہیں

377

کب ہیں نرگس کی یہ ایں شوخ ادائی آنکھیں
اُن نے تیری سی کہاں پائیں ہوائی آنکھیں

ایک تو ہر مژہ اس شوخ کی رو گرداں ہے
تس پہ ہر لحظہ بتاتی ہیں رُکھائی[1] آنکھیں

سخت دیکھا میں الم ان سے، بہت بہتر تھا
پھوٹ جاتیں جو مری روزِ جدائی آنکھیں

سادگی ان کی، مجھے ذبح کرے ہے یارو
بس کہ اس شوخ کی رکھتی ہیں صفائی آنکھیں

بے بصر ہوتے ہیں محتاج عبث عینک کے
کام آتی نہیں زنہار پرائی آنکھیں

کھول کر آنکھیں ذرا سیرِ جہاں کر کہ یہاں
ذرّے ذرّے میں دکھاتی ہیں خدائی آنکھیں

ایک دن اس کی کفِ پا سے مَلیں تھیں میں نے
ہوگئی ہیں مری اُس دن سے حنائی آنکھیں

حسن گو پردہ نشیں ہووے پرکھ جاتے ہیں
جن نظر بازوں کی رکھتی ہیں رسائی آنکھیں

یا رب اپنی بھی کبھی رخنۂ دیوار کی طرح
حرمِ وصل میں کر گئی تھیں رسائی آنکھیں

ایک دن در پہ کھڑے اس کو کبھی دیکھا تھا
تب سے دیدار کی کرتی ہیں گدائی آنکھیں

مصحفی کو نہ رہی طاقتِ نظارہ دریغ
اس نے سیں[2]، دیکھ تری تنگ قبائی آنکھیں

378

حرکات اس کی سے نکلیں ہیں ادائیں لاکھوں
کیوں نہ دوں اس کے تئیں دل سے دعائیں لاکھوں

کوچۂ زلف میں اک رات میں جا نکلا تھا
دوڑیاں اُٹھ کے مرے پیچھے بلائیں لاکھوں

باز آتے نہیں ہم تو بھی زیاں کاری سے
گرچہ اس عشق میں پاتے ہیں سزائیں لاکھوں

شیشۂ دل کو مرے یار نہ پتھر پہ پٹک
ورنہ نکلیں گی ابھی اس سے صدائیں لاکھوں

ناز بردارِ بتاں ہم تو رہے تالبِ گور
مرتے مرتے بھی سہیں ان کی جفائیں لاکھوں

---

[1] رُکھائی = تغافل، سردمہری۔ [2] یعنی سی لیں۔

ہو جے ہرگز نہ دلا عفوِ خدا سے نومید — بخش دیتا ہے وہ اک دم میں خطائیں لاکھوں

مصحفی خوابِ عدم سے کوئی اب اُٹھتا ہے
گو اسے آن کے عیسیٰ سے جگائیں لاکھوں

379

کیوں نہ لوں وصل کی شب تیری بلائیں لاکھوں — میں ترے واسطے مانگی ہیں دعائیں لاکھوں

وائے قسمت کہ شفا مجھ کو میسّر نہ ہوئی — گرچہ کی ہیں مرضِ دل کی دوائیں لاکھوں

بیٹھے بیٹھے جو میں شب سینے پہ ناخن مارا — پردۂ دل سے مرے نکلیں صدائیں لاکھوں

کشتہ ہوں اس کے میں برہم زدنِ مژگاں کا — گردشِ چشم میں ہیں جس کی ادائیں لاکھوں

مصحفی رنگِ گل اک وضع پہ کس طرح رہے
روز اس باغ میں چلتی ہیں ہوائیں لاکھوں

380

وہی آہ و فغاں و زاریاں ہیں — وہی راتیں وہی بے داریاں ہیں

نہ نام عشق لے ناداں کہ اس میں — بہت رسوائیاں اور خواریاں ہیں

میں حیراں ہوں کہ کیوں ہنسنے میں گل کے — ترے ہنسنے کی وضعیں ساریاں ہیں

کہیں ہیں جس کو خوباں پان کھانا — ہمارے حق میں وے خوں خواریاں ہیں

مرے، ان نونہالوں نے بدن پر — قطعہ — زبس پھولوں کی چھڑیاں ماریاں ہیں

جدا، جس نقش کو دیکھوں ہوں، اس میں — ہزاروں رنگ اور گل کاریاں ہیں

محل کی رنڈیوں کا کیا کروں ذکر — قطعہ — جہاں گرم اُن کی صحبت داریاں ہیں

وہی ٹھٹے وہی چُہلیں ہیں باہم — وہی چھینیں، وہی کِل کاریاں ہیں

نہ پوچھ اے مصحفی احوال دل کا
کہ اس دل کو کئی بیماریاں ہیں

381

نہ تنہا دل میں سو نشتر چھپے ہیں — تہِ ہر مو یہاں خنجر چھپے ہیں
زمیں کو کھودیے تو اس کے نیچے — ہزاروں سردلیں[1] اور دَر چھپے ہیں
فقیروں کو بہ چشمِ کم نہ دیکھو[2] — کہ ان میں اولیا اکثر چھپے ہیں
کہے تھی دایہ طفلی میں وہ بھوں دیکھ — ابھی اس تیغ کے جوہر چھپے ہیں
اگر سینے کو میرے چاک کیجے — تو اس میں مثلِ گل دفتر چھپے ہیں
نہ چادر پوشوں کو تو سرسری دیکھ — کہ رعنا قد پسِ چادر چھپے ہیں
جھلکتا ہے وہ رخ برقع سے سارا — چھپائے کب پری پیکر چھپے ہیں
کیا تھا دفن ہم کو جس جگہ واں — انگارے[3] زیرِ خاکستر چھپے ہیں

بہ ہر سو مصحفی کا تذکرہ ہے
کوئی ایسے سخن پرور چھپے ہیں

382

چقیں پلکوں کی جب اُٹھا دی ہیں — اُس نے آنکھیں ہمیں دکھا دی ہیں
تہِ پا آگئے ہیں گر تیرے — تہِ دل سے تجھے دعا دی[4] ہیں

---

[1] سَردل = دہلیز کے اوپر کا حصہ۔ دروازے کی ڈاٹ [2] فارسی کے مشہور شعر کا ترجمہ ہے:

خاکساران جہان را بہ حقارت منگر — تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

[3] اس کا تلفظ غور طلب ہے۔ انگارے بروزن شرارے نظم ہوا ہے۔

[4] یہاں دعا جمع کے طور پر آیا ہے۔ بجائے دعائیں۔

میرے پیچھے بلائیں زلفوں کی　　بیٹھے بیٹھے ابھی لگا دی ہیں
سر فرہاد پر نہیں موقوف　　عشق نے گردنیں کٹا دی ہیں
اس نے کل دیکھتے ہی میری طرف　　کیا ہی نظریں تلے جھکا دی ہیں
چل بے ناصح کہ میں گریباں کی　　پھاڑ کر دھجیاں اُڑا دی ہیں
قصر دل کا خراب ہے، غم نے[1]　　اس کی سب صورتیں مٹا دی ہیں
یوں بھڑکتے ہیں استخواں میرے[2]　　تو کہے لکڑیاں جلا دی ہیں
شاہدِ گل سے آج نرگس نے　　بے طرح انکھڑیاں ملا دی ہیں
کہہ نہ تو مصحفی کے وصف میں یہ قطعہ کیا ہی بیتیں مجھے لکھا دی ہیں

اس نے ایسی تو سیکڑوں غزلیں
مؤت کے ریلے[3] میں بہا دی ہیں

383

خورشیدِ اوجِ خوبی، ماہِ سپہرِ احساں قطعہ شمشیر جنگ، یعنی مرزا محمدی خاں[4]
بُرِش میں تیغ جس کی، ہے جیسے برقِ خاطف مدحیہ بخشش میں ہاتھ جس کا، ہے جیسے ابرِ نیساں
جوں گل، شگفتگی میں باغ و بہار ہے وہ　　مجلس تمام اُس کی، ہے اس لیے گلستاں
اُس کے جلوس سے ہے، سب پالکی کی زینت　　اِس بُرجِ قوس کا ہے وہ آفتابِ تاباں
کیا زَرق بَرق اُس کی، پوشاک کا بتاؤں　　اک دن میں جا جو نکلا سوے حریر[5] دوزاں
زربَفت و مہر و مہ کو مقراض[6] کر رہے تھے　　تا قطع کر سکیں وے اُس کی سَنجافِ[7] داماں

---

[1] میرؔ: دیدنی ہے شکستگی دل کی　　کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
[2] میرؔ: استخواں کانپ کانپ جلتے ہیں　　عشق نے آگ یہ لگائی ہے
[3] موت کے ریلے میں = پیشاب کی دھار پر۔ [4] مرزا محمدی خاں کے لیے ملاحظہ ہو: مقدمہ کلیات مصحفی۔ درذیل ممدوحین مصحفی۔ [5] حریردوز = ریشمی کپڑے کاڑھنے والے۔ [6] مقراض کرنا = کترنا۔
[7] سنجاف داماں = دامن پر لگی ہوئی پٹی۔

کیوں کر نہ ہر طرف سے تحسیں بلند ہووے — وہ مصحفی سا شاعر جس بزم میں غزل خواں
جب مدح کہہ چکا میں، دل نے مجھے کہا یوں: — کا ے طوطیٔ نوا سنج وَ ے بلبلِ خوش الحاں
اک مجھ کو اس زمیں میں اپنی غزل سنا دے — سنتے ہی جس کو ہوویں سب سامعین حیراں

تب دل سے یوں کہا میں: کیا چاہیئے[1]، بہت خوب
اتنے میں لب تک آیا یہ مطلعِ نمایاں

384

گر اس روش سے ہو تو سوٗے چمن خراماں — لے آنکھوں سے لگاوے گُل تیرا طرفِ[2] داماں
گردش میں چشم کی تھی، گردش فلک کی ساری — دل ہل گئے ہزاروں جوں ہی ہلے وہ مژگاں
خوں گشتہ دل کو میرے مت چشمِ کم سے دیکھو — یہ لعل بھی کسی کا تھا تکمۂ گریباں
شرمندہ ہو ستارے آنکھیں لگے چُرانے — مکھڑے کو چاندنی میں آیا جو کر کے افشاں
یہ بھی کوئی روش ہے، اے جامہ زیب ادھر دیکھ — ہاتھوں سے تیرے گُل کا ٹکڑے ہوا گریباں
اب تک حواس میرے، یارو ہوئے نہیں جمع — میں سر کے بال اُس کے دیکھے تھے کل پریشاں
اُس گل کی تنگ پوشی گر ہے یہی تو اک دن — کچھ گُل کھلا رہے گا یہ اختلاطِ[3] چسپاں

یہ شاعری نہیں کچھ بے شک کہ ساحری ہے
اے مصحفی وہ سمجھے اس کو جو ہو زباں داں

385

ہم نہ وہ تاب و تواں رکھتے ہیں — کانپتے پانو وہاں رکھتے ہیں
یہ نہ جانو نہیں عاشق پیشہ — ہم بھی اک آفتِ جاں رکھتے ہیں

---

[1] کیا چاہیئے = یعنی کیا ہرج ہے، یہ کون سی مشکل ہے۔ [2] طرف داماں = کنار دامن
[3] چسپاں اختلاطی = فارسی کا محاورہ ہے، گہرا تعلق

خوش قد اس اور بھی، خوش جلوہ ہیں لیک — پانو اس دھج سے کہاں رکھتے ہیں

مجھ میں اور اُس میں ہے اک الفتِ صاف — بدگماں اور ہی گماں رکھتے ہیں

عشق ہے ہم کو، کہ اب تک تجھ سے — اپنی خواہش کو نہاں رکھتے ہیں

بولتے آپ نہیں ہم سے کبھی — مُنھ میں کہنے کو زباں رکھتے ہیں

مصحفی گر وہ لگاوے کوئی تیر
ہم دل اپنے کا نشاں[1] رکھتے ہیں

386

ملا چاہو تم، تو بہانے بہت ہیں — جگہ سیکڑوں ہیں، ٹھکانے بہت ہیں

حدیثِ سرِ زلف کیا کوئی سمجھے — کہ اس بات کے شاخسانے بہت ہیں

تہی دست جانے کایاں سے نہ غم کھا — زمیں کے تلے تو خزانے بہت ہیں

بھڑکیو سمجھ کر تک اے آتشِ گل — کہ اس باغ میں آشیانے بہت ہیں

کہوں غیرِ مجلس میں کیا تجھ سے دل کی — کہ یاں لوگ اپنے بِگانے بہت ہیں

کوئی میں نکلتا ہوں دریائے غم سے — ابھی اس میں جھکجھولے[2] کھانے بہت ہیں

نہیں آدمیّت کا دلّی میں چرچا — جدھر دیکھو بھڑوے[3] زنانے بہت ہیں

لگا تیر کوئی جسے چاہے پیارے — کماں ہاتھ میں لے، نشانے بہت ہیں

بتوں کے تحشّم[4] کا کیا ذکر کیجے — خدائی کے یاں کارخانے بہت ہیں

تری زلف کس کس کے پانووں پڑے گی — ہے زنجیر اک اور دوانے بہت ہیں

---

[1] نشاں = نشانہ [2] جھک جھولے کھانا = تھپیڑے کھانا (لیکن یہ محاورہ اپنا مفہوم جدا ہی رکھتا ہے)۔
[3] یہ مصحفی نے غلط نہیں لکھا۔ نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں کی کتاب ''مرقع دہلی'' پڑھ دیکھیے۔ اس شعر کی تفسیر ہے۔ [4] شرمانا، حیا کرنا

زمانے کا دیکھا ہے میں بہت کچھ قطعہ مجھے یاد ایسے زمانے بہت ہیں
زمانے کا شکوہ نہ کر ہم[1] سے، ہمدم سخن اور کہہ کچھ، فسانے بہت ہیں
اُٹھ اے مصحفی کیا یہی در ہے تجھ کو
پٹکنے کو سر آستانے بہت ہیں

387

ہے بسا، گل عذار آنکھوں میں کیا سما وے بہار آنکھوں میں
جیسے شیشے میں مے، جھلکتا ہے رنگِ رخسارِ یار آنکھوں میں
رات جاگا ہے تو، کہاں، جو تری اب تلک ہے خمار آنکھوں میں
دمِ شمشیر سا چمکتا ہے سرمہ اُن آب دار آنکھوں میں
کام کرجاتی ہیں تری آنکھیں چپکے چپکے ہزار آنکھوں میں
اُس نے اک جھانولی[2] سے دکھلا دی گردشِ روزگار آنکھوں میں
لال ڈوروں سے اُس پری رُو کے ہے قیامت بہار آنکھوں میں
تیرے ہاتھوں سے آرہی ہے جان اے دل بے قرار آنکھوں میں
رات از بس کہ کر رہا تھا ہجوم قطعہ شوقِ دیدارِ یار آنکھوں میں
تارے گِن گِن کے مصحفی کاٹی
میں شب انتظار آنکھوں میں

388

یار بن شغلِ مے و جام کے نزدیک نہیں عمر گزری کہ میں اس کام کے نزدیک نہیں
اک طرف شمع، کہ یاں تیرگیِ طالع سے نورِ مہ اپنے در و بام کے نزدیک نہیں

---

[1] ن۲: مجھ سے [2] جھلک

تہمتِ بوسۂ عاشق کے ہوں آلودہ، دریغ — وے لبِ سادہ، کہ دشنام کے نزدیک نہیں

کیا مصیبت ہے کہ جی نکلے ہے اور اس ساعت — کوئی اس تیرہ سرانجام کے نزدیک نہیں

میوۂ پختہ کا طالب ہوں میں اس باغ کے بیچ — ہاتھ میرا ثمرِ خام کے نزدیک نہیں

کون سا طائرِ بگرفتۂ اجل، اے صیاد — اس گلستاں میں ترے دام کے نزدیک نہیں

دردِ دوری کی اذیّت کو وہی سمجھے ہے — جو کوئی اپنے دل آرام کے نزدیک نہیں

نت دعا ہی میں رہا ہاتھ مرا یا قسمت — اب تلک زلفِ سیہ فام کے نزدیک نہیں

جب سے اے راحتِ جاں، مجھ سے ہوا ہے تو جدا — دل مرا راحت و آرام کے نزدیک نہیں

مصحفی خاص تو سمجھیں ہیں بھلا، رتبۂ شعر
قدر اس چیز کی گو عام کے نزدیک نہیں

389

میں جب اُس کو خنجر بکف دیکھتا ہوں — ہزاروں کے جی کو تلف دیکھتا ہوں

فلک گر ہنساتا ہے مجھ پر کسی کو — میں ہنس کر فلک کی طرف دیکھتا ہوں

نہ یہ وے زمیں ہے، نہ وے آسماں ہے — کچھ اُلٹی ہوئی صف کی صف دیکھتا ہوں

اِدھر کو ہے رخ کس کی مژگاں کا یارب — کئی دن سے سینہ ہدف دیکھتا ہوں

جب آتا ہے مژگاں پہ آنسو میں اپنے — تماشائے درِ نجف دیکھتا ہوں

ترا مستِ نظّارہ مارا پڑا ہے — جہاں، خون پر اس کے کف دیکھتا ہوں

اگرچہ میں ہمّت بلندی سے اپنی — قطعہ گہر اپنے سارے خزف دیکھتا ہوں

وے مصحفی ہو ہے میری تسلّی
جو گاہے کلامِ سلف دیکھتا ہوں

390

چہرہ اُتر رہا ہے، نقشے بگڑ گئے ہیں — پھر ان دنوں تو تیرے لچھن سے[1] جھڑ گئے ہیں

ہم جن کی دوستی پر دیتے تھے جان اپنا[2] — قدرت خدا کی ہم سے وے رات لڑ گئے ہیں

تلوار سج کے جب وہ نکلا ہے گھر سے باہر — کشتوں کے ہر گلی میں سُتھراو[3] پڑ گئے ہیں

تیری صفا سے دنداں کے آگے ہو کے عاجز — دانتوں میں اپنے موتی تنکے پکڑ گئے ہیں[4]

جب شہرِ دل سے پیارے تم نے سفر کیا ہے — بستے نگر ہزاروں پل میں اُجڑ گئے ہیں

وے جو مریض تیرے جیتے تھے کل ذرا ٹک — کہتے ہیں آج اُن کے پھر دم اُکھڑ[5] گئے ہیں

روتا پھروں ہوں تنہا میں قافلے میں یارو — منزل پہ میرے ساتھی مجھ سے بچھڑ گئے ہیں

جب سے پھرا ہے اُس کی پلکوں کا رُخ ادھر کو — سینے میں آسماں کے سوراخ پڑ گئے ہیں

واں اس نے گر لیا ہے خمیازہ مُنھ پھرا کر — یاں میرے چاکِ دل کے ٹانکے ادھڑ گئے ہیں

اے مصحفی میں روؤں کیا پچھلی صحبتوں کو
بَن بَن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

391

دیکھا جو دستِ غیر میں اس کا سرِ آستیں[6] — رویا بہت میں رکھ کے وو ہیں مُنھ پر آستیں

دستِ ستم کو تو نے جو کوتہ کیا تو پھر — خواہی دراز خواہ تو، کوتہ کر آستیں[7]

---

[1] لچھن جھڑنا= یہ بھی روہیل کھنڈ کی بولی ہے۔ حالت بدل جانا، وضع میں فرق آجانا۔ [2] ن۲: اپنی
[3] سُتھراو پڑنا= ڈھیر لگ جانا [4] دانتوں میں تنکا پکڑنا= اظہارِ عاجزی کرنا۔ [5] دم اُکھڑنا= حالت خراب ہونا۔ [6] سرِ آستین= آستین کا کنارا (فک اضافت)
[7] آستین کوتاہ کرنا= بعض صوفیہ اپنے مریدوں کو آستیں کٹوانے کا حکم دیتے تھے، یہ ترکِ دنیا اور اسباب مادی سے بےتعلقی کا اظہار ہوتا تھا۔ اس لیے کہ پہلے زمانے میں بہت بڑی بڑی آستینیں رکھتے تھے اور ان میں اکثر اشیا رکھ لی جاتی تھیں، گویا ان سے جیب کا کام لیا جاتا تھا۔ کوتاہ آستینی سے مراد یہی تھی کہ اسبابِ دنیا رکھنے کا وسیلہ ہی ختم کر دیا۔

کیا خوب دن تھے وے کہ جو گلشن سے ہر سحر — چن چن کے پھول لاتے تھے ہم بھر بھر آستیں
ساعد نہ جان تو کہ وہ شوخ دوپٹہ باز[1] — رکھتا ہے میرے قتل کو خنجر درآستیں
تاہم نہ دیکھیں گوہرِ دنداں کی آب و تاب — ہنستے بھی ہیں جو آپ تو مُنھ پر دھر آستیں
اس تیرے ساعدِ ورق نقرہ وش[2] کو شوخ — ایسا نہ ہو چُنَت[3] سے کرے مسطر آستیں
جس طرح کہکشاں میں ستارے ہوں جلوہ گر — یاں اشکِ خوں سے رکھتی ہے سو اخگر آستیں
نکلا پڑے ہے[4] کپڑوں سے وہ، اس کا کیا عجب — ساعد سے مجھ پہ کھینچے اگر خنجر آستیں

اے مصحفی تو ایک غزل اور بھی تو ٹانک
تیرے قلم کی ہے ابھی پُر گوہر آستیں

392

پہنے ہے بر میں جامہ وہ جب چُن کر آستیں — اپنے ہمیں دکھاتی ہے تب جوہر آستیں
دل زخمی اُس کے رنگِ حنا کا ہے، دیکھ تو — رکھتا ہوں اشکِ سرخ سے شاہد در آستیں
تلمے رکھا کرو کہ میاں تنگ پوشوں کی — تلموں سے اور ہوتی ہے زیب[5] آور آستیں
آگے ہی تیرے ہاتھوں سے مر رہے ہیں جان — تو دم بہ دم چڑھائے ہے یہ کس پر آستیں
کر ذبح مجھ کو، اے مرے قاتل تو، شوق سے — پر بے شعور خوں میں نہ اپنی بھر آستیں
جب خاصہ کھانے بیٹھے ہے وہ، اس کے خوان پر — آ کر ملک ہلاتے ہیں اپنا سر[6] آستیں

اے مصحفی تو کس لیے رہتا ہے گریہ ناک[7]
آنکھوں پہ دیکھتا ہوں تری اکثر آستیں

---

[1] دوپٹہ باز = غالباً پٹے بازی کی اصطلاح ہے۔ [2] اضافت توصیفی مرکب ہے۔ چاندی کے ورق جیسی کلائی۔ [3] چُنت = کرتے کی آستین چن کر اس میں شکنیں ڈال دی جاتی ہیں، شعر نمبر ۲۱۴۳ میں بھی یہی استعمال ہے۔ [4] کپڑوں سے نکل پڑنا = جامے سے باہر ہونا، خود پسندی۔ [5] زیب آور = یہ بھی نئی ترکیب ہے، بجلی۔ [6] ملاحظہ ہو ۳۱۳۴ کا حاشیہ [7] گریہ ناک بھی نئی ترکیب ہے۔

393

بے وفایانِ جہاں کس سے وفا کرتے ہیں
ہم لگے[1] جاتے جو ہیں اُن سے برا کرتے ہیں

اور تو شغل کچھ آتا نہیں ہم کو لاچار
رات دن بیٹھے ہوئے گریہ کیا کرتے ہیں

تجھ سے ہم شاد بہت رہتے تھے اے کنجِ قفس
وقتِ رخصت ہے اب ہم تجھ کو دعا کرتے ہیں

مُنھ چھپایا جو کل اس نے تو میں ہنس کر بولا:
آپ کیا مجھ سے بھی پردے میں چھپا کرتے ہیں

دیکھیے صبح ہو گیا، شام بنے کیا جی پر
ہم اسی سوچ میں دن رات رہا کرتے ہیں

جس پہ کی اُس نے نظر چٹ اُسے وو ہیں مارا
قدر[2] انداز کوئی تیر خطا کرتے ہیں

ماہ و خورشید کا پھرنا نہیں دن رات عبث
آپ کو تجھ پہ مری جان، فدا کرتے ہیں

جستجو میں تری ہم اے گلِ تر مدّت سے
جوں صبا ہر طرف آوارہ پھرا کرتے ہیں

مصحفی ایک غزل اور بھی کہہ، کیوں کہ میاں
قافیے تجھ سے بہت خوب بندھا کرتے ہیں

394

صبح اُٹھ ہم جو درِ خانہ کو وا کرتے ہیں
شام تک تیری ہی پھر راہ تکا کرتے ہیں

بعد مرنے کے بھی ہے دائر[3] و سائر بلبل
تب تو پر اس گلستاں میں اُڑا کرتے ہیں

اِن کو سمجھا، کہ ترے کوچے کے رہنے والے
ہم پہ دن رات نت آوازے کسا کرتے ہیں

کیا نصیب ان کے بھی اچھے ہیں جو خنجر کے تلے
اپنے قاتل کی طرف دیکھ رہا کرتے ہیں

سببِ گریہ کہیں کیا یو ہیں ہم پَل پَل میں
خود بخود آبلے سے پھوٹ بہا کرتے ہیں

نو بہار آئی ہے اب گُل کی طرح ہم بھی نسیم
دھجیاں کرکے گریباں کو ہوا کرتے ہیں

---

[1] لگے جانا = اختلاط رکھنا [2] قدر انداز = نشانے باز۔ فوج کی اصطلاح ہے۔ قدر بروزن نظر ہے۔
[3] دائر و سائر = زندہ متحرک

شوق تو دیکھ کہ جس وقت تو، سو جاتا ہے ہم یہ آنکھیں ترے تلووں سے ملا کرتے ہیں

طرفہ عزّت ہے ہماری بھی گلی میں تیری گالیاں جو کوئی دیتا ہے، سنا کرتے ہیں

باغ میں آ، کہ ترے شوقِ ہم آغوشی میں صبح اُٹھ پھول بھی خمیازے لیا کرتے ہیں

رخصتِ جنبشِ لب تو نہیں دیتا ہے ادب دور سے ہم تجھے نظروں میں دعا کرتے ہیں

لے خبر اپنی ذرا جلد کہ یاں یاروں میں تیغِ ابرو پہ تری خون ہوا کرتے ہیں

تھی جہاں مصحفیِ سوختہ جاں کی تربت
پھول لالے کے کئی[1] واں سے اُگا کرتے ہیں

395

شب ہے اور آشنا کی باتیں ہیں عشق کے ابتدا کی باتیں ہیں

حسن کی سرزمیں کا ہے مذکور واں کی آب و ہوا کی باتیں ہیں

کیوں نہ ہر بات پر کوئی غش ہو تیرے ناز و ادا کی باتیں ہیں

مجھ سے اور اتنا تلخ بولے تو یہ بھی پیارے خدا کی باتیں ہیں[2]

اس کی شرم و حیا کا نام نہ لو کہ یہ شرم و حیا کی باتیں ہیں

ہم ہیں اور شب ہے اور وہی تا صبح تیری زلفِ رسا کی باتیں ہیں

میرے نامے کو وہ نہیں پڑھتا جس جگہ مدّعا کی باتیں ہیں

یار نے مصحفی کا خون کیا
نہ غلط، یہ حنا کی باتیں ہیں[3]

---

[1] کئی = بہت سے کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اہلِ پنجاب کی زبان پر آج بھی ہے۔ ہمارے ہاں اس کے استعمال میں ذرا سا تصرف کرلیا ہے۔ مثلاً ''وہاں کئی جاننے والے تھے'' یعنی متعدد۔ یا تھوڑے نہ تھے۔

[2] یعنی خدا کی قدرت ہے۔ [3] حنا کی باتیں ہیں یعنی حنا کا کام ہے۔

396

اُس زلف میں عرق کے قطرے لٹک رہے ہیں — یا رات اندھیری[1] میں تارے چھٹک رہے ہیں
بیزاری اس چمن میں پھیلی ہے بس کہ ہر سو — گل دستِ باغباں سے دامن جھٹک رہے ہیں
ہم سے ملائیاں ہیں ٹک جس نے اپنی آنکھیں — ہم اک نگہ پہ اُس کی برسوں اٹک رہے ہیں
آیا ہے آخرِ شب کون اس چمن میں یارب — جیسے سپندِ مجمر[2] غنچے چٹک رہے ہیں

اے مصحفی وہ کوئی آتا ہے گھر سے باہر
ہم آستاں سے اس کے کیوں سر پٹک رہے ہیں

397

بال زلفوں کے جب سنوارے ہیں — جان سے لاکھوں اس نے مارے ہیں
دشمنِ جاں ہوئے ہیں عالم کے — وے جو اک مہرباں ہمارے ہیں
اس کے اعضا کی کیا کروں تعریف — جیسے سانچے میں ڈھال اُتارے ہیں
کیوں نہ چھاتی سے میں لگا رکھوں — داغ چھاتی کے مجھ کو پیارے ہیں
وصل سے ان کے تو نہ ہو نومید قطعہ — یہ جو کئی شب نما شرارے ہیں

مصحفی کیوں نہ ہاتھ آویں گے
ایسے کیا آسماں کے تارے ہیں

398

کبھی جو یار کی پلکیں دوچار ہوتی ہیں — تو برچھیاں سی کلیجے کے پار ہوتی ہیں
وہ دام ہے تری زلفِ ہزار خم صیّاد — کہ جس کو دیکھ نگاہیں شکار ہوتی ہیں

---

1. اندھیری بفتح یا اندھیاری کا مخفف ہے۔ 2. مجمر = انگیٹھی

دکھاتی ہیں ہمیں سیرِ شگوفۂ بادام — وے انکھڑیاں جو کبھو پُرخمار ہوتی ہیں
میں بس کہ کانپتا رہتا ہوں وصل کی شب بھی — تری ہی زلفیں تری ہم کنار ہوتی ہیں
کب ایک جان کی عاشق کے اس کو پروا ہے — ہزار جانیں جس اوپر نثار ہوتی ہیں
بہار آئی کہاں ہے قفس میں اے صیّاد — یہ بلبلیں تو عبث بے قرار ہوتی ہیں
خدا کرے کہ مرے اور ترے ہوں روزِ وصال — جو چہلیں باغ میں فصلِ بہار ہوتی ہیں

اُنھیں کو دیکھ کے دل مصحفی پھسلتا ہے
جو صورتیں کہ ذرا آب[1] دار ہوتی ہیں

399

بلبل کے چہچہوں سے آزار کھینچتے ہیں — دو چار نالے ہم بھی ناچار کھینچتے ہیں
شب[2] باز کا تماشا ہے یہ جہاں، جو دیکھو — پردے میں آپ بیٹھے وے تار کھینچتے ہیں
ابروکوان کی گر ہم کہتے ہیں راست خم[3] ہے — اس بات سے وہ کٹ کر تلوار کھینچتے ہیں
دیتے ہیں دل میں میرے پیکاں اچوک[4] خوباں — چٹکی سے تیر کا جب سوفار کھینچتے ہیں
جو وادیٔ طلب میں دن رات قطرہ زن[5] ہیں — پائے پُر آبلہ سے کب خار کھینچتے ہیں
دشتِ جنوں سے جب میں ناگاہ اُٹھ چلوں ہوں — دامن یکڑ کے میرا سب خار کھینچتے ہیں
ساقی بغیر جب ہم جاتے ہیں سیر کرنے — خمیازہ ہی چمن میں ہر بار کھینچتے ہیں
کیا ناسار ہیں طالع ان کے جو اس صنم کی — موے کمر سمجھ کر زنّار کھینچتے ہیں
میری اور آسماں کی ہے پیل کی لڑائی — گو لوگ درمیاں میں[6] دیوار کھینچتے ہیں

---

[1] آب دار صورت کتنے لطیف مفہوم کو ادا کرتی ہے۔ [2] شب باز کا تماشا= کٹھ پتلی کا تماشا جو رات کو دکھایا جاتا ہے۔ [3] راست خم= یہ بھی نرالی ترکیب ہے اور غالباً کچھ سیدھی کچھ خمیدہ۔ [4] اچوک= بے خطا۔ [5] قطرہ زن= قطرہ ٹپکانے والے۔ [6] دیوار کھینچنا اور پیل کی لڑائی دونوں شطرنج کی اصطلاحیں ہیں۔

وہ ہم سے گر خفا ہیں، تو ہم بھی مصحفی اب
لو ہے کی درمیاں میں دیوار کھینچتے ہیں

400

زبس کہ زلف کا تھا شب خیال میرے تئیں — تمام روز رہا ہے ملال میرے تئیں
حنا کی طرح کروں میں بھی اُس کی پابوسی — خدا نے دی نہیں اتنی مجال میرے تئیں
ہوا وہ دشمنِ جاں مارے بدگمانی کے — کسی نے گر کبھی پایا بحال میرے تئیں
تنِ نزار سے ہوں تنگ اپنی ہستی کا — کیا ہے بخت نے چینی[1] کا بال میرے تئیں
زبس کہ سوکھ کے کانٹا ہوا ہوں میں غم سے — کہیں ہیں لوگ زمیں کا ہلال میرے تئیں
بھلا تو ساتھ تو چلتا مرے جنازے کے — نہ آئی موت بھی روزِ وصال میرے تئیں
خدا ہی جانے یہ کیا رنگ ہے کہ صبح سے آج — وے انکھڑیاں نظر آتی ہیں لال میرے تئیں
کہے ہے کبک تری چال پر نظر کر کے — ہزار حیف نہ آئی یہ چال میرے تئیں
میں کیا سوال کروں اُس سے، سخت حیراں ہوں — کہ ہائے کر نہیں آتا سوال میرے تئیں
نگاہِ لطف جو اس کی کبھی ہوئی مجھ پر — تو دل میں گذرے ہزار احتمال[2] میرے تئیں
زبس کہ مستِ مئے ساغرِ تصوّف ہوں — نہیں خیالِ حرام و حلال میرے تئیں
قدم زمیں پہ نہ رکھے مجھے یہ حیرت ہے — کہ اس نے کیوں کے کیا پایمال میرے تئیں
کبھی وہ ماہ بھی آوے گا، اب کے گذرا ہے — اسی خیال میں سارا یہ سال میرے تئیں
یہ کیا سبب ہے جو آج اتنا مُنھ تھتھاتا[3] ہے — بہت خفا ہے، تو لے مار ڈال میرے تئیں

---

[1] چینی کا بال یعنی چینی کے برتن کا بال، جو شکست کی وجہ سے آجاتا ہے۔
[2] احتمال = بمعنی شکوک [3] منھ تھتھانا = خفا ہونا۔

اگرچہ مصحفی میں خارِ خشک ہوں لیکن
کیا ہے سایۂ گل نے نہال میرے تئیں

401

ہم جن بتوں کی خاطر زنّار باندھتے ہیں — وے قتل پر ہمارے تلوار باندھتے ہیں
مضمونِ زلف از بس پیچیدہ ہے، ہم اس کو — سو بار کھولتے ہیں سو بار باندھتے ہیں
ساون ہمارے آگے بے طرح مُنھ چڑھا ہے — رونے کا ہم بھی، یارو اب تار باندھتے ہیں
کیا خودنما ہیں یارو، یہ جامہ زیب لڑکے — آئینہ رکھ کے آگے دستار باندھتے ہیں
اب تک اکڑ وہی ہے ان نازنین بتوں کی — پٹکا کمر سے اپنی بل دار باندھتے ہیں
دیکھا ہے کیا، جو ہردم رفتار کو تمھاری — کبکِ دری کی شاعر رفتار باندھتے ہیں
تلوار تیری چلتی غیروں پہ کیوں کے دیکھیں — آنکھوں پہ اپنی پٹی ناچار باندھتے ہیں
تقلید سے نہ ہووے نامرد مرد ہرگز — دیکھا ہے ہیجڑے بھی ہتھیار باندھتے ہیں
آگاہ وے نہیں ہیں کہ فنِ شاعری سے — مضموں چُرا کے میرے جو یار باندھتے ہیں

جی کیوں چلا نہ جاوے ہر شعر کی ادا پر
اے مصحفی ہم اُس کی رفتار باندھتے ہیں

402

کس مست کی لوہوسی آنکھیں نظر آئی ہیں — جو یارو مری آنکھیں پھر جوش کر آئی ہیں
ہر لحظہ قدم رکھتے، پڑتی ہیں ترے پانوؤں — ان روزوں تری زلفیں کچھ راہ پر آئی ہیں
جب گھر سے تو نکلا ہے بن ٹھن کے کبھی باہر — سو منتظروں کی تب امیدیں بر آئی ہیں
کہنے کو تو چھوٹی ہیں زلفیں تری، پر تو نے — جب کھول دیا ہے تو وے تا کمر آئی ہیں

دل یار کے چنگل میں پاتا ہوں سدا اپنا — جس دن سے تری پلکیں سینے میں در آئی ہیں

جانے کی خبر میں نے جب تیری سنی ہے تب — کچھ مُنھ سے نہیں نکلا پر آنکھیں بھر آئی ہیں

جب نام ترا مُنھ سے نکلا ہے مرے، دو ہیں — پلکوں سے کئی بوندیں مُنھ پر اُتر آئی ہیں

اک وضع جو ہوتی تو ہم اُس کا بیاں کرتے — دلّی میں ہمیں لاکھوں وضعیں نظر آئیں ہیں

اب مصحفی حجرے سے نکلے ہے جو کم باہر
ان روزوں کہیں اُس کی آنکھیں مگر آئی ہیں[1]

403

مخلوق ہوں یا خالقِ مخلوق نما ہوں — معلوم نہیں مجھ کو کہ میں کون ہوں کیا ہوں

ہوں شاہدِ تنزیہہ[2] کے رخسار کا پردہ — یا خود ہی مُشاہد[3] ہوں کہ پردے میں چھپا ہوں

ہے مجھ سے گریبانِ گلِ صبح معطّر — میں عطرِ نسیمِ چمن و بادِ صبا ہوں

گوشِ شنوا ہو تو مرے رمز کو سمجھے — حق یہ ہے کہ میں سازِ حقیقت کی نوا ہوں

ہستی کو مری ہستیِ عالم نہ سمجھنا — ہوں ہست تو، پر ہستیِ عالم سے جدا ہوں

ہوں سینۂ عشاّق میں سوزِ جگر و دل — اور دیدۂ معشوقاں میں کیا ناز و ادا ہوں

یہ کیا ہے کہ مجھ پر مرا عقدہ نہیں کھلتا — ہر چند کہ خود عقدہ و خود عقدہ کشا ہوں

اے مصحفی شانیں ہیں مری جلوہ گری میں
ہر رنگ میں میں مظہرِ آثارِ خدا ہوں

404

ازبس تری ادائیں مجھ کو کُڑھاتیاں ہیں — جب دیکھتا ہوں تجھ کو، آنکھیں بھر آتیاں ہیں

---

[1] آنکھیں آنا = آشوبِ چشم اور دوسرے معنی محبت ہو جانا۔ [2] شاہدتن۔ یہہ = ذات بحت۔
[3] مشاہدہ کرنے والا، ن۲ میں ''یا خود ہی میں شاہد ہوں''۔

میں چونک چونک اُٹھوں ہوں، ناگن سی تیری زلفیں — جب آ کے خواب میں بھی مجھ کو ڈراتیاں ہیں

تم واں پڑے پھرو ہو گلیوں میں بے خبر سے — رفتار پر تمھاری یاں جانیں جاتیاں ہیں

کیوں[1] کر کے میں نہ باندھوں مضمونِ تازہ ہر دم — سو باتیں تیری آنکھیں مجھ کو سُجھاتیاں ہیں

اے مصحفی تو اس کو مت دیکھ چوری چوری
کم بخت یہ نگاہیں تہمت لگاتیاں ہیں

405

کوچے میں عافیت[2] کے کہاں بیٹھتا ہوں میں — فتنہ اُٹھے ہے ایک جہاں بیٹھتا ہوں میں

آتا ہے جو کوئی تری مجلس میں، تجھ سے، یار — کہتا ہے یہ ادب سے: یہاں بیٹھتا ہوں میں

کیا ہو گیا ہے مجھ کو، جو اس عقل و ہوش پر — تیرِ بلا کی جاے نشاں بیٹھتا ہوں میں

کہتا ہے تیرِ غمزہ یہی مجھ سے ہر گھڑی: — ہاں پہلوے شکستہ دلاں بیٹھتا ہوں میں

صیدِ مراد کی ہی کمیں گاہ میں مدام — راتوں کو لے کے تیر و کماں بیٹھتا ہوں میں

مضمونِ بے دماغیٔ عالم پہ کر نظر — پردے میں بوے گُل کے نہاں بیٹھتا ہوں میں

دل رُک گیا ہے سب سے مرا اب تو مصحفی
دروازہ بند کر کے میاں بیٹھتا ہوں میں

406

ہم ترے کوچے سے ناچار چلے جاتے ہیں — جی تو کرتا نہیں جانے کو وَلے جاتے ہیں

چال چلتا ہے مری جان تو اُٹھکھیلی سے — دل ترے پانْو تلے مفت ملے جاتے ہیں

آنسوؤں کا مجھے اپنے ہے نہایت افسوس — خاک کے بیچ یہ موتی سے رَلے[3] جاتے ہیں

---

[1] ن۲،۴: کس طرح میں نہ باندھوں [2] عافیت بغیر تشدید یا نظم ہوا ہے۔

[3] محمد حسین آزاد نے ''رلنے'' پر بھی اعتراض کیا ہے (ملاحظہ ہو: آبِ حیات/ ۳۱۶) ہم نے مصحفی کی زبان سے تفصیلی بحث مقدمے میں کی ہے، رجوع کنید بآں۔

دیکھ زخمی مجھے اُس تیغ کا ڈر کے مارے — سامنے سے مرے احباب ٹلے جاتے ہیں
جی میں کیا اُن کے دمِ نزع گذرتی ہو گی — یاں سے جاتے ہوئے جو حسرتیں لے[1] جاتے ہیں
کیا تماشا نظر آتا ہے اُنھیں حیراں ہوں — یار کیوں خاک کے پردے میں چلے جاتے ہیں
میں ہی مُنھ ڈھانپ کے روتا نہیں کچھ، میرے لیے — آنسو واں اُس کے بھی برقع میں ڈھلے جاتے ہیں
ایک عالم کا گذرگاہ ہے دروازۂ مرگ — جس میں ہو کر کے برے اور بھلے جاتے ہیں

کیوں کے اس آتشِ سوزاں کے مقابل رہیئے
مصحفی اپنے تو تیور ہی جلے جاتے ہیں

407

غیر کے گھر تو نہ رہ رات کو مہمان کہیں — تا نہ اس بات کا چرچا ہو، مری جان کہیں
اب تلک غنچے کی گردن ہے جھکی خجلت سے — اُس نے دیکھی تھی تری گوے گریبان کہیں
رازِ دل اس سے کہا میں تو و لے یہ ڈر ہے — کہ مرے راز کو کہہ دے نہ وہ نادان کہیں
اے پریشانیٔ زلفِ صنمِ کافر کیش — کیجیو تو نہ مرے دل کو پریشان کہیں
دل کی بے چینی سے میں سخت تنگ آیا ہوں — چین پڑتا ہی نہیں ہے اسے اک آن کہیں
دھانی جوڑے نے ترے کھیت[2] رکھا ہے مجھ کو — سبز رنگ اتنے تو دیکھے نہیں ہیں دھان کہیں
منع کس واسطے کرتا ہے میں تیرے صدقے — عید کے دن تو مجھے ہونے دے قربان کہیں
دردِ دل جا کے میں کہہ لوں ابھی در کے نزدیک — ایک ساعت کو ہی اُٹھ جاوے جو دربان کہیں

مصحفی ایک غزل اور بھی میں لکھتا ہوں
یہ تو بیتیں کئی میں نے بہت آسان کہیں

408

بال بکھرے ہیں کہیں، زلف پریشان کہیں — یارو از بہرِ خدا دیکھی ہے یہ آن کہیں

---

[1] یہ قافیہ غور طلب ہے [2] کھیت کر دینا (کھیت رکھنا) = مار رکھنا، چت کر دینا۔

قتلِ عاشق پہ کمر باندھ نہ، آجانے دے   بانکپن خوب نہیں اتنا، کہا مان کہیں
ایسا دیوانہ رکھے جامے کا اپنے کیا ہوش   جس کا دامن ہو کہیں اور گریبان کہیں
کیا فسوں پڑھ کے خدا جانے کھلا دے تجھ کو   غیر کے ہاتھ سے تو کھائیو مت پان کہیں
تو تو اس شہر سے جاتا ہے ولے یہ ڈر ہے   ہووے جانے سے ترے شہر نہ ویران کہیں
خلشِ دل کے ہیں آثار بُرے، ڈرتا ہوں   رہ گیا ہو نہ ترے تیر کا پیکان کہیں
کب تلک کوہ و بیاباں میں پھروں میں اے کاش   جستجو ہی میں نکل جاوے مرا جان کہیں
خط لکھا آپ نے میرے تئیں بے سرنامہ[1]   خط کے لکھنے کا بھلا ہو ہے یہ عنوان کہیں
کیا کروں دردِ محبت کی دوا[2] حیراں ہوں   مجھ کو ملتا نہیں اس درد کا درمان کہیں
آئینے میں تو بہت اپنی طرف دیکھے ہے   دل کو اپنے نہ گنوا بیٹھیو نادان کہیں
ابر کی طرح سے آتے ہیں بھرے دیدۂ تر   مجھ کو یہ ڈر ہے کہ لاویں نہ یہ طوفان کہیں
اک ذرا خاکِ شہیداں سے سنبھل کر چلنا   دیکھیو خوں میں نہ ڈوبے زہ داماں کہیں

مصحفی کے تئیں تم قتل عبث کرتے ہو
پیدا ہوتے ہیں بھلا ایسے بھی انسان کہیں

409

گر ہو طمنچہ[3] بند وہ رشکِ فرنگیاں   بانکے مغل بچے نہ کریں خانہ جنگیاں
شوخی مزاج اس کے سے اب تک گئی نہیں   ویسے ہی بانکپن ہیں، وہی غولہ دنگیاں[4]
بلبل کے اشکِ سرخ نے یہ کیا غضب کیا   جو تیلیاں قفس کی سبھی خوں میں رنگیاں
گردوں اگرچہ دن کو غزالِ سیاہ ہے   پر شب کو میرے ساتھ کرے ہے پلنگیاں[5]

---

[1] سرنامہ = پتا یا القاب۔ خط کے اوپر لکھی جانے والی عبارت [2] ن ا: کا دوا
[3] طمنچہ بند = طمنچے سے لیس۔ [4] غولہ دنگی = شرارتیں
[5] پلنگیاں کرنا = غالباً پلنگ (شیر) سے مشتق ہے مراد ڈرانا۔

دیکھا نہ ہوگا وہ کبھی بیون[1] نے چاہ میں — جو دن مجھے دکھاتی ہیں قسمت کی تنگیاں
عارض پہ تیرے جوششِ خطِ سیاہ ہے — یارو م پر چڑھ آئی ہے یہ فوجِ زنگیاں
کیا جانے کس سے بگڑی ہے دریا میں مصحفی
لہروں کے ہاتھوں[2] میں ہیں جو تلواریں ننگیاں

و

410

اس گفتگو کا اور ہی انداز ہے، سنو — پردے میں نُہ فلک کے یہ آواز ہے، سنو
بسم اللہ کتابِ دوعالم ہے حرفِ عشق — اس قصّے کا یہیں سے تو آغاز ہے، سنو
تنہا نہ حق کو سوٗلی پہ منصور کہہ گیا — ہر ذرّے کی زباں پہ یہی راز ہے، سنو
کنجِ قفس میں دیکھ کے کہتی ہے مجھ کو خلق — اس مرغ کو بھی حسرتِ پرواز ہے، سنو
بے اعتنائی خوب نہیں اتنی، میری جان — نالے کو ٹک مرے بھی، یہ کیا ناز ہے، سنو
مرغِ چمن تو بولے ہی ہے اس بہار میں — مرغِ قفس بھی زمزمہ پرداز ہے، سنو
دیکھو نہ مصحفی کی غزل کو بہ چشمِ کم
اے یارو یہ تو سحر ہے، اعجاز ہے، سنو

411

دل ہے لبِ ریزِ تمنا، دیکھیو — مے سی چھلکے ہے، یہ مینا دیکھیو
چشم و ابرو عالمِ تصویر ہے — اُس بتِ کافر کا نقشا دیکھیو
سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں، تو کہے — ان خوش اندامو ں کے اعضا دیکھیو

---

[1] بیون = شاہ نامہ فردوسی کا ایک کردار [2] ن۴: ہاتھ۔تلوار

اُٹھ گیا گر اس کے مکھڑے سے نقاب تم مرا اس دم تماشا دیکھیو

مصحفی، رو پاتے ہی اس شوخ کا
لگ چلا ہے اُس سے کیسا دیکھیو

412

آتا ہے کس انداز سے، ٹک ناز تو دیکھو کس دھج سے قدم پڑتا ہے، انداز تو دیکھو

طاؤسِ پری جلوہ کو ٹھکرا کے چلے ہے اندازِ خرامِ بتِ طنّاز تو دیکھو

یک جنبشِ لب اُس کی نے، لاکھوں کو جلایا عیسیٰ کو یہ قدرت تھی، تم اعجاز تو دیکھو

کرتا ہوں میں دزدیدہ نظر گر کبھی اس پر نظروں میں پرکھ لے ہے، نظرباز تو دیکھو

میں کنگرۂ عرش سے پر مار کے گذرا اللہ رے رسائی، مری پرواز تو دیکھو

اے وائے کہ اس سعی پر اپنی، کبھی اُس سے سازش[1] نہ ہوئی، طالعِ ناساز تو دیکھو

کیا بولنے میں اس بتِ کافر کی ادا ہے شیریں سخنی اک طرف، آواز تو دیکھو[2]

ابتر ہے یہ دیواں تو میاں مصحفی سارا
انجام کی کیا کہتے ہو، آغاز تو دیکھو

413

بہارِ گل کی خوبی ہم دل افگاروں سے مت پوچھو
مزہ گل گشت کا گلشن کے بیماروں سے مت پوچھو

ہزاروں طرح دل لینے کے تئیں، آغازِ الفت میں
جو آفت ہم پہ آئی ان طرح داروں سے مت پوچھو

---

[1] سازش = موافقت [2] آواز کے لیے دیکھنا، مصحفی نے بھی استعمال کیا، مگر بات بنی نہیں بولنے کی ادا دکھا رہے ہیں، آواز تو نظر نہیں آئی مگر مومن نے واقعی دکھا دی: شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو۔

رہائی نام ہے کس چیز کا اور کس کو کہتے ہیں
یہ بات، اے دوستاں ہم سے گرفتاروں سے مت پوچھو

تجلّی نام شعلہ رات اس گلشن میں دائر تھا
پڑی پھولوں پہ بجلی کس کے رخساروں سے مت پوچھو

مرا جی جانتا ہے یا میں جانوں ہوں، وہ کیا جانیں
جو غم گذرے ہے مجھ پر میرے غم خواروں سے مت پوچھو

کہا اک بار میں نے حالِ دل اپنا میاں تم سے
یہ کیا خو، ہے تمھاری اتنی تکراروں سے مت پوچھو

جو کچھ ہم پر گذرتی ہے وہ پوچھو ہم سے کہہ دیں گے
خدا کے واسطے ان کبک رفتاروں سے مت پوچھو

حسن[۱] کا شعر ہے میاں مصحفی، کیا حسب حال اپنے
سنو تو ہم سے اس کو خانماں[۲] داروں سے مت پوچھو

گئے وے دن جو رہتے تھے جہاں آباد میں ہم بھی
خرابی[۳] شہر کی صحرا کے آواروں سے مت پوچھو

414

گر اپنا حال غم سے ترے تنگ ہے تو ہے — آنکھوں کا اشکِ سرخ سے یہ رنگ ہے تو ہو

اپنے تو گھر میں نالہ وزاری ہے روز و شب — مجلس میں اس کی شغلِ نے وچنگ ہے تو ہو

تیغِ جمال کو نہ لگے تیری مورچہ[۴] — گر دل کے آئینے پہ مرے زنگ ہے تو ہو

---

۱ میر حسن حسنؔ دہلوی مصنف مثنوی سحرالبیان مراد ہیں۔ ۲ ن۳: اس کی ۳ ن۱: خراب شہر۔

۴ مورچہ لگنا= تلوار پر ریگ کے باریک سیاہ دانے پڑ جاتے ہیں، غالباً یہی مراد ہے اور یہ خط عارض کے لیے استعارے کے طور پر آیا ہے۔

ہم بت کے پوجنے کو سمجھتے ہیں اپنا فخر
اس سے خدا پرستوں کو گر ننگ ہے تو ہو

کعبے کا جانا فرض نہیں ہم کو مصحفی
کعبہ جو ہم سے سیکڑوں فرسنگ ہے، تو ہو

415

بس کہ سر تا بہ قدم مائلِ بیداد ہے سرو
غم میں اس قد کے اک آہِ دلِ ناشاد ہے سرو

قدکشاں باغ میں جس روز کہ وہ آیا تھا
ہائے وہ[1] روز قیامت کا تجھے یاد ہے سرو

بند ہے خاکِ چمن سے رگ و ریشہ اس کا
پُر غلط ہے یہ جو کہتے ہیں کہ آزاد ہے سرو

حق تعالیٰ تجھے اس باغ میں سرسبز رکھے
تیرے قدموں ہی کی دولت[2] چمن آباد ہے سرو

جوشِ خوں کا مرے ہوتا نہیں اس پر بھی علاج
گرچہ ہر برگ ترا نشترِ فصّاد ہے سرو

رو دیا میں نے جو قمری نے کہا وقتِ سحر
بھر کے اک آہ، "ترے ہاتھوں سے فریاد ہے سرو"

گرچہ ہر نخل جدا باغ میں سر کھینچے ہے
پر جو دیکھا تو قیامت تری اِستاد ہے سرو

ہے غلط قد کو ترے سرو سے نسبت دینا
سایہ قد کا ترے، اے شوخِ پری زاد ہے سرو

کیجو آزردہ نہ قمری کو، ترے سر پر سے
اُڑ گئی وہ، تو یہ خوبی تری برباد ہے سرو

قدِ نوخیز کو اس سرو کے کب پہنچے ہے
گرچہ رعنائی میں اے مصحفی اُستاد ہے سرو

416

آج جو صبح سے تم چیں بہ جبیں بیٹھے ہو
بے جگہ رات مگر جا کے کہیں بیٹھے ہو

ہو جفا جوئیِ گردوں سے جو اتنے غافل
ایسے کس فکر میں اے اہلِ زمیں، بیٹھے ہو

---

[1] ن۳: اس روز قیامت کا۔ [2] تیرے قدموں کی دولت = بدولت

کہیں دیکھا ہے یہ غم، تم بھی تو آخر، یارو — سالہا باغم و اندوہ قریں بیٹھے ہو
مر گیا کون سا دل سوز تمھارا عاشق — کس کے ماتم میں مری جان، حزیں بیٹھے ہو
تم گرفتاریٔ خاطر کو میاں کیا سمجھو — ابھی روزِ بد عاشق میں نہیں بیٹھے ہو
حلقۂ بزم کی نت زیب رہی ہے تم سے — تم جہاں بیٹھے ہو واں مثلِ نگیں بیٹھے ہو
کوچۂ یار میں کل چھوڑ گیا تھا تم کو — آج دیکھا تو اُسی طرح غمیں بیٹھے ہو

میں یہ جانا تھا کہیں گھر کو سدھارے ہو گے
کیا میاں مصحفی، تم تب کے یہیں بیٹھے ہو

417

اپنی پیشانی پہ تم مالشِ صندل نہ کرو — دردِ سر مجھ کو نہ دو، جی مرا بے کل نہ کرو
کیا قیامت ہے کہ تم خون کرو عالم کا — اور نظر جانبِ رنگینیٔ مقتل نہ کرو
تیرہ روزی کو مری سُرمہ کفایت[1] ہے میاں — ٹک خدا ہی سے ڈرو، آنکھوں میں کاجل نہ کرو
حاکمِ شہر اگر میں ہوں تو اتنا کہہ دوں — کہ کوئی شہر میں آئینے کو صیقل نہ کرو
میں بھی موجود ہوں اور تم بھی ہو، یہ تیغ، یہ طشت[2] — قہر ہے اب بھی جو جھگڑا مرا فیصل نہ کرو

یا علی مصحفی پھر جائے بھلا کس کے پاس
اُس کی مشکل کے تئیں تم ہی اگر حل نہ کرو

418

رہنے دو مرے سینے میں، پیکاں کو نہ چھیڑو — از بہرِ خدا ناوکِ جاناں کو نہ چھیڑو

---

[1] کفایت ہے = کافی ہے [2] غالبؔ: آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا
یہ خیال مصحفی پہلے ہی نظم کر گیا ہے۔ غالبؔ نے صرف تیغ و کفن اور عذر کی رعایت سے نیا پن پیدا کر لیا ہے۔ فارسی میں باتیغ و کفن آمدن یا آوردن کا مفہوم عذر خواہی کے لیے آنا یا لانا بھی ہے۔

ٹک رحم کرو چاک گریبان پہ میرے — یارو کوئی اس شوخ کے داماں کو نہ چھیڑو
اس دھوم سے آئی ہے بہار اب کی کہ ہر سُو — قدغن ہے کہ برگِ گل و ریحاں کو نہ چھیڑو
یہ وہ نہیں ناسور کہ ہو بند کسی سے — رہنے دو مرے دیدہ گریاں کو نہ چھیڑو
خاطر کو پریشاں نہ کرو اور بھی میری — ہر لحظہ، میاں زلفِ پریشاں کو نہ چھیڑو
روٹھا ہوں جو میں اس سے تو من لوں گا پھر آپھی[1] — جاؤ، کوئی مجھ تازہ پشیماں کو نہ چھیڑو
وہ فتنہ نہیں[2] ہے وہ کہ تہمت نہ لگا دے — ہر چند کہ اس فتنۂ دوراں کو نہ چھیڑو
اے ناصحو کچھ فکر کرو چاکِ جگر کا — بیہودہ مرے چاکِ گریباں کو نہ چھیڑو
زلفیں تری زاہد سے الجھتی ہیں، تو آنکھیں — کہتی ہیں کہ اس مردِ مسلماں کو نہ چھیڑو
دُکھتا ہے یہ دل اور بھی، فریاد کرے ہے — مت ہاتھ لگاؤ دلِ نالاں، کو نہ چھیڑو

رہنے دو پڑا مصحفیؔ خاک بہ سر کو
اس غم زدۂ بے سر و ساماں کو نہ چھیڑو

419

زلفوں کو کیوں کیا ہے پریشان یہ کہو — کیا مدّعا ہے اس سے مری جان، یہ کہو
باراں سے میرے اشک کو نسبت نہ دو کوئی — نازل ہوا ہے عرش سے طوفان یہ کہو
اب تک ہے انکھڑیوں میں تمھاری خمار سا — کس کے رہے تھے رات کو مہمان یہ کہو
دیر و حرم کی راہ میں حیراں ہے میری عقل — جاؤں کدھر کو گبر و مسلمان یہ کہو
کس پر بجی ہے تم نے میاں تیغ خوش غلاف — ہے ایسا کس کے قتل کا سامان یہ کہو
اس خستہ دل کو دوکھتے[3] ہو تم جو دوستو — دیکھی ہے اُس کی جنبشِ مژگان یہ کہو
جاؤں چمن میں اب کی تو پوچھوں گلوں سے میں — کس پر ہوئے ہو چاک گریبان یہ کہو

---

[1] ن ۳: آپی پھر [2] ن ۲: وہ فتنہ نہیں ہے کہ وہ تہمت نہ لگا دے۔ [3] دوکھنا= قسوروار ٹھہرانا

نکلے ہو آج آئینہ خانے سے بے حواس　　نظروں میں کُھب گئی ہے کوئی آن یہ کہو
نرگس کی طرح نکلے ہے اک تم سے رفتگی　　اے دیدہ اتنے کس کے ہو حیران یہ کہو
آخر تمھارے، ناز کا کشتہ ہے مصحفی
کیوں ہو گئے ہو جان کے انجان یہ کہو

420

ہمارے حال پر اس کی نگاہ کیوں کر ہو　　الٰہی دیکھیے عفوِ گناہ کیوں کر ہو
خدا نے تجھ کو بنایا ہے سنگ دل، اے بت　　بھلا کسو کی ترے دل میں راہ کیوں کر ہو
نہ در سے جھانکے کبھی وہ[1] نہ بام پر آوے　　ہماری اس کی ملاقات آہ کیوں کر ہو
جہاں کہ ہو دمِ شمشیرِ تیغ تیز بلند　　زباں بُریدہ کوئی داد خواہ کیوں کر ہو
تمھیں تو غیروں سے الفت ہے، تم ہو ہرجائی　　تمھارے ساتھ ہمارا نباہ کیوں کر ہو
ہنوز ملنے کی صورت نظر نہیں آتی　　اس آرزو میں بسر سال و ماہ کیوں کر ہو
یہ کیا سبب ہے میاں مصحفی، بتاؤ تو
تم اس گلی میں بحالِ تباہ کیوں کر ہو

421

تو کہے[2] سو بار اگر اپنی زباں سے دور ہو　　یہ نہیں ممکن فقیر اس آستاں سے دور ہو
ہجر میں اُس بے وفا کے مجھ پہ جو گذرے ہے ہائے　　یہ وہی جانے جو اپنے دل ستاں سے دور ہو
گو کہ دن ہووے بڑا، پر ایسی منزل کے تئیں　　کس طرح پہنچے جو کوسوں کارواں سے دور ہو
قصۂ دردِ غریبی اُس سے پوچھا چاہیے　　موسمِ گل میں جو اپنے آشیاں سے دور ہو

---

[1] ن۲: اور نہ　　[2] ن۲: تم کہو

کل گیا تھا اس کے کوچے میں، وہ مجھ کو دیکھ کر غصہ ہو کہنے لگا یوں: چل بے یاں سے دور ہو
گو نہ اُٹھے تو نہ اُٹھے اُس کے چہرے سے نقاب یہ حجابِ چشم یارب درمیاں سے دور ہو
مصحفی تو مر بھی نہیں جاتا کہ تا اے ننگِ عشق
نامِ بدنامی کہیں اس دودماں سے دور ہو

422

آ بھی اُکتا کے جو تیرے آستاں سے دور ہو تو نہ کہہ، پیارے اُسے اپنی زباں سے دور ہو
کس طرح وہم وگماں میں آدمی کے آ سکے وہ منزّہ ذات جو وہم وگماں سے دور ہو
یاس کو اُس بُلبلِ بے پر کی دیکھا چاہیے آتشِ گل جس کے کچھ اک آشیاں سے دور ہو
کیوں نہ راتوں کے تئیں، اے ماہ تیرا مُنھ تکے جو کوئی اپنے مہِ نا مہرباں سے دور ہو
ہے مرے سینے میں آتش دل کے ہاتھوں سے بھری چین سے سووں جو یہ دل درمیاں سے دور ہو
ایک تنکا بھی نہ ڈھونڈا پایئے، افسوس ہے آشیاں بلبل کا یوں اس گلستاں سے دور ہو
مصحفی روے زمیں پر یوں نہیں رہنے کا لطف
آسماں کو دور کر یا آسماں سے دور ہو

423

نے وہ آپ آوے، نہ قاصد درمیاں سے دوٗر ہو دل کی بیتابی مری یارب، کہاں سے دوٗر ہو
اس بیاباں میں الٰہی قیس کا ہووے گذار جس بیاباں میں کہ ناقہ ساریاں سے دوٗر ہو
کب روا ہے یہ کہ ایسی فصلِ گل میں، باغباں بلبلِ بے چارہ اپنے آشیاں سے دوٗر ہو
میں جو کھینچوں ہوں بغل میں اُس کو، یوں بھاگے ہے وہ جیسے کھنچ کر تیر آغوشِ کماں سے دور ہو
جس نشاں پر تیر پھینکے تک[1] کے وہ ابرو کماں کیا عجب داغِ سیاہی اس نشاں سے دور ہو

---

[1] تک کے = تاک کے

پان کھا کر وہ بتِ رنگیں ادا، اے مصحفی قطعہ مجھ سے کل کہتا گیا یوں تو بھی یاں[1] سے دور ہو

اب[2] کے گر آیا تو میں بھی مُنھ سے اس کے مُنھ لگا

ایسے بوسے لوں کہ سرخی رنگِ پاں سے دوٗر ہو

424

هم جی سے خفا بیٹھے ہیں، آؤ نہ اِدھر کو[3] — تلوار لیے ہاتھ میں جاتے ہو کدھر کو

ڈرتا ہوں کہ گرد آپ کے دامن پہ نہ بیٹھے — ٹھکراتے ہوئے چلتے ہو اس خاک بسر کو

تختہ ہو چمن کا، مرا ہر تختۂ دامن — دامن میں اگر جمع کروں لختِ جگر کو

کاکل کی ترے یاد میں رویا ہی کروں ہوں — کھل جاتی ہے جب آنکھ مری پچھلے پہر کو

محبوبوں کا ازبس کہ تو محبوب ہوا ہے — لپٹے ہے تری زلف بھی اب تیری کمر کو

جب مل گیا مُنھ پھیر لیا اُس کی طرف سے — نالے سے مرے ننگ رہا بس کہ اثر کو

یوں لختِ دل اور اشک ہیں مژگاں پہ مری جمع — اک تاگے میں جو دیویں گرہ لعل و گہر کو

گھایل کا ترے داغ نگہبان ہے جس طرح — زخمی کے گلے باندھیں ہیں طاؤس[4] کے پر کو

گھر جانے کا مت نام لے، جی دھڑکے ہے میرا — میں خاک رہوں گا تو اگر جائے گا گھر کو

تیرے لب و دنداں کی مزے داریاں، پیارے — ڈرتا ہوں کہ رسوا نہ کریں شیر و شکر کو

اے مصحفی میں آہ کی سوزن سے شبِ وصل

کرتا ہوں رفو چاکِ گریبانِ سحر کو

425

نامِ عشق اب تو لیا اس میں بھلا ہو یا نہ ہو — خود وفا کرنی ہمیں، اُس میں وفا ہو یا نہ ہو

---

[1] ن۲: چل بے یاں سے [2] ن۳: لیک گر آیا۔ ن۲: مُنھ سے منھ اس کے۔

[3] ن۲: آؤ نہ ادھر کاٹ لو سر سے مرے تن کو، تلوار لیے الخ

[4] یہ کوئی ٹونکا ہے، قدیم زمانے میں ایسا ہوتا ہوگا۔

خوب رذلڑکے کا ہم کوٹک نظر آنا ہے شرط　　پھر تو دو دو باتیں کرنی، آشنا ہو یا نہ ہو

وے نہیں کچھ ہم کہ بھاگیں دیکھ کر انبوہِ خلق　　ہم کو بھی جا بیٹھنا، محبس میں جا ہو یا نہ ہو

ہائے رے زلفیں تری اور ہائے رے وہ لمبے بال　　دیکھ[1] کوئی ان کو گرفتارِ بلا ہو یا نہ ہو

جب کہ تو گالی سوا پیارے کرے ہرگز نہ بات　　تو ہی کہہ باتوں سے تیری جی بُرا ہو یا نہ ہو

ڈھب کدھب اُس کو لگانی تیغ ہر دم مصحفی
اس میں سر مقتول کا تن سے جدا ہو یا نہ ہو

426

مجھے کر قتل ناحق آپ کو بدنام کرتے ہو　　میاں کیوں کھینچتے ہو تیغ کو، کیا کام کرتے ہو

دکھاتے ہو اگر گاہے سرِ دیوار سے مکھڑا　　تو پھر وہیں نہاں جوں آفتاب بام کرتے ہو

ستم کرتے ہو اور بیداد یہ ہم روسیاہوں پر　　کہ زلفوں کو نقابِ عارضِ گلفام کرتے ہو

نگاہیں تو بہم لڑیاں ہیں پر کچھ شرم کے مارے　　نہ ہم پیغام کرتے ہیں، نہ تم پیغام کرتے ہو

تمھیں اے دیدہ و دل آفریں اپنی تو کیا کہیے　　خیال اک ایسے ہی وحشی کا ہر شب رام کرتے ہو

جو ملنا ہے تو اک شب مصحفی سے آ کے مل جاؤ
میاں جھوٹی یہ کیا ہر روز صبح و شام کرتے ہو

427

زبس آٹھوں پہر گھیرے ہی رہتی ہے حیا تجھ کو　　نہیں پاتا میں اپنے ساتھ ہرگز آشنا تجھ کو

حرم میں جاوے اے محرم، تو اتنا اس سے کہہ دیجیو　　پسِ دیوار بیٹھا کوئی دیتا ہے دعا تجھ کو

ترا کشتہ ہوں میں اے نونہالِ باغِ رعنائی　　کہ اس بوٹے سے قد پر کتنی پھبتی ہے قبا تجھ کو

مرے دل کی پریشانی کو سمجھے اپنی زلفوں سے　　نہیں اتنا بھی ہوش، اے دشمنِ جاں کیا بھلا تجھ کو

---

[1] ن۲: دیکھ دل ان کو۔

رہا ویسا ہی بیگانہ، تو نامِ آشنائی سے ۔۔۔ نہ لائی آہ میری بر سرِ مہر و وفا تجھ کو
بہ ایں بے پردگی ہے گر یہ تیرا بام پر آنا ۔۔۔ تو رسوا کر رہا ہے ایک دن یا مجھ کو یا تجھ کو
ہمارے دل کی آسایش نہ چاہی، ہائے کیا ہوتا ۔۔۔ جو ساتھ اس حسن کے ٹک رحم بھی دیتا خدا تجھ کو
دیا ہاتھوں پر اس کے عاشقانہ تو نے جا بوسہ ۔۔۔ نہ آئی شرم خونِ دل سے میرے، اے حنا تجھ کو

کہیں اے مصحفی رسوا نہ ہو تو مجھ کو یہ ڈر ہے
پڑا ہے بے طرح[1] سے دیدہ بازی کا مزہ تجھ کو

428

جاتا تھا سرِ رہ سے چلا صبح کہیں کو ۔۔۔ سر پیٹ لیا دیکھ کے میں اُس کی جبیں کو
آنکھوں سے مری حسرتِ نظارہ نے تیری ۔۔۔ کر آب، بہایا نگہِ باز پسیں کو
اے دیدہ تجھے قدر ہے کیا لختِ جگر کی ۔۔۔ کیوں ہاتھ سے کھوتا ہے سلیماں[2] کے نگیں کو
ہر چند میں سو پردے میں تقریرِ سخن کی ۔۔۔ پر کوئی نہ سمجھا مری آوازِ حزیں کو
اے وائے کہ آ رہتا ہے اک ٹکڑا جگر کا ۔۔۔ جب پونچھوں ہوں دامن سے میں اس چشمِ نمیں[3] کو
کچھ جذبِ محبت سے نہیں دوُر جو رقصاں ۔۔۔ لاوے بہ حرم، راہبِ بُت خانہ نشیں کو

اے مصحفی رشحِ قلمِ نادرِ فن سے
ٹک اور بھی سرسبز کر اس تازہ زمیں کو

429

گو مجھ پہ فلک تیز کرے خنجرِ کیں کو ۔۔۔ جیتے تو نہ چھوڑوں گا میں اُس مہر جبیں کو

---

[1] ن۲: بے طرح پہ [2] نگیں سلیماں = تلمیح ہے، کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان پیغمبر کی انگوٹھی میں جو نگینہ تھا اُسی کے سبب جن و پری مسخر تھے۔ ن۳، ۴: تو ہاتھ سے کھوتا ہے الخ
[3] یہ چشم نمیں کی ترکیب بھی مصحفی کا حصہ ہے۔

یہ حسن وہ شعلہ ہے کہ گر سر کو اُٹھاوے پروانہ بناوے پرِ جبریلِ امیں کو
کیا دوُر رہے کچھ اُس سے، تری چشم کی گردش اک پل میں جو چاہے تو اُلٹ دیوے زمیں کو
پیار آتا ہے جب دل میں تو سوچوں ہوں یہی میں بوسہ ترے رخسار کو دیجے کہ جبیں کو
اے شوقِ سفر اس کی خبر ہم کو بھی کیجو گریاں سے کوئی قافلہ جاتا ہو کہیں کو
باندھا ہے، مری جاں یدِ قدرت نے خدا کے ہر چین میں کاکل کی ترے، نافۂ چیں کو
زیبندہ ہے یوں لختِ جگر اشک کے نیچے جیسے کہ جلا ڈانک سے ہوتی ہے نگیں کو
اے مصحفی دلّی میں بہ اعجاز مسیحا
خامے نے ترے پھر کے جلایا ہے حزیں[1] کو

430

کیا حسن سے اُس کے ہو خبر اہلِ زمیں کو سورج نے بھی دیکھا نہیں جس پردہ نشیں کو
حکّاک[2] نے جب باد[3] دیا نام ہمارا آزردہ کیا بر سرِ ہر حرف نگیں کو
کیا تابِ کبوتر جو مرے نامے کو لے جائے واں طاقتِ پرواز نہیں روح الامیں کو
گھبراتا ہے جب جی تو یہی آتا ہے دل میں سر پیٹ نکل جایئے بستی سے کہیں کو
میں دم بخود اُس کوچے سے گذرا کہ مبادا پہچان لے دشمن مری آوازِ حزیں کو
یہ اس سے نکوتر ہے تو وہ اس سے نکوتر رخسار کو ہم اس کے سراہیں کہ جبیں کو
اے مصحفی ہے خوف مجھے آہ کا تیری
لاوے نہ تزلزل میں کہیں عرشِ بریں کو

---

[1] مراد شیخ علی حزیں اصفہانی، فارسی کا مشہور شاعر، جس کا مزار بنارس میں ہے۔
[2] حکاک = جوہر فروش، سنار، (لفظی معنی ہیں = بہت زیادہ رگڑنے والا، کسوٹی پر کسنے والا۔
[3] باد دینا = کندہ کرنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

431

ٹک مرے حال پر نظر تو کرو　　کوئی جاؤ اُسے خبر تو کرو
اور ہی انداز کا ہے یہ رونا　　ابر اس طرح چشم تر تو کرو
صفِ مژگاں کے سامنے، یارو　　ہونا ہو وے سو ہو جگر تو کرو
بات کہتا ہوں تم سے، سنتے ہو　　ٹک میاں جان مُنھ اُدھر تو کرو
سوچتے کیا ہو، خوب ہووے گا
مصحفیؔ یاں سے تم سفر تو کرو

432

اے دل اک روز ہم اپنا بھی جگر دیکھیں تو　　تیرِ مژگاں کا ہدف سینے کو کر دیکھیں تو
ابر سے آج مجھے دعویٔ خوں باری ہے　　رنگ کیا لاتے ہو، اے دیدۂ تر دیکھیں تو
میں اِدھر یار کا خواہاں ہوں، اُدھر تو اے دل　　کون لے جاوے اسے کھینچ کے گھر دیکھیں تو
کب کے مشتاق ہیں کیسی ہے، کدھر ہے، کیا ہے　　ٹک ادھر آ تو تری ہم بھی کمر دیکھیں تو
مصحفیؔ طبعِ رواں برسرِ دُر ریزی ہے
اور بھی فکر ٹک اس بحر میں کر دیکھیں تو

433

شام تک کرتی ہے تو کیوں کے اثر دیکھیں تو　　ہم بھی شیخی تری، اے دیدۂ تر دیکھیں تو
ڈھب میں آجائے تو آجائے وہ شب چوری سے　　اس کے پانوں پہ ذرا ہاتھ کو دھر دیکھیں تو
لالہ ہے شعبدہ بازی پہ چمن میں، ہم آج　　گُل کِھلانا ترا، اے داغِ جگر دیکھیں تو
تیرِ مژگاں ترے سورج سے یہی کہتے ہیں　　ہم ذرا آج یہ تیری بھی سپر دیکھیں تو
کرتے ہیں دعویٔ اعجازِ مسیحا لبِ یار　　کیا تعجب ہے جلا دیں کبھی مر دیکھیں تو

ہم بھی موجود ہیں اور اتنے اسیر اے قاتل — کون رکھتا ہے تلے تیغ کے سر دیکھیں تو

دشت میں بھی نہ ملا مصحفیؔ آوارہ
کبھی آیا ہو بھلا[1]، پھر اُسے گھر دیکھیں تو

434

اوروں پہ نہ نیچہ نکالو — یوں چاہو تو ہم کو مار ڈالو

تیار ہوا ہے قافلہ سب — پھر دیر یہ کیا ہے چلنے والو

یہ طرفہ کہ ہم کو ہی کرو قتل — اور اُلٹا ہمیں سے خوں بہا، لو

یوں گذریں ہیں خاکِ کشتگاں سے — دامن کو تو اپنے ٹک سنبھالو

کیا اپنی کہو ہو ٹک سنو تو — باتوں میں نہ میری بات ٹالو

تم وے ہو کہ جس کے دل کو چاہو — نظروں میں میاں[2] وہیں چُرا لو

لازم ہے کہ سب کے روبرو ہو — اور پردے میں ہم سے منھ چھپا لو

اے مصحفیؔ دوست دار آخر
روٹھا ہے تو اُس کو جا منا لو

435

ایک تو بیٹھے ہو دل کو مرے کھو اور سنو — تس پہ کہتے ہو: "دیا ہے تجھے" لو اور سنو

مے پیو آپ، جو دیویں مجھے تلچھٹ احباب — اُن سے کہتے ہو: اسے خاک نہ دو اور سنو

قصہ اپنا تو میں سب تم سے کہا: اے یارو — چپکے کیوں بیٹھے ہو کچھ تم بھی کہو اور سنو

چٹکیاں لیتے ہو جب پاس مرے بیٹھو ہو — آپ نے زور نکالی ہے یہ خو اور سنو

سِتم طرفہ تو یہ ہے کہ مجھے روتا دیکھ — ہنس کے کہتے ہو: ذرا اور بھی رو اور سنو

---

[1] بھلا = شاید [2] ن۳: وہ ہیں میاں

ابھی دفتر ہیں بغل میں مری، اے ہم نفسو　　ایک ہی بات میں اتنا نہ رُکو[1] اور سنو

مصحفی ڈر نہیں میرے تئیں رسوائی سے
بات اپنی مجھے کہنی اُسے گو اور سنو

436

بزم ہو، یار ہو اور شغلِ مے و جام بھی ہو　　پھر تو خطرے ہیں جو ایسے میں یہ ناکام بھی ہو

ہائے کیا صبر کروں، میں تو موا جاتا ہوں　　دلِ بیتاب کو یا رب کہیں آرام بھی ہو

کیا قیامت ہے کہ آنکھ اک تو لڑے غرفے سے　　تس پہ پھر محوِ تماشائے لبِ بام بھی ہو

فرقتِ یار میں یہ دن تو مجھے دکھلایا　　بارے اے صبحِ فراق اب تو کہیں شام بھی ہو

ہے ارادہ ترے کوچے سے سفر کا ہم کو　　ابھی اُٹھ جاویں جو تھوڑا سا سرانجام بھی ہو

ذبح کر ایسے سلیقے سے تو مجھ کو کہ میاں　　خونِ خنجر پہ ہے، اور اس میں ترا نام بھی ہو

ایک بوسے کے لیے کیا ہمیں ترساتے ہو　　جان جاتی ہے، جو دینا ہے تو انعام بھی ہو

حیف ہے اس پہ بھی گر اس کے نہ پہنچے در تک　　جب کہ عاشق میں طلب ہووے اور ابرام بھی ہو

مصحفی ہر گھڑی جایا نہ کرو تم صاحب
اک تو عاشق ہو، اور اُس کوچے میں بدنام بھی ہو

437

دوٗر سے مجھ کو نہ مُنھ اپنا دکھاؤ، جاؤ　　بس جی بس دیکھ لیا میں تمھیں جاؤ جاؤ

اس قدر آمد و شد تم کو ضرر رکھتی ہے　　دوستاں ہر گھڑی اس کوٗ میں نہ آؤ جاؤ

"جاؤں جاؤں" ہی جو کرتے ہو تو مانع ہے کون　　جاؤ، مت جاؤ، جو جاتے ہو تو جاؤ جاؤ

آپ کی آنکھوں سے میرے تئیں ڈر لگتا ہے　　مجھ ستم کشتہ سے آنکھیں نہ ملاؤ جاؤ

---

[1] رکنا = کڑھنا، رنجیدہ ہونا۔

تم جہاں جاتے ہو، مجھ کو بھی خبر ہے صاحب اپنے جانے کو نہ بندے سے چھپاؤ، جاؤ
سیرِ گلشن کو اگر جاتے ہو ہمراہِ رقیب بخشو میرے تئیں، مجھ کو نہ بلاؤ، جاؤ
ہم سے کیا مُنھ کو چھپائے ہوئے جاتے ہو تم[1] ہم نے پہچان لیا، مُنھ نہ چھپاؤ، جاؤ
آپ کی میری کسی طرح نہ ہووے[2] گی صلح فائدہ کچھ نہیں، باتیں نہ بناؤ، جاؤ
کیا میاں مصحفی یاں جی کے تئیں کھوؤ گے
اس کے کوچے سے کہیں رخت اُٹھاؤ، جاؤ

438

چھیڑا ہے کس نے تجھ کو جو چیں بر جبیں ہے تو وہ کون ہے کہ جس پہ میاں، خشمگیں ہے تو
تابِ جفائے عشق نہ لاوے گا، جانِ من جانے دے، نامِ عشق نہ لے، نازنیں ہے تو[3]
ہاتھوں سے تیرے مجھ پہ جو عرصہ ہوا ہے تنگ اس کا سبب یہی ہے کہ تنگ آستیں ہے تو
کیا جانے خال و خط کو بنا دے تو کیا کرے اس حسن پر تو فتنۂ روے زمیں ہے تو
گر روزِ حشر ہو تو ترے مُنھ پہ یوں کہوں: آ محکمے میں، کیوں مرا قاتل نہیں ہے تو
اے دوزخِ فراق میں سارا ہی جل گیا کس دردمند کا نفسِ آتشیں ہے تو
کل آسماں تلک نہ قدم رکھ سکا، چہ خوش اے نالہ آج عازمِ عرشِ بریں ہے تو
عرشِ بریں کے در پہ جو میں حلقہ زن ہوا[4] آئی صدا یہ واں سے کہ عرشِ بریں ہے تو
اے لختِ دل نہ رکھیو قدم پیشتر کہیں خاتم پہ میری چشم[5] کی جیسے نگیں ہے تو
میری خبر نہ تجھ کو، نہ تیری خبر مجھے مدّت سے میں کہیں ہوں میاں اور کہیں ہے تو

---

[1] ن۳: تم جاتے ہو [2] ن۲، ۳: نہیں ہونے کی
[3] میرؔ: تو پری شیشے سے نازک ہے، نہ کر دعویٔ مہر چھاتی پتھر ہے انھوں کی جو وفا کرتے ہیں!
[4] حلقہ زن ہوا = زنجیرِ در کھٹکھٹائی [5] ن۲: چشم میری کے

اے مصحفی بتا تو ترا کس نے دل لیا
دل کے لیے جو اس قدر اندوہ گیں ہے تو

439

جانِ ستم رسیدہ آئی ہے لب تلک تو
آنا ہے تجھ کو تو آ جیتا ہوں اب تلک تو

کرتا بلند نالہ کیا اور شیشۂ دل
بانگِ شکست اس کی پہنچی حلب[1] تلک تو

جوں شمع پھر سحر گہ پیارے اُٹھا ہی دیجو
محفل میں تیری ہم بھی بیٹھے ہیں شب تلک تو

ہاتھوں سے میرے اے غم مت چھین جامِ عشرت
لے جانے دے یہ ساغر تو، مجھ کو کب تلک تو

مت مصحفی سے پیارے کر کل کا وعدۂ وصل
رہنے کا نہیں ہے باقی کچھ اُس میں جب تلک تو

440

جو غیر سے ملا ہو، وہ ہم سے یار کب ہو
اور ہووے بھی تو اُس سے صحبت برار کب ہو

شعلے سے اُس کے گر وہ تیری سی خو نہ دیکھے
پروا نہ شمع اوپر پیارے نثار کب ہو

ہم روے کوچہ[2] دل بیٹھے ہیں آرزو میں
دیکھیں پھر اس طرف سے اس کا گذار کب ہو

کِھل کِھل کے آئینے میں وہ گل جو منھ نہ دیکھے
آئینے اس طرح سے باغ و بہار کب ہو

پھندے میں اس کے میں ہی اک پھنس گیا وگرنہ
جو ہووے مرغِ زیرک وہ یوں شکار کب ہو

جو آئینے میں اپنی صورت کو دیکھ جھجکے
یارانِ صاف دل سے پھر وہ دوچار کب ہو

---

1. حلب شام کے ایک شہر کا نام اسے سب سے پہلے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح نے ۶۳۷ھ میں فتح کیا تھا۔
یہاں کی صنعتوں میں شیشے کا سامان اور آئینے مشہور رہے ہیں۔
2. روے کوچہ = سرکوچہ، گلی کے کنارے

اے مصحفی مجھے تو اس نے بہت ستایا
اس بے قرار دل کو دیکھیں قرار کب ہو

441

بیچ دنیا کے کچھ آئے نہیں گھر کرنے کو — مستعد بیٹھے ہیں ہم یاں سے سفر کرنے کو
گو شب ہجر نہ ہو صبح ہمیں کیا پروا — شعلۂ آہ کفایت[1] ہے سحر کرنے کو
ہم کہاں اور تماشاے رخِ یار کہاں — حوصلہ چاہیے ہے اُس پہ نظر کرنے کو
کیا قیامت ہے کہ تو کچھ نہ کہے اور لے جائیں — تیرے کوچے سے ہمیں شہر بدر کرنے کو
ہم تو گلدستہ ہی باندھا کریں بیٹھے لیکن — چاہیے دل بھی بہم لختِ جگر کرنے کو
ظلم سے ہاتھ اُٹھایا نہ کبھی قاتل نے — ٹوٹی گر تیغ تو رکھی وہ تبر کرنے کو

مصحفی گوش ادھر رکھ کہ انھیں قافیوں میں
طبع ہے فکر بہ اندازِ دگر کرنے کو

442

اک تو آگو ہی ترستے تھے نظر کرنے کو — تس پہ پھر حکم ہوا شہر بدر کرنے کو
قاصد آتا ہے کچھ اس کو سے بہت آزردہ — دیکھیے آیا ہے کس کس کی خبر کرنے کو
کون مدفون ہے ایسا جو ترے کوچے میں — روز آتی ہے صبا خاک بہ سر کرنے کو
سخت مشکل ہے کہ اس ناوکِ مژگاں کے حضور — چاہیئے روز نیا سینہ، سپر کرنے کو
راہ سورج کی شب ہجر کہاں تک تکیے — آ جھمک تو ہی ٹک اس شب کی سحر کرنے کو
روز، اے نالہ کہے ہے تو کروں گا اب اثر — آگ لگ جائے کہیں تیرے اثر کرنے کو

مصحفی دل کو تسلی نہ ہوئی اس سے تو لکھ
اک غزل اور بھی اظہارِ ہنر کرنے کو

---

[1] رک ۳۲۵۴ کا حاشیہ

443

آیا اس کوٗ میں جو میں خاک بہ سر کرنے کو — دل گیا وو ہیں اُسے میری خبر کرنے کو

شبِ غم میں نہ کہو کوئی جزا فسانۂ زلف — یہی افسانہ کفایت[1] ہے سحر کرنے کو

نالہ یا آہ بن اس کی تو گذرتی ہی نہیں — چاہیے کچھ بھی تو اوقات بسر کرنے کو

یا تو ان آنکھوں سے دریا سے پڑے بہتے تھے — یا اب اک قطرہ نہیں ہے مژہ تر کرنے کو[2]

آئینے نے ترے مکھڑے کی بہاریں لوٹیں — ہم ترستے ہی رہے ایک نظر کرنے کو

صفِ مژگاں کے رہا خوب مقابل، اے دل — آفریں تجھ کو اور اس تیرے جگر کرنے کو

جس نے اس کوچے میں دیکھا مجھے اتنا ہی کہا: — 'جا بھی[3] کیوں آیا ہے یاں جی کا ضرر کرنے کو

وے اولی العزم[4] کدھر رہ گئے جو قافلے میں — ساتھ تھے محملِ لیلیٰ کے سفر کرنے کو

مصحفی حقِ نزاکت نہ ادا ہو، جب تک
ہووے موٗسی نہ زباں وصفِ کمر کرنے کو

444

آپ آئے ہیں ہمیں رخصت اگر کرنے کو — آیئے، ہم بھی[5] ہیں دنیا سے سفر کرنے کو

کربلا ہے یہ گلی کیا، جو نہیں ملتا یاں — ایک قطرہ بھی لبِ خشک کے تر کرنے کو

ہیں کھلے چاکِ قفس، لیک گلستاں میں ہمیں — حکمِ صیّاد نہیں گل پہ نظر کرنے کو

یہ چمن جائے اقامت نہیں جب[6] تو شب سے — غنچے گٹھری لیے بیٹھے ہیں سفر کرنے کو

زہر کا جام پلانے سے ہمیں کیا حاصل — اک نگہ کافی ہے سو ٹکڑے جگر کرنے کو

---

[1] رک ۳۳۵۴ کا حاشیہ نیز ۳۵۳۷ [2] میر ۔ وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سوکھا پڑا ہے اب تو مدّت سے یہ دوآبا
[3] ن۲: جا بے [4] قاعدے کے مطابق اولوالعزم ہونا چاہیے۔ مگر مصحفی نے ایک جگہ اولی الابصار بھی باندھا ہے۔ [5] ن۲: آئے ہم بھی تو ہیں [6] ن۲: تب تو

اے فلک کس نے کہا تھا تجھے، یہ تو بتلا — اس شتابی سے شبِ وصل سحر کرنے کو

ان دنوں بس کہ زمانے میں نہیں قدرِ ہنر — ہم سمجھتے ہیں ہنر، ترکِ ہنر کرنے کو

وے جو مارے تھے کبوتر مرے اُس نے، اُن کے — جمع کر رکھے ہیں پَر، بالشِ[1] پَر کرنے کو

مصحفی یوں تو سبھی شعر و سخن کہتے ہیں
چاہیے لطفِ سخن دل میں اثر کرنے کو

445

بعد از سالے و ماہے گر کبھو آیا کرو — تم ہمارے پاس تو اک[2] شب کو رہ جایا کرو

میں تو سمجھوں گا جو سمجھاتے ہو مجھ کو ہر گھڑی — لیکن ان دزدیدہ نظروں کو بھی سمجھایا کرو

گو کوئی میری طرف سے کچھ کہے تم کو، میاں — تم کسی کی بات کو خاطر میں مت لایا کرو

سیکڑوں کا خوں کیا ہے اس تمھاری تیغ نے — چپ رہو، جھوٹی نہ قبضے کی قسم کھایا کرو

دل الجھتا ہے ہمارا دیکھ کر اس وضع کو — بال زلفوں کے بہت بھی تم نہ سلجھایا کرو

موکشاں[3] میرے تئیں، اے محرمانِ بزمِ یار — بر سرِ بازارِ رسوائی نہ لے جایا کرو

ایسے ہاتھوں پر کسی کا خون ہووے گا، میاں — یہ حنائی ہاتھ ہر اک کو نہ دکھلایا کرو

جی کا ترسانا بُرا ہوتا ہے مانو بات کو — او میاں صاحب کسی کا جی نہ ترسایا کرو

جب وہ سو جایا کرے تو بیٹھ کر میاں مصحفی
اپنی آنکھوں سے تم اس کے تلوے سہلایا کرو

446

مستی میں اس کے پانو کی افتاد دیکھیو — دل پس گئے ہیں سیکڑوں، بیداد دیکھیو

---

[1] پرندوں کے پر تکیے میں بھرے جاتے ہیں، "بالش پر کرنے کو" سے مراد ہے پروں کا تکیہ بنانے کے لیے۔

[2] ن۲: پاس بھی۔ [3] موکشاں = بال پکڑ کر کھینچتے ہوئے۔

آتا نہ ہووے وہ بھی کہیں، میرے قتل میں جلدی بہت نہ کیجیو جلّاد، دیکھیو

صیّاد، ناتواں ہوں نہ پہنچوں گا باغ تک کیجو مجھے قفس سے نہ آزاد دیکھیو

پھرتا ہے کب کا دامنِ صحرا میں گردباد یہ کس کی خاک ہوتی ہے برباد دیکھیو

گویا اسے خبر ہے کہ آئی بہارِ گل ٹک اضطرابِ مرغِ قفس زاد دیکھیو

شیریں جو بے ستوں کی طرف ہو ترا گذار تو جا کے کارِ تیشۂ فرہاد دیکھیو

میں مرغِ نو اسیر ہوں، مرجاؤں گا مجھے جھک کر درِ قفس سے، نہ صیّاد دیکھیو

ہے اُس کی رگ کے نیچے رگِ جاں مری نہاں نشتر لگے زیادہ نہ فصّاد دیکھیو

مجھ سخت جاں پہ اس کو لگاتے تو ہو ولے جاوے نہ ٹوٹ خنجرِ فولاد دیکھیو

رکھیو قدم سمجھ کے ذرا کوے یار میں یہ کربلا ہے، اے دلِ ناشاد دیکھیو

لکھی ہے خونِ دل سے میں تصویرِ روے یار تم بھی تو اس کو مانی و بہزاد دیکھیو

اے مصحفی نہ جائیو گلشن میں اب کے سال
سرگرمِ عشوہ ہیں گل و شمشاد دیکھیو

447

کوچے میں ترے گو کہ نہ جا اپنے تئیں ہو مرنا ہی جب آیا، تو مری جان کہیں ہو

رکھ دیکھ تو تو، اس کو ذرا دانتوں کے نیچے شاید کہ کبابِ دلِ عاشق نمکیں ہو

کہتا ہے یہی تجھ سے ترا حسن ہمیشہ اے برقِ جہاں سوز کہیں پردہ نشیں ہو

کب پہنچے ہے رتبے کو مرے، مجھ سے فروتر کیا قدر ہے کرسی کی جہاں عرشِ بریں ہو

سورج کی سی سرعت جو خدا ہم کو بھی دیتا آ رہتے فلک پر وو ہیں پھر زیرِ زمیں ہو

اندوہ یہ کس کا مرے سینے میں بھرا تھا نکلا نفسِ سرد بھی جو آہِ حزیں ہو

معلوم کروں میں بھی تو، کیا میری خطا ہے بتلاؤ تو کس بات پہ تم چیں بہ جبیں ہو

فتراک سے باندھو تو ہو سر میرا وے لے میں　　ڈرتا ہوں نہ آلودہ بخوں دامنِ زیں ہو

ہے ناخنِ غم کی جو خراش اپنے جگر میں　　گرتے ہیں سدا لختِ جگر کندہ[1] نگیں ہو

گہ دہر میں جاتا ہوں گہ آتا ہوں حرم میں　　تسکینِ دل اپنی نہ یہیں ہو، نہ وہیں ہو

اے مصحفی، کچھ کام نہیں مجھ[2] کو کسی سے

گو صاحبِ دنیا کوئی یا صاحبِ دیں ہو

448

ہوا ہے عشق کا اظہار، دیکھیے کیا ہو　　بجی ہے اس نے بھی تلوار دیکھیے کیا ہو

اب اس کا چلنے میں پڑتا ہے کچھ قدم ترچھا　　نکالی ہے نئی رفتار دیکھیے کیا ہو

ملے تو ہیں پہ یہی دل میں سوچ رہتا ہے　　ہمارے اس کے اب اقرار دیکھیے کیا ہو

بچے تھے مر کے جس آزار سے ہم الفت میں　　ہوا ہے پھر وہی آزار دیکھیے کیا ہو

کشیدہ تیغ ہے وہ قاتل، اور اس کے حضور　　کھڑے ہیں سارے گنہگار دیکھیے کیا ہو

بہا کریں ہیں شب و روز صورتِ ناسور　　ہمارے دیدۂ خوں بار دیکھیے کیا ہو

تغافلوں نے ترے، ہم سے روزِ محشر پر　　رکھا ہے وعدۂ دیدار دیکھیے کیا ہو

اُٹھائے صدمے بہت ابتدائے الفت میں　　الٰہی عاقبتِ کار دیکھیے کیا ہو

کھنچی ہے اس کی مری چاہ پھر بہ رسوائی[3]　　چُھپے ہیں[4] رخنۂ دیوار دیکھیے کیا ہو

اُلجھ رہا ہے مرا جی خیالِ گیسو میں　　کھنچا ہے طول[5] یہ آزار دیکھیے کیا ہو

ہمارے ساتھ، مری جان دوستی میں تری　　ہوئے ہیں دشمنِ جاں یار، دیکھیے کیا ہو

شبِ فراق میں دیکھا جو کچھ کہ میں دیکھا　　سحر ہوئے پہ نمودار دیکھیے کیا ہو

---

1. کندہ نگیں = کھدے ہوئے نگینے　2. ن۳: کچھ مجھ کو نہیں کام

3. فارسی محاورے کا لفظی ترجمہ۔ کار بہ رسوائی کشیدہ　4. چھپے ہیں = یعنی چھپائے گئے ہیں، بند کیے گئے ہیں۔　5. طول کشیدن کا ترجمہ

ملیں ہم اس مہِ نا مہرباں سے یا نہ ملیں فلک ہے درپئے آزار دیکھیے کیا ہو

ہماری بزم سے اے مصحفی سحر ہوتے
گیا ہے ہو کے وہ بے زار، دیکھیے کیا ہو

449

یا رب مری اس بت سے ملاقات کہیں ہو جس بات کو جی چاہے ہے وہ بات کہیں ہو

گر قربِ سخن اس سے نہیں، دور سے اے کاش نظروں ہی میں ٹک حرف و حکایات کہیں ہو

پھرتا ہے حسینوں سے بہت آنکھیں لڑاتا ڈرتا ہوں نہ دل مصدرِ آفات کہیں ہو

ہوتے ہوئے دشمن کے کہوں کیوں کے میں کچھ بات مجلس سے تری دفع[1] یہ بدذات کہیں ہو

کاغذ پہ شب و روز تری کھینچوں ہوں تصویر یعنی اسی صورت بسر اوقات کہیں ہو

ہے آج کی شب وعدۂ وصل اس کا مرے ساتھ یا رب کہ شتابی سے یہ دن رات کہیں ہو

دے ڈالو دلِ مصحفی تم، ورنہ مری جان
رسوائی ہے وہ تم پہ گر اثبات[2] کہیں ہو

ہ

450

ہم نے چاہا تھا کریں گے رخِ جاناں پہ نگاہ رہ گئی ضعف سے آ کر سرِ مژگاں پہ نگاہ

اس کی رفتار یہ کچھ، دورۂ داماں[3] یہ بلا کیجیے رفتار پہ یا دورۂ داماں پہ نگاہ

ہم سے کب آنکھ لڑے اس کی کہ واں رہتی ہے گاہ سینے پہ گہے چاکِ گریباں پہ نگاہ

حلقہ در حلقۂ زنجیر چلے جاتے ہیں کون کرتا ہے اب احوالِ اسیراں پہ نگاہ

---

[1] ن۳: تیری رفع [2] اثبات ہو = ثابت ہو [3] دامن کا گھیر

عزم ہو تجھ کو گر اے برق ادھر آنے کا　　پہلے کر لیجیو میرے سر و ساماں پہ نگاہ
مل گئے خاک میں ایسے کہ نشاں بھی نہ رہا　　کیا کوئی خاک کرے گورِ غریباں پہ نگاہ
دیدہ بازی کا مزہ شیخ جی کیا جانتے ہیں　　ان کی تو آٹھ پہر رہتی ہے قرآں پہ نگاہ
ہم تو مدّت سے[1] ہیں محبوسِ قفس کیا جانیں　　کہ کبھی کرتے ہیں کیوں کر گل و ریحاں پہ نگاہ
یعنی یہ لختِ جگر قابلِ دیدن ہی نہیں　　کیا کرے کوئی ان اوراقِ پریشاں پہ نگاہ
ڈرتے[2] ہے اس چشم سے، یارو کہ دمِ خوں ریزی　　نہ وہ کافر پہ کرے ہے نہ مسلماں پہ نگاہ

مصحفی سلک گہر ایسی کہاں چمکے ہے
کیجیو یار کی شفافیٔ دنداں پہ نگاہ

451

ہم بھی ہیں ترے حسن کے حیران ادھر دیکھ　　کیا آئینہ دیکھے ہے، مری جان ادھر دیکھ
آنکھیں نہ چُرا مجھ سے، مری جان ادھر دیکھ　　اے میں تری اس چشم کے قربان، ادھر دیکھ
ترسوں ہوں تری یک نگہِ لطف کو پیارے　　اتنا بھی تو مجھ کو نہ کڑھا، مان، ادھر دیکھ
عاشق تو ہزاروں ہی غرض گذرے ہیں لیکن　　یوں چاک ہوا کس کا گریبان، ادھر دیکھ

آنکھیں نہ چُرا مصحفی ریختہ گو سے
اک عمر سے تیرا ہے ثنا خوان ادھر دیکھ

452

جس جا کہ نہ ہووے پر و پیکان کا صرفہ[3]　　عاشق نہیں پھر وہ جو کرے جان کا صرفہ
نت گل کی طرح دھجیاں کر کر کے اُڑایا　　ہرگز نہ کیا ہم نے گریبان کا صرفہ
ہر تار سے اُلجھے ہے یہاں خارِ مغیلاں　　اس راہ میں ممکن نہیں دامان کا صرفہ[4]

---

[1] ن۳: مدّت ستی　[2] ن۳: ڈریے　[3] صرفہ = جھجک، کنجوسی　[4] بہ معنی حفاظت، احتیاط

عاشق کی تسلّی کو بھلا ہنسیے کبھو تو — اتنا بھی نہ کیجے لب و دندان کا صرفہ
وقتے کہ صبا لے گئی بُو اُس کی اُڑا کر — کیا لطف ہے پھر زلفِ پریشان کا صرفہ
رونا تو بڑا یہ ہے کہ اس عشقِ بتاں میں — ہم سے نہ ہوا دیدۂ گریان کا صرفہ
اے مصحفی سنتا ہے، نہ لے نامِ محبت
اس بات میں ناداں نہیں انسان کا صرفہ[1]

453

کیا کھینچے ہے خود کو دُور، اللہ — اللہ رے ترا غرور، اللہ
حسن ایسا کہاں ہے مہر و مَہ میں — کچھ اور ہی ہے یہ نور، اللہ
ہم نے تو بچشمِ خویش دیکھا — ہر شے میں ترا ظہور، اللہ
ہم ہیں ترے بندے، میرے صاحب — گو شیخ کو دیوے حور، اللہ[2]
پہلو سے مرے نکل گیا بت — کیا مجھ سے ہوا قصور، اللہ
جس دم میں کروں ہوں نالہ دل سے — اُٹھتا ہے کتنا شور، اللہ
اے مصحفی حق نہیں سمجھتا
کتنا ہوں میں بے شعور، اللہ

454

کیا نظر پڑ گئیں وہ چشم خمار آلودہ — شفقِ صبح تو ہے زور بہار آلودہ
قتل اپنے کا تو کچھ ڈر نہیں، یہ ڈر ہے مجھے — کہ مرے خوں سے نہ ہو دامنِ یار آلودہ
دُور ہے سوختہ جانوں سے خیالِ تزئیں — نہ کرے رنگِ حنا دستِ چنار آلودہ
ایک دن رو کے نکالی تھی میں واں کلفتِ دل — اب تلک دامنِ صحرا ہے غبار آلودہ

---

[1] بمعنی فائدہ [2] امیر خسرو: جنت طلبا تو دانی و حور — ما شاہد خود نمی گذاریم

پھول کیا چاہیے تربت پہ شہیدوں کی[1] لے ترے — جوششِ خوں سے ہے خود خاکِ مزار آلودہ

مشتعل بس کہ ہے سینے میں مرے آتشِ عشق — آہ جو نکلے ہے دل سے وہ[2] شرار آلودہ

مصحفی گلشنِ ہستی میں تو ہم کو ہرگز
نظر آیا نہ کہیں جز گلِ خار آلودہ

455

ہرچند بہار و باغ ہے یہ — پر کس کو دل و دماغ ہے یہ

ہے بوند عرق کی زلف کے بیچ — یا گوہرِ شب چراغ ہے یہ

کیا لالے کو نسبت اپنے دل سے — یعنی کہ تمام داغ ہے یہ

درگذرے ہم ایسی زندگی سے — دنیا میں اگر فراغ ہے یہ

پھر اتنی درنگ کیا ہے ساقی — مے ہے یہ اور ایاغ ہے یہ

ایسا گیا مصحفی جہاں سے — قطعہ یارو مرے دل پہ داغ ہے یہ

جو پھر نہ کہا کسو نے اتنا
اُس گم شدہ کا سراغ ہے یہ

456

دل کہ جوں شیشۂ مے، دیدۂ گریان ہے یہ — ایک اک دم میں درِ اندازِ صد افغان ہے یہ

زلف میں یار کی، بوندیں ہیں عرق کی یارب — یا شبِ تار میں اک جوشِ چراغان ہے یہ

سرمہ آنکھوں میں جو ہر وقت دیا جاتا ہے — چشمِ بد دُور مرے قتل کا سامان ہے یہ

کوفت سے غم کی کبھی مُنھ تو نہ موڑا اس نے — مجھ[3] کو حیرت ہے یہی، دل ہے کہ سندان[4] ہے یہ

---

1. ن۳: شہیدوں کو ع۲ جوش خوں سے ہے یہ خود خاک مزار آلودہ
2. ن۳: سو شرار
3. ن۲: ہم کو
4. سندان = بکسرِ اول۔ ہتھوڑا، ایرن

تار سے تار کو پیوند کہاں تک کیجے — جی کا جنجال ہے اک، کوئی گریبان ہے یہ
روبرو یار کے لے جا کے مجھے ازرہِ لطف — کوئی اتنا ہی کہے: آپ کا خواہان ہے یہ
کیا نہیں دیکھی ہے صورت تری آئینے نے — اپنے چہرے کی صفائی پہ جو نازان ہے یہ
مصحفی ایک غزل اب کے تو تو اور بھی پڑھ
کیوں کہ نت تیرے سخن کہنے کا عنوان ہے یہ

457

جس کو چاہے اُسے اپنا کرے، انسان ہے یہ — پر ہو تو رام کسی کا کوئی امکان ہے یہ
نہ شریعت، نہ حقیقت، نہ طریقت، نہ مجاز — کون کافر مجھے کہتا ہے: مسلمان ہے یہ
عالم اک دیکھ کے تکتا تجھے رہ جاتا ہے — کس کو کہیئے کہ تری شکل کا حیران ہے یہ
زخمِ دل پر مرے مرہم نہ لگاؤ کوئی — اس پہ ٹک چھڑکو نمک، اس کا تو درمان ہے یہ
اس کے پیکاں کو مرے سینے ہی میں رہنے دو — کہ ٹک اک موجبِ تسکینِ دل و جان ہے یہ
چھپ گیا چاند سا مکھڑا ترا اس میں سارا — کوئی گھٹا امڈی ہے یا زلفِ پریشان ہے یہ
خونِ عاشق سے، میاں جان نہ انکار کرو — تیغ گو دھوئی گئی، آپ کا دامان ہے یہ
وصل کے بعد بھی بیتابیٔ دل کم نہ ہوئی — آہ کیا چاہیے کس چیز کا خواہان ہے یہ
ایک تو چشمے سے آنکھوں سے اُبلتے ہیں مدام — تس پہ پھر دل بھی بھرا آئے ہے، طوفان ہے یہ
ہیں ز خود رفتہ ہم اتنے کہ نہیں کچھ معلوم — ہے ترے وصل کی شب یا شبِ ہجران ہے یہ
مصحفی شہر نہیں، شرم ہے اب یاں کس سے
خوب سا کھول کے دل رو کہ بیابان ہے یہ

458

گر ہوئے ہم سے مکدّر، ٹک دوچارِ آئینہ — خاک میں مل جائے گی ساری بہارِ آئینہ

اس دلِ پُر داغ کو جا کر کسے دکھلائیے　　کیوں کہ ہوتا ہے صفا سے اعتبارِ آئینہ

کیا کسی کے صاف دل پر اب گئی اس کی نگاہ　　سادہ روئی میں نہ تھا جو شرمسارِ آئینہ

مر گئے گر ہم سے روشن[1] گر تو اپنی خاک میں　　یا ہوئے خاکسترِ گل یا غبارِ آئینہ

بزم میں اس کی ہوا ہے جب سے اپنا بندوبست　　تب سے وصلِ شانہ ہے واں اور نہ بارِ آئینہ

کیا قیامت ہے کہ وے آئینے کو اس کے شکست　　دل کو عاشق کے دیا ہے اضطرارِ[2] آئینہ

روبرو اس کے کوئی کیا خاک دم مارے کہ، ہائے　　ہے دمِ روح القدس بھی واں غبارِ آئینہ

جب سے اس کی زلفِ درہم کا پڑا ہے اس میں عکس　　ہو گیا ہے تب سے برہم کار و بارِ آئینہ

جلوہ گر ہوتا ہے اس میں جب وہ روئے پُر عرق　　عِقدِ پرویں[3] کو کرے ہے مہ، نثارِ آئینہ

سکتہ[4] رہ جانے پہ اس کے مجھ کو اک آتا ہے رشک　　کھو دیا کس کی نگہ نے اضطرارِ[5] آئینہ

دیکھنا اس کا میسّر ہو چکا، اے مصحفی
گر رہا یک چند یوں ہی اختیارِ آئینہ

459

دیکھتا ہوں اس کو میں ہر دم دوچارِ آئینہ　　اپنے پردے میں ہوا ہے وہ شکارِ آئینہ

بہہ چلے ہیں شوق میں تیرے، چمن ہو کر کے آب　　اک نظر ادھر بھی اے باغ و بہارِ آئینہ

کشتۂ پرہیز مَیں اس سرو قد کا ہوں کہ وہ　　عکس کو اپنے نہ چاہے ہم کنارِ آئینہ

جائے گل تکیوں کے آئینے رہیں تھے راست چپ　　جن دنوں تھا حسن اس کا بے قرارِ آئینہ

اس کے چہرے سے روا ہے دیجیے نسبت اسے　　جس کے تلووں سے صفا مانگے[6] عذارِ آئینہ

---

[1] روشن گر = آئینے پر صیقل کرنے والے۔ قلعی گر　[2] اضطرار = بہ معنی حیرانی　[3] عِقدِ پرویں = آسمان پر ستاروں کا جھمکا جسے ثریا بھی کہتے ہیں۔　[4] سکتہ رہ جانا = مبہوت رہ جانا۔ حیران۔
[5] اضطرار بمعنی اضطراب۔　[6] یعنی آئینے کا رخسار جس کے تلووں سے صفا مانگتا ہے۔

دورِ خط میں اک ذرا عارض کو اس کے دیکھیو ہو گیا ہے تیرہ کتنا روزگارِ آئینہ
سادہ رُو ہیں اور بھی لیکن کوئی کرتا نہیں اس قدر آرایشِ نقش و نگارِ آئینہ
گر یہ صورت ہے تری تو ایک دن اے رشکِ حور تجھ کو رنگ اپنا دکھاوے گی بہارِ آئینہ
داد کو میری وہ اب پہنچے تو پہنچے مصحفی
شوق نے اس کو کیا ہے شرمسارِ آئینہ

460

کل سوے غیر اس نے کئی بار کی نگاہ لاکھوں کے بیچ چھپتی نہیں پیار کی نگاہ
پوچھا میں دل سے نزع میں، قاتل ہے میرا کون بولا کہ: اس سپاہیِ خوں خوار کی نگاہ
کیا قہر ہے کہ مکھڑے سے کھولے تو جب نقاب طاقت نہ لا سکے ترے دیدار کی نگاہ
اتنا ہوا ضعیف کہ باہر نہ جا سکی چاکِ قفس سے مرغِ گرفتار کی نگاہ
قسمت کہاں ہے ایسی کہ گاہے بہ زعمِ خویش ہو آشنا نگہ سے مری، یار کی نگاہ
ابرو کو اس کی دیکھ کے حیران رہ گئے تھی جن مبصروں کو کہ تلوار کی نگاہ[1]
اب مجھ سے مُنھ نہ ڈھانپ کہ ہوتی ہے عینِ اشک وقتِ اخیر مردمِ بیمار کی نگاہ
گو حور یا پری ہو پہ کیا اس کو دیکھیے
جس پر پڑی ہو مصحفی دوچار کی نگاہ

461

غیروں ہی کی مجلس میں تو اے بت نہ سدا بیٹھ اک دم تو مرے پاس بھی از بہرِ خدا بیٹھ
اب کیوں ہے کھڑا آگے مرے، دُور ہو جا، بیٹھ کچھ ہو نہ سکا تجھ سے تو اے آہِ رسا، بیٹھ

---

[1] یعنی جو تلوار کے پرکھنے والے تھے۔

خورشید کو غرّہ ہے نپٹ حسن پہ اپنے — اک صبح تو ٹک تو بھی، میاں غرفے میں آبیٹھ
آنے دے تک آغوش میں اس راحتِ جاں کو — اے دل مرے پہلو سے شبِ وصل جدا بیٹھ
میں مجلسِ خوباں میں رہا رات کھڑا ہی — جوں شمع، پہ مجھ کو تو کسی نے نہ کہا: بیٹھ
در سے ترے تجھ تک یہ گنہگار نہ پہنچا — آیا بھی جو گاہے تو سرِ کوچہ رہا بیٹھ
پھر اس نے کبھی تا بہ ابد سر نہ اُٹھایا — جس کشتے پہ قاتل کا مرے ہاتھ گیا بیٹھ[1]
اس چال سے پامال کیا تو نے اک عالم — کوئی یہ بھی[2] میاں چال ہے کہیں اب تو ذرا بیٹھ
دیدار سے مطلب تھا، سو وہ دیکھ لیا میں — اب خواہ مرے روبرو خواہی بہ قفا بیٹھ

اے مصحفیؔ گر چاہے ہے روز اس کو تو دیکھے
جا کر کہیں اس کوچے میں دھونی سی رما بیٹھ

462

اُٹھنے سے ترے شورِ قیامت بھی گیا بیٹھ — اے فتنۂ برخاستہ از بہرِ خدا بیٹھ
پردہ نہ رکھ اس روئے دل افروز کے آگے — یوں چاہے تو سب اپنا بدن مجھ سے چھپا بیٹھ
اب ہم بھی کوئی دم کو میاں یاں سے اُٹھیں گے — کیا اتنی شتابی ہے، کہاں جا ہے ذرا بیٹھ
پاتا ہی نہیں دل کا نشاں اپنے میں، ہے ہے — کیا جانے وہ آوارہ کدھر جا کے رہا بیٹھ
گر اُس کے تماشے کا تجھے شوق ہے، اے دل — سینے سے نکل کر تو مری آنکھوں میں آ بیٹھ
شمشیر سے کچھ کم نہیں محرابِ در اس کی — اس در پہ جو بیٹھے ہے تو گردن کو جھکا بیٹھ
اُس یوسفِ ثانی کی سواری کی خبر ہے — .تندِ زلیخا تو سرِ راہ میں جا بیٹھ
کیا ہم نہیں پہچانتے یہ ساختہ صورت — غصے سے ٹک اک اور بھی تو مُنھ کو بنا بیٹھ
کہتے ہیں صبا یار کے کوچے سے چلی ہے — اے غنچۂ نشگفتہ نہ اتنا بھی خفا بیٹھ

---

1. ہاتھ بیٹھ گیا = ہاتھ پڑ گیا۔ 2. ن۲: ہے یہ بھی کوئی چال

گھر اس کے گیا ملنے، تو جا بزم میں وہ شوخ　　مشغول ہوا غیر سے اور مجھ سے کہا: بیٹھ

اے مصحفی کیا دیکھے ہے، ہے مجلسِ خوباں

ایک آدھ سے تو بھی کہیں یاں آنکھ لڑا بیٹھ

463

شیریں لب اس صنم کے، ہیں جوں نبات تحفہ[1]　　پھر تس پہ اتنی تلخی ہے یہ بھی بات تحفہ[2]

زلفوں کا تار اس کی میں حرزِ جاں بنایا　　ہاتھ اپنے لگ گیا تھا یہ کل کی رات، تحفہ

کیوں کر نہ خوں میں ڈوبے کوئی[3] دیکھ اس پھبن کو　　رنگِ حنا عجائب، پھر تس پہ ہات تحفہ

آخر کو دخترِ رز دل لے گئی ہمارا　　ازبس کہ جوں پدمنی[4] تھی اس کی ذات تحفہ

اب سبز خط سے ان پر کاہی سی جم گئی ہے　　وے لب کہ تھے بہ رنگِ آبِ حیات تحفہ

دریا میں کل نہاتے دیکھا جو میں نے اس کو　　سب سیمبر بتوں میں تھی اس کی گات[5] تحفہ

دلّی کے کیا کروں وصف، اے مصحفی میں دیکھا

ہر ایک کوچہ اس کا جوں سومنات تحفہ

464

مجھ کو یاروں نے بد و نیک کہا، کیا کیا کچھ　　دیکھ تو اک تری خاطر، میں سنا کیا کیا کچھ

ساغرِ بادہ و دامانِ گل و دستِ نگار　　ہاتھ سے میرے بہ یک بار گیا کیا کیا کچھ

نشے کے بیچ تھے ہم، یہ ہمیں معلوم نہیں　　رات ہم سے تری خدمت میں ہوا کیا کیا کچھ

مے کشی، سیرِ چمن، بزمِ طرب کا جانا　　عشق میں میں نے ترے، ترک کیا کیا کیا کچھ

رلتا پھرتا ہے[6] مرا کاسۂ سر خاک کے بیچ　　دیکھیے ہے ابھی طالع میں لکھا کیا کیا کچھ

---

1. تحفہ = خاصے کی چیز 2. نرالی، عجیب 3. ن۴: دل دیکھ 4. پدمنی = قدیم تصورات کے مطابق عورتوں کی اقسام میں سے ایک قسم۔ 5. گات = جسم 6. مقدمہ کلیاتِ مصحفی میں اس کی بحث ملاحظہ ہو۔

دیدۂ فرق سے ٹک دیکھ کہ ایک اک پل میں — رنگ بدلے ہے زمانے کی ہوا کیا کیا کچھ

سفرِ عشق سے غارت زدہ[1] آیا ہوں، نہ پوچھ — راہ میں میرا بھی اسباب لٹا کیا کیا کچھ

ہائے میں کس سے کہوں، ابرِ سیہ میں مجھ کو — کوند بجلی کی دکھاتی ہے ادا کیا کیا کچھ

یاں جو کچھ ہم پہ ہوا سو تو سبھوں نے دیکھا — دیکھیے اور بھی ہو روزِ جزا کیا کیا کچھ

ذکرِ دشنام فقط کیا[2] ہے کہ اُس بدخو نے — نہ کہا میرے تئیں اس کے سوا کیا کیا کچھ

کون جانے ہے کہ نظارہ کشِ شوق کو یاں — رنگ دکھلائے ہے وہ رنگِ حنا کیا کیا کچھ

بلبل اک نالے پہ مت بھول کہ اس گلشن میں — دیکھ تو اور بھی ہیں نغمہ سرا کیا کیا کچھ

ہم نے ہی قدر نہ کی دولتِ دنیا کی دریغ قطعہ ورنہ ہم کو بھی فلک نے تھا دیا کیا کیا کچھ

پیل و اسپ و شتر و پالکی و نقارہ — قور میں[3] اپنی بھی اک عمر چلا کیا کیا کچھ

کان دھر کر تو ذرا مصحفی اک بار تو سن
آئے ہے دل کے دھڑکنے کی صدا کیا کیا کچھ

465

عید کا روز ہے، کیوں آج نہاں ہے شیشہ — مے کشو لاؤ بھی کیدھر ہے، کہاں ہے شیشہ

مے نہ دو، گریۂ سرشار ہی کافی ہے مجھے — کہ مری چشم میں ہر اشکِ رواں ہے شیشہ

شغل گریے کا بہم دیدہ و دل کرتے ہیں — ہے وہاں جام بھی موجود، جہاں ہے شیشہ

پنبۂ مے اسے مت سمجھیو[4]، اے بادہ کشاں — جوشِ مستی کے سبب کف بہ دہاں ہے شیشہ

مئے گلگوں سے ہے ٹک اس میں بہار، اے ساقی — ورنہ بے برگ[5] تر از نخلِ خزاں ہے شیشہ

---

[1] لٹا ہوا [2] نیز دشنامِ سقط = گندی گالیاں [3] قور میں = جلو میں

[4] پہلے شراب کے برتن کا منھ روئی رکھ کر بند کرتے تھے، تا کہ وہ اُڑے نہیں۔ اسے پنبۂ مے کہا جاتا ہے۔

[5] بے برگ = بے نوا،

شیشہ بازی[1] تو مری دیکھ، کہ زاہد کے حضور
آستیں میں مری جوں اشک نہاں ہے شیشہ

اپنی آنکھوں میں سدا ہند کے سبزوں کی ہے جا
شیشہ والوں کی اگر زیبِ دُکاں ہے شیشہ

جب تلک مے نہ پییں کچھ ہمیں آوے نہ نظر
عینکِ چشم ہماری تو میاں ہے شیشہ

کیا بلا مے تھی جو ساقی نے بھری کیا جانے
دم بہ دم آج درانداز فغاں ہے شیشہ

وائے اس بزم میں گر عمر خوشی سے گذرے
خندۂ جام پہ نت گریہ کناں ہے شیشہ

شیشہ خانے میں تمھارے، مجھے سچ کہہ دیجو
کوئی اس دل سا بھی اے شیشہ گراں ہے شیشہ

عکسِ گل بادۂ رنگیں سے گرو لیتا ہے
ساقی، اس باغ میں خود آبِ رواں ہے شیشہ

مے کے کم پینے سے کچھ زور بنا ہے کافر
بہ تکلف بتِ زنّار میاں ہے شیشہ

محتسب کیا ہے کہ لاوے وہ اسے خاطر میں
آج اس بزم میں خود پیرِ مغاں ہے شیشہ

نہ اُٹھا اس کو اگر جام بھی مے ہو اس میں
تیرے ہاتھوں کی نزاکت پہ گراں ہے شیشہ

عازمِ مے کدہ ہے، یار کہ تیری رہ میں
دہنِ باز سے چشمِ نگراں ہے شیشہ

مصحفی دیکھ کے دل کیوں نہ لبھاوے اس کی
چشمِ بد دوٗر، عجب سج کا جواں ہے شیشہ

466

نت رہا سوے چمن مرغ گرفتار کا منہ
اس تمنا میں کہ دیکھے گل و گلزار کا منہ

بگڑو مت، آپ نے دیکھا نہیں تلوار کا منہ
لال ہو جائے گا ورنہ ابھی دو چار کا منہ

عقدۂ زلف کے کھلنے میں جہاں یوں مہکا
تو کہے کھول دیا نافۂ تاتار کا منہ

کیوں نہ خوں ٹپکے ہر اک گام پہ اس کی رہ میں
پان سے لال ہے اس قاتلِ مے خوار کا منہ

باغ میں چاروں طرف گل کھلے کلیاں چٹکیں
نہ کھِلا میرے ہی اک غنچۂ منقار کا منہ

---

[1] شیشہ بازی = شعبدہ باز شیشے نچایا کرتے تھے۔

علمِ نالہ پہ پرچم تھے ظفر کے گویا — پھر گیا دیکھ جسے ہر مژۂ یار کا منھ[1]

اب کوئی دم میں یہ دنیا سے گذر[2] جاتا ہے — کرو قبلے کی طرف اس دلِ بیمار کا منھ[3]

ابھی آئینے کو پتھر پہ پٹک دیتا میں
مصحفیؔ کیا کروں ہے میرے تئیں یار کا منھ[4]

467

دل بستگی ہے مجھ کو گل و گلستاں کے ساتھ — گو تلخ بولے، کام ہے کیا باغباں کے ساتھ

الفت بھی کیا بلا ہے کہ شب آگ جو لگی — مرغانِ بیضہ دار[5] جلے آشیاں کے ساتھ

برقِ گل اس طرح سے گری شب کہ عندلیب — خاکِ سیاہ جل کے ہوئی آشیاں کے ساتھ

مرکر اُٹھیں گے یاں سے، یقیں کیجیو میاں — اپنا تو سر لگا ہے ترے آستاں کے ساتھ

یاں تک ہے لخت لخت مرا دل کہ دم بدم — ٹکڑے جگر کے جھڑتے ہیں آہ و فغاں کے ساتھ

رکھتا ہے مجھ سے دُور مرے رشکِ ماہ کو — خصمی[6] اسی سبب ہے مجھے آسماں کے ساتھ

البتہ کارِ سہل نہیں تیری دوستی — دشمن کوئی ہو کیوں کے بھلا اک جہاں کے ساتھ

وہ کشتہ اپنے حال کی تقریر کیا کرے — سر جس کا مثلِ شمع کٹا ہو زباں کے ساتھ

تو رفتگی تو دیکھ کہ مژگاں کے شوق میں — لپٹا ہی جا ہے دل مرا نوکِ سناں کے ساتھ

اے خارِ خارِ عشق کہیں اب تو در گذر
یہ کیا خلش ہے مصحفیؔ نیم جاں کے ساتھ

---

1. یہ عسکری اصطلاح نظم کی ہے۔ غنیم کی شکست کے بعد فوجیں فتح کے نشان لے کر آگے بڑھتی تھیں اور اُنھیں دیکھ کر غنیم کی فوج ہتھیار ڈال دیتی تھی۔ 2. ن ۲ و ۴: سفر کرتا ہے۔ 3. یہ مسلمانوں کا مذہبی رواج ہے کہ مرتے وقت بیمار کا چہرہ داہنی طرف کو موڑ دیا جاتا ہے۔ اس سے قبر میں اس کا رُخ قبلے کی طرف ہی رہتا ہے۔ 4. کسی کا منھ کرنا= لحاظ کرنا 5. یعنی وہ پرندے جو انڈوں پر بیٹھے تھے۔ 6. خصمی= دشمنی

468

دم بہ دم لب پہ مرے نالۂ ''وادرد[1]'' ہے آہ
سر اُٹھانے نہیں دیتا ہے یہ کیا درد ہے آہ

دن گئے[2] وہ کہ کبھی دل کی جگہ تھا یہ مکاں
جائے دل اب مرے پہلو میں، ترا درد ہے آہ

عشق کا درد نہ ہووے کسی دشمن کے[3] نصیب
جان جاتی ہے چلی یہ تو بُرا درد ہے آہ

ٹکڑے ٹکڑے ہی ہوا جائے ہے دل اور جگر
آج تو کچھ مرے پہلو میں بلا درد ہے آہ

ہے پڑی آنکھ پھر اک آفتِ جاں پر میری
اس کی دارو میں کروں کیا کہ نیا درد ہے آہ

زائچہ اپنا منجم سے جو[4] میں کھنچوایا
رو کے بولا: تری قسمت میں لکھا درد ہے آہ

جلد تدبیر کرو جا کے الم کی میرے
کم نہ جانو اسے یارو یہ بڑا درد ہے آہ

مصحفی، ہاتھ نہ پہلو پہ مرے رکھ، بے درد
اس گھڑی کچھ مرے سینے میں ذرا درد ہے آہ

469

زمانہ کا چلن یکساں نہیں کچھ
کہیں کچھ ہے، کہیں کچھ ہے، کہیں کچھ

زمیں سر پوشِ خونِ کشتگاں ہے
بغیر از خوں نہیں زیرِ زمیں کچھ

مرا جی تو بھلا بہلے کوئی دم
اسی کا ذکر کر، اے ہم نشیں کچھ

خدا جانے رہا ہے شب تو کس پاس
پریشاں ہیں ترے موئے جبیں کچھ

یہ سرگوشی نہ تھی بے وجہ اس کی
کہے تھی چشمِ تر سے آستیں کچھ

عبث انکارِ قتلِ عاشقاں ہے
بھرا تو خوں سے ہے دامانِ زیں کچھ

غرض دونوں جہاں سے ہم ہیں آزاد
غمِ دنیا ہے یاں، نے فکرِ دیں کچھ

---

[1] وادرد = ہائے درد، (واحرف ندبہ) [2] ن۲،۳: گئے وے دن۔
[3] ن۲و۳: دشمن کو [4] ن۲،۳ کو جو میں دکھلایا۔

مرا ہر شعر موتی کی لڑی ہے　　کہیں گو دیکھ اس کو عیب بیں کچھ
اگر اے مصحفی ہو قصد تیرا
تو دوٗر اتنا نہیں عرشِ بریں کچھ

470

اس کی مژگانِ رخنہ گر کو دیکھ　　بعد ازاں آمرے جگر کو دیکھ
اب تو سینہ سپر کیا میں نے　　تیغ کو کھینچ اور سپر کو دیکھ
یار کو مجھ سے کر دیا بیزار　　میرے طالع کے ٹک ہنر کو دیکھ
دسترس ہی نہیں جنھیں اس پر　　ہاتھ مَلتے ہیں اُس کمر کو دیکھ
کیا ہی مژگاں کے زخم جھیلے ہیں　　اپنے عاشق کے بھی جگر کو دیکھ
بس کہ وہ طفل سادہ تھا پُر کار　　چھپ گیا میرے نامہ بر کو دیکھ
گو کہ وہ جھانکتا نہیں لیکن　　دل تو خوش ہوے[1] ہے چاکِ در کو دیکھ
شعلۂ شمع کا حریف نہ ہو　　نفع تو اک طرف ضرر کو دیکھ
اس قدر ہے بلند پروازی　　اے پتنگ اپنے بال و پر کو دیکھ
دیکھ تو کیا پڑھوں ہوں ایک غزل
مصحفی تو، ذرا ادھر کو دیکھ

471

اپنے عاشق کی چشمِ تر کو دیکھ　　صدقے تیرے میں، ٹک ادھر کو دیکھ
تیرِ مژگاں ترا دو سار ہوا　　دل کو کیا دیکھے ہے، جگر کو دیکھ
دیکھتا کیا ہے عِقدِ[2] پرویں کو　　اپنے آویزۂ گہر کو دیکھ

---

[1] ن۲: دل تو ٹک خوش ہے۔　　[2] رک ۳۶۹۲ کا حاشیہ۔

جب کہ تو گھر سے اُٹھ گیا میرے خوب رویا میں اپنے گھر کو دیکھ
میرے آگے نہ دیکھ آئینہ میری حسرت بھری نظر کو دیکھ
زلف کا بوجھ دے کمر پہ نہ جان زلف کو دیکھ اور کمر کو دیکھ
تھی شبِ وصل کھل گئی جو ہیں آنکھ رنگ فق ہو[1] گیا سحر کو دیکھ
کیسی فرفر[2] زبان چلتی ہے اس کی گفتارِ بے خطر کو دیکھ
مصحفی پہ ستم نہ کر نادان
خط نہ دے اپنا نامہ بر کو دیکھ

472

چمن آرائے نوبہار تو دیکھ اک ذرا جوشِ لالہ زار تو دیکھ
آرسی لے کے ہاتھ میں اپنے اپنی آنکھوں کا تو خمار تو دیکھ
مجھ کو کیا دیکھتا ہے کرکے قتل اپنی شمشیرِ آب دار تو دیکھ
اتنا موئے کمر پہ غرّہ[3] نہ ہو ٹک ہمارا بھی جسمِ زار تو دیکھ
مرگئے پر بھی ہیں کھلی آنکھیں اپنے عاشق کا انتظار تو دیکھ
سینے آیا ہے کس کو، اے ناصح ٹک مرا جیب تار تار تو دیکھ
مصحفی بول اُٹھے عجب بھی نہیں
اس کی تربت پہ تو پکار تو دیکھ

ے

473

زمزمے ہم سے سنو بلبلِ خوش الحاں کے کہ سدا نغمہ سرا تھے چمن و بُستاں کے

---

1. رنگ فق ہونا= حواس باختہ ہوجانا 2. فرفر زبان چلنا= تیزی سے بولنا۔
3. غرّہ ہونا= غرور کرنا، نازاں ہونا (ن ۲: ہماری بھی چشم زار)

آنکھیں دکھلائی ہیں کیا تو نے اُسے سچ کہیو — آج اوسان سے گم ہیں جو ترے درباں کے

کون سی بچنے کی صورت ہے مری، حیراں ہوں — لوگ کس واسطے درپے ہیں مرے درماں کے

پھر نہ جاوے تری مژگان کا رخ اُن سے میاں — تیری آنکھیں یہی کہتی ہیں تری مژگاں کے

دیدۂ شیر سے لگتے ہیں مری آنکھوں میں — ہولناک ایسے ہیں تارے یہ شبِ ہجراں کے[1]

ہم سیہ بخت رہے بوسے سے محروم دریغ — لوٹے مسّی نے مزے تیرے لب ودنداں کے

اشکِ خونیں کو مرے دیکھے ہے جو، کہتا ہے — چُنّیاں[2] لعل کی، یا دانے ہیں یہ مَرجاں[3] کے

خارِ صحرائے جنوں دست درازی سے تری — چاک جاتے ہیں گریباں کو مرے داماں کے

ہم اسیروں پہ بڑا قہر ہوا، یا قسمت — عید کے دن بھی نہ دروازے کھلے زنداں کے

حوصلہ دیکھیے میرا کہ بغل میں میری — ایک دل جس پہ ہیں[4] سو زخم ترے پیکاں کے

قافلہ جائے ہے یاروں کا چلا بس کہ شتاب — میں بھی نالش[5] میں ہوں پیچھے جرسِ نالاں کے

مسّی و پان کے کشتوں کے ترے مدفن سے — پھول اُگتے ہیں بہم لالہ و نافرماں کے

دیدۂ کم سے نہ دیکھو یہ مرے طفلِ سرشک — گو کہ طوفاں نہیں، ہمنام تو ہیں طوفاں کے

چاندنی رات میں تارے سے پڑے چمکیں ہیں — یہ جو ذرّات ہیں مکھڑے پہ تری افشاں کے

کسی بے درد نے دامن کو ترے کھینچا ہے — چیں کے اُدھڑے نظر آتے ہیں سارے ٹانکے

مصحفی سے تجھے کیا لاگ ہے چل جانے دے
اتنا درپے نہیں ہوتا ہے کوئی انساں کے

474

تم گھر میں اپنے ہم سے جب منہ چھپا کے بیٹھے — ہم پھاڑ کر گریباں صحرا میں جا کے بیٹھے

---

1. اسی مضمون کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے عربی شعر میں کہا ہے (دیکھیے شعر نمبر ۵۵۲۷ کا حاشیہ)
2. لعل کی چنّی = لعل کے ریزے، چھوٹے ٹکڑے۔ 3. مرجان = مونگا۔ 4. ن۲: اک دل خستہ میں
5. نالش = فریاد

نکلی نیام سے جب شمشیرِ ناز اس کی — کیا کیا نیاز پیشہ سر کو جھکا کے بیٹھے

بدلی سی آگئی اک کر موے سر پریشاں — جب آفتاب[1] میں تم پیارے نہا کے بیٹھے

آنے کی گر ہمارے تم نے خبر سنی تو — آنے سے پیشتر ہی تیوری چڑھا کے بیٹھے

رستے کے جانے والے بھینچک[2] ہو، رہ گئے سب — جس دم تم اپنے در پر مونڈھا بچھا کے[3] بیٹھے

تم پاس گر میں آکر بیٹھا تو اُٹھ گئے تم — یعنی اسی بہانے مجھ کو اُٹھا کے بیٹھے

پیارے ابھی تو مجھ سے تم روٹھ کے مُنے تھے — پھر کیا غضب ہوا ہے جو منھ پھُلا کے[4] بیٹھے

ہم اُٹھ نہ جاویں کیوں کہ در سے تمھارے، تم تو — پانوؤں کو اپنے گھر میں مہندی لگا کے بیٹھے

گل چاک کر گریباں رسوا ہوئے چمن میں — جب تم روش پہ اپنا سینہ اُٹھا کے بیٹھے

اے مصحفی شب اس کے میں سامنے کھڑا تھا قطعہ اتنے میں جوں ہی دشمن مجلس میں آکے بیٹھے

تب دیکھ دیکھ مجھ کو بولا: یہ اس سے کہہ دو
کیوں چور سا کھڑا ہے گھر اپنے جا کے بیٹھے

475

غم میں تیرے راحت و آرام سے جاتے رہے — گھُل گئے ایسے کہ ہم سب کام سے جاتے رہے

دیکھ کر کتنے نصاریٰ تجھ کو، مومن ہو گئے — بلکہ مومن بھی کئی اسلام سے جاتے رہے

دربدر روتا پھرا میں جن کی خاطر سوے شب — چاند سا مکھڑا دکھا کر بام سے جاتے رہے

اس نے شب باشی کا وعدہ غیر سے جس دن کیا — ہم چھپا کر منھ کو اپنے شام سے جاتے رہے

ہائے کیسے کیسے گل اس گلستاں کے ایک بار — خاک میں مل، گردشِ ایام سے جاتے رہے

---

[1] آفتاب = دھوپ [2] بھینچک (بھونچکا) = متعجب [3] یہ ہے قصباتی معاشرت کی تصویر۔ جہاں آج بھی، اور مصحفی کے زمانے میں تو اکثر لوگ اپنے دروازے کے سامنے پلنگ یا مونڈھا بچھا کر، حقہ بھرے بیٹھے رہتے تھے۔ یہ گویا وقت گذارنے کا ایک طریقہ تھا۔ [4] ن ا: پھُرا کے

دَورِ خط وہ دیکھ کر زلف اپنی یوں بولا کہ ہائے چھوٹ کر کیا کیا اسیر اس دام سے جاتے رہے

کل جو میں ان سے کہا: دیکھا ہے تم نے مصحفی
کچھ خفا ہو مصحفی کے نام سے جاتے رہے

476

چتون سے اک تو دل پر آگے ہی بے کلی ہے پھر تس پہ یہ غضب ہے چشمک ہے جھانولی[1] ہے

فندق ان انگلیوں کو دیتی ہے یاد مجھ کو ہر شاخِ گل کے اوپر سر کھینچے جو کلی ہے

مرجھا رہے ہیں غنچے گل ہو گئے ہیں پت جھڑ اب کے برس چمن میں یہ کیا ہوا چلی ہے

خوں نابِ دل سے میرے کر کے خضاب اوّل ہاتھوں پر اپنے اس نے پھر کچھ حنا ملی ہے

دلّی میں روے خوش کی ہرگز کمی نہیں کچھ یاں جنسِ حسن ارزاں ہر کوچہ و گلی ہے

شب طبعِ مصحفی سے مانندِ سلکِ گوہر
انصاف کچھ یارو، کیا ہی غزل ڈھلی ہے

477

ہم کیا کریں چمن میں گر پھر ہوا چلی ہے اپنا دلِ فسردہ تصویر کی کلی ہے

ابرو کا ٹک اشارہ، جس دم کیا ہے اس نے پھر عاشقوں میں باہم تلوار ہی چلی ہے

محبوبِ شرمگیں کا نقشا ہے اس چمن میں سر کو جھکائے اپنے لالے کی جو کلی ہے

ہر چند چشمِ کافر پُر دل بہت ہے لیکن تیکھی نگاہ اُس کی اس سے بھی من چلی[2] ہے

آدھی اُگل کر اس کی تلوار رہ گئی کل
کیا مصحفی کے سر سے آئی بلا ٹلی ہے

---

[1] جھانولی = تاک جھانک [2] من چلی = شوخ

478

جمنا میں کل نہا کر جب اس نے بال باندھے — ہم نے بھی اپنے دل میں کیا کیا خیال باندھے

ایسا شکوہ اس کی صورت میں ہے کہ تا گہ — آوے جو سامنے سے، دستِ خجال[1] باندھے

آنکھوں سے گر کرے وہ زلفوں کو ٹک اشارہ — آویں چلے ہزاروں وحشی غزال، باندھے[2]

عیسیٰ و خضر تک بھی پہنچے اجل کا مژدہ — تو تیغ اگر کمر پر بہرِ قتال[3] باندھے

لالے کی شاخ ہرگز لہکے نہ پھر چمن میں — گر سر پہ سرخ چیرا وہ نونہال باندھے

لت عاشقی کی کوئی جائے ہے عاشقوں سے — گو بادشاہ ڈانڈے[4] گو کوتوال باندھے[5]

ہم کس طرح سے دیکھیں جب دے سے پیچ لڑ کے — چیرے کے پیچوں میں تو زلفوں کے بال باندھے

بندہ ہوں میں تو اس کی آنکھوں کی ساحری کا — تارِ نظر سے جس نے صاحب کمال باندھے

ہم ایک بوسے کے بھی ممنوں نہیں کسی کے — چاہے سو کوئی تہمت روزِ وصال باندھے

سوزِ دل اپنا اس کو کیا مصحفی سناویں
آگو ہی وہ پھرے ہے کانوں سے شال باندھے

479

برقع ہے یہ یا کوئی بلا ہے — جس میں ترا سب بدن چھپا ہے

کیا جاتا ہے اس میں منھ لپیٹے — ٹک پیچھے تو دیکھ، آشنا ہے

ہر نقشِ قدم پہ تیرے اے بت — سایہ ترا سجدے کر رہا ہے

اس طرزِ خرام سے قیامت — گر آج نہیں تو کل بپا ہے

---

[1] یعنی ہاتھ جوڑ کر۔ [2] باندھے چلے آویں = بندھے چلے آئیں۔ [3] یعنی قتال بمعنی قتل استعمال ہوا ہے لیکن عربی میں اس کا مفہوم جنگ ہے۔ [4] ڈانڈے = جرمانہ کرے۔
[5] باندھے = قید کرے۔

تو دیکھ ڈھٹائیاں[1] تو اس کی
پھر مصحفی تجھ سے لگ چلا ہے

480

دل مرا تیرے غم میں مرتا ہے — دیکھ اب کوئی دم میں مرتا ہے
تیرے رونے کے روبرو، اے ابر — پانی کب چشمِ نم میں مرتا ہے[2]
دیکھ اس کو بہت میں روتا ہوں — جو کوئی عمرِ کم میں مرتا ہے
سفرِ کعبہ کر کہ ہے ناجی[3] — جو کہ راہِ حرم میں مرتا ہے

مصحفی کو بڑا الم ہے ترا
آج کل اس الم میں مرتا ہے

481

کدھر جایئے[4] اور کہاں بیٹھیے — پرچتا[5] نہیں دل جہاں بیٹھیے
میں دیکھا تمھیں خوب، پردے میں اب — ذرا اور ہو کر نہاں بیٹھیے
کھڑے دیکھتے کیا ہو، پھر[6] آیئے — کرم کیجیے مہرباں، بیٹھیے
ابھی سے کہاں اُٹھ چلے، کوئی دم — غنیمت ہے صحبت میاں بیٹھیے
ترے ہاتھوں سے اے جفاے فلک — بتا تو ہی چھپ کر کہاں بیٹھیے
بٹھایا مجھے تم نے زنداں میں خوب — میں بیٹھا بس اب دوستاں بیٹھیے
تم آنکھوں میں کیا بیٹھتے ہو مری[7] — بہ پہلوے دل مثلِ جاں بیٹھیے

---

[1] بمعنی بے غیرتی۔ [2] پانی مرنا= نکلنا۔ [3] ناجی= نجات یافتہ۔ [4] ن۳: کہوتم کدھر
[5] پرچتا نہیں = لگتا نہیں، بہلتا نہیں۔ [6] ن۲و۴ : یاں آیئے۔ [7] ن۲و۴: تم آنکھوں میں
بیٹھے ہوئے ہو مری۔

نہیں بیٹھنے کی تمھارے وہ جا ادھر آیئے اب یہاں بیٹھیے
نہ پہنچو گے منزل کو تم مصحفی
گیا دوٗر اب کارواں بیٹھیے

482

انداز کے صدقے ہیں نہ ہم ناز کے صدقے گر ہیں بھی تو اس نرمیِ آواز کے صدقے
دامن کو ترے پانْو کی جب لگتی ہے ٹھوکر کہتے ہیں یہ مردے کہ اس انداز کے صدقے
کر ذبح مجھے تو نے نئے سر سے جلایا اے خنجرِ قاتل ترے اعجاز کے صدقے
اک بار اُڑا ہوں میں تو مرغانِ گلستان سو بار ہوئے ہیں مری پرواز کے صدقے
مت دیکھ تو اوروں کی طرف میری طرف دیکھ کافر میں تری چشمِ فسوں ساز کے صدقے
کرتا ہوں میں نالہ تو نکلتی ہے یہ آواز[1] اس نالے کے، اس سوز کے، اس ساز کے صدقے
اے مصحفی کیا تیرا بھی اندازِ سخن ہے
باللہ کہ ہیں ہم تو اس انداز کے صدقے

483

اس طفل کو دیکھو تو یہ رنگ کسو کا ہے شعلہ ہے، شرارہ ہے، آتش ہے، بھبوکا ہے
اس آئینہ خانے میں، اے روشنیِ دیدہ جیدھر کو نظر کیجے جلوہ ترے رو کا ہے
یا اس کا کبھی حلقہ وہ ساعدِ سیمیں تھا یا حلقۂ آہن اب طوق اپنے گلو کا ہے
مت زخمِ جگر میرا جرّاح سے سلواؤ لاؤ کسی بینا کو کام اس میں رفو کا ہے
تزئیں سے نہیں خالی یہ جامۂ عریانی جو زخمِ محرف ہے خط اس پہ اُتو[2] کا ہے

---

[1] ن ۳: تو یہی نکلے ہے آواز۔

[2] اُتو = کپڑے پر دھاریاں ڈالی جاتی تھیں اسے اُتو کرنا کہتے ہیں۔ (بغیر تشدید و بہ تشدید دونوں صحیح)۔

اس دستِ حنائی کو رکھا تھا کہیں اس نے — اب تک مری تربت پر چھاپا سا لہو کا ہے

اب مصحفیِ خستہ اس در سے کدھر جاوے
مارا ترے رُو کا ہے، کشتہ ترے مو کا ہے

484

سب اُٹھے بزم سے اور اپنے اپنے گھر کو چلے — ولیک یہ نہیں معلوم ہم کدھر کو چلے

کمر ہوئی تری یاں تک تو شہرۂ آفاق — کہ سر کے بال ترے دیکھنے کمر کو چلے

کہے ہے یہ تپشِ دل کہ اب وہ آتا ہے — ہوئی ہے دیر بہت واں سے نامہ بر کو چلے

جگر میں میرے کئی قطرے خوں کے باقی تھے — سو آج وہ بھی تماشائے چشمِ تر کو چلے

یہ کیا شتابی ہے، اے قاصدانِ اشک کہو — مگر مرے دلِ گم گشتہ کی خبر کو چلے

جنوں کی لہر میں آ، شب میں یاں تلک رویا — کہ سیلِ خوں مری آنکھوں سے بحر و بر کو چلے

یہ راہ وہ ہے کہ اس رہ میں جو مسافر ہو — نہ پہنچے شام بھی منزل اگر سحر کو چلے

کوئی دن اور بھی دنیا میں تم کو رہنا ہے
ابھی سے تم تو میاں مصحفی سفر کو چلے

485

یاں ضعف سے یہ گردن زنہار نہیں اُٹھتی — واں مارے نزاکت کے تلوار نہیں اُٹھتی

کب دردِ جگر مجھ کو بیتاب نہیں کرتا — کب ہوک کلیجے سے یک بار نہیں اٹھتی

کہنے ہی کو رنگینی ہے ابرِ بہاراں میں — ان آنکھوں سے کوئی بدلی[1] خوں بار نہیں اٹھتی

غم خانۂ دل میرا مدت سے ہے افتادہ — یا رب کبھی اس گھر کی دیوار[2] نہیں اُٹھتی

کب سلکِ گہر پیارے، بازی ترے دانتوں سے — رکھتی ہے، کہ آخر کو وہ ہار نہیں اٹھتی

---

[1] بروزنِ فع ن۲و۴ میں: اک بدلی — [2] دیوار اُٹھنا = تعمیر ہونا

شب وہ بتِ بے پروا تھا سب سے الگ بیٹھا قطعہ یہ نبات سمجھ، یاں کچھ تکرار نہیں اٹھتی
میں نے جو کہا اس سے: چل بیٹھیے مجلس میں — بن آپ کے واں لذّت زنہار نہیں اٹھتی
تب مُنھ کو پھرا اپنے اک ناز سے وہ کافر — بولا کہ مری اب تو بیزار نہیں اٹھتی

اے مصحفی میں کیوں کر اس غم کو بھلا ٹالوں
چھاتی پہ مری سل ہے سو یار نہیں اُٹھتی

486

ہر چند خالِ کنج دہن دل کا چور ہے — پر ہاتھ کا بھی وزدِ حنا اُس کا زور ہے
اے عندلیب گا ہے تو ہم کو بھی کچھ سنا — آخر چمن چمن ترے نالے کا شور ہے
کیا جانے خط کو پڑھ کے کسی کے وہ طفلِ شوخ — نت ہاتھ میں پتنگ ہے واں یا کہ ڈور ہے
آتی ہے شب وہاں سے اک آوازِ دل خراش — تیری گلی میں کیا کسی عاشق کی گور ہے
سچ کہیو کس کے خون کا ساماں کیا ہے آج — فندق بندھی ہوئی جو تری پور پور ہے
پیارے بڑا مزا[1] ہو جو شب آؤں تیرے پاس — سوتے سے چونک اُٹھ کے تو بولے کہ چور ہے

زخموں میں کس کے چور، تو، آتا ہے مصحفی
جامہ تمام خوں میں ترا شور بور ہے

487

جس وقت کہ کوٹھے پر وہ ماہِ تمام آوے — کیا دوٗر ہے گر اس کو سورج کا سلام آوے
کہتے ہیں کہ عاشق کو آتی ہے اجل جلدی — کس طرح کا آنا ہے، نے صبح نہ شام آوے
پاس اپنے ہی رہنے دو تم دل کو مرے صاحب — پھر اس سے ہے کیا بہتر گر آپ کے کام آوے
پانوؤں کو لگا مہندی دل خون کیا میرا — کیا جانیے کیا آفت تا وقتِ خرام آوے

---

[1] ن ۳،۴: عجب مزہ ہو

ہم آپ ہی خط[1] لکھ کر بھیجیں ہیں اسے ورنہ مدت ہوئی اُودھر سے نامہ نہ پیام آوے
کرواتے نہیں صاحب تم غیر سے گر چپی[2] ہو حکم تو کرنے کو یہ کام غلام آوے
اے مصحفی میں کیوں کرے پینے سے مُنھ موڑوں
جب یار ہو خود ساقی با شیشہ و جام آوے

488

زلفوں نے تری دیکھ تو کیا کام کیا ہے کر آپ تطاول[3] مجھے بدنام کیا ہے
اے دل قدم آہستہ کہ اس فرشِ زمیں پر محنت زدۂ چند نے آرام کیا ہے
غازے میں یہ خوں نابِ جگر اپنا ملا کر ہم نے ہی ترے چہرے کو گلفام کیا ہے
وہ خرقہ کہ آلودۂ صد داغ رہا تھا زاہد نے اسے جامۂ احرام کیا ہے
صاحب نظراں مژدہ کہ خورشید کے مانند اس شوخ نے دیدار کو پھر عام کیا ہے
رخسار کو دل دیجیے یا زلف کو یا رب اس کو کئی معشوقوں نے پیغام کیا ہے
اے مصحفی کل قافلہ یاروں کا ہے راہی
کچھ تو نے بھی چلنے کا سرانجام کیا ہے

489

اک ایسے ہی وحشی کو مرا رام کیا ہے بے طاقتیِ دل نے غرض کام کیا ہے
میں ہوں وہ قدح کش کہ جسے پیرِ مغاں نے سر حلقۂ رندانِ مے آشام کیا ہے
آیا سو پھنسا وو ہیں، مگر رشتۂ الفت صیاد نے صرفِ قفس و دوام کیا ہے

---

[1] ن۲و۳: خط لکھ لکھ۔ [2] چپی = غالباً مالش کے لیے استعمال ہوا ہے۔
[3] تطاول کا مادہ طول ہے اور مراد ہے درازدستی، ظلم۔

اے وعدہ فراموش کہیں اب تو خبر لے — مر مر کے میں اس دن کے تئیں شام کیا ہے

ساقی سے گلہ کیا ہے کہ قسّامِ ازل نے — قسمت میں مری دُردِ تہِ جام کیا ہے

اِس رات ستاروں کی جھکی پڑتی ہیں آنکھیں — اس مہ نے مگر جلوہ سرِ بام کیا ہے

عارض پہ نہیں خال، کسی سوختہ جاں نے — سائے میں تری زلف کے آرام کیا ہے

ہر حلقے میں رکھ رکھ گلِ نسرین و شقایق[1] — اُس زلف کو میں روکشِ گلدام کیا ہے

اک حرفِ تمنّا تھا مرے دل میں سو میں نے — وہ بھی گروِ نامہ و پیغام کیا ہے

بدنامی سے میری اُسے کچھ شرم نہ آئی — بے فائدہ میں آپ کو بدنام کیا ہے

ہر چند ہوں آوارہ و لے مصحفی میں نے
کس دن گلۂ گردشِ ایّام کیا ہے

490

دیوار و در اپنے سے اجل آن نہ نکلی — ہے ہے شبِ فرقت میں مری جان نہ نکلی

عالم کے مرقّع کو کیا سیر میں، لیکن — اس میں بھی کوئی صورتِ انسان نہ نکلی

کب تو نے نظر کی کسی عاشق پہ کہ سو بار — ہو کر وہ تری چشم کے قربان نہ نکلی

ہر چند کہ شانے نے کیا اس کو بہت صاف — لیکن گرہِ زلفِ پریشان نہ نکلی

کیا کھینچے گا تیغا[2] تو مرے قتل کی خاطر — تلوار بھی تجھ سے تو مری جان نہ نکلی

ہر چند سفر ہی میں رہے تو بھی، ہمارے — دل سے ہوسِ سیرِ بیابان نہ نکلی

اے مصحفی آیا وہ ترے سامنے لیکن
اک بات بھی مُنھ سے ترے حیران، نہ نکلی

---

[1] شقائق = اک پھول جسے لالہ کہتے ہیں۔ [2] تیغا = بڑی تلوار۔

491

غبغب[1] کی موج جلوہ ذقن[2] میں چُرا گئی — گرتے ہی کچھ کنوئیں میں یہ بجلی سما گئی

اب بھی ہزار غنچے شگفتن کے ہیں قریب — گو بادِ صبح پھولوں کی ڈالی ہلا گئی

اک شاخِ گل پہ صبح مری جا پڑی تھی آنکھ — قامت کو کھینچ مجھ کو قیامت دکھا گئی

تم دیکھتے ہو اس کا رخِ گل پہ بولنا — بلبل بھی طرز نالے کی میرے اُڑا گئی

بازار سے عرب کے جو گذرا وہ خود فروش — لیلیٰ دکانِ ناز کو اپنی اُٹھا گئی

ہم دیکھ لیں گے دانۂ یاقوتِ سرخ کو — لوہو کی بوند گر کوئی مژگاں پہ آ گئی

اُفغاں کہ سرسری سی کسی کی نگاہِ لطف — بیٹھے بٹھائے اک ہمیں تہمت لگا گئی

کیا وہ خرام موج تھی آبِ حیات کی — جو اس روش[3] سے خاک کے مردے جلا گئی

کنجِ قفس میں ہم تو رہے مصحفی اسیر
فصلِ بہار باغ میں دھومیں مچا گئی

492

اس رشکِ مہ کو یاد دلاتی ہے چاندنی — ہر رات مجھ کو آ کے ستاتی ہے چاندنی

آبِ رواں میں حسن ملاتی ہے چاندنی — ہر موج میں گھٹی نظر آتی ہے چاندنی

جا بیٹھتے ہیں ہم لبِ دریا پہ جب کبھو — کیا جھمکے[4] اپنے ہم کو دکھاتی ہے چاندنی

سامانِ بزمِ بادہ میں کرتا ہوں جس گھڑی — آ چاندنی[5] کا فرش بچھاتی ہے چاندنی

صحرا میں جا کے دیکھ کہ ہر رودِ خشک کو — ہم رنگِ جوئے شیر بناتی ہے چاندنی

جب دیکھتی ہے دودھ سا پنڈا[6] ترا میاں — خجلت سے آب ہی ہوئی جاتی ہے چاندنی

---

[1] غبغب = ٹھوڈی اور گلے کے درمیان کا ابھرا ہوا حصہ جسے انگریزی میں Dewlap کہتے ہیں۔
[2] ذقن = ٹھوڑی میں پڑا ہوا گڑھا۔ [3] اس چال سے، طرح سے۔ [4] ن۲: کیا کیا جھمکے ہم کو
[5] چاندنی کا فرش = سفید فروش [6] پنڈا = جسم

پیارے اندھیری راتیں ہیں ایسے میں مل لے تو پھر ورنہ چاند چڑھتے ہی آتی ہے چاندنی
گر وہ بھی قدرداں ہو تو بے جذبۂ طلب روٹھے ہوئے صنم کو ملاتی ہے چاندنی
کیوں کر نہ میں جلوں شبِ ہجراں میں مصحفی
بن یار میرے جی کو جلاتی ہے چاندنی

493

حضورِ عشق سے الفت کا کام کیوں لیجیے جو کام ہو نہ سکے اس کا نام کیوں لیجیے
جو تو نہ دے ہمیں گالی تو وقت بوسے کے ترے لبوں سے میاں انتقام کیوں لیجیے
جو غور[1] اس کی نہ منظور ہو مرے صاحب تو بندگی میں کسی کو غلام کیوں لیجیے
مرا سلام وہ لیتا نہیں، مگر سمجھا کہ یہ غریب ہے اس کا سلام کیوں لیجیے
جو شاخِ گل ہے سو حورِ پیالہ برکف ہے چمن میں ہاتھ سے ساقی کے جام کیوں لیجیے
ترے ہی نام سے تسکینِ دل ہے یا اللہ وگر نہ نام ترا صبح و شام کیوں لیجیے
جو مرغ ہو نے قفس کا بھی ننگ اے صیاد تو فصلِ گل میں اسے زیرِ دام کیوں لیجیے
جو دل گرا نہ پڑے مارے بے قراری کے بغل میں اس کو بھلا تھام تھام کیوں لیجیے
خدا جو دیوے سو اس پر ہی رہیے بس قانع
کسی سے مصحفی کچھ قرض و دام کیوں لیجیے

494

ہم آپھی گر نہ کوچۂ جاناں تلک گئے نالے ہمارے ضعف سے کب واں تلک گئے
کل بندھ گیا جو گریۂ رنگیں کا تار سا آنکھوں سے ڈورے خون کے، دلاں تلک گئے
ہم گل کو چاکِ جیب دکھاویں گے، اے نسیم اب کی بہار میں جو گلستاں تلک گئے

---

[1] پرورش، نگہداشت

ان قیدیوں پہ تہمت نظارہ ظلم ہے — زنداں سے اُٹھ نہ جو درِ زنداں تلک گئے
کیوں آنکھ[1] جھپکے گل سے مری اس بہار میں — اپنے بھی چاک جیب تو داماں تلک گئے
چھاتی پہ چڑھ کے مجھ کو لگا کرنے جب وہ ذبح — فوارے خوں کے اس کے گریباں تلک گئے
پامالِ ناز کرکے انھیں مارے شرم کے — پھر وے کبھی نہ گورِ غریباں تلک گئے
پانوؤں تلک نہ ہم کو رسائی ہوئی دریغ — اوروں کے ہاتھ زلف پریشاں تلک گئے
اک رفتگی سی ہم میں بھی کل کر گئی اثر — ہم اٹھ کے شہر سے جو بیاباں تلک گئے
زنداں کا جن کو حکم کیا تو نے، اے میاں — کیا کہیئے کس خرابی سے زنداں تلک گئے
نرگس تو اک طرف رہی اب کی بہار میں — شہرے اُن انکھڑیوں کے غزالاں تلک گئے
کوچے میں اس کے شورِ قیامت ہوا بلند — ہم شب کو جی چلا کے جو درباں تلک گئے

اے مصحفی دوانے ہیں ہم ان کی بوجھ[2] کے
جو درد مول لے کے نہ درماں تلک گئے

495

کون[3] عہدِ وفا اس بتِ سفاک سے باندھے — سر کاٹ کے عاشق کا جو فتراک سے باندھے
دریائے سرشک اپنا جو طغیان پر آوے — دامن کو وہ ہیں دامنِ افلاک سے باندھے
جاؤں جو حرم میں تو مری آہ کا شعلہ — قندیل ستونِ حرمِ پاک سے باندھے
مژگاں نہ کبھی سدِّ رہِ اشکِ رواں ہوں — دریا کو نہ کوئی خس و خاشاک سے باندھے
چسپید گئی دل سے عجب کیا ہے جو عاشق — تیرا، دمِ خنجر جگرِ چاک سے باندھے
گر دیدۂ بینا ہو تو صناعِ جہاں نے — کیا کیا نہ طلسم ایک کفِ خاک سے باندھے
کشمیر بھی جاؤں تو عجب کیا ہے جو یہ چشم — رونے میں گرد[4] چشمۂ ورناک[5] سے باندھے

---

[1] آنکھ جھپکنا= شرمندگی ہونا۔ [2] عقل [3] ن۲و۴: کیا عہدِ وفا۔
[4] گرد باندھنا = شرط لگانا۔ [5] ورناک = ویری ناگ کشمیر کا مشہور چشمہ

اے مصحفی شاعر وہی جو ایسی زمیں میں
مضموں نئے قوتِ ادراک سے باندھے

496

گلدستہ جو لختِ دلِ صد چاک سے باندھے — گر تارِ جگر ہو نہ تو کیا خاک سے باندھے
قاتل سے یہ کہیو کہ بھلا ٹک دمِ بسمل — پٹی تو نہ اس دیدۂ نمناک سے باندھے
میں مے سے کروں توبہ تو پھر ابرِ بہاری — اس سال تو خوشہ نہ رگِ تاک سے باندھے
کل میں شبِ ہجراں میں تری، غصّے کے مارے — الماس کے ٹکڑے جگرِ چاک سے باندھے
ہم سجدہ ادا کر چکے، اب سر کو ہمارے — نیزے پہ رکھے خواہ وہ فتراک سے باندھے
آہوں کے شراروں کو اڑا کل شبِ ہجراں — میں اور بھی تارے کئی افلاک سے باندھے
کیا کیا نہ غزالِ ختنی مصحفی میں نے
اس دشت میں تارِ نظرِ پاک سے باندھے

497

جو بندِ قبا یار کے ناپاک[1] سے باندھے — دھجی[2] تو وہ میرے بھی دلِ چاک سے باندھے
کیا لطف ہو ساقی تو اگر ایسی ہوا میں — گردن کو صراحی کی رگِ تاک سے باندھے
وہ صیدِ رسن بستہ نہ جیتے[3] تو رہا ہو — جو عشق کی ڈوری ترے فتراک سے باندھے
عاشق شبِ ہجراں میں ان آہوں کی طنابیں — ہے خوب تو گر خیمۂ افلاک سے باندھے
دامن کے ترے گھیر سے کیا دور رہے پیارے — گر اپنی ہوا میری کفِ خاک سے باندھے

---

1. ناپاک = بے قراری، گھبراہٹ۔ 2. دھجی = کپڑے کا ٹکڑا
3. نہ جیتے تو = یعنی زندگی میں تو۔

وہ سروِ رواں آوے اگر جلوہ گری میں فتنے کے قدم قامتِ چالاک سے باندھے

ہم بیٹھے ہیں کھول اپنی کمر، مصحفی ہاں اب
جو چاہے سو دل اُس بُتِ بے باک سے باندھے

498

جب اس بت نے مہندی بھرے ہاتھ دھوئے ہم آنکھوں سے یک لخت خونناب روئے
نہ رونا مرا سرسری جانو یارو کہ رونے نے میرے بہت گھر ڈبوئے
کریں جستجو کس کی، دیکھ اس کو یا رب گئے ہیں کئی دن سے ہم آپ کھوئے
جنھیں تیری ٹھوکر کا تھا دل میں کھٹکا لحد میں بھی آرام سے وے نہ سوئے
نہ فرہاد بے چارہ مقصد کو پہنچا سدا عشق میں اس نے پتھر ہی ڈھوئے[1]
زبس شوق تھا اس کو رنگِ حنا سے مری خاک پر بیج مہندی کے بوئے
شماری کے دانوں کے مانند آخر سناں نے تری متصل دل پروئے

مگر مصحفی خون رویا ہے چھپ چھپ
ہیں سرخ اب تلک اس کی آنکھوں کے کوئے[2]

499

جب تک کہ میرے دل میں تری آرزو رہے یہ آرزو ہے مجھ کو کہ تو خوب رو رہے
جس صید کا گذر ہو کبھی صید گاہ سے یوں چاہیے کہ اس کی نظر چار سُو رہے
جب ٹانکے توڑ ڈالے ہوں خمیازے کھینچ کھینچ عاشق کے زخمِ دل پہ کہاں سے رفو رہے
اے دیدہ شرطِ گریہ ہے ابرِ بہار سے اتنا تو کیجیو کہ مری آبرو رہے

---

[1] پتھر ڈھونا = مشقت جھیلنا [2] آنکھ کا کویا = گوشہ چشم

جو طفلِ خوب رؤ کہ ہو آواز اس کی خوب | کیا خوب ہے ہمیشہ اگر خوش گلوٗ رہے
کیا کیا نہ اپنے دل کی نکالوں میں حسرتیں | ظالم گر ایک شب بھی مرے پاس توٗ رہے
عاشق وہ چاہیے کہ اگر خاک میں ملے | تو بھی ہمیشہ در صَدَدِ[1] جستجو رہے
میں نے کہا جو اس سے کہ آ وَ نہ جانِ من | بولا کہ میرے ساتھ نہ یہ گفتگو رہے
بوسہ لیا ہو جس نے کبھی تیری زلف کا | مرجاوے وہ تو اس کا دہن مشک بوٗ رہے

ہم نذرِ تیغ یار کریں اس کو مصحفی
گریے کے ہاتھ سے جو بدن میں لہوٗ رہے

500

رحمت تری اے ناقہ کشِ محملِ حاجی[2] | چاہے تو کرے راہبِ بت خانہ کو ناجی
کس دن نہ اُٹھا دل سے مرے شورِ پرستش | کس رات یہاں کعبے میں ناقوس نہ باجی[3]
میں آپ کمر بستہ ہوں اب قتل پہ اپنے | دن یار ہے جینے سے مرا بس کہ خفا جی
اک سینے میں دل رکھتے ہیں ہم سو بھی وہ کیا دل | جو روز رہے لشکرِ سلطاں کا خراجی
تم شب مجھے دیتے ہوئے گالی تو گئے ہو | میں بھی کسی دن تم سے سمجھ لوں گا بھلا جی
شیشہ مئے گلگوں کا ہے یا رنگِ شفق سے | رنگ اپنے دکھاتا ہے مجھے چرخِ زجاجی[4]

اے مصحفی میں افصحِ شیریں سخناں ہوں
کب مجھ سے طرف ہو سکے ہے ہر کوئی پاجی

501

نہیں کرتی اثر فریاد میری | کوئی کس طرح دیوے داد میری

---

1. درصدد = درپے
2. یعنی اے وہ ذات جو مسافرِ حج کی منزلِ دشوار کو آسان بناتی ہے۔
3. ناقوس کی تانیث ملاحظہ طلب ہے۔
4. زجاجی = شیشے جیسا بنا ہوا۔

فغانِ جاں گسل رکھتا ہوں لیکن نہیں سنتا، مرا صیاد میری

تو اے پیغامبر جھوٹی ہی کچھ کہہ کہ خوش، ہو خاطرِ ناشاد میری

میں تجھ کو یاد کرتا ہوں، الٰہی ترے بھی دل میں ہوگی یاد میری

نہیں ہوتا مقید میں کسی کا طبیعت ہے بہت آزاد میری

اُدھر اے مصحفی کیا دیکھتا ہے
غزل سن آ مرے استاد، میری

502

اس نزاکت پر پھریں ہم کہ اے یہ بُل کھائے ہوئے پھرتے ہو شبنم کا جامہ بر میں بھڑکائے ہوئے

خفتگانِ خاک کی مجھ کو فراغت پر ہے رشک سوتے ہیں کیا چین سے[1] یہ پانْو پھیلائے ہوئے

لگ رہی ہے خانۂ دل کو ہمارے آگ ہائے اور ہم چاروں طرف پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

سن کے ہمسائے مرے نالوں کو کہتے ہیں کہ وائے کس عذابِ جان کے ہم آکے ہمسائے ہوئے

ہم موئے جاتے ہیں مارے انفعالِ عشق کے دیکھتے ہیں جوں جوں نیچے آپ شرمائے ہوئے

پیچ میں لائے[2] ہیں کیا کیا ٹیڑھے[3] بانکوں کو میاں پیچ پگڑی کے تری، ہیں یہ جو بل کھائے ہوئے

گل گریباں چاک ہیں تم پر، خبر لو ان کی ٹک ہر طرف پھرتے ہو کیا چولی کو مسکائے ہوئے

کچھ یہ دل ناداں نہیں اس دل کو ہم اے مصحفی
کب تلک باتوں میں رکھیں یوں ہی بہلائے ہوئے

503

شانے کی عمر گرچہ جدائی میں کٹ گئی پر زلف بھی فراق میں شانے کے لَٹ گئی[4]

---

[1] ن ۲: سب پانْو۔ [2] پیچ میں لانا۔ چکر میں ڈالنا۔ [3] ٹیڑھے بانکے = خاص وضع وقماش کے لوگ۔ یاد کیجیے میر کا شعر ''سارے رند اوباش جہاں کے..... الخ [4] لٹ جانا = (بفتح اول) کمزور ہو جانا، سُت جانا۔

نرگس کی وے ہیں آنکھیں، نہ گل کا وہ رنگ ہے — کچھ ان دنوں چمن کی ہوا ہی پلٹ گئی
چھوڑا نہ ایک لحظہ تری زلف نے خیال — رخ سے جدا ہوئی تو گلے سے لپٹ گئی
معشوق کو بھلا نہیں عاشق سے اختلاط — بلبل کی ایک چونچ میں غنچے کی پھٹ گئی
جورِ فلک سے ہم نہ کبھی سر اُٹھا سکے — جوں شمع زیرِ تیغ ہی یاں عمر کٹ گئی
بازار میں لیے میں دُرِ اشک کو بہ کف — اتنا پھرا کہ قیمتِ اوّل بھی گھٹ گئی

کہتے ہیں ٹکڑے ٹکڑے ہوا رات مصحفی
سنتے ہی اس کے اپنی طبیعت تو بٹ گئی[1]

504

گردن سے میری تیغِ جفا گر پلٹ گئی — گو پلٹے، اس میں کچھ مری قیمت نہ گھٹ گئی
ساعد کے حسن سے ید بیضا ہوا خجل — جب اس کی آستین کی مہری اُلٹ گئی
تو میرے آگے غیر سے باتیں کرے دریغ — اپنی طبیعت ایسی ہی باتوں سے ہٹ گئی
یاں ہم کمر پہ ہاتھ دھرے رہ گئے، وہاں — پٹکے کے ساتھ زلف کمر سے لپٹ گئی
اس چاکِ آستیں کا ذرا دیکھیو پھبن — اس بانکپن سے غنچے کی کہنی نہ پھٹ گئی
انداز میں نگاہ کے مارا پڑا کوئی — گردن کسی کی تیغِ تغافل سے کٹ گئی
دن رات اس گلی میں یہی ماجرا رہا — کب عاشقوں کی، در سے ترے، بھیڑ چھٹ گئی

لگنے چلی تھی آنکھ کہ اتنے میں مصحفی
بولا جو مرغِ صبح تو پھر نیند اُچٹ گئی

505

قدغن ہے کہ در تک کوئی یاں آنے نہ پاوے — اور بے خبر آوے بھی تو پھر جانے نہ پاوے

---

[1] بٹ گئی = سراسیمہ ہوگئی

واں روزنِ دیوار بھی اب بند ہوئے ہیں — تا سینے کے روزن کوئی دکھلانے نہ پاوے

یوں صاحبِ بستاں کا ہے اب حکم کہ صیاد — اس باغ میں بلبل کا قفس لانے نہ پاوے

تو آگے ہی جا بیٹھ دلا، بزم میں اس کی — تا آکے کوئی کچھ اسے سکھلانے[1] نہ پاوے

کیا خاک کرے سحر[2]، ترے نقشِ قدم کی — جو خاک بھی اس کوچے سے لے جانے نہ پاوے

تو شوق سے لچکا قدِ جوں شاخ گل اپنا — پر موے کمر دیکھیو بل کھانے نہ پاوے

کعبے میں تو ہم کو نہ ملا مصحفی، یارو
بھیجو کوئی قاصد اُسے بت خانے نہ پاوے

506

اک پل میں بھلائے سب، دکھ درد زمانے کے — صدقے میں گیا تیرے اس آنکھ لڑانے کے

ہم نے نہ لگایا دل، ہر چند کہ عالم میں — اسباب مہیا تھے سب دل کے لگانے کے

از بس کہ سوا اپنے پاتے نہیں یاں کوئی — ہم اس لیے حیراں ہیں اس آئینہ خانے کے

اس آنے و[3] جانے میں کیا ناز نکلتا ہے — صدقے ترے آنے کے، قرباں ترے جانے کے

رفتار تری ہم پر لائی تھی قیامت کل — انداز تھے سب اس میں مُردوں کے جلانے کے

گو تو نہ بُرا مانے ہم سے تو نہ ہوگا یہ — دیکھیں گے تری زلفیں ہم ہاتھ میں شانے کے

میاں مصحفی اتنا تو رویا نہ کرو صاحب
خوناب سے سب تر ہیں تکیے بھی سرہانے کے

507

جوں تیغ خوش غلاف کل اس کی اُگل پڑی — گاوزمیں[4] زمین کے نیچے اُچھل پڑی

---

[1] سکھلانا = بہکانا۔ [2] بعض ٹوٹکوں کے لیے (خصوصاً تسخیر کے واسطے) پیروں کے نیچے کی خاک بھی استعمال کی جاتی تھی۔ [3] یہ عطف اب متروک ہے۔ مصحفی کے دور تک رائج تھا۔ نسخۂ لکھنؤ میں ”آنے میں جانے میں“۔ [4] گاوزمیں = قدیم خرافی تصور کے مطابق یہ زمین گائے کے سینگ پر قائم ہے، وہ گائے ایک مچھلی کی کمر پر کھڑی ہے اور مچھلی پانی میں تیر رہی ہے۔

یہ چہچہے ہیں اس کے تو دیکھو گے باغ میں   بلبل کے آشیان پہ برق آج کل، پڑی[1]
بادِ صبا نے اس کے یہ کیا کان میں کہا   گُل کی کلی جو کپڑوں سے باہر نکلی پڑی
شیشے کا کچھ گناہ نہیں اس میں دخترِ زر   اُس کی صفائی دیکھ کے تو ہی پھسل پڑی
دشمن تھا میرا یہ دلِ بیتاب مصحفی
مجھ کو ملایا خاک میں تب اس کو کل پڑی[2]

508

ترا شوقِ دیدار پیدا ہوا ہے   پھر اس دل کو آزار پیدا ہوا ہے
سدا پان کھا کھا کے نکلے ہے باہر   زمانے میں خوں خوار پیدا ہوا ہے
یہ مدفن ہے کس کا، جو ہر لالہ یاں سے   جگر خوں، دل افگار پیدا ہوا ہے
اڑائے ہیں لختِ جگر آہ نے جب   ہوا میں بھی گلزار پیدا ہوا ہے
میں کیوں کر نہ رکھوں عزیز اپنے دل کو   کہیں دل سا بھی یار پیدا ہوا ہے
کہے تھی یہ طفلی میں دیکھ اُس کو دایہ   یہ لڑکا طرح دار پیدا ہوا ہے
میں آیا ہوں مدّت میں کوئی اس سے کہہ دو: تمھارا گنہگار پیدا ہوا[3] ہے
یہ دل مجھ سے لڑتا ہے تیری طرف سے   کہاں کا طرف دار پیدا ہوا ہے
میاں مصحفی بیچتے ہو جو دل کو
تو لاؤ خریدار پیدا ہوا ہے

509

ہم نہ فرہاد ہیں جو تیشے سے سر چیریں گے   ہاتھ آجائے گا خنجر تو جگر چیریں گے

---

[1] برقِ افتادن کا ترجمہ۔ [2] کل پڑنا = چین آنا۔ [3] پیدا ہوا ہے = ظاہر ہو گیا ہے۔ آ گیا ہے۔

بستہ بالی[1] نے نپٹ تنگ کیا ہے یا رب — وقت پرواز کے ہم بھی کبھی پر چیریں گے

تو نہ ہووے گا کبھی خانہ نشیں گر عشاق — چوبِ صندل سے ترے تختۂ در چیریں گے

تیغِ ابرو سے تری میں نہ پھروں گا ہرگز — مجھ کو آرے کے تلے رکھ کے اگر چیریں گے

مر گئے ہم، تو گریبانِ کفن کی جاگہ — قدسیاں آکے گریبانِ سحر چیریں گے

عقدۂ دل نہ کھلا، ناخنِ ابرو سے ترے — اس معمے کو ہم اب لے کے تبر چیریں گے

ہم وہ ہتھ چھٹ ہیں[2] کہ گر ہووے گا دشمن جوں کوہ — ایک ضربت میں اسے تا بہ کمر چیریں گے

مصحفی کشتۂ شمشاد قداں ہے، ہم تو
اس کے تختوں کو کوئی تازہ شجر چیریں گے

510

اس کے ہاتھوں سے ہیں سب آئینہ گر فریادی — آرسی کس نے یہ لے جا کے اُسے دکھلا دی

آنکھیں چندھیا گئیں دامن کی کناری سے تری — جنبشِ پا نے تری بجلی سی جب چمکا دی

کل جو کھینچا میں اسے تنگ بغل میں تو کہا: — چھوڑ بے تو نے تو چولی مری سب مسکا دی

ہم اسیروں کی بھی کچھ یاد ہے ان کو یا رب — وے جو لوٹیں ہیں بہارِ چمنِ آزادی

ذبح کرتا ہے وہ بت نظروں میں مجھ کو اور لوگ — یہی کہتے ہیں کہ اللہ رے تری جلادی

ہو کے چنگا جو میں آیا تو مرے قاتل نے — مجھ پہ اک وار کی پھر، نامِ خدا، ٹھہرا دی

مصحفی میں تو نہ لکھتا تھا ولے کیا کیجے
مجھ سے خامے نے غزل اور بھی اک لکھوا دی

---

۱ بستہ بالی = پر بندھے ہونے کی حالت۔ ۲ ہتھ چھٹ = کاری اور فوری ہاتھ لگانے والا۔ یہ خاص روہیل کھنڈ کی بولی ہے۔

511

چلتے چلتے جو کمر اُس نے ذرا لچکا دی
مجھ کو اک آن میں بجلی کی ادا دکھلا دی

کثرتِ گریہ سے دل ڈھے کے ہوا خاک کا ڈھیر
اب کے بارش نے عمارت ہی یہ سب بٹھلا دی[1]

تھی بھری ہاتھ میں ساقی کے گلابی مے کی
ہنستے ہنستے ابھی دکھلا کے مجھے چھلکا دی

سیکڑوں خون کیے اس نے عجب کیا اس کا
عشق نے گردنِ فرہاد اگر کٹوا دی

تنگ پوشی میں مزہ اس نے جو پایا تو وو ہیں
چولی انگڑائیاں لے لے کے بھی مسکا دی

راہ جاتے مجھے کل پھر کے جو دیکھا اس نے
آہ لا کر کے لبوں پر میں وو ہیں ٹھہرا دی

حکمِ سلطاں ہے کہ اس محکمۂ عدل کے بیچ
دستِ فریاد کو اونچا نہ کرے فریادی[2]

میں نہ بھولا اسے تا زیست، تری آنکھوں نے
وہ جو اک بات اشاروں میں مجھے سمجھا دی

مصحفی جل کے میں گر خاک ہوا اُس کو میں
میرے دشمن نے مری خاک بھی لے اُڑوا دی

512

نظر آتے ہیں پردے تیری آنکھوں کے گلابی سے
کہیں مے پی ہے تو نے یا اُٹھا ہے نیم خوابی سے

ہوا میں ہے وہ کیفیت کہ نخل اس باغ کے سارے
گلے میں بانہیں ڈالے ہیں کھڑے باہم شرابی سے

نمودِ رنگِ گل یوں غنچۂ سوسن کی تہ میں ہے
شرابِ سرخ دیوے جلوہ جوں اودی گلابی سے

بھلا سچ کہیو، پیارے کس کا ان سے خوں ٹپکتا ہے
حنا آلودہ یہ جو ہاتھ ہیں تیرے شہابی سے

نزاکت پر نظر کیجو کہ کل اس نے شبِ مہ میں
چھپایا چاند سے مکھڑے کو اپنے آفتابی[3] سے

---

[1] عمارت کے لیے بٹھلانا آج بھی بولا جاتا ہے۔ بارش میں گھر بیٹھ گیا، یا بارش نے گھر بٹھلا دیا۔

[2] ایسا شعر بغیر واقعاتی پسِ منظر کے نہیں ہوسکتا۔ [3] آفتابی = ایک طرح کا زنانہ لباس جو اوڑھنی کی طرح استعمال کیا جاتا ہے، اسے زنانہ چھتری کے معنوں میں بھی بولتے ہیں۔

کج دِلوا کج[1] پڑے تھا بس کہ مستی میں قدم اس کا
گھر اپنے تو میں لایا اس کو شب پر سُو خرابی سے

خدا کے واسطے مکھڑا چھپا، ورنہ قیامت ہے
پڑا ہے شور اک عالم میں تیری بے نقابی سے

جو میرا دل نہیں جلتا تو پیارے میرے پہلو پر
اُٹھا لیتا ہے تو کیوں ہاتھ کو رکھ کر شتابی سے

سوالِ بوسہ پر سَو سَو سنائیں گالیاں مجھ کو
کوئی عہدہ برآ ہو کیوں کے اس حاضر جوابی سے

مکانِ مصحفی اس کو نہ سمجھو آپ کا گھر ہے
تکلّف کچھ نہیں کھل بیٹھیے یاں بے حجابی سے

513

دل چیز کیا ہے، چاہیے تو جان لیجیے
پر بات کو بھی میری ذرا مان لیجیے

مریے تڑپ تڑپ کے دلا، کیا ضرور[2] ہے
سر پر کسی کی تیغ کا احسان لیجیے

آتا ہے جی میں چادرِ ابرِ بہار کو
ایسی ہوا میں سر پہ ذرا تان لیجیے

میں بھی تو دوست دار تمھارا ہوں، میری جاں
میرے بھی ہاتھ سے تو کبھو پان لیجیے

کیجیے شریک ہم کو بھی اے دل، روا نہیں
یوں آپھی آپ لذّتِ پیکان لیجیے

اس اپنی تنگ چولی پہ ٹک رحم کیجیے، جان
خمیازہ اس طرح سے نہ ہر آن لیجیے

گر قبرِ کشتگاں پہ تم آئے ہو، تو میاں
اپنے شہیدِ ناز کو پہچان لیجیے

بوسے کا جو تمھارے گنہ گار ہو میاں
لازم ہے اس سے بوسہ ہی تاوان لیجیے

وحشت کے دن پھر آئے ہیں اس نو بہار میں
اے چاکِ جیب پھر رہِ دامان لیجیے

مشکل نہیں ہے یار کا پھر ملنا مصحفی
مرنے کی اپنے جی میں اگر ٹھان لیجیے

---

[1] کج دوا کج = اُلٹا سیدھا۔ [2] ن ۲: کیا حصول ہے۔

514

پان کھا کر گھر سے باہر یوں نہ آیا کیجیے
آرسی میں مُنھ کو اپنے مُنھ دکھایا کیجیے

چاند سا مُنھ کھول دینا تم کو یوں لازم نہیں
دیکھ کر ایدھر اُدھر برقع اُٹھایا کیجیے

میں نہ مانوں گا کہ تم بھی چاہتے ہو مجھ کو، ہائے
جھوٹی باتوں سے نہ میرا جی جلایا کیجیے

گر خوشی ہے آپ کی میرے ستانے میں تو خیر
میں بھی اب مانع نہیں، اچھا ستایا کیجیے

دیکھتے ہی مجھ کو تم آنکھیں چُرا لیتے ہو کیا
اک ذرا چتون سے چتون تو ملایا کیجیے

نیک و بد سب جانتے ہیں تم کو باشرم و حیا
شوخ چشموں سے نہ یوں آنکھیں لڑایا کیجیے

یار نے گالی بھی دی تو کیا ہوا میاں مصحفی
ہر گھڑی اس بات کو مُنھ پر نہ لایا کیجیے

515

سیاہی کیا بیاں کیجے تری زلفوں کے بالوں کی
کہ دیکھے سے جنھوں کے جان لہراتی[1] ہے کالوں کی

کوئی زناریوں سے سر فرو لاتا ہے وہ کافر
جو پگڑی چھین لے دھولیں[2] لگا تسبیح والوں کی

کمر کی فکر میں تیری سدا حیران رہتے ہیں
نہیں کچھ کام کرتی عقل یاں نازک خیالوں کی

ہنسو ہو جانِ من، تم اس لیے آشفتہ حالوں پر
کہ صورت آپ نے دیکھی نہیں آشفتہ حالوں کی

برنگِ آئینہ میں سامنے حیراں کھڑا دیکھوں
تو اے حجام یوں لیوے صفائی[3] اس کے گالوں کی

جگر کس کا ہے ایسا جو اَب ان کے سامنے آوے
دکن تک دھوم پہنچی ہے تری مژگاں کے بھالوں کی

اگر خورشید سے روشن ہوں تو بھی خوار پھرتے ہیں
غرض اس دَور میں یہ قدر ہے صاحب کمالوں کی

دیارِ عشق میں ہر اک کے مُنھ پر خاک اڑتی تھی
عجب صورت میں دیکھی اس نگر کے رہنے والوں کی

---

[1] جان لہرانا= خوف طاری ہونا، لرزنا۔ [2] دھول لگانا= سر پر ہاتھ مارنا
[3] صفائی لینا= خط بنانے کے بعد ہاتھ پھیرنا۔

ہمارے دام میں اے مصحفی وے کس طرح آویں
کمندِ زلف میں گردن ہے جن رعنا غزالوں کی

516

رسائی عرش تک کیوں کر نہ ہووے اس کے نالوں کی
لگی ہو چوٹ جس کے دل پر ان چھڑیوں[1] سے بالوں کی

اگر دیکھیں ترے قد کی لٹک[2] اے شاخِ گل اک دن
لٹک مل جائے ساری خاک میں نازک خیالوں کی

گلابی چھینٹے ڈالے اپنی نظروں سے تو سب گذرے
بہار اب دیکھنی ہے، زعفرانی چہرے والوں کی

کبھی ابرِ سیہ میں جیسے بجلی کوند جاتی ہے
چمک زلفوں میں یوں دیکھی ترے کانوں کے بالوں کی

تری نازک کمر کو مو بھی کہتے وے تو ڈرتے ہیں
طبیعت بس کہ نازک ہوتی ہے نازک خیالوں کی

مرکّب[3] کی جگہ نوکِ قلم سے خوں ٹپکتا ہے
تماشاہ گاہ ہے تحریر ہم رنگیں مقالوں کی

چبھیں ہیں دل میں یہ بوٹے سے قد اے مصحفی میرے
بلائے جان ہو ہے[4] دوستی ان خورد سالوں کی

---

[1] چھڑیاں = وہ لمبے لمبے علم جو میلے والے لے کر نکلتے تھے۔ مثلاً شاہ مدار کی چھڑیاں (رک۔ قتیل، ہفت تماشا)۔ [2] لٹک = خراش [3] مرکب = سیاہی [4] ن۲: بلائے جاں ہے ہوتی دوستی۔

517

جب زہ اس کی کمان پر آئی — آفت ہر اک نشان پر آئی

کانپ اُٹھا میں تو، رات بلبل کے — برق جب آشیان پر آئی

ہیں تری تیغ میں جو دندانے — کیا کسی استخوان پر آئی

گردشِ چشم سے تری، اے شوخ — اک مصیبت جہان پر آئی

مصحفی دردِ دل کہے ہی بنے
بات اب تو زبان پر آئی

518

جی کی دشمن اس کی زلفوں کی پریشانی ہوئی — ہم نے کیوں چھیڑا اُنھیں، کیا ہم سے نادانی ہوئی

غم بڑا یہ ہے کہ آخر باچنیں سعیِ بلیغ — ہم کو کسبِ عشق سے حاصل پشیمانی ہوئی

بس کہ سر رگڑا کیا میں آستانِ یار پر — ماہِ نو کی طرح صرفِ سجدہ پیشانی ہوئی

یاد کر کس ناوکِ مژگاں کو، خوں رویا کہ رات — اشک کی ہر بوند جیسے لعلِ پیکانی[1] ہوئی

کیوں کے ہم ضامن ہوں یا رب اچپلاہٹ[2] کے تری — برق کے شعلے کی خس سے کب نگہبانی ہوئی

گریۂ شب سے یہ سوز اپنا گھٹا کچھ؟ بلکہ اور — آتشِ دل پر ہماری روغن افشانی ہوئی

اے زلیخا اس قدر بے صبری، اب کیا فائدہ — ساتھ ہی یوسف کے تو بھی کیوں نہ زندانی ہوئی

بس کہ شانِ حسن میں یوسف سے تو، کچھ کم نہ تھا — صفحے پر تصویر تیری یوسفِ ثانی ہوئی

شب تری مجلس میں واں دورِ قدح چلتا رہا — تا سحر یاں آنسوؤں کی سبحہ گردانی ہوئی

اک نگاہِ آشنا پر تھا مدار اپنا، دریغ — اس سمیں[3] کو دیکھ وہ بھی ہم سے بیگانی ہوئی

---

[1] لعلِ پیکانی = لبوتری شکل کا لعل۔ [2] بمعنی شوخی۔ [3] ہندی کا لفظ سے समय یہاں حالت کے معنوں میں۔

شب دلِ بیمار میرا دیر سے تھا محتضر[1] بارے تک آتے ہی تیرے اس کی آسانی ہوئی
ایک دم پاسِ سخن سے میرے تئیں فرصت نہیں شعر بانی[2] بھی کہے تو، اک جہاں بانی ہوئی
بس کہ کیشِ کفر میں کامل تھے ہم اے مصحفی
دیرِ ترسا کی مفوض[3] ہم کو رہبانی ہوئی

519

آئے ہے دل میں خس و خار سے اک ہیبت سی آشیاں سے مجھے کچھ ہو گئی ہے وحشت سی
سرِ بالیں ہی علیلانہ[4] پڑا رہتا ہوں ان دنوں جاتی رہی ہے مری کچھ طاقت سی[5]
شکر قاتل کا کروں کیا کہ بہ زیرِ دمِ تیغ جوں جوں تڑپوں ہوں مجھے آوے ہے اک لذت سی
برقِ شمشیرِ تغافل کا کہوں کیا انداز ناگہاں سر پہ مرے آ پڑی اک آفت سی
جب سے دیکھے ہیں میں اوضاعِ فلک رہتی ہے مثلِ آئینہ شب و روز مجھے حیرت سی
تیری تصویر ہی دن رات پڑا دیکھوں ہوں بس کہ کچھ اس سے مجھے ہو گئی ہے الفت سی
اے شبِ مرگ میں بس تیرا بھی شہرہ دیکھا تیرہ و تار کہاں ہے تو، شبِ فرقت سی
مصحفی کی جو تو بالیں پہ دمِ نزع نہ تھا
اس کی آنکھوں سے عیاں ہوتی تھی اک حیرت سی

520

مجھ سے نسیمِ قدس بھی پیچھے کہیں رہی مقدور ہر کسی کا نہیں میری ہمرہی

---

1. محتضر = حالت نزع میں۔ 2. شعر بانی، نئی ترکیب ہے اور غالباً مصحفی کی ایجاد کردہ، شعر کے لوازم اور نزاکتوں کا لحاظ رکھنا، اور اس کے نوک پلک کی فکر کرنے کے لیے شاید اس سے بہتر اظہار نہ ملے۔
3. یعنی ترسا کے دیر کی رہبانی سونپی گئی۔ 4. علیلانہ = بیماروں کی سی حالت، یہ بھی مصحفی کی وضع کردہ ترکیب ہے۔ 5. ایسے بہ ظاہر معمولی الفاظ کے غیر معمولی استعمال میں قدرتِ سخن ظاہر ہوا کرتی ہے اس غزل میں ردیف کی معنویت مصحفی کے رتبہ استادی کی گواہ ہے۔

افسوس یہ رہا کہ بہ ہنگامِ ذبح بھی — قاتل سے میں نے آرزوے دل نہ کچھ کہی
نظروں میں ہر کسی کی سبک تو میں ہو چکا — کیا جانے کیا دکھاوے گی اب آگے بے تہی[1]
کندن سے رنگ کو ترے کب پہنچے ہے میاں — جلوے میں گرچہ ہے زرِ خورشید ڈہڈہی[2]
جو ہیرے کی کنی کہ نہاں میرے دل میں تھی — آخر لباسِ اشک میں وہ آب ہو، بہی[3]
رکھے وہ کس طرح سے خبر میرے عشق کی — جب اپنے حسن سے بھی نہ ہو اس کو آگہی

اب کی جو تو نے نامہ لکھا مجھ کو مصحفی
میں اس کو رکھ دوں شعلۂ آتش پہ تو سہی

521

کیا چمک نتھ کی ہے اور کیا ہی ڈلک[4] موتی کی ہے — کوند بجلی کی کہوں یا یہ لپک[5] موتی کی ہے
اس جھمکنے سے ترے دیکھا تو کچھ کم بھی نہیں — یہ جو عارض پر ترے، کافر جھجک[6] موتی کی ہے
ایک تو رخسار کی تیرے جھلک کرتی ہے قہر — آب داری میں بلاتس پر جھمک موتی کی ہے
اشک آنکھوں سے مری جتنے بھی گرتے ہیں صنم — بس کہ ان آنکھوں میں سرخی اب تلک موتی کی ہے

ٹک ڈھلاوٹ کو ذرا تم اس غزل کی دیکھیو
پاک بیناں، وصف[7] اس میں منسلک[8] موتی کی ہے

522

یہ تیروں کا کس کے نشانا ہوا ہے — جو دل میرا زنبور[9] خانہ ہوا ہے

---

[1] بے تہ = بے حیثیت، سبک سر [2] ڈہڈہا = چمکتا ہوا، جسے انگریزی میں Glittering کہیں گے۔
[3] یعنی بہ گئی۔ [4] ڈلک = روشنی کی لکیر سے جو موتی کے ساتھ گھومتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔
[5] یہاں لپک بھی بڑے لطیف مفہوم کو ادا کر رہا ہے۔ [6] موتی کی جھجک = کبھی چمکنا، کبھی ماند پڑ جانا۔
[7] وصف مؤنث استعمال ہوا ہے۔ [8] منسلک (بہ فتح لام) موتی = پروئے ہوئے موتی۔
[9] زنبور خانہ = بھڑوں کا چھتا۔

کہیں راہ بھولے ہو شاید، تمھارا ہماری طرف کو جو آنا ہوا ہے

میں پھڑکا ہوں یاں تک کہ کنجِ قفس میں پروں کا مرے آشیانہ ہوا ہے

کرے قد کشی کیوں نہ سروِ چمن سے وہ نامِ خدا اب تو سیانا[1] ہوا ہے

شکنجے میں[2] زلفوں کے کھینچ اس کو لڑکے یہ مُلّا بہت چارشانہ[3] ہوا ہے

خبر لے شتاب ان کی صیّاد آ کر قفس بُلبلوں کا پُرانا ہوا ہے

نہیں خوں کا اک قطرہ اب اس میں باقی یہ دل تیری مژگاں کا چھانا[4] ہوا ہے

جو بھیجا ہے اس پاس میں اپنے دل کو تو پیچھے سے قاصد روانہ ہوا ہے

کل آسودگاں کی جو تربت سے گذرا قطعہ جنھیں خواب کرتے زمانہ ہوا ہے[5]

پڑا ایک مرقد پہ جو پانو میرا یہ آئی صدا: کیا دوانہ ہوا ہے

ترے در پہ بیٹھا ہے گھٹنوں کو پکڑے

یہی مصحفی کو بہانہ ہوا ہے

523

مسّی ہے کہ اک ابر دھواں دھار اُٹھا[6] ہے اس مسّی سے کتنوں کو ابھی مار اٹھا ہے[7]

پیارے، جو موا خواہشِ دیدار میں تیری وہ حشر کو بھی طالبِ دیدار اُٹھا ہے

---

1. سیانا = یہ بھی خالص بولی کا لفظ ہے۔ لڑکپن سے جوانی میں قدم رکھنے والے کے لیے کہتے ہیں کہ اب وہ سیانا ہوگیا ہے۔ 2. شکنجہ = سزا دینے کے لیے قینچی نما لکڑی کا بنا ہوا ہوتا ہے (ن۴ میں: کھینچ اس کو اک دن)۔ 3. چارشانہ = موٹا تازہ، گٹھا ہوا حریص۔ 4. چھانا ہوا میں ایہام ہے، یعنی چھلنی کیا ہوا، اور خوب دیکھا بھالا۔

5. میر: کل پانو ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر میں بھی کبھی کسو کا سرِ پُر غرور تھا

6. ان ردیفوں میں اٹھنا مصدر کے مختلف استعمال غور طلب ہیں۔ 7. یعنی مار چکا ہے۔

دیکھے ہے جو کوئی اس کو تو کہتا ہے کہ: اللہ — یہ طفل بھی کیا شوخ و جفا کار اُٹھا[1] ہے
خوں کتنوں کا سرخی نے اُن آنکھوں کی کیا ہے — جب صبح کو سوتے سے وہ خوں خوار اُٹھا[2] ہے
اُس بزم میں آیا ہے مرا ذکر تو ناگاہ — وہ ہاتھ میں لے کر وہیں تلوار[3] اُٹھا ہے
چاند ابر میں جاتا ہے چھپا شرم کے مارے — شاید کہ ترا پردۂ رخسار اُٹھا[4] ہے
چکھا ہے مرے خوں کو گر انگشت سے اس نے — مانندِ عسل اُس میں بھی اک تار اُٹھا[5] ہے
کیا خون میں[6] رنگے تھے کہیں رات کو تو نے — بازی ترے ہاتھوں سے جو گل ہار اُٹھا[7] ہے
کل ہاتھ پہ کرتا تھا ترے گل بھی گرانی — تو آج بہ ایں وضع مرے یار اُٹھا ہے
میں ساعدِ نازک کے ترے صدقے ہوں تجھ سے — کیوں کر قفسِ مرغ گرفتار اُٹھا ہے

اے مصحفی دل جس نے اُٹھایا[8] ہے جہاں سے
اُٹھتے[9] ہوئے وہ یاں سے سبک سار اُٹھا ہے

524

تری چپ تو ہے خصمِ جانی ہماری — تؤ بولے تو ہو زندگانی ہماری
جگہ سے نہ ہلنے دیا اس نے آخر — ہمیں لے رہی[10] ناتوانی ہماری
جز الفت کے تیری نہ کچھ خاک پایا — فلک نے بہت خاک چھانی ہماری
یہ ممکن نہیں ہے کہ عشقِ بتاں میں — ہمیں چین دے بدگمانی ہماری
جوانی میں ہم سے ملو تا ہمیشہ — دعا دیوے تم کو جوانی ہماری
تری تیغِ ابرو کا ہم پر کرم تھا — کٹی خوب تب زندگانی ہماری

---

[1] بڑھا۔ [2] بیدار ہوا۔ [3] چل دیا ہے۔ [4] سرک گیا ہے۔ [5] نکلا ہے۔
[6] باعلانِ نون۔ [7] ہار گیا ہے۔ [8] بے تعلقی پیدا کرلی ہے۔ [9] جاتے ہوئے (مرتے ہوئے)۔
[10] لے رہنا = ختم کر دینا، ٹھکانے لگا دینا۔

پڑے ہیں کئی[1] استخواں اس گلی میں | یہی رہ گئی ہے نشانی ہماری
بہت سر کو خالی[2] کیا ہم نے لیکن | نہ نبڑی[3] نہ نبڑی کہانی ہماری

شب آخر ہوئی مصحفی جا پڑی اب
بروزِ دگر قِصہ خوانی ہماری

525

عمر گذری ہے ہمیں نالہ[4] وزاری کرتے | کاش ہم اس بتِ کافر سے نہ یاری کرتے
بر سرِ شکوہ بھی لائی نہ ہمیں اس کی نگاہ | تا اسی پردے میں ہم شکر گذاری کرتے
بار[5] مجلس میں تری، آنکھوں کو نہیں ورنہ میاں | مہر و مہ آکے ابھی آئینہ داری کرتے
تو کہاں کا تھا[6]، بھلا یہ تو ہمیں بتلا دے | ہم بھی ٹک گریہ اگر ابرِ بہاری کرتے
عشق میں چل نہ سکا پیش[7] ہمارا ورنہ | ہم قبول اپنے اُپر ذلت و خواری کرتے
اپنے کہنے میں نہیں نشترِ مژگاں اس کے | ورنہ یوں خوں نہ مری چشم سے جاری کرتے
کوئی پرکالہ جگر کا نہ گرا آنکھوں سے | کہ ہم اس کو ترے دامن کی کناری کرتے

مصحفی یار ہیں اس وقت کے سب مردہ پسند
بد نہ تھا ہم بھی تخلّص جو 'مزاری' کرتے

526

نہ کہیں صبح ہی ہوتی ہے نہ خواب آتا ہے | رات کیا آتی ہے اک مجھ پہ عذاب آتا ہے
قاصد اس کوچے سے پھرنے کا نہیں اے ہمدم | جھوٹ کہتا ہے کہ نامے کا جواب آتا ہے

---

1. بمعنی چند۔ 2. سر خالی کیا = بک جھک کی، کوشش کی۔ 3. نبڑنا = ختم ہونا۔
4. ن۴: گریہ وزاری۔ 5. بار ہونا = اجازت ہونا۔ 6. تیری کیا وقعت رہ جاتی۔
7. آج کل پیش نہ چل سکی بولتے ہیں۔

کیا کروں اس لبِ شیریں سے سوالِ بوسہ | مجھ کو اس بات کے کہنے سے حجاب آتا ہے
جان قالب میں نہیں رہتی مری جب کہ رقیب | ساتھ گھوڑے کے ترے، پکڑے رکاب آتا ہے
میں ترے واسطے سر پٹکوں ہوں دیواروں سے | چین کس طرح تجھے خانہ خراب آتا ہے
ہستیٔ پوچ سے اپنی مجھے دیتا ہے خبر | سامنے میرے جو دریا سے حَباب آتا ہے
ہوگیا ہے مرا گریے سے زبس دل خالی | اشک آنکھوں میں مری جیسے حباب آتا ہے
فرصتِ وقت غنیمت ہے کہ اے دل وہ شوخ | آج اس راہ سے پھر مستِ شراب آتا ہے

مصحفی کے بھی کچھ احوال سے ہے تجھ کو خبر
روز اس کوچے میں باچشمِ پُر آب آتا ہے

527

نے گل کے، نہ یاسمن کے صدقے | چمپا سے ترے بدن کے صدقے
ہر حلقۂ زلف میں مرا دل | ہوتا ہے شکن شکن کے صدقے
بیٹھا ہو جس انجمن میں وہ شوخ | میں ساری اس انجمن کے صدقے
حسرت یہ رہی کہ فصلِ گل میں | ہم کیوں نہ گئے چمن کے صدقے
پروانے کے شوق کو تو دیکھو | ہوتا ہے پڑا لگن کے صدقے
نکلا ہے تو آج زور سج سے | ہوں کیوں نہ میں اس پھبن کے صدقے
تیشے سے قلم کا کام کرنا | تردستی[1] کوہکن کے صدقے
تلوار تو روز ہی بجی ہے | صدقے، ترے بانکپن کے صدقے
وہ تشنہ ہوں میں کہ دن میں سو بار | ہوتا ہوں چہِ ذقن کے صدقے
نکلے نام اس کا جس دہن سے | ہو جایئے اس دہن کے صدقے

---

[1] تردستی = مہارت

جامہ تو پھبے ہی ہے پر اس کی زیبائی پیرہن کے صدقے

اے مصحفی کیا غزل لکھی ہے
تیری روشِ سخن کے صدقے

528

یہ آنکھیں ہیں تو سر کٹا کر رہیں گی
کسو سے ہمیں یاں لڑا کر رہیں گی

اگر یہ نگاہیں ہیں کم بخت اپنی
تو کچھ ہم کو تہمت لگا کر رہیں گی

یہ سفاکیاں ہیں تو جوں مرغِ بسمل
ہمیں خاک وخوں میں ملا کر رہیں گی

کیا ہم نے معلوم نظروں سے تیری
کہ نظریں تری ہم کو کھا کر رہیں گی

یہ آہیں ہیں تو ایک دن آسماں کو
جلا کر، کھپا کر، اُڑا کر رہیں گی

اگر گردشیں آسماں کی یہی ہیں
تو ہم کو بھی گردش میں لا کر رہیں گی

یہ آنکھیں ہیں تو ایک دن مصحفی کو
نگاہوں کے اندر فنا کر رہیں گی

529

یادِ فندق میں شب اس دل نے جو بیتابی کی
میں نے رو رو کے لہو ہر مژہ عنابی کی

اک ذرا کھول کے پڑھ اس کو کہ ظاہر ہے تمام
میرے نامے سے، حقیقت مری بیتابی کی

جلوۂ حسن کے آگے ترے، اے ماہِ منیر
روشنی پھیکی ہوئی جاتی ہے مہتابی کی

سازِ دل وہ ہے کہ ہر تار کے اوپر جس کے
سالہا ناخنِ اندوہ نے مضرابی[1] کی

اب تک آنکھوں سے مری اشک بہے جاتے ہیں
اک جھلک دیکھی تھی اس پیرہن[2] آبی کی

---

1 مضرابی کرنا = مشق کرنا، چھیڑنا۔ 2 آبی پیرہن = پانی جیسا ہلکا، شفاف اور سفید لباس، مثلاً تن زیب کا۔

پیشِ محراب میں کرتا تو ہوں سجدہ لیکن دل سے جاتی نہیں یاد ابروے محرابی کی

مصحفی ہوں میں گداے درِ شاہنشہِ عشق
آرزو مجھ کو نہیں خانی و نوابی کی

530

نصیبوں سے کوئی گر مل گیا ہے تو پہلے اس پہ اپنا دل گیا ہے
کرے گا یاد کیا قاتل کو اپنے تڑپتا یاں سے جو بسمل گیا ہے
لگے ہیں زخم کس کی تیغ کے یہ کہ جیسے پھوٹ[1] سینہ کھل گیا ہے
خدا کے واسطے اس کو نہ لاؤ ابھی تو یاں سے وہ قاتل گیا ہے
کوئی مجنوں سے ٹک جھوٹے ہی کہہ دے کہ لیلیٰ کا ابھی محمل گیا ہے
اگر ٹک کی ہے ہم نے جنبش اس[2] کو پہاڑ اپنی جگہ سے ہل گیا ہے

کوئی اے مصحفی اس سے یہ کہہ دے
دعا دیتا تجھے سائل گیا ہے

531

ہم تو بیٹھے ہی رہے یار کے در کے آگے کھائیں سو ٹھوکریں پرواں سے نہ سرکے[3] آگے
وے نہیں ہم کہ سپر سینے پہ اپنے رکھیں بلکہ رکھ دیتے ہیں سینے کو سپر کے آگے
صرف اے دیدہ کوئی لختِ جگر روتا ہے چاہیے اشک بھی ہوں لختِ جگر کے آگے
یک بیک جا جو پڑی اس گلِ نازک پہ نگاہ پھر گئے سیکڑوں رنگ اپنی نظر کے آگے
مجھ کو یہ ڈر ہے چرا لیں نہ کہیں حسن ترا منھ کو مت کھولیو تو شمس و قمر کے آگے

---

[1] پھوٹ ایک پھل کا نام ہے جو پکنے کے بعد تڑق جاتا ہے۔ [2] ''اس کو'' تصحیح قیاسی، کسی نسخے میں جنبش کے بعد کوئی لفظ نہیں ہے۔ [3] سرکنا = ٹلنا

گریہ رکتا ہی نہیں ہم سے تو رومال ہی ایک　　باندھ رکھیں گے اب اس دیدۂ تر کے آگے

مصحفیؔ اس کو ہی کہتے ہیں، سنا[1] ہی ہوگا
وہ جو کل غش میں پڑا تھا ترے در کے آگے

532

بیٹھا مونڈھے کو بچھا جب کہ وہ در کے آگے[2]　　خون کتنوں کے ہوئے یار کے گھر کے آگے

بال اک وضع پہ رہتے ہی نہیں کافر کے　　کبھی پیچھے تو کبھی ہیں وے کمر کے آگے

دجلۂ خشک کے مانند نظر آتا ہے　　پاٹ دریا کا مرے دامنِ تر کے آگے

صدمہ آہ کہیں اس کو نہ پہنچا ہووے　　اور تو کچھ نہیں، اک دل ہے جگر کے آگے

داغ سینے کے مرے دیکھے جو اس نے تو کہا:　　پھول اتنے تو نہ تھے تیری سپر[3] کے آگے

منتظر فیض کا رہ موئے جبیں سے اس کے　　صبحِ نورانی ہے اس تیرہ سحر کے آگے

بے ہنر گو کہ کرے آکے ہنر کا دعویٰ　　پیش جاتی ہے کوئی اہلِ ہنر کے آگے

دیکھ کر ہم کو ہوا چیں بہ جبیں مجلس میں　　اپنی جا سے جو ٹک اک ہم کہیں سر کے آگے

مصحفیؔ کیا ہوا گر سب سے میں آنکھوں کو سیا
میرا مطلوب تو ہے میری نظر کے آگے

533

سر اس کے پہ کیا کوئی دستار باندھے　　جو پھرتا ہے گلیوں میں زنار باندھے

کمر باندھتے تو کیا قتلِ عالم　　قیامت ہے جس دم وہ تلوار باندھے

---

[1] ن۲و۴: اسی کو مصحفی کہتے ہیں، سنا ہوئے گا۔　[2] نیز ملاحظہ ہو شعر نمبر ۳۸۵۲ کا حاشیہ

[3] ڈھال کے سامنے والے محدب حصے پر نقش و نگار بنا دیے جاتے ہیں۔

کوئی سحر سے باندھتا تھا دکاں کو[1] وہ کافر جو آوے تو بازار باندھے
ہو دشوار بانکوں کو پھر سر اُٹھانا جو بلدار پھینٹا وہ خوں خوار باندھے
فرشتہ بھی گر اس کے آجائے آگے پکڑ ہاتھ مثلِ گنہ گار باندھے[2]
نہ ساون کرے پھر برسنے کا دعویٰ جو یہ دیدۂ تر کبھی تار باندھے
ہے صرفہ اسی میں کہ یاں مردِ عاقل دل اپنا کسی سے نہ زنہار باندھے[3]
کھُلیں بازوے زاغ اس فصلِ گل میں فلک بالِ مرغِ گرفتار باندھے
تپ دل سے ہے دردِ سر مصحفی کو
سر اپنا نہ کیوں کر یہ بیمار باندھے

534

یار آ کے رہے قریب میرے ہیں[4] ایسے کہاں نصیب میرے
گر نالے کی طرز سیکھنا ہے سن نالے تو عندلیب میرے
اس کوُ میں نہیں کوئی مزاحم ہیں طالعِ بد، رقیب میرے
کیوں ہو گیا ناتواں تو اے دل کیا تجھ پہ پڑی غریب میرے
بیمار ہوں مصحفی میں کس کا
حیراں ہیں جو سب طبیب میرے

535

نہ ملیے[5] اس سے، رہیے فاصلے سے ضرر ہو اپنے تئیں جس کے ملے سے
نہ قاتل اس جگہ آیا نہ تلوار یہ سب مارے پڑے ٹک بھوں ہلے سے

---

[1] عملیات کے ذریعے کسی دُکان کی بندش کرنا، کہ اس میں نفع نہ ہو یا چل نہ سکے۔ اسے دُکان باندھنا کہا ہے۔
[2] یعنی محبوب فرشتے کو پکڑ کر اس کے ہاتھ گنہ گاروں کی طرح باندھ دے، بیان میں ذرا تعقید ہو گئی ہے۔
[3] دل بستن کا ترجمہ۔ [4] اصل: ہیں گے ایسے کہاں الخ [5] ن ۳: نہ اس سے ملیے۔

سب اپنے مہرباں منزل کو پہنچے　　رہے اک ہم ہی پیچھے قافلے سے
مریدِ زلف خوباں ہوں کہ میرا　　بندھا ہے اعتقاد اس سلسلے سے
نہ کر اے مصحفیؔ روزی کا شکوہ
خدا بیزار ہوتا ہے گلے سے

536

ہمیں گالی دینا یہ خو تھی کسو کی　　کبھو ہم سے بھی گفتگو تھی کسو کی
میں آئینے سے آنکھ ہرگز نہ پھیری　　کہ صورت مرے روبرو تھی کسو کی
گلے لگ کے سویا تھا کس رشکِ گل سے　　سحر جیب میں میرے بو تھی کسو کی
ہوئے خاک میں بھی نہ آسودہ ہرگز　　وہاں بھی ہمیں جستجو تھی کسو کی
مری نعش پر لوگ کہتے ہیں آکر　　اسی شخص کو آرزو تھی کسو کی
اب اے مصحفیؔ ہم کہاں اور تعشق
مگر چاہ ہم کو کبھو تھی کسو کی

537

باتوں نے اس کی ہم کو خاموش کر دیا ہے　　آگو زباں تھی لیکن اب گوشِ کر دیا[1] ہے
عشقِ بتاں میں از بس کھائے ہیں داغ پیہم　　ساعد کو اپنے ہم نے گل پوش کر دیا ہے
کس سیم بر کا یارو عاشق ہوں میں کہ مجھ کو　　کاہش نے جوں مہِ نو آغوش کر دیا ہے
جب یادِ قد میں تیری کھینچا ہے ہم نے نالہ　　سروِ چمن سے اُس کو ہم دوش کر دیا ہے

---

[1] عالم حیرت کا کتنا بلیغ بیان ہے یعنی سنتے سب ہیں، بولتے کچھ نہیں۔ بقول خسرو:
مائیم وتحیر وخموشی　　وآفاق ہمہ بہ گفتگو یت　یا　گوشِ کر سے مراد یہ کہ اب سنتے بھی نہیں!

طاقت یہ اپنی کب ہے جو اس کی تاب لاویں　　جس جلوے نے کہ موسیٰ بے ہوش[1] کر دیا ہے

اے مصحفی اٹھا ہے جب دل سے میرے شعلہ
مارِ آستیں میں اس کو خاموش کر دیا ہے

538

دامن کی اک جھپک نے مدہوش کر دیا ہے　　جیسے چراغ ہم کو خاموش کر دیا ہے

ہمراہِ آہ از بس لختِ جگر اُڑے ہیں　　میں عرصۂ ہوا کو گل پوش کر دیا ہے

کون آیا تھا نہانے، لطفِ بدن نے کس کے　　لہروں سے سارا دریا آغوش کر دیا ہے

اب اور آہ پیچاں کیا چاہے ہے، میں اُس کو　　زنجیرِ عرش سے تو ہم دوش کر دیا ہے

ساقی کو میں دیا تھا خونِ فشردہ، اُس نے　　میرے تئیں اُسی کو پھر جوش کر دیا ہے[2]

صوفی و شیخ و زاہد سب کیفی بن رہے ہیں　　اس کی نگہ نے عالم مے نوش کر دیا ہے

نوبت سخن کی ہم تک جب آئی ہے، ادب نے　　خاموش کہہ کے سب کو خاموش کر دیا ہے

مجلس میں مصحفی کی آیا ہے جو بہ دعویٰ
میں اک قدح میں اس کو بے ہوش کر دیا ہے

539

شب آکے روبرو جو ہیں بجلی چمک گئی　　نظروں میں میری یار کی صورت جھمک گئی

آئی ہوائے ابر تو کیا دل خنک[3] ہوا　　وہ بھی ہماری آگ پہ دامن جھپک گئی

اے گل تجھے دکھاویں گے اس کے بدن کا رنگ　　اس نازنیں کی گر کبھو چولی مسک گئی

طوفاں کیا وہ اشک نے غم میں ترے کہ رات　　جو موجِ تند اس سے اُٹھی تا فلک گئی

---

۱ کو علامت مفعولی کا حذف ہوا ہے۔ جس طرح اگلے شعر کے مصرع ثانی میں نے علامت فاعلی کا حذف ہے۔
۲ یعنی جوش کر کے دے دیا ہے۔　　۳ استفہام انکاری ہے، یعنی دل خنک نہیں ہوا۔

بجلی شب آسماں سے جو بیتاب ہو گری — آ کر کے آستاں پہ ترے سر پٹک گئی
اُس گلبدن نے بندِ قبا جوں ہی وا کیے — مجلس تمام پھولوں کی بُو سے مہک گئی
یاروں کو ہم دکھاویں گے بے طاقتی کے رنگ — اپنی بھی آنکھ گر کسی گل سے اٹک گئی
ہر بات پر مری تو نہ کر نکتہ چینیاں — ان باتوں سے تری مری چھاتی تو پک[1] گئی

ہم نے بہت علاج کیا لیک مصحفی
ہرگز نہ دردِ دل کی ہمارے چمک گئی

540

باغ سرسبز ہے اور آب و ہوا اچھی ہے — کیجیے سیر کوئی دم، تو فضا اچھی ہے
تیری تصویر کو کب پہنچے ہے تصویرِ پری — تو ہی پھر خوب ہے، وہ گو کہ ذرا اچھی ہے
شوخ چشمی نہ کر اے شوخ کہ معشوقوں کی — جس قدر چشم میں ہو شرم و حیا، اچھی ہے
گل سے کہتی ہے کہ یہ تیری ہے بو کا طالب — تو بھڑا دیے[2] کو اے بادِ صبا، اچھی ہے
دیکھتا ہے جو کوئی اس کو، یہی کہتا ہے — صورت اس طفلِ پری زاد کی کیا اچھی ہے
اس فریبندہ سے کیوں کر کوئی سودا نہ کرے — طرح ترکیب[3] ہے خوش، وضع و ادا اچھی ہے
حق تعالیٰ مرے پیارے سے ملا دے مجھ کو — یہ دُعا وِرد کر اے دل، یہ دُعا اچھی ہے
جس قدر خونِ جگر کھاوے اسے کھانے دے — تیرے بیمار کے حق میں یہ غذا اچھی ہے
مَلیو پیشانی کو خاک اس کی گلی کی اے دل — دردِ سر جائے گا اس سے، یہ دوا اچھی ہے
مصحفی مجھ سے تعجب ہے کہ یہ بات کہوں قطعہ کہ مری طرزِ سخن کہنے کی، کیا اچھی ہے

پر میں اتنا تو سمجھتا ہوں کہ سب کے نزدیک
نالۂ جُغد سے بلبل کی نَوا اچھی ہے

---

[1] چھاتی پک گئی = عاجز آ گیا۔ [2] بھڑانا = لڑا دینا۔ [3] طرح ترکیب = بناوٹ

541

اب تلک یار کی ہے چینِ جبیں ویسی ہی — نت مرے ساتھ چلی جاتی ہے کیں[1] ویسی ہی

اب تلک بھوں کا چڑھانا ہے وہی ہر ساعت — اب تلک پڑتی ہے پیشانی میں چیں ویسی ہی

جب سے دیکھا ہے مرا لختِ جگر، کہتا ہے — مجھ کو بازار سے لا دے تو نگیں[2] ویسی ہی

جس جگہ میرے تئیں قتل کیا تھا اس نے — اب تلک خون سے تر ہے وہ زمیں ویسی ہی

دل جو غائب ہے مری نظروں سے، شاید اس کو — پھر کے[3] صورت نظر آئی ہے کہیں ویسی ہی

کب مرے نالۂ جاں کاہ کو وہ سنتا ہے — بات بدگو کی ہے واں ذہن نشیں ویسی ہی

مصحفی اب تلک آیا نہیں ہرگز میں بحال[4]

غمِ ایام سے ہے طبع، حزیں ویسی ہی

542

پاسباں جاگے ہے، در بند ہے، مینھ برسے ہے — میں اِدھر تڑپوں[5] ہوں اور یار اُدھر ترسے ہے

اس طرح توڑ کے پر پھینک نہ دے[6] بلبل کے — بیر ہے اس کو تو اِک بالِ کبوتر سے ہے

چرخِ بے مہر سے میں کیا گلہ بنیاد کروں[7] — کہ ستم میرے اُپر بازیٔ اختر سے ہے

وہ ستم کشتہ بتاں کا ہوں کہ کل روزِ جزا — دعویٔ خون مجھے داورِ محشر سے ہے

ہم گرفتار ہوئے اور ہی ہنگامے میں — یاں[8] خبر کا ہے کو ہنگامۂ محشر سے ہے

دوستو اس کو جو پکڑا ہے تو تم چھوڑیو مت — لاؤ لاگ اپنے تئیں بھی اِسی کافر سے ہے

کیوں کہ بیت الصنمِ عشق کا جلوہ دیکھیں — راہ و رسم اپنے تئیں بت سے نہ بت گر سے ہے

---

[1] کیں = بمعنی کینہ مونث استعمال ہوا ہے۔ [2] بمعنی نگینہ (مونث)۔ [3] پھر کے = دوبارہ (کے زائد) اور یہی بولی ہے۔ [4] بحال آنا = شگفتہ ہونا۔ [5] ن ۳: ترسوں۔ [6] (لہجہ) یعنی نہیں پھینکے گا۔ [7] فارسی کا لفظی ترجمہ (گلہ بنیاد کردن) شکایت کا آغاز کرنا۔

[8] کا ہے کو کا یہ استعمال بھی ٹھیٹھ بولی ہے۔

کیوں نہ اس زلف سے مل، ہوں میں مشوّش اے دل | کیا کروں یار، کہ کام ایسے ہی ابتر سے ہے

مصحفی دوکھیں[1] ہیں گر خویش و برادر دوکھیں
کام کیا اپنے تئیں خویش و برادر سے ہے

543

منظور گر تمھیں بھی تماشائے خلق ہے | وابستہ اک نظر کی تمنائے خلق ہے
افسوس ہے نہ جانے تو اس کی ہی قدر کو | جو شخص تیرے واسطے رسوائے خلق ہے
کس طرح کوئی چین سے بیٹھے کہ رات دن | دورِ سپہر، درپئے ایذائے خلق ہے
میرا گناہ کیا ہے جو مجھ بے گناہ پر | عالم سمٹ کر آیا ہے دعوائے[2] خلق ہے
معنی طلب کی صورتِ خالق پہ ہے نظر | صورت پرست، محوِ تماشائے خلق ہے
پھرتا ہے نت وہ برہنہ رو، جیسے آفتاب | گو خلق دیکھے، کب اُسے پروائے خلق ہے

شاید کہ آج مصحفی مارا گیا کہیں
اُس کی گلی میں کہتے ہیں غوغائے خلق ہے

544

کوچہ ترا یہ جائے تماشائے خلق ہے | بہرِ نظارہ بیہُدہ غوغائے خلق ہے
میری طرح سراسرِ عالم پھرا نہیں | ہرچند آفتاب بھی رسوائے خلق ہے
کیا تجھ کو فائدہ ہے بھلا اس میں اے فلک | تو اس قدر جو درپئے ایذائے خلق ہے
کم ہم سے کم بغل[3] پہ وہ ہوتا ہے ملتفت | نت جس کے ساتھ گرمیٔ سودائے خلق ہے
میں ہوں وہ خاکِ راہ کہ کوچے میں یار کے | میرا سرِ شکستہ ہے اور پائے خلق ہے
کچھ شعر و شاعری سے نہیں مجھ کو فائدہ | اِلّا حصولِ کاوش[4] بے جائے خلق ہے

---

[1] دوکھنا = طعنے دینا، قصوروار ٹھہرانا۔ [2] ن۲: غوغائے خلق۔ [3] کم بغل = بے حیثیت۔
[4] کاوش = رنجیدگی، کپٹ۔

چل تو بھی مصحفی کہ وہ نکلا ہے بزم سے
ہے بارِ عام، نوبتِ مجرائے خلق ہے

545

تو بے وفا ہوا تو مروّت کہاں رہی　　عاشق کو تجھ سے جائے شکایت کہاں رہی
دنبالِ دل، پری سی کوئی گامزن تو تھی　　پر یہ خبر نہیں کہ وہ صورت کہاں رہی
وقتے کہ شاعروں نے رگِ گل کیا خیال　　موئے کمر کی اس کے نزاکت کہاں رہی
میں نے چمن سے آن کے جب نالہ سر کیا　　مرغانِ نغمہ سنج کی حرمت کہاں رہی
مڑتے ہی بھوں کے، ہاتھ سے جاتا رہا یہ دل　　اپنے کہے میں اپنی طبیعت کہاں رہی
مدّت ہوئی کہ بیٹھے ہیں ہم انتظار میں　　کیا جانے آتے آتے قیامت کہاں رہی
وقتے کہ میں نے نامے پہ رو رو دیا لہو　　سمجھے کوئی جسے وہ عبارت کہاں رہی
جب تو نے دی رقیب کو پہلو میں اپنے جا　　عاشق کی تیری بزم میں عزّت کہاں رہی
آنے سے خط کے اور ہی کچھ رنگ ہو گیا　　چہرے کی اُس کے اب وہ شباہت کہاں رہی
جو کچھ میں دیکھتا ہوں فلک، تجھ سے حادثہ　　فرہاد و قیس پر یہ مصیبت کہاں رہی
جب تیرِ غمزہ دل سے مرے پار ہو گیا　　جانِ ستم رسیدہ سلامت کہاں رہی
حیراں ہیں سارے قاضی و مفتی و بادشاہ　　آگے ترے کسی کی حکومت کہاں رہی

تھی یاروں تک ہی رونقِ بزم اپنی مصحفی
جب یار ہی اُٹھ گئے تو وہ صحبت کہاں رہی

546

کیا کہوں بات میں اس گریے کی طغیانی کی　　کشتیِ نوح اسی گریے نے طوفانی کی
خوشہ خوشہ مری آنکھوں سے گرے دامن میں　　دانۂ اشک نے اس سال فراوانی کی

نو بہار آنے سے سودائے جنوں تازہ ہوا — سبزے کی موج نے پھر سلسلہ جنبانی کی

صاف تو یہ ہے کہ انصاف نہیں یاروں میں — ورنہ جوں آئینہ صورت ہوں میں حیرانی کی

دردِ سر کیوں کے نہ ہو مجھ کو کہ ان آنکھوں سے — شکل دیکھی ہے میں صندل لگی پیشانی کی

ایسی کیا جلدی ہے، ہاں خط بھی پڑھوں گا، قاصد — پہلے کچھ بات تو کہہ لے تو مرے[1] جانی کی

مجتہد ملّتِ ترسا کا ہوں میں، کیوں کہ مدام — خدمتِ بت میں رہا، دیر کی رہبانی کی

دِہِ غارت زدہ کی طرح نمایاں ہے تمام — میرے ظاہر[2] سے حقیقت مری ویرانی کی

تیرے دامن کی کناری کو نہ پہنچا زنہار — شعلۂ برق نے ہرچند کہ جولانی کی

جو سدا محو رہے اپنی ہی آرایش کا — اس کو کیا فکر مری بے سر و سامانی کی

فصلِ گل میں بھی رہے کنجِ قفس کے ہی اسیر — ہم گرفتاروں نے کس روز پَر افشانی کی

گھر میں رہنا تمھیں ہوجائے گا مشکل پیارے — کر گئی آہ اثر گر کسی زندانی کی

بن گیا سطحِ فلک تختۂ دامن سارا — ابرِ مژگاں نے مرے بس کی دُر افشانی کی

مصحفی دوں میں جہاں ریختہ گوئی کو رواج
قدر شیرازی کی ہو واں نہ صفاہانی کی

547

خوش حال ان کا، وے جو گلستاں میں مرگئے — حسرت نصیب ہم تھے کہ زنداں میں مرگئے

پہنچا نہ کام چشم کی گردش تلک دریغ — ہم اس کی ایک ہی جنبشِ مژگاں میں مرگئے

آخر نہ[3] ہوسکا سفرِ دورِ راہ عشق — لاکھوں گھسٹ گھسٹ کے بیاباں میں مرگئے

روتا پکارتا نہیں اب کوئی، کیا میاں — عاشق ترے سبھی شبِ ہجراں میں مرگئے

---

[1] مرے جانی کی ترکیب ملاحظہ طلب ہے۔ جانی میں یا خود متکلم کی ہے۔ مگر اس کو کیا کریں کہ یہ بھی بولی ہے۔

[2] ظاہر کے معنوں میں ایہام ہے۔ ظاہر شہر کے سواد کو بھی کہتے ہیں۔ [3] آخر ہونا = تمام ہونا۔

نسبت درست کیجیے اب کس سے مصحفی
جو منتخب تھے گبر و مسلماں میں، مر گئے

548

کہیں مغز اس کے میں صبح دم تری بوے زلفِ رسا گئی
ترے کوچے سے جو چمن تلک گل اڑاتی خاکِ صبا گئی

مرض اک جہاں سے نرالا تھا مری جان، تیرے مریض کا
نہ ہوا کسی سے علاج جب، اجل اس کی کرنے دوا گئی

غرض اس نباہ کے صدقے میں، غرض ایسی چاہ کے صدقے میں
نہ ترا ہی جور و جفا گیا، نہ مری ہی مہر و وفا گئی

یہ بہار ہووے گی سب خزاں، نہ سمن، نہ لالہ، نہ ارغواں
دمِ گرم کی مرے، دوستاں کبھو باغ میں جو ہوا گئی

جو فِدا ے صورتِ خوب ہیں اُنھیں تب کہوں گا کہ دیکھیے
کوئی شکل اپنی ہی چشم میں کبھو سیر کرتی جو آ گئی

میں ہوا بہ خاکِ سیہ فرو، ترے کوچے میں بہ صد آرزو
رہا شرمگیں ہی ہمیشہ تو، تری اب تلک نہ حیا گئی

سر اٹھاؤں کیوں کے میں مصحفی، نہیں مجھ میں تاب وتواں ذری
کہ خرام اس بتِ[1] شوخ کی مجھے خاک ہی میں ملا گئی

549

تصویرِ یار جب تئیں پیشِ نظر رہی سو صورتوں سے آنکھ مری بے خبر رہی

---

[1] خرام مونث آیا ہے۔

آخر ہمیں جلا کے کفِ خاک کر دیا　　دن رات کی یہ سوختگی کام کر رہی

اک روز دیکھ لوگے کہ ہم درمیاں نہیں　　گر درمیاں، میاں یہی شام و سحر رہی

وقتے کہ خط کو پانی میں ان نے ڈبو دیا　　کہہ تو ہی میری آبرو کیا نامہ بر رہی

واں جھوٹ موٹ[1] بھی نہ ہوئی ان کی چشم نم　　یاں اشک سے ہر اک مژہ سلکِ گہر رہی

جوں زخمِ تازہ تجھ کو میں نت پونچھتا رہا　　سوکھی کب آستیں مری اے چشمِ تر رہی

وقتے کہ اس کمر پہ طمنچے[2] سجے کیے　　انصاف کیجے آپھی کہاں سے کمر رہی

شاید کہ لختِ دل کوئی پیچھے رہا جو آج　　مژگاں پہ بوند اشک کی آ کر ٹھہر رہی

جانا نہ ہم نے بالشِ پَر کہتے ہیں کسے　　اک خشت سی تو اپنے بھی ہاں زیرِ سر رہی

میرا اور اس کا جھگڑا نہ فیصل ہوا کبھی　　آپس کے بیچ بحث ہی دو دو پہر رہی

قسمت کہ تجھ سے اب کے بھی اپنی ملازمت[3]　　موقوفِ مہربانیِ وقتِ دگر رہی

دیکھو گے کر دکھاویں گے ہم ریختے کو فرس[4]　　یک چند اگر توجہ خاطر ادھر رہی

بے اعتدالیوں سے تری اس گلی کے بیچ　　خانہ خراب دھوم ہی شام و سحر رہی

آہ و فغاں ہی کرتا رہا تو تو مصحفی
تیری زباں نہ ایک دم[5] اے نوحہ گر رہی[6]

550

نہ غمِ عاشقِ رسوا ہے تجھے　　نہ خیالِ دلِ شیدا ہے تجھے

میں ترے غم میں موا جاتا ہوں　　کوئی یہ بات بھی کہتا ہے تجھے

---

[1] جھوٹ موٹ = دوسرا تابع مہمل ہے، یہ خالص بولی ہے۔ سچ مچ کے لیے سودا کا شعر یاد کیجیے:

یہ تو نہیں کہتا ہوں کہ سچ مچ کرو الطاف　　جھوٹی ہی تسلّی ہو تو ضائع تو نہ ہوں میں

[2] طمنچہ = ریوالور کی طرح کا دیسی ساخت کا آتشیں ہتھیار۔ [3] ملازمت = باریابی، ملاقات۔

[4] فرس = فارسی۔ [5] ن ۳: ایک دن۔ [6] یہاں رہنا بہ معنی بند ہونا۔

آشنا سا نظر آتا ہے تو یار　　میں نے شاید کہیں دیکھا ہے تجھے
جب میں کہتا ہوں کہ ٹک زلف تو کھول　　تب یہ کہتا ہے کہ سودا ہے تجھے
جانِ من تو ہے بہت بے پروا[1]　　سچ ہے، پرواہ مری کیا ہے تجھے

جاں بہ حسرت جو تو یوں دیتا ہے
مصحفی کس کی تمنا ہے تجھے

551

جب کمر میں کٹار[2] رکھا ہے　　اس نے کتنوں کو مار رکھا ہے
اِک فریبِ نگہ پہ یاں ہم نے　　سالہا انتظار رکھا ہے
پھانس بھی گر چبھی ہے دل میں مرے　　اُس نے برسوں فگار رکھا ہے
تم نے اپنا جہاں دھرا ہے قدم　　ہم نے واں سر اُتار رکھا ہے
اپنا عاشق نہیں تو اے کافر　　آئینہ کیوں دو چار رکھا ہے
ہم نے دستِ جنوں کے ہاتھوں سے　　جیب کو تار تار رکھا ہے
میری تربت پہ آن کر گا ہے　　کب قدم تو نے یار رکھا ہے
بعد از مرگ بھی مجھے یعنی　　کشتۂ انتظار رکھا ہے

مصحفی ہم نے اپنے پہلو میں
دل کو دے دے[3] فشار رکھا ہے

552

دنیا میں دل سے دل کو محبت نہیں رہی　　ہرگز کہیں دو شخص[4] میں الفت نہیں رہی

---

[1] مصحفی نے پروا اور پرواہ دونوں ہی استعمال کر دکھایا ہے (نیز دیکھیے کلیات مصحفی ۲/ ۲۸۰۷)

[2] کٹار مذکر۔ [3] فشار دے دے کر = بھینچ بھینچ کر۔ [4] دو شخص میں = بجائے دو شخصوں میں۔

پھڑکے ہیں زیرِ دام ہم اتنے کہ اب ہمیں ... خنجر تلے تڑپنے کی حسرت نہیں رہی
کیا فائدہ ہے اس سے گر آنکھیں ملائیے ... آنکھوں میں اس کی کچھ بھی مروّت نہیں رہی
اے دیدہ زار زار نہ رو اس قدر کہ اب ... مجھ کو بھی گریہ کرنے کی طاقت نہیں رہی
مجلس میں اس کی جاکے کوئی کیا ذلیل ہو ... ہرگز موافق اپنے وہ صحبت نہیں رہی
کیا جاکے اب کسی کے تئیں منہ دکھائیے ... وقتے کہ وہ زمانے کی صورت نہیں رہی
آتے ہی اس کے سامنے ٹوٹی ہے آرسی ... ہرگز نظر سے اس کی سلامت نہیں رہی
اے غم فشارِ دل میں نہ اتنی بھی سعی کر ... جانے بھی دے کچھ اس میں تو حالت نہیں رہی
اتنا رمیدہ خو ہے کہ اس کو ہمارے ساتھ ... الفت تو اک طرف کہ خصومت نہیں رہی

اے مصحفی نہ کیجیے سوے کودکاں نگاہ
اس کام میں بزرگوں کی حرمت نہیں رہی

553

اس سوا اور ہزاروں ہیں تو کیا کام مجھے ... اس کے بن دیکھے نہیں ایک دم آرام مجھے
شہر میں شہرۂ ہر برزن و کوٗ تو میں ہوا ... عاشقی اور کہاں تک کرے بدنام مجھے
یہی حسرت رہی دل میں کہ کبھی ساقی نے ... اپنے ہونٹوں سے لگا کر نہ دیا جام مجھے
شہر سے دوٗر پڑا خاطرِ یاراں سے گیا ... کون اب بھیجتا ہے نامہ و پیغام مجھے
مجھ کو سو چشم تھیں یاروں سے، ولے روزِ فراق ... نہ کیا یاد کسو نے بہ دو بادام مجھے
سادگی دیکھ کہ بوسے کی طمع رکھتا ہوں ... جن لبوں سے کہ میسّر نہیں دشنام مجھے
میں نے کیا ان کا لیا ہے جو گلی کوچوں میں ... مدّعی ڈھونڈتے ہیں صبح مجھے، شام مجھے
اک ترے کوچے سے باہر نہ نکالے تا زیست ... یوں جو چاہے سو کرے گردشِ ایّام مجھے

مصحفی ہاتھ اُٹھا اب بھی تعشق سے کہ یار
نظر آتا ہے بد اس کام کا انجام مجھے

554

ڈرتی نہیں وہ چشمِ سیہ، زاریِ دل سے
دن رات اسے کام ہے خوں خواریِ دل سے

یا رب تری زلفوں سے مجھے جس نے چھڑایا
تا حشر نہ چھوٹے وہ گرفتاریِ دل سے

اک داغ نیا ہر بُنِ مؤ پر ہے نمایاں
یہ پھول چنے ہم نے شرر باریِ دل سے

شعلے کا ترے حسن کے فانوس بنا ہے
تو اس پہ بھی غافل ہے ہواداریِ دل سے

ہم بھی دلِ خوں گشتہ لیے ساتھ ہیں اس کے
گو ہاتھ اُٹھاوے نہ دل آزاریِ دل سے

غم کیوں کے چھپاؤں میں کہ چہرے کا مرے رنگ
عالم کو نشاں دیتا ہے بیماریِ دل سے

اے مصحفی جز آہ و غم و نالہ و زاری
حاصل نہ کیا ہم نے تو کچھ یاریِ دل سے

555

پہنچا ہے زیاں تجھ کو وفاداریِ دل سے
کیا میں نہیں واقف تری بیزاریِ دل سے

بن دل کے تری زلف بھی اب رہ نہیں سکتی
ہے وہ بھی گرفتار، گرفتاریِ دل سے

ایسا نہ ہو، لے جا کے کہیں مجھ کو لُٹا دے
میں آگو ہی ڈرتا ہوں زیاں کاریِ دل سے

شب دیدۂ بیداد کے محتاج نہیں وے
جو فیض، سحر لیتے ہیں بیداریِ دل سے

اس شہر کا کیا نام ہے جس شہر میں کوئی
جاں بر نہیں ہوتا تبِ بیماریِ دل سے

کیا نامِ محبت لیں کہ اب بزمِ بتاں میں
ہم آپ خجل ہوتے ہیں ناداریِ دل سے

کرتا تھا یہ دل پیش ازیں مشقِ طپیدن
ہے اب تو شکایت ہمیں بیکاریِ دل سے

اے آئینے ہم تجھ کو دکھا دیویں گے نقشا ۔۔۔ گر پردہ اُٹھا آئینہ رخساریِ دل سے
ہر چند کہ ہیں خانہ برانداز وے آنکھیں ۔۔۔ پر شکر کہ غافل نہیں معماریِ[1] دل سے
کاہے کو پئیں بادہ، کہ پہنچے ہے ہمیشہ ۔۔۔ بے ہوشی کا مژدہ ہمیں ہشیاریِ دل سے
ان روزوں پھر اس شوخ کی آنکھوں نے کیا ہے ۔۔۔ بازارِ نظر گرم خریداریِ دل سے
وقتے کہ مدد خواہ تھے ہم، کوئی نہ آیا ۔۔۔ کیا فائدہ ہے اب مدد و یاریِ دل سے
اے مصحفی سمجھیں ہیں ہم اس شوخ کو غافل
یک لحظہ جو غافل نہیں معماریِ دل سے

556

جب دیکھوں وہ صورت مرے آگے ہی کھڑی ہے ۔۔۔ اک قاتلِ خوں خوار سے ہی آنکھ لڑی ہے
اس گریے کے صدقے ہوں کہ خونابِ جگر کی ۔۔۔ جو بوند ہے پلکوں پہ وہ چنّی[2] سی جڑی ہے
وہ ابرِ سیہ جس سے کہ خوں برسے ہے ہر دم ۔۔۔ اس کے لبِ پاں خوردہ پہ مسّی کی دھڑی[3] ہے
اس زلف میں کیا کام کریں اپنی نگاہیں ۔۔۔ جس زلف کا ہر حلقہ زرہ کی سی کڑی ہے
حیراں ہوں کہ اس غم کے تئیں کیوں کے میں ٹالوں ۔۔۔ اے وائے کہ سل سی مری چھاتی پہ اڑی ہے
وہ کشتۂ بے کس ہوں کہ خوں خواہی[4] کی خاطر ۔۔۔ دروازے پہ قاتل کے، مری لاش پڑی ہے
خوں کس کا کیا تو نے جو آج اے مرے قاتل ۔۔۔ تلوار ترے ہاتھ میں پھولوں کی چھڑی ہے
سنگینوں سے پلکوں کی شرارے ہی اُڑے ہیں ۔۔۔ جب جنگ کو پلٹن[5] پہ مری باڑھ چڑھی ہے
لے مصحفیِ خستہ کی ٹک دیکھ لے صورت
یہ غم زدہ مہماں کوئی پل، کوئی گھڑی ہے

---

[1] معماری بمعنی آبادی استعمال کیا ہے۔ [2] چنّی = لعل کا ریزہ۔ [3] دھڑی = مسّی کا جماؤ۔
[4] خوں خواہی = دیت کی طلب، خوں بہا کا مطالبہ۔ [5] یہ انگریزی لفظ Platoon کی خرابی ہے، مصحفی کے وقت میں رائج ہو چکا تھا۔

557

کس گل کی نزاکت یہ مری آنکھ پڑی ہے — جو ہر رگِ گل خار سی نظروں میں گڑی ہے

جس موج سے لپٹا ہوں، کر ابرو کا تصوّر — اس موج نے سر پر سے تلوار جڑی ہے

گھر کیوں کے غریبوں کے بھلا بیٹھ نہ جاویں — بے فاصلہ[1] رونا مرا ساون کی جھڑی ہے

جو دیکھے ہے وہ ابروے خم دار، کہے ہے — کیا صانعِ قدرت نے یہ تلوار گھڑی ہے

تو آئینہ خانے میں بہت دیر رہے ہے — کیا جانیے واں کس سے تری آنکھ لڑی ہے

گل دستہ ہے خود اک تو ترا دست نگاریں — پھر تس پہ غضب اور یہ پھولوں کی چھڑی[2] ہے

کچھ ذکر تھا میرا، جو میں آنکلا، تو ہنس کر — کہنے لگا وہ یوں: تری کیا عمر بڑی[3] ہے

خوں جلوہ گری کرتا ہے ازبس کہ شب و روز — قطعہ — اس جا گہ پہ جس جا گہ مری لاش گڑی ہے

جو نخل کہ اُگتا ہے وہاں خاک سے، لڑکے — گویا وہ ترے واسطے پھولوں کی چھڑی ہے

اے مصحفی گذری کی[4] ذرا سیر تو کر لے
جاتا ہے کہاں دن ابھی دو چار گھڑی ہے

558

دل کیوں کے کریں بیٹھ کے ہم یار سے خالی[5] — ہوتی ہی نہیں بزم تو اغیار سے خالی

کس طرح قدِ یار سے وہ آ کے طرف ہو[6] — ہے سرو کے اک پانو سو رفتار سے خالی

ہم سوے عدم یوں گئے دنیا سے تہی دست — جس طرح کہ مفلس پھرے بازار سے خالی

باندھی ہے کمر اس نے زبس خلق کُشی پر — جب دیکھو میاں[7] اس کا ہے تلوار سے خالی

1۔ بے فاصلہ = مسلسل۔ 2۔ چھڑی = بید، عصا۔ 3۔ یہ بھی خالص ہندوستانی مشرقیت کی روایت ہے۔ اگر کسی شخص کا ذکر ہو رہا ہو اور وہ اس وقت آ جائے تو یہ کہا جاتا ہے کہ تمھاری عمر زیادہ ہوگی۔

4۔ گذری کی سیر = گذری بازار کو کہتے ہیں، آج کل کی اصطلاح میں مال روڈ۔

5۔ دل خالی کرنا = شکوہ شکایت کر کے دل کا غبار نکالنا۔ 6۔ مقابل ہو۔ 7۔ میاں = کمر۔

پیمانہ مری چشم کا افسوس کہ یا رب مرتے بھی رہا شربتِ دیدار سے خالی
اے مصحفی شاید کہیں دل بند ہے تیرا
یہ آہ کا بھرنا[1] نہیں اسرار سے خالی

559

سر تری تیغ کو دیے ہی بنے سجدہ محراب میں کیے ہی بنے
دستِ ناصح سے تنگ آیا ہوں چاکِ جیب اب مجھے سیے ہی بنے
آ پھنسے اب تو بزمِ رنداں میں شیخ جی تم کو مے پیے ہی بنے
ہم کب اس زندگی کے تھے طالب پر جلایا تو اب جیے ہی بنے
مصحفی تم کو وہ کرے گا خراب
اس سے دل باز پس[2] لیے ہی بنے

560

لب زخمِ جگر سیے ہی بنے خونِ دل ہم کو اب پیے ہی بنے
کھینچ کر تیغ یار آیا ہے اس گھڑی سر جھکا دیے ہی بنے
دل گرا ہی پڑے ہے سینے سے اب یہ دل ہاتھ میں لیے ہی بنے
یار کا صبح پر ہے وعدۂ وصل ایک شب اور بھی جیے ہی بنے
اب تو اس دردِ دل کی تاب نہیں
مصحفی کچھ دوا کیے ہی بنے

561

تو ہر شب نت بغل میں اور کے ہے یہ دل شایستہ کب اس جور کے ہے

---

[1] آہ کا بھرنا میں کا ہی بولی ہے۔ قواعد اسے زائد کہے گی۔ [2] باز پس = واپس

ترے دامن کا دَور ایسا ہے، پیارے | کہ صدقے دَور[1] ابھی جس دَور کے ہے
اُسے کیا دَورِ دامن کی خبر ہے | جو قصّے میں تسلسل دَور کے ہے
بُتاں کیا پوچھتے ہو ہم سے کیجے | جو کچھ شایاں تمھارے طور کے ہے
مرے نامے کو یوں مت سرسری دیکھ | کہ ہر اک سطر قابل غور کے ہے
نہ خود قائم ہے یہ پُتلا بدن کا | کل اس کی ہاتھ میں اک اور کے ہے

جبیں اُس بُت کی اب اے مصحفی دیکھ
کہ وہ سُودے[2] میں چندن گھور[3] کے ہے

562

اب تو اس بزم میں پیارے تمھیں آئے ہی بنے | اپنے مشتاقوں کو دیدار دکھائے ہی بنے
زخم دو چار تری تیغ کے کھائے ہی بنے | جائے تسلیم ہے یہ سر کو جھکائے ہی بنے
سخت حیران کیا چہچہۂ بلبل نے | باغ میں ہم کو بھی اب دھوم مچائے ہی بنے
گر تصوّر ہے یہی تو مرا جینا معلوم | اس تصوّر کے تئیں جی سے بھلائے ہی بنے
یار لے رشتہ وسوزن کو بکف آیا ہے | اب تو اس چاکِ گریباں کو سلائے ہی بنے
وہ جو ہجراں میں ترے مجھ پہ گزرتی ہے میاں | تو سنے یا نہ سنے، مجھ کو سنائے ہی بنے

سخت افسردہ کیا ہے ہمیں بے[4] عشقی نے
مصحفی پھر کہیں اب آنکھ لڑائے ہی بنے

---

[1] دور = ایک بہ معنی دامن کا گھیر دوسرے زمانہ۔ [2] سودہ = پیسا ہوا، جسے انگریزی میں Paste کہیں گے۔ [3] چندن گھور = صندل کی ایک قسم۔ [4] بے عشقی۔ کتنی سادہ اور کیسی بلیغ ترکیب ہے۔

563

بند بھی آنکھوں کو ذری کیجیے　　چند[1] پریشاں نظری کیجیے
اک نظر ایدھر بھی ذری کیجیے　　گر نہیں اچھی، نظری[2] کیجیے
دل کے عوض دیجیے بوسہ ہی ایک　　خوب نہیں، مفت بَری[3] کیجیے
آئینے میں دیکھیے مکھڑا میاں　　آئینے کو رشکِ پری کیجیے
گر نہیں قاصد تو بدل کر کے بھیس　　آپ ہی پیغام بری کیجیے
قدر ہنر کی جو ہوئی، دیکھ لی　　اب ہنرِ بے ہنری کیجیے
کون ہے ان باتوں کا مانع، میاں　　خوب سی بیدادگری کیجیے
دل کی کچھ اس کو، سے نہ آئی خبر　　ماتمِ یارِ سفری کیجیے

مصحفیؔ، ہے وقتِ وداعِ جہاں
مثلِ چراغِ سحری کیجیے

564

روحِ بلبل چمن میں بھٹکے ہے　　اب تلک یاں گلاب چَھٹکے[4] ہے
زلف کو جب وہ کھول دیتا ہے　　جیسے مارِ سیاہ، لٹکے ہے
گر پڑا میں، ترا برا ہووے　　یوں بھی دامن کو کوئی جھٹکے ہے
مے پیوں ہوں تو مثلِ شیشۂ مے　　وہ بھی تجھ بن گلے میں اٹکے ہے
کون سے عضو کی کروں تعریف　　اس کی تو بوٹی بوٹی مٹکے[5] ہے
جب سے دیکھی ہے وہ پلک میں نے　　پھانس سی کچھ جگر میں کھٹکے ہے

---

[1] چند = تا چند۔ [2] نظری = سرسری، اچٹتی ہوئی۔ [3] مفت بری = مفت لے جانا۔
[4] چھٹکنا = بفتح اول و دوم، بھرپور کھلنا۔ [5] مٹکنا = پھڑکنا (بلکہ اس سے بھی لطیف معنوں میں)۔

گھر سے باہر نکل کہ مصحفی آج
تیری چوکھٹ پہ سر کو پٹکے ہے

565

آغازِ صبحِ ہجر کا' انجام دور ہے — اے دیدہ اور روکہ ابھی شام دور ہے
طاقت کہاں ہے اتنی کہ واں تک پہنچ سکیں — ہر چند باغ ہم سے کئی گام دور ہے
انصاف تو کرو، دلِ بیتاب کو مرے — آرام کس طرح ہو دل آرام، دور ہے
بیٹھے ہیں اور لوگ تو سارے بھڑے ہوئے[1] — مجلس میں تجھ سے اک یہی ناکام دور ہے
نزدیک میرے لاوے ٹک اُس ماہ رو کے تئیں — کیا یہ بھی تجھ سے گردشِ ایام دور ہے
مے پی چکوں تو دیکھیو بدمستیاں مری — یارو ابھی تو لب سے مرے جام دور ہے
مت بھولیو تو اپنی کمندِ شعاع پر — اے آفتاب اس کو لبِ بام دور ہے
بیٹھا ہے نقش سب کا لبِ یار پر درست — الّا کہ اس نگیں سے مرا نام دور ہے
جب سے نظر پڑی ہے اُس ابرو کی تیغ پر — سر سے ہمارے بالشِ آرام دور ہے

کیوں مصحفی کو دیکھ کے کہتا ہے دور دور
مدّت سے تجھ سے آپھی یہ بدنام دور ہے

566

گہ خون روئی' گاہے لختِ جگر نکالے — پھر تو نے رنگ اپنے' اے چشمِ تر نکالے
پھر نو بہار آئی اور پھر شگوفہ پھولا — ہر شاخِ بے ثمر نے پھر برگ و بر نکالے
ٹک دیکھ تو تماشا صنعت کی باغباں نے — اک مشتِ گِل سے کیا کیا رنگیں شجر نکالے

---

[1] بھڑے ہوئے = ایک دوسرے سے ملے ہوئے۔

سدِ سکندری میں گر رکھیے خوب روٗ کو　　وہ کاوشِ مژہ سے اس میں بھی دَر نکالے
اے نامودہ[1] عارض اس تیری جستجو نے　　پردے سے باہر آخر شمس و قمر نکالے
کوے بتاں میں میری چاروں طرف نظر ہے　　شاید کوئی پری روٗ غرفے سے سر نکالے
یہ حسن وہ بلا ہے آوے جو ساحری پر　　گھر سے پری کو اپنے دیوانہ کر نکالے
ممنونِ بے پری رہ یعنی کہ اس جہاں سے　　پروازِ زندگی ہے جب مور پر نکالے
اے شوقِ جاں فشاندن کیجو خبر ہمیں بھی　　دستِ ستم میاں سے شمشیر اگر نکالے
مارے خوشی کے مجھ کو آجائے ہے غشی سی　　کیسے سے خطِ جاناں تا نامہ بر نکالے
تو جس زمیں پہ اپنا اے مصحفی دھرے پانو
یُمنِ قدم سے تیرے وہ گنجِ زر نکالے

567

مارے گئے کئی ترے اے یار ہاتھ سے　　پر تو بھی تو نے رکھی نہ تلوار ہاتھ سے
اللہ رے دشمنی کہ جو ہیں مجھ کو دیکھنا　　کر لینے بند رخنۂ دیوار ہاتھ سے
یارب کہیں وہ دن ہو کہ میں گریہ جب کروں　　پونچھے تو میرے دیدۂ خوں بار ہاتھ سے
دیکھا ہے میں نے جب سے ترا چاکِ آستیں　　جاتا رہا ہے دل مرا اے یار ہاتھ سے
کیا اتنا اضطراب ہے خوں ریزی میں مری　　مہندی تو کھول ٹک کہیں خوں خوار ہاتھ سے
صیاد مرغِ دل کو ابھی ٹک قفس میں رکھ　　خوگر نہیں ہوا یہ گرفتار ہاتھ سے
کرنی ہے کچھ دوا مرے دل کو تو کر طبیب　　جاتا ہے مفت ورنہ یہ بیمار ہاتھ سے
گر اس چمن سے میں نے چنا ہو گلِ مراد　　نکلیں بسانِ شانہ مرے خار ہاتھ سے
کہتے ہیں رات سیر و تماشا میں مصحفی
مارا گیا کسی کے طرح دار ہاتھ سے

---

[1] نامودہ = اَن دیکھا۔

568

او دامن اٹھا کے جانے والے ٹک ہم کو بھی خاک سے اٹھا لے
روٹھو ہو ادھر، اُدھر منو ہو دنیا سے یہ ناز ہیں نرالے
حلقے زلفوں کے تیرے رخ پر اک ماہ ہے اور ہزار ہالے
عشق اس کو[1] ہے ہے جو کہ مثلِ شانہ ہاتھوں میں کھلائے[2] ناگ کالے
اس دل نے مجھے بہت ستایا دشمن کے پڑے نہ کوئی پالے
واں ہلتی ہیں پلکیں تیری اور یاں چلتے ہیں میرے جگر پہ بھالے
اتنا بھی تو مصحفی نہ خوں رو
رنگین تو ہو گئے رسالے

569

پردہ گر درمیاں سے اٹھ جاوے اک جہاں جسم و جاں سے اٹھ جاوے
مارے الفت کے مر گئے اے کاش رسمِ الفت جہاں سے اٹھ جاوے
دیکھ اُس کو، میں مجھ کو یوں بولا: کہہ دو اس کو کہ یاں سے اٹھ جاوے
جی میں ہے اتنے بوسے لیجے کہ آج مُہر اس کے دہاں سے اٹھ جاوے
رہے اے گل تو باغ میں، بلبل ستمِ باغباں سے اٹھ جاوے
ہم کو چلنا، وہ شوخ بے پروا گو سرِ امتحاں سے اٹھ جاوے
گل کا یہ رنگ، کیا تعجب ہے مرغ اگر آستاں سے اٹھ جاوے
نہ ملے جا اُسے کسی دَر پر جو ترے آستاں سے اُٹھ جاوے
کون کہتا تھا، خوش زباں ایسا مجلسِ دوستاں سے اُٹھ جاوے
ہائے رے مصحفی کا مرنا ہائے
آدمی یوں جہاں سے اٹھ جاوے

---

[1] عشق ہے = قلندروں اور آزادوں کا سلام۔ [2] کھلانا = کھیلنا سے متعدی ہے۔

570

آنکھوں سے رواں خونِ دل ریش رہے ہے | یاں روز یہی واقعہ درپیش رہے ہے
نظروں میں کبھی ہے مژہ اس شوخ کی جب سے | دل ساتھ مرے نت خلشِ نیش رہے ہے
منصور صفت گو کہ اسے دار پہ کھینچیں | حق گوئی سے کب مردِ حق اندیش رہے ہے
گہ لام تو گہ لام الف بنتی ہے بل کھا | زلف اس کی نہ برقاعدۂ خویش رہے ہے
نت قتلِ غریباں پہ کمر اس کی ہے بستہ | ان باتوں سے کب چرخِ جفا کیش رہے ہے
پانو اپنا رہِ عشق میں رکھوں کہ نہ رکھوں | ہر لحظہ یہی مجھ کو پس و پیش رہے ہے

اک روز تو کر مصحفی کی تو بھی زیارت
کوچے میں ترے کب سے یہ درویش رہے ہے

571

جوں ہی ٹک یار کی پیشانی میں چیں پڑتی ہے | سر و ساماں میں مرے برق وو ہیں پڑتی ہے
اس تامّل کا ہوں[۱] کشتہ کہ ترا وقتِ خرام | پانو پڑتا ہے کہیں، آنکھ کہیں پڑتی ہے
خار خار اُس مژہ کا بس کہ رہے ہے شبِ ہجر | ایک پل میرے تئیں نیند نہیں پڑتی ہے
نیم بسمل گئے ہیں وے جو ترے کشتۂ ناز | کیوں کے کل ان کے تئیں زیرِ زمیں پڑتی ہے

مصحفی کے تو، گھر آوے تو عجب بھی نہیں کچھ
تجھ سے امید تو اے زہرہ جبیں پڑتی ہے

572

عین رقت[۲] میں کوئی مجھ سے رکا جاتا ہے | کیا کروں خونِ دل آنکھوں سے بہا جاتا ہے

---

۱ ن۲: اس شمائل کا ہوں۔ ۲ ن۳: عین آفت میں۔

اندک اے پیش رواں وقفہ، کہ اس منزل میں اک مسافر سا کوئی پیچھے رہا جاتا ہے
بے حجابانہ نہ یوں بام پر آیا کر تو کہ ترے سامنے خورشید چھپا جاتا ہے
کون آگاہ ہے یاں درد سے اس گھایل کے روز زخموں سے نمک جس کے ملا جاتا ہے
بیٹھو اے یارو، کوئی بات بتاؤ مجھ کو آج نامے کا جواب اس کے لکھا جاتا ہے
آج کیا جانیے کیا باؤ چلی گلشن میں خود بخود رنگِ گل ولالہ اڑا جاتا ہے
مصحفی کے بھی میں ابرام کا دیوانہ ہوں
جھڑکیاں دے ہے وہ، یہ ساتھ لگا جاتا ہے

573

سرِ دل پر مجھے اک نیشتر معلوم ہوتا ہے مژہ کا تیری رخ پھر کچھ اِدھر معلوم ہوتا ہے
نمی سی پنبہٴ داغِ جگر میں اپنے پاتا ہوں کئی دن سے مجھے پھر اب وہ تر معلوم ہوتا ہے
کوئی گھر بیٹھے کیا جانے اذیت راہ چلنے کی سفر کرتے ہیں، جب رنجِ سفر معلوم ہوتا ہے
امیدِ وصل پڑتی ہے طلوعِ شمس سے دل کو ابھی سے نالہٴ شب کا اثر معلوم ہوتا ہے
کروں کیوں ذکر میں زاہد کے آگے شعر و شاہد کا وہ ان باتوں سے مجھ کو بے خبر معلوم ہوتا ہے
میں تم سے پوچھتا ہوں انتہا اس عشق بازی کی تمھیں بھی کچھ بھلا اے چشمِ تر معلوم ہوتا ہے
مری بھوکی نگاہیں دیکھ، شب ہمدم سے یوں بولا
کہ مجھ کو مصحفی کچھ بد نظر معلوم ہوتا ہے

574

تو، دیکھے تو اک نظر بہت ہے الفت تری اس قدر بہت ہے
اے دل تو نہ کر ہماری خصمی بس اک دلِ کینہ ور بہت ہے

ٹک اور بھی صبر کر کہ مجھ کو لکھنا ابھی نامہ بر بہت ہے
ہم آبلہ بن رہے ہیں ہم کو اک جنبشِ نیشتر بہت ہے
شیشے میں ترے شراب ساقی ٹک ہم کو بھی دے، اگر بہت ہے
اس رنگ سے اپنے گھر نہ جانا دامن ترا خوں میں تر بہت ہے
افسانۂ عشق کس سے کہیئے اس بات میں دردِ سر بہت ہے
مجھ کو نہیں آہ کا بھروسہ یعنی کہ یہ بے اثر بہت ہے
اس دل کی تو تو، خبر رکھا کر یہ آپ سے بے خبر بہت ہے
کیا بگڑی ہے آج مصحفی سے
اس کوچے میں شور و شر بہت ہے

575

اُٹھ گیا ہے وہ ستم دیدہ کہیں مدّت سے کچھ خبر مجھ کو دل اپنے کی نہیں مدّت سے
جیسے ناسور شب و روز بہا کرتی ہیں ہے یہ آزار ان آنکھوں کے تئیں مدّت سے
کبھی آزردگی اپنی کو کریں گے ظاہر دل میں کھٹکے ہے تری چیں بہ جبیں مدّت سے
کچھ نہ پوچھو کہ غمِ عشق بتاں نے یارو کر رکھا ہے مری خاطر کو حزیں مدّت سے
آسماں تازہ نہیں برسرِ بیداد آیا یاد ہے اس کے تئیں شیوۂ کیں مدّت سے
کچھ تبسّم نے لبِ یار کے ڈالا نہیں شور خندۂ زخمِ جگر ہے نمکیں مدّت سے
کوئی واقف نہیں احوال سے میرے شاید میں تو اس شہر میں ہوں گوشہ نشیں مدّت سے
آبرو کی ہے زبس پاس مجھے، گاڑے پانو[1] گھر میں بیٹھا ہوں میں مانندِ نگیں مدّت سے

---

[1] پانو گاڑ کر بیٹھنا = پانو توڑ کر بیٹھنا، (قناعت گوشہ نشینی)۔

مصحفی اس کی گلی میں ہی رہا آخر ٹھور[1]
تھی مرے خون کی پیاسی یہ زمیں مدّت سے

576

جب سے اس شوخ نے شمشیر و سپر باندھی ہے — ہم نے بھی خون پہ یاں اپنی کمر باندھی ہے
روز آ آ کے مجھے گالیاں دے جاتے ہو — مجھ پہ زور آپ نے اس بات کی کر باندھی ہے[2]
کیا تماشا ہے کہ اس شعبدہ بازی نے تری — جو نظر باز ہیں ان کی بھی نظر باندھی[3] ہے
گل ہی اس باغ سے جانے پہ نہیں بیٹھا کچھ — گٹھری غنچے نے بھی از بہرِ سفر باندھی ہے
جائے مرہم نمکِ سودہ لگایا ہے اسے — زخمِ دل پر میں نئی پٹّی اگر باندھی ہے
آج جو گریے کا ساماں ہے بہ اندازِ دگر — شرط کیا ابر سے اے دیدۂ تر باندھی ہے
دل کو اپنے ہدفِ تیرِ بلا پاتا ہوں — اس کماں کش نے مگر شست ادھر باندھی[4] ہے
لختِ دل جھمکے ہے یوں چشم کے پردے سے مری — تو کہے جگنو ہے یا اس میں شرر[5] باندھی ہے
باندھ[6] نیوں ہم پہ نئے سر سے لگے ہیں بندھنے — اس نے پھر باندھنوں[7] کی پگڑی مگر باندھی ہے

مصحفی اشکِ مسلسل کے میں صدقے جس نے
ہر پلک سے مری اک سلکِ گہر باندھی ہے

577

اوّل تو یہ دھج اور یہ رفتار غضب ہے — تس پہ ترے پازیب کی جھنکار غضب ہے

---

[1] ٹھور رہنا = رہ پڑنا۔ [2] کر باندھی ہے = خوب طریقہ اختیار کرنا۔ [3] نظر باندھنا = شعبدے باز نظر بندی کر دیتے ہیں، یعنی جو وہ چاہتے ہیں وہی نظر آتا ہے۔ [4] شست باندھنا = نشانہ باندھنا۔ [5] شرر مونث۔ [6] باندھ بندھنا = پابندیاں، احتیاط۔ [7] باندھنو، ایک طرح کا بندکی دار کپڑا جس کی پگڑی باندھی جاتی ہے۔ چھینٹ۔

کیوں کر نہ تجھے دوڑ کے چھاتی سے لگالوں — پھولوں کا گلے میں ترے یہ ہار غضب ہے
جب دیکھوں ہوں کرتی ہے مرے دل کو پریشاں — آشفتگیِ طرّۂ طرار غضب ہے
اے کاش یہ آنکھیں مجھے دن نہ دکھاتیں — اس شوق پہ محرومیِ دیدار غضب ہے
خورشید کا منہ ہے کہ طرف ہو سکے اس سے — یعنی وہ بر افروختہ رخسار غضب ہے
میں اور کسی بات کا شاکی نہیں تجھ سے — یہ وقت کے اوپر[1] ترا انکار غضب ہے
اب تک حرمِ وصل سے محرم نہ ہوئے ہم — کعبے میں حجابِ در و دیوار غضب ہے
گر ایک غضب ہو تو کوئی اس کو اٹھاوے — رفتار غضب ہے، تری گفتار غضب ہے
فرہاد بچا عشق سے، نے قیس، نہ وامق — جی لے ہی کے جاتا ہے یہ آزار غضب ہے

اے مصحفی اس شوخ سے ٹک بچ کے تو چلنا
سنتا ہے، میاں وہ بت خوں خوار غضب ہے

578

راہِ خدا میں اتنی سعیِ قدم[2] کریں گے — اب اس گلی کو ہم بھی جانا ہی کم کریں گے
تیغِ نگہ کی اس کے سنتے ہیں آب داری — اک دن جگر کے ٹکڑے، ہم بھی بہم کریں گے
آئے تھے کچھ سمجھ کر، کیا جانتے تھے یہ ہم — تیغِ جفا کو خوباں ہم پر علم کریں گے
بن خوں سے لکھے کوئی ہوتا ہے نامہ رنگیں — ہم انگلیوں کو اپنی اک دن قلم کریں گے
جانے لگا ہے پھر دل بے طرح اس گلی میں — اس کا بھی رفتہ رفتہ کچھ فکر ہم کریں گے
مسجد میں گر خروشاں ہے شیخ، یا صمد خواں — ہم بت کدے میں جا کر ذکرِ صنم کریں گے

---

[1] وقت کے اوپر = اس ترکیب پر غور کیجیے۔ یہ اردو کی بولی ہے۔

[2] سعیِ قدم = چلنا، یعنی اب اتنا خدا کی راہ میں چلیں گے۔ صفا و مروہ کے درمیان کے حجاج کے چلنے کو بھی سعی کہتے ہیں۔

معمورۂ جہاں سے دل سرد ہو گیا ہے — یک چند جا کے سیرِ ملکِ عدم کریں گے
گر تازہ کاریوں پر آئے یہ اشکِ خونیں — تیری گلی کو جیسے باغِ ارم کریں گے
کیا غم ہے مصحفیؔ گر کاغذ نہیں[1] حنائی
ہم خون رو رو اُس کو نامہ رقم کریں گے

579

چاہ ہی کہیں بلا بھی ہوتی ہے — طبع ہی مبتلا بھی ہوتی ہے
شیخ جی سچ کہو تو تم سے نماز — کبھی حضرت قضا بھی ہوتی ہے
تونے اک بات پر کیا مجھے قتل — کہیں ایسی جفا بھی ہوتی ہے
مار نہیں ڈالتے[2] ہیں یوں اس کو — آدمی سے خطا بھی ہوتی ہے
مصحفیؔ جب میں شعر پڑھتا ہوں
تحسیں اور مرحبا بھی ہوتی ہے

580

یوں کر کے مرے لاشۂ قرباں کے ٹکڑے — جاتا ہے کدھر[3] او بے مری جان کے ٹکڑے
مت نام لو سینے کا کوئی ورنہ ابھی میں — کر ڈالوں گا پھر اپنے گریباں کے ٹکڑے
وہ خستہ بدن ہوں میں کہ جب ڈھونڈیں ہیں احباب — زخموں سے مرے نکلیں ہیں پیکان کے ٹکڑے
تم نے کبھو آگو بھی کوئی قتل کیا ہے — اس طرح نہیں کرتے ہیں انسان کے ٹکڑے
اے عشق روا ہے یہ گریباں زلیخا — ثابت رہے یوسف کے ہوں دامان کے ٹکڑے

---

[1] حنائی کاغذ = پہلے مہندی سے رنگا ہوا کاغذ استعمال کیا جاتا تھا۔ [2] ن۲: ماریوں ڈالتے نہیں اس کو۔
[3] ن۳. جاتا ہے کہاں۔

کچھ لختِ دل اور اشک میں اتنا تو نہیں فرق دے پارۂ آتش ہیں، یہ طوفان کے ٹکڑے

اے مصحفی غیرت سے مرے طرزِ سخن کی
ہر اک نے کیے پھاڑ کے دیوان کے ٹکڑے

581

اوّل تو قفس کا مرے در باز کہاں ہے اور ہو بھی تو یاں طاقتِ پرواز کہاں ہے

انجام ہے بد اس کا، نہ ہر اک سے ملا کر چہرے پہ ترے خط ابھی آغاز کہاں ہے

بلبل تو، طرف مجھ سے تو سو مرتبہ ہوتی میری سی ولیکن تری آواز کہاں ہے

معلوم ہی گھر اس کا نہیں، ڈھونڈیں سو کیوں کر کیا جانیے وہ خانہ بر انداز کہاں ہے

طاؤسِ چمن گرچہ بہ صد ناز چلے ہے تری سی روش پر بتِ طنّاز کہاں ہے

یارو کوئی سمجھو تو مغنّی کی صدا کو کس پردے میں بولے ہے یہ آواز کہاں ہے

میری ہی طرح اور بھی یاروں کی زباں پر سو بات ہیں پر بات کا انداز کہاں ہے

اے مصحفی میں جس سے کہوں دردِ دل اپنا
اب کوئی یہاں محرم و ہمراز کہاں ہے

582

اس کی جب بات کان پڑتی ہے تنِ بے جاں میں جان پڑتی ہے

دیکھنا سب کا بھول جاتا ہوں جب نظر تجھ پر آن پڑتی ہے

ایک دن بھی معاملت جس کو قطعہ تم سے اے مہربان پڑتی ہے

جی دیے ہی بنے پھر اس کو صبح گو کہ شب درمیان پڑتی ہے

عشق کی برق گو نہیں ہمہ سوز
مصحفی پر ندان پڑتی ہے

583

جوں نقشِ قدم، پیارے واں خاک میں جم بیٹھے　　اٹھنے کی، ترے در سے، ہم کھا کے قسم بیٹھے
احسان کا قاتل کے حق کیوں کے کریں برباد　　شمشیر تلے اس کی ہم بھی کوئی دم بیٹھے
نت تفرقہ ہی اس میں اور ہم میں رہا یارب　　افسوس کہ اک دن بھی مل کر نہ بہم بیٹھے
دل کرنے لگا جب شغل اس کوچے میں نالے کا　　اک سمت کے تئیں ہم بھی لے دیدۂ نم بیٹھے
آتے ہو تو جلدی آؤ یاں یوں ہی کہو: جاؤ　　تا چند میاں صاحب در پر رہیں ہم بیٹھے

اے مصحفی آئے تھے وے یار کہ بَن بَن کر
اس محفلِ ہستی میں افسوس کہ کم بیٹھے

584

خط آچکا پہ ہنوز اس کی آن باقی ہے　　وہی ادا ہے وہی عظم و شان باقی ہے
گر اور بھی ہوسِ امتحان باقی ہے　　تو اب تلک بھی میاں نیم جان باقی ہے
جو اٹھ گئے تری کو سے، نشست گاہ ان کی　　برنگِ نقشِ قدم اک نشان باقی ہے
گدازِ غم کو جواب تک ہے لاگ شمع صفت　　مگر بدن میں کوئی استخوان باقی ہے
لیا تو جان و دل، اس وقت وہ بھی لے لیجے　　کچھ اور بھی اگر اے مہربان باقی ہے
رہا ہے کون سدا اس جہانِ فانی میں　　اسی کی ذات ہے وہ جو ندان باقی ہے

ملے بھی خاک میں ہم، لیک مصحفی اس کو
ہمارے جینے کا اب تک گمان باقی ہے

585

اس کے لبِ مے گوں ہیں سدا کام میں اپنے　　ہم خونِ جگر کیوں نہ بھریں جام میں اپنے

کس طرح کریں عشق، کہ مانند نگیں کے — حرف آتا ہے اس بات سے اک نام میں اپنے
بیدار نہ ہوتے کبھی ہم خوابِ عدم سے — گر عشق نہ کرتا خلل آرام میں اپنے
آئینے میں وہ دیکھ کے زلف اپنی پریشاں — آخر کے تئیں آہی گیا دام میں اپنے
کر کر کے یہ فریاد فغاں راتوں کو آپھی — ہم آپ خلل کرتے ہیں آرام میں اپنے

مر جاویں پہ واعظ کی نہ ہو ہم سے اطاعت
اے مصحفی یہ کفر ہے اسلام میں اپنے

586

دل کو یہ اضطرار کیسا ہے — دیکھیو بے قرار کیسا ہے
ایک بوسہ بھی دے نہیں سکتا — مجھ کو پیارے، تو یار کیسا ہے
کشتۂ تیغِ ناز کیا جانے — خنجرِ آب دار کیسا ہے
ہر گھڑی گالیاں ہی دیتے ہو — جان میری، یہ پیار کیسا ہے
مے نہیں پی تو کیوں چھپاتے ہو — انکھڑیوں میں خمار کیسا ہے

اور تو ہیں ہی، یہ تو کہہ، بارے
مصحفی دوستدار کیسا ہے

587

دل میں مرغانِ چمن کے تو گماں اور ہی ہے — پر دلِ زار کا اندازِ فغاں اور ہی ہے
قدِ نوخیز نہیں، آفتِ جاں اور ہی ہے — جس پہ دل اپنا گیا ہے وہ جواں اور ہی ہے
ہم جہاں رہتے ہیں یارو، وہ جہاں اور ہی ہے — وہ جگہ اور ہی ہے اور وہ مکاں اور ہی ہے
شفقی رنگ پہ مت بھولیو اپنے، اے ابر — چشمِ خشک اور مژۂ اشک فشاں اور ہی ہے

بدن آغشتہ بخوں ہونے پہ موقوف نہیں　　زخمیٔ ناوکِ مژگاں کا نشاں اور ہی ہے

گو کہ اوروں کی ہوئیں سرمے سے آنکھیں روشن　　سرمۂ بینشِ صاحب نظراں اور ہی ہے

گرچہ رکھتے ہیں نزاکت یہ سبھی موکمراں　　وہ نزاکت ہے جُدی اور وہ میاں اور ہی ہے

مصحفی گرچہ یہ سب کہتے ہیں ہم سے بہتر
اپنی پر ریختہ گوئی کی زباں اور ہی ہے

588

یہ نہیں، پیارے وہ تقریر و بیاں اور ہی ہے　　جس سے کوئی تم کو سرا ہے وہ زباں اور ہی ہے

میں تو کہتا ہوں بہت دن سے کہ ہوں عاشقِ صاف　　لیک یاروں کو مرے حق میں گماں اور ہی ہے

کیا عمارات سے ڈھونڈے ہے نشانِ عشاق　　ہائے ان خانہ خرابوں کا نشاں اور ہی ہے

ہو گیا پردۂ دل چاک تو تم دیکھو گے　　اس کے پردے میں کوئی آفتِ جاں اور ہی ہے

اور کہتے ہیں جو مو، تیری کمر کو تو کہیں　　ہم کو کیا کام، خیال اپنا میاں اور ہی ہے

اک ذرا جھانک تو تو خاک کے پردے سے اُدھر　　تا تجھے بھی نظر آوے کہ جہاں اور ہی ہے

پھول جھڑتے ہیں قلم سے مرے گل[1] ریز کی طرح　　کوئی انصاف سے دیکھے تو سماں اور ہی ہے

مصحفی ہر کوئی کب پہنچے ہے اس رتبے کو
رتبۂ شعر و سخن سچ ہے کہ ہاں اور ہی ہے

589

معشوق کی بلا سے پڑا خوار ہو کوئی　　جیوے کوئی، مرے کوئی، بیمار ہو کوئی

جس طرح دامِ زلف میں پھڑکے ہے مرغِ دل　　یارب نہ یوں کسی کا گرفتار ہو کوئی

1۔ گل ریز = آتش بازی جسے پھلجھڑی بھی کہتے ہیں۔

سوتا ہے میرے پاس وہ اور گرد سب رقیب دھڑکا ہے دل میں یہ کہ نہ بیدار ہو کوئی
کیا ایسی تجھ میں خوبی ہے، کاہے کو، کیا ضرور جی بیچ کر جو تیرا خریدار ہو کوئی
گر کام دل کا لیجیے اُس سے تو خوب سا کیا ایک بوسہ لے کے گنہ گار ہو کوئی
پیارے کرے نہ آہ تو پھر آہ کیا کرے ہاتھوں سے درد و غم کے جو ناچار ہو کوئی
میری طرف سے اک نے کہا اس کو کاے میاں قطعہ کرتے ہیں یوں خفا اُسے، جو یار ہو کوئی
کہنے لگا کہ واہ جی تم بھی ہو زور شخص میں کیا کروں جو آپ سے بیزار ہو کوئی

سو بار جا چکا ہے یہ گدڑی[1] میں مصحفی
وہ دل نہیں کہ جس کا خریدار ہو کوئی

590

ہے جی میں تو اپنے کہ وفا کیجیے اس سے پر جی ہی کا دشمن ہو، تو کیا کیجیے اس سے
شاید وہ غمِ دل کی مرے داد کو پہنچے اس بات کو ظاہر تو بھلا کیجیے اس سے
غصے ہو تو کچھ اپنی غرض آپ نہ کہیے جو کچھ وہ کہے اس کی سنا کیجیے اس سے
تا حشر لبِ شکوہ مرے بند نہ ہو ویں اس دل کو اگر باتوں میں وا کیجیے اس سے
وہ ہم سے جو شاکی ہے تو گو ہووے ولیکن ہم کو نہیں لازم کہ گلا کیجیے اس سے
پیچھے ہی لگا پھرتا ہے جوں سایہ شب و روز کیوں کر دلِ دیوانہ جدا کیجیے اس سے

سنتے ہو میاں مصحفی ہو جاؤ گے رسوا
چھپ چھپ کے نہ راتوں کو ملا کیجیے اس سے

591

آہ و فغان و گریہ و زاری ہم ہیں اور یہ رات ہے ساری

---

[1] گدڑی = بازار

دیکھ تو تو' اس رونے کا رنگ — یوں روتا ہے ابرِ بہاری
اُس بُت سے تو وہی بہتر تھا — پتھر سے گر کرتے یاری
اے دل، اب ہم دور چلے ہیں — دیکھیو مت تو راہ ہماری
کیا کیا ہم نے کیا نہیں آگے — چہرہ خراشی' سینہ فگاری
مصحفی آیا وقت سفر کا
چلنے کی کیجے تیاری

592

ایسے تم کیا ہو میاں جو تمہیں ہم دیکھیں گے — جا کسی اور ہی کو اب کوئی دم دیکھیں گے
تم خفا ہم سے بہت ہو گئے اس دیکھنے پر — آج سے ہم کو بھی سوگند ہے، کم دیکھیں گے
قبلہ ہو گے تو کبھی منھ نہ کریں گے اودھر — بخدا ہم کو بھی، ہم اور صنم دیکھیں گے
غیر دیکھیں تمہیں اور ہم کو کہو: جا بے نہ دیکھ — اپنی آنکھوں سے بھلا ہم یہ ستم دیکھیں گے
دیکھنے کی جو اِدھر تم نے قسم کھائی ہے — کب تلک نبھتی ہے، ہم بھی یہ قسم دیکھیں گے
دیکھ کر ہم تو چلے پر یہی حسرت ہے کہ ہائے — اب یہ اغیار ترے لطف و کرم دیکھیں گے
ایک دن جان نکل جاوے گی آنکھوں ہی کی راہ
مصحفی عشق میں گر ایسے ہی غم دیکھیں گے

593

جب وہ قاتل خرام کرتا ہے — ہم قدم قتلِ عام کرتا ہے
جو کوئی دیکھتا ہے اس کے تئیں — دونوں ہاتھوں سلام کرتا ہے
تجھ بن اس مے کدے میں، اے ساقی — کون لب ریز جام کرتا ہے

تو کھڑا رہ کہ آپھی یہ بسمل — کام اپنا تمام کرتا ہے
جب کہ نکلے ہے گھر سے وہ باہر — عالم اک ازدحام کرتا ہے
نہ کرے گا کوئی میاں صاحب — خدمتیں جو غلام کرتا ہے
ایک دن آکے مل بھی جا پیارے — روز کیا صبح و شام کرتا ہے
ابھی اک زخم اور بھی قاتل — تیغ کو کیوں نیام کرتا ہے
مصحفی دل دیا تو ایسے کو — قطعہ — جس سے ہر اک پیام کرتا ہے
کیا کیا تونے سن تو دیوانے
کوئی ایسا بھی کام کرتا ہے

594

دل غش کردہ مرا زار و نزار اس کا ہے — لے چلو واں مجھے جس جا گہ گذار اس کا ہے
ایسے بدوضع سے اب اپنی، کہو کیوں کے نبھے — ہر گھڑی غیر سے ملنا، یہ شعار اس کا ہے
داغ ہوتے ہیں اُسے دیکھ کے گل گلشن میں — سرخ جوں لالہ زبس رنگِ عذار اس کا ہے
نشۂ مے سے نہیں، یارو مری آنکھیں سرخ — خون دل کل جو پیا تھا، یہ خمار اس کا ہے
شمع رُو کیوں نہ جلوں رشک سے پروانے کے — رات ہوتے ہی تری بزم میں بار اس کا ہے
چہرۂ زرد پہ عاشق کے نہیں اُس کو نگاہ — جو کوئی زر اُسے دے یار، وہ یار اس کا ہے
مصحفی گرچہ میں حسرت زدہ ہوں خاک کا ڈھیر
تو بھی ہر روز مرا آئینہ دار اس کا ہے

595

کیا جانے کب وہ چہرۂ پُرنور دیکھیے[1] — کب صبح ہووے یہ شب دیجور دیکھیے

---

[1] یعنی کب دیکھیں

ازبس میں تجھ سے دیکھے ہیں رنج وتعب کہ اب — دل دیجیے نہ اس کو اگر حور دیکھیے
کیا کر رہے ہو باغ میں نرگس ہی[1] پر نگاہ — ٹک اپنی بھی تو نرگسِ مخمور دیکھیے
وہ دل کہ جس کی آنکھ سے آنسو گرا نہ ہو — کیا قہر ہے کہ اب اسے ناسور دیکھیے
ہم رہ گئے، رفیق سب آگے نکل گئے — اب ہم سے طے ہو کب یہ رہِ دور، دیکھیے
تم دیکھو آئینے میں تمھیں اس کا کیا ہے ڈر — جو ہووے اپنی چشم کا منظور دیکھیے
اک تند خو سے آنکھ لڑائی تو ہے، ولے — ہے حق میں میرے کیا اسے منظور دیکھیے
مارا ہے ہم کو جان سے اس کے غرور نے — کب مہرباں ہو وہ بتِ مغرور، دیکھیے

ایسے کے تئیں نہ چھیڑیے زنہار مصحفی
دیوانے پہلے اپنا بھی مقدور دیکھیے

596

نت ضعف سے فتادہ یہ سر، برزمین ہے — مانندِ نقشِ پا مرا بستر، زمین ہے
کاٹے ہی سے کٹے گی یہ مانند بیستون — فرہاد راہِ عشق کی پتھر زمین ہے
پست و بلندِ دہر پہ کیا کیجیے نظر — جب آنکھیں مُند گئیں تو برابر زمین ہے
اس زلفِ مشک فام کی لٹ کھل گئی تھی رات — دیکھا تو اب تلک بھی معطّر زمین ہے
بارِ گنہ سے آپ کو اتنا گراں نہ کر — کشتی کی طرح، پانی کے اوپر زمین ہے

ہوں خاکِ پائے خلق، میں دنیا میں مصحفی
یعنی بسانِ مور مرا گھر زمین ہے

597

کوچے میں اس کے کتنوں کا سر، برزمین ہے — مسجودِ خلق ہے یہ عجب سر زمین ہے

---

[1] ن۲: نرگس پہ تم نگاہ

مت پوچھ ماند و بود تو اپنے مریض کی — بالیں جو سنگ سے ہے، تو بستر زمین ہے
ہندوستاں سے ہائے کوئی کیوں کے بچ کے جائے — یہ خاکِ سحر خیز تو کافر زمین ہے
اک دن ہوا تھا وہ گلِ عارض عرق فشاں — اب تک ہمارے گھر کی معطّر زمین ہے
تخمِ امید اس میں جو بویا سو جل گیا — صحرائے دل کی حیف کہ بنجر زمین ہے
مت کھینچ آسمان پہ خود کو کہ آخرش — منزل گہِ فقیر و تونگر زمین ہے
فرشِ شہی سے کام ہے کیا ہم کو مصحفی
اپنی نشست گاہ تو اکثر زمین ہے

598

کوچے کی تیرے خوں میں تر اکثر زمین ہے — کیا خاکِ کربلا یہی کافر زمین ہے
ہے مبتذل[1] ہمیشہ ہوا آہِ سرد کی — اقلیمِ عشق کی بھی عجب سرزمین ہے
دل کی طپش پہ میرے، ہے اس کا بھی عرصہ تنگ — صحرائے حشر اگرچہ سراسر زمین ہے
کس طرح کہیئے، چھوٹ گئے مر کے وے مریض — سل سی جنھوں کی چھاتی کے اوپر زمین ہے
کیا کیا نہ خوں ہوئے ترے کوچے کی خاک پر — انصاف ہو تو قابلِ محضر[2] زمین ہے
آتا ہے جی میں رو کے ڈبا دوں اسے بھی سب — یہ تھوڑی سی جو پانی کے باہر زمین ہے
گاڑا تھا تیری زلف کے کشتے کو جس جگہ — کہتے ہیں لوگ واں کی معنبر زمین ہے
دیکھو نہ خاکساروں کو ہرگز بہ چشمِ کم — رتبے میں آسماں کے برابر زمین ہے
جس جا کیا تھا ذبح مجھے اس نے مصحفی
تھالے[3] سے خوں کے اب بھی وہاں تر زمین ہے

---

[1] مبتذل= رک غزل (۲۹۷) کے حواشی۔ [2] محضر= قتل کا محضر یا پنچایت نامہ، جو خوں خواہوں کی طرف سے بادشاہِ وقت کو یا قاضی کو دیا جاتا تھا۔ [3] تھالا= جانور کو ذبح کرنے سے پہلے زمین میں چھوٹا سا گڑھا کھود لیا جاتا ہے جس میں اس کا خون گرتا ہے، پھر وہ جگہ مٹی سے بند کر دی جاتی ہے۔

599

ہر طرف وہ شمع رو ہے جلوہ آرا، دیکھ لے
حق نے گر دی ہیں تجھے آنکھیں، تماشا دیکھ لے

اس گذر[1] کا اور بھی دو دن تماشا دیکھ لے
آنکھیں کرتی ہیں تری کس کس سے سودا دیکھ لے

ہم کو تو ہرگز نظر آتی نہیں اس کی کمر
چاہیئے کیا ہم نشیں، گر تو ہے بینا دیکھ ہے

یار کے چہرے سے کھولا چاہتا ہوں میں نقاب
لیک ڈرتا ہوں کوئی اُس کو مبادا دیکھ لے

پھر کہاں پاوے گا اے دیوانے یہ فصلِ بہار
کر لے سیرِ گلستاں، اور کوہ و صحرا دیکھ لے

دیکھ تو کیسا یہ تیری راہ میں ہے شور و شر
رکھ نہ تو یاں سے قدم آگے، یہ غوغا دیکھ لے

بام پر آتا تو ہے تو، ہو کے ہر شب بے حجاب
اور جو کوئی چاند سا تیرا یہ مکھڑا دیکھ لے

مصحفی آخر تو تو، جاوے گا آپھی اس کے پاس
راہ اس کی اور بھی امروز و فردا دیکھ لے

600

نہ کرو دیر مرے قتل میں تم آوَ بھی
گر نہیں تیغ تو خنجر ہی میاں لاوَ بھی

سر بسر، مایۂ شر ہے یہ مری بد مستی
شیخ جی خیر سے تم گھر کو کہیں جاوَ بھی

جانِ من دور کھڑے کیا ہمیں ترساتے ہو
آئے ہو اب تو گلے سے کہیں لگ جاوَ بھی

کون برداشت کرے نت کی تمھاری ہر دم
ایک تو گالیاں دو دوسرے دھمکاوَ بھی

کیا کروں اب تو کیا تم سے سوالِ بوسہ
لب شریں سے جو دینا ہے تو فرماوَ بھی

سارے عالم میں بہت تم نے کیا مجھ کو خراب
کہیں اے دیدہ و دل اپنا کیا پاوَ بھی

بزم سب منتظر آنے کی تمھارے ہے غرض
حضرتِ مصحفی تشریف کہیں لاوَ بھی

---

[1] گذر = بہ تخفیف یا بمعنی گذری

601

ہم کو تو اپنا ہی جانا چاہیے ۔۔۔ غیر سے یوں منہ پھرانا چاہیے

کیوں کے بے تقریب جاؤں اس کے پاس ۔۔۔ کچھ تو ملنے کو بہانا چاہیے

جانے کا کچھ اس گلی میں ڈر نہیں ۔۔۔ شب کے رہنے کو ٹھکانا[1] چاہیے

کوئی کسی کو مفت بھی دیتا ہے جاں ۔۔۔ او میاں اتنا تو جانا[2] چاہیے

قصۂ غم میں اگر لکھوں تمام ۔۔۔ اس کے لکھنے کو زمانا[3] چاہیے

جب کہ گردن رکھ دی ہو خنجر تلے ۔۔۔ پھر ہمیں کیا سر اٹھانا چاہیے

تیرِ مژگاں کے یہ دل قابل نہیں ۔۔۔ یاں کوئی نازک نشانا چاہیے

رہیے اک شب یاں بھی، ایسی کیا ہے ضد ۔۔۔ بات کو میری بھی مانا چاہیے

مصحفی ناصح تو نکلا منہ کا سخت

اس کے تئیں اب اک دہانا چاہیے

602

اے عشق تیری[4] اب کے وہ تاثیر کیا ہوئی ۔۔۔ شورِ جنوں کدھر گیا، زنجیر کیا ہوئی

دیوانہ پن کا میرے جو کرتے نہیں علاج ۔۔۔ تدبیر کرنے والوں کی تدبیر کیا ہوئی

آگو کی طرح آپ جو اَب بولتے نہیں ۔۔۔ کیا جانے ایسی ہم سے وہ تقصیر کیا ہوئی

ہم نے تو تم کو دوڑ کے کولی مٔیں بھر لیا[5] ۔۔۔ فرمایئے اب آپ کی شمشیر کیا ہوئی

کی تھی جو میں مرقّعِ عالم سے انتخاب

اے مصحفیؔ دریغ وہ تصویر کیا ہوئی

---

۱ جانا چاہیے = جاننا چاہیے۔ ۲ ن۲: رہنے کا ۳ ن۲: بہانہ

۴ ن۳: اب کی وہ تری۔ ۵ کولی میں بھرنا = آغوش میں لے لینا، یہ بھی ٹھیٹھ بولی ہے۔ نیز دیکھو شعر نمبر ۵۰۶۳

603

وصل کی شب جسے کہتے ہیں سو پائی نہ گئی
ہم گئے جان سے، پر تیری جدائی نہ گئی

عشق[1] سے ہم کو کھلاتا تھا قسم یار بہ تیغ
تیغ کھائی پہ قسم ہم سے تو کھائی نہ گئی

تیری تصویر بنا، ویسی ہی پھر مانی نے
اور تصویر بنائی، تو بنائی نہ گئی

آہ وہ آتشِ سوزاں ہے کہ جس دم بھڑکی
پھر کسی طرح سے یہ آگ بجھائی نہ گئی

آج جور طلِ گراں دے اسے، دشمن ہے مرا
جس سے کل مے کی صراحی بھی اٹھائی نہ گئی

گرم ہے آہ سے ہنگامۂ آتش بازی
کون سی شب کہ فلک تک یہ ہوائی نہ گئی

کب وہ بت گھر سے نہ مسجد کی طرف آنکلا
دیکھنے کس دن اسے ساری خدائی نہ گئی

گرچہ کوتاہ کیا قطع کر ان کو تو' نے
تو بھی، پیارے تری زلفوں کی رسائی نہ گئی

کس طرح ہم تجھے پردے میں چھپا بٹھلاویں
جب کہ حق سے ہی تری شکل چھپائی نہ گئی

وصل کی شب ہی تو کچھ مجھ سے بگڑ بیٹھے ہے
سب ہوا پر یہ تری شب کی لڑائی نہ گئی

دیکھ اس جنبشِ ابرو کو ہوئے ہم مجروح
مصحفی ہم سے یہ تلوار بچائی نہ گئی

604

کل جوں ہی دابی چشمِ تر انگشت کے تلے
آنے لگا لہو سا ہر انگشت کے تلے

صیّاد مجھ کو اب ترے چنگل سے چھوٹنا
رہ جاویں گو کہ ایک دو پر انگشت کے تلے

قاتل سے میرے خون کا دعویٰ نہ کیجیو
دیکھو مزار اُس کی گر انگشت کے تلے[2]

مرہم لگا دے گر تو، مرے داغ کو طبیب
رکھ لیجو ٹک حنا بھی سر انگشت کے تلے

---

[1] ن۲: عشق کی ہم کو کھلاتا ہے۔ [2] مسلمانوں میں (خاص طور سے شیعوں میں) یہ قاعدہ ہے کہ مردے کو دفن کرنے کے بعد کوئی شخص جھک کر انگشتِ شہادت مزار پر رکھتا ہے اور اسی حالت میں دعائے مغفرت پڑھتا ہے۔ مذکورہ شعر میں مزار کے انگشت کے تلے ہونے میں یہی تلمیح ہے۔

مَردوں کے زیردست ہی ہوتے ہیں بھائی بند　　جیسے سب انگلیاں ہیں نرانگشت[1] کے تلے

سینے میں داب داب کے رکھوں کہاں تلک　　دل ہاتھ کے تلے، جگر انگشت کے تلے

کاہے کو اپنا زور سے رکھو تم اس پہ ہاتھ　　جو ناتواں کہ جائے مر، انگشت کے تلے

تو مجھ سے کیا چھپائے ہے، لایا ہے اس کا خط

کچھ ہے تو تیری نامہ برانگشت کے تلے

605

روتے نت زار زار گذری ہے　　یوں ہی لیل و نہار گذری ہے

جی سے گذارا ہے وہ، تری صورت　　جس کی نظروں سے یار گذری ہے

سیکھے عشق ہم سے کوئی، اپنی عمر　　کرتے یہ کاروبار گذری ہے

اشکِ گلگوں رہے ہیں زیبِ مژہ　　خار پر بھی بہار گذرہی ہے

گل کی خاطر میں بھی نہیں اب تک　　جی سے بلبل ہزار گذری ہے

پوچھ مت سرگذشت کچھ میری　　زیرِ شمشیرِ یار گذری ہے

کیا کہوں اس نگاہ کا انداز　　تیری دل کے پار گذری ہے

کہہ دو مجنوں سے، ناقۂ لیلیٰ　　آج پھر بے مہار گذری ہے

مصحفی سر سے آبِ تیغ اس کی

جیسے دریا کی دھار گذری ہے

606

آغوش میں کب آ کے، تم اے یار سو گئے　　خالی بغل ہی ہم تو کئی بار سو گئے

اغلب کہ حشر کو نہ اٹھیں گے وے خواب سے　　جو اس کے زیرِ سایۂ دیوار سو گئے

---

[1] نرانگشت = ابہام، انگوٹھا

آتی نہیں جو کان تلک اب صدائے آہ — شاید کہ تیری چشم کے بیمار سو گئے

جو آئے اس کے کوچے میں، رات ان پہ یوں کٹی — دو چار جاگتے رہے، دو چار سو گئے

کیا رکھے چشم وا کوئی اس خواب گاہ میں — یاں ہم سے کتنے مردمِ ہشیار سو گئے

باہر نکل تو، گھر سے کہیں اب تو، میری جان — باشندگانِ کوچہ و بازار سو گئے

مخمل کی سیج پر بھی نہ آتا تھا[1] جن کو خواب — سو اب وے فرشِ خاک پہ ناچار سو گئے

گر ہم تمہارے ملنے کو آئے تو تم، میاں — چادر سے منہ چھپا دو ہیں یک بار سو گئے

اے مصحفی ملا نہ وہ کافر بہ قول درد
ایسے ہمارے طالعِ بیدار سو گئے

607

ہم کو نے دنیا و نے دیں چاہیے — اک صنمِ زہرہ جبیں چاہیے

دل مرے پہلو میں ٹھہرتا نہیں — جا اسے، اب زیرِ زمیں چاہیے

یار کے کوچے میں کرو مجھ کو دفن — یعنی مری قبر یہیں چاہیے

غم نہیں گر ہو مری خاطر حزیں — خاطرِ عشاق حزیں چاہیے

گریۂ شبنم میں نمک ہے تو لیک — خندۂ گل بھی نمکیں چاہیے

چاہیے یہ، مہر کی باتیں کرو — ہم سے میاں تم کو نہ کیں چاہیے

بیچتے ہیں مصحفی ہم اپنا دل
ہم سے تو، کہیو جو کہیں چاہیے

608

چہرے سے نقاب دور کیجیے — بس شرم و حجاب دور کیجیے

---

[1] اصل = نہ آتی تھی

ہو تیغ تو دل کو چاک کرکے پہلو سے عذاب دور کیجیے
ہے جی میں، یہ زندگی کا برقع مانندِ حباب دور کیجیے
تا چند نوشت و خواند، اے دل بس لوح و کتاب دور کیجیے
دھو ڈالیے خونِ مصحفی کو
خنجر سے خضاب دور کیجیے

609

شبِ ہجر کل بے قراری میں گذری سحر تک ہمیں آہ و زاری میں گذری
نہ جھپکی نہ جھپکی ذرا آنکھ میری یہ شب مجھ کو اختر شماری میں گذری
کیا اس نے گاہے نہ ملنے کا وعدہ مری یوں ہی امیدواری میں گذری
یہ آنکھیں تری ہیں وہ بازِ سبک پر کہ جن کی سدا دل شکاری[1] میں گذری
کوئی فعلِ نیکو نہ ہم سے ہوا ہائے اسی خجلت و شرمساری میں گذری
یہ عمرِ دراز اپنی جوں زلفِ خوباں پریشانی و سوگواری میں گذری
کبھو خوں، کبھو آب رویا کیا میں ان آنکھوں کی نت تازہ کاری میں گذری
ترے روبرو بیٹھا رویا کیا میں شبِ وصل بھی اشک باری میں گذری
بیاں کیا کرے مصحفی تجھ سے اس کا
جو حالت تری دوست داری میں گذری

610

تری واں تغافل شعاری میں گذری مری یاں سدا آہ و زاری میں گذری

---

1. دل شکاری = دل کا شکار کرنے میں

ہوئے آخرِ کار اپنے وے دشمن — جنھوں کی ہمیں دوست داری میں گذری
بن اک خوبصورت نہ ہرگز رہے ہم — ہمیشہ سے یاروں کی یاری میں گذری
کبھی ایسی زلفوں کو شانہ کیا ہے — صبا تیری نت شانہ کاری میں گذری
چُھٹی ہی رکھیں منہ پہ مژگاں سے چلمن — ان آنکھوں کی نت پردہ داری میں گذری
مجھے آخرِ کار آیا یہ رونا — کہ عمرِ عزیز اپنی خواری میں گذری

تو کتنا بُرا ہے کہ اوقات تیری
سدا مصحفی ہرزہ کاری میں گذری

611

انداز و ناز میں تجھے استاد کر گئے — اہلِ زمانہ ہم پہ یہ بیداد کر گئے
صدا آفریں ہے ان کو جو اس قتل گاہ میں — آ' سر کو وقفِ خنجرِ جلاد کر گئے
آتے ہوئے گلی سے تری جیسے گردباد — ہم آپ اپنی خاک کو برباد کر گئے
پہنچی نہ گوشِ گل میں صدا اس چمن کے بیچ — کیا کیا نہ مرغ نالہ و فریاد کر گئے
کیا ڈر ہے، باغباں جو کبھی آکے باغ میں — ہم بھی نظارہ[1] گل و شمشاد کر گئے
گر آ گئے گلی میں تری ہم کبھی، تو یار — روکر تسلیِ دلِ ناشاد کر گئے
یارب بھلا ہو ان کا جو آتے ہی روزِ عید — زندانیوں کو قید سے آزاد کر گئے
مرغانِ تیز بال سے شکوہ ہے یہ، کہ ہائے — ہم کو اسیرِ چنگلِ صیاد کر گئے
مردانِ دیں انھیں کو لکھا اہلِ ہوش نے — دنیا میں آکے وے جو تری یاد کر گئے
ہاتھوں کو ان کے چومیے جو اک رقم کے بیچ — کاغذ کو رشکِ صفحۂ بہزاد کر گئے

اک تو ہی مصحفی نہ گیا قافلے کے ساتھ
اسباب اپنا یار تو سب لاد کر، گئے

---

[1] نظارہ بغیر تشدید دوم نظم ہوا ہے۔

612

صورت کے تیری صدقے، تصویر ہے تو یہ ہے
عاشق کے حق میں پیارے تسخیر ہے تو یہ ہے

دل پیچ زلف سے ہو کیوں کر رہا کسی کا
گر دام ہے تو یہ ہے زنجیر ہے تو یہ ہے

شب خواب میں لیے ہیں بوسے ترے لبوں کے
کیوں کر نہ منفعل ہوں تقصیر ہے تو یہ ہے

دل کی تڑپ سے اپنی پے[1] لے گیا میں، یعنی
تیرِ نگہ کا اس کی نخچیر ہے تو یہ ہے

ہے جی میں شاخِ گل کے لگ کر گلے سے روؤں
رفعِ جنوں کی میرے تدبیر ہے تو یہ ہے

ابرو کے آگے تیری لازم ہے سر جھکانا
محراب ہے تو یہ ہے، شمشیر ہے تو یہ ہے

میری طرف سے اس کا دل کر دیا ہے پتھر
آہ و فغاں کی اپنی تاثیر ہے تو یہ ہے

کل کی شب آہ اپنی، گردوں سے پار گذری
ترکش میں عاشقوں کے گر تیر ہے تو یہ ہے

میں مر گیا، پر اس نے میری طرف نہ دیکھا
اس جرمِ عاشقی کی تعزیر ہے تو یہ ہے

فرقت میں تیری پیارے جیتا رہا ہے اب تک
ہاں سچ ہے مصحفی کی تقصیر ہے تو یہ ہے

613

غیر کے قابو میں یوں آجائے یار، افسوس ہے
ہم رہیں یاں ہاتھ ہی ملتے، ہزار افسوس ہے

خاک بھی اپنی نہ پہنچی اس کے کوچے میں صبا
یوں کیا برباد یہ مشتِ غبار، افسوس ہے

ہم صفیرانِ قفس نے باغ کے لوٹے مزے
ہم قفس ہی میں رہے فصلِ بہار، افسوس ہے

کیوں نہ میں ماتم میں دل کے، بیٹھ کر زاری کروں
اُٹھ گیا دنیا سے ایسا غم گسار، افسوس ہے

اے دلِ شوریدہ، آخر اس کی زلفوں کی طرح
ہو گیا تو بھی پریشاں روزگار، افسوس ہے

یہ بھی کچھ قسمت کی خوبی ہے کہ با ایں ارتباط
میری اور اس کی نہ ہو صحبت برار، افسوس ہے

---

[1] پے لے گیا = (پے بردن فارسی محاورے کا لفظی ترجمہ) جھیل گیا۔

جس کو ہم سمجھے تھے یارِ باوفا، اے مصحفی
آخر اس نے دیا ہی انتظار، افسوس ہے

614

ہم رہیں باحسرت وحرماں دوچار، افسوس ہے
آئینہ ہو اس کا ہم زانو، ہزار افسوس ہے

مجھ سے روٹھا ہی پھرے ہر لحظہ یار، افسوس ہے
غیر سے ہو اس کو یوں صحبت برار، افسوس ہے

گل کا پت جھڑ دیکھ کر بلبل یہ بولی آہ مار[1]
مل گیا یوں خاک میں رنگِ بہار، افسوس ہے

اس کا وہ دامن جھٹکنا اب تلک آتا ہے یاد
کیا گیا ہے ہاتھ سے میرے شکار، افسوس ہے

عید کے دن بھی رہیں محروم ہی ہم یا نصیب
یار یوں غیروں سے ہووے ہم کنار، افسوس ہے

دیکھتے ہی اس کی صورت مصحفی دل سے مرے
یک بہ بیک جاتا رہا صبر و قرار، افسوس ہے

615

کرتے نہیں جو داد تو بیداد کیجیے
یعنی کسو طرح تو ہمیں یاد کیجیے

دام و قفس کو توڑ کے جاتے رہیں گے ہم
کچھ فکر اور، اے مرے صیّاد کیجیے

صفحے پہ دل کے کھینچے تصویرِ روے یار
تضحیکِ کارِ مانی و بہزاد کیجیے

اک آسمان طرفہ بپا ہو ہوا کے بیچ
گر اپنی مشتِ خاک کو برباد کیجیے

تقریب کون سی ہے ہمارے نشاط کی
اس دل کو کس طرح سے بھلا شاد کیجیے

اپنے نصیب میں یہ لکھا تھا کہ فصلِ گل
کنجِ قفس میں زمزمہ بنیاد کیجیے[2]

صنعت پہ آیئے تو ابھی سنگِ سخت میں
ناخن سے کارِ تیشۂ فرہاد کیجیے

---

[1] آہ مار کر = آہ زدن کا ترجمہ۔ [2] بنیاد کردن کا ترجمہ = ابتدا کرنا۔

کیوں مصحفی کو دیتے ہو دشنام او میاں
مرتا ہے وہ اسے بہ دُعا یاد کیجیے

616

خاطر کو بندِ غم سے ٹک آزاد کیجیے — چلیے چمن میں رویئے، فریاد کیجیے
تاچند ہم سے، جان مری یہ رکھائیاں — گاہے تسلّیٔ دلِ ناشاد کیجیے
مانندِ گل جو کھولیے دستِ سخا کبھو — زر اک طرف کہ آپ کو برباد کیجیے
آتا ہے جی میں صورتِ[1] شیریں کو دیکھ کر — جا بیستوں میں ماتمِ فرہاد کیجیے
روے شب[2] فراق سیہ، کانپتا ہے دل — اُس شب کی بے قراریاں گر یاد کیجیے
کہنا ہے جو کچھ آپ کو، پھر سوچتے ہو کیا — ہم کو بجاں قبول ہے، ارشاد کیجیے
گر جایئے چمن میں تو آنکھیں نہ موندیے — واں بھی نظارہ[3] گل و شمشاد کیجیے
یک پردہ عندلیب سے رکھیے نوا بلند — نالے کی طرز اب کی گر ایجاد کیجیے
ڈرتے نہیں جفا سے جو چوکیں[4] وفا سے ہم — جتنا کہ تم سے ہو سکے بیداد کیجیے
اُڑنے کے بال و پر ہیں کہاں مصحفی مگر
اب پھر سراغِ خانۂ صیّاد کیجیے

617

ہے آج تو گلشن میں بہارِ گلِ مہندی — آتا ہے نظر سرخ عذارِ گلِ مہندی
بے برگی غرض اس کی تو ظاہر ہے سبھوں پر — کیا رنگِ شفق ہووے دوچار گلِ مہندی
کہیئے گلِ بے خار اگر اس کو بجا ہے — یعنی کہ نہ دیکھا کہیں خارِ گلِ مہندی

---

[1] ن ۳: صورت شیریں تو۔ [2] روے شب فراق سیہ، = کلمہ بددعا بہ طور جملہ معترضہ۔
[3] رک ۴۹۴۷ کا حاشیہ۔ [4] چوکیں = باز رہیں، کوتاہی کریں۔

ہر شاخِ گل افشاں سے ہے ظاہر، کہ چمن میں ہے خود گلِ مہندی ہی، نثارِ گلِ مہندی
کیوں کر نہ گریباں کو کریں چاک کہ بن یار یوں ہاتھ سے جاتی ہے بہارِ گلِ مہندی
رنگین ہے اتنا کہ وہ ہو جاوے حنائی انگشت سے گر کیجے شمارِ گلِ مہندی
اے مصحفی آتش سی لگا دی ہے چمن میں
اُڑتے نہیں پتے، ہیں شرارِ گلِ مہندی

618

عاشق کو اپنے منعِ محبت نہ کیجیے یہ بھی نہ کیجیے، جو مروّت نہ کیجیے
ہے گریۂ شبانہ سے آگو ہی دل پہ کوفت اے آہِ صبح اور قیامت نہ کیجیے
میں آپ خوش ہوں، آیئے تلوار کھینچ کر تم کو قسم ہے میری، رعایت نہ کیجیے
گر یہ طپش ہے دل کو تو شاید کہ بعدِ مرگ زیرِ زمیں بھی خوابِ فراغت نہ کیجیے
وقتے کہ دسترس ہی نہ ہو اُس عذار پر پھر کس طرح نگاہ بہ حسرت نہ کیجیے
مقتل کو دل چلا ہے[1] یہ جانے گا کیا بھلا گرواں تلک بھی اس کی رفاقت نہ کیجیے
میری طرف بھی دیکھیے ٹک، میرے روبرو نظروں میں ہر کسی سے اشارت نہ کیجیے
تابوت پر تو آیئے اپنے مریض کے گر زندگی میں اس کی عیادت نہ کیجیے
سر کاٹ کر اگر تو' مرا پھینک دے میاں تو بھی کسی سے تیری شکایت نہ کیجیے
صورت کو ٹک ہی دیکھیے اس کی بھی، ناصحو مجھ کو ہی وقت[2] وقت نصیحت نہ کیجیے
اس دھج سے اپنا پانو نہ رکھیے زمین پر میری تو کیا ہے، شہر کو غارت نہ کیجیے
اے مصحفی نہ جایئے اس کی گلی کے بیچ
سینے کسی کی بات، جہالت نہ کیجیے

---

[1] یہ بھی بھلا کیا جانے گا= خالص بولی کا اظہار ہے۔ جیسے کہتے ہیں کیا یاد کرے گا!

[2] وقت وقت= وقت و ناوقت ن۲ و۳ میں "عاشق کو وقت وقت"۔

619

اجل کی گھات[1]، مری جان ہر کسی پر ہے
بہ ہوش باش کہ عالم روا روی پر ہے

مژہ سے چتی سی آتی ہے کوئی بوند کبھی
زبس کہ خونِ جگر ان دنوں کمی پر[2] ہے

میں دیکھتا ہوں طرف اس کی اور یہ رُغم مرے[3]
نگاہ اس بتِ کافر کی آرسی پر ہے

دلا خموش[4] گلۂ روزگار کیا کیجیے
کچھ ایک پر نہیں یہ حادثہ سبھی پر ہے

میں جانتا نہیں تڑپے ہے کون خوں میں مگر
کسی کے ہاتھ سے آفت کسی کے جی پر ہے

لگا کے تیر مرے، ہمسروں[5] سے یوں بولا:
لگاؤ تم بھی کہ چوٹ اپنی اب اسی پر ہے

ہمیں خبر نہیں پر بعضے لوگ کہتے ہیں
کہ خون کتنوں کا اِس پان اور مسی[6] پر ہے

بظاہر اتنی خشونت یہ کیا ہے، حیراں ہوں
مزاج اس کا اگر ہم سے آشتی پر ہے

خدا کے واسطے ہاتھوں کو مت حنائی کر
کہ تیرے ہاتھوں سے بیداد مصحفی پر ہے

620

شب روتے روتے ہم جو ترے غم میں سو گئے
تا صبح ہوتے ہم پہ تو طوفان ہو گئے

آئے جو تیرے کوچے میں سوداگرانِ عشق
تیرا تو کیا لیا وے کچھ اپنا ہی کھو گئے

کس سے ہم اپنے دیدۂ تر کا کریں گلہ
ڈوبے یہ آپ اور ہمیں بھی ڈبو گئے

از بس دو چند شوق رہا مجھ کو، نامہ بر
آیا جو واں سے ایک تو پھریاں سے دو گئے

تو، کارگاہِ عشق کی کچھ نازکی نہ پوچھ
یاں رونے والے پلکوں سے موتی پرو گئے

دریائے خوں بہا تھا زبس اس گلی کے بیچ
پہنچے وے اپنی جان سے جو ہاتھ دھو گئے

---

[1] ن ۲: اجل لگائے ہوئے گھات۔ [2] کمی پر ہے = کم ہے۔ [3] یعنی میرے برخلاف۔
[4] خموش میں واؤ کا تلفظ نہیں ہوگا۔ [5] ہمسر = ساتھی۔ [6] اصل: اس پان اس مسی۔

آیا نہ تو تو بجلی کا سینہ تڑق گیا — تربت پہ بے کسوں کی ترے، ابر رو گئے
اِس سرزمینِ عشق سے حاصل ہوا نہ خاک — یاں کتنے شخص تخمِ تمنّا کا بو گئے
میں رَہ روانِ عشق کا پایا نہ کہیں[1] سراغ
اے مصحفی گئے ہی وہ اس رہ میں، جو گئے

621

نظروں سے جب نہاں وہ برودوش[2] ہو گئے — ہم لاکھ حسرتوں سے ہم آغوش ہو گئے
آیا چمن میں وہ گلِ نازک جو ہم کو یاد — گل ہائے باغ جی سے فراموش ہو گئے
گرمِ سخن تھی جن کی زباں ساری ساری رات — سو وے چراغِ صبح سے[3] خاموش ہو گئے
تزئینِ عاریت[4] کا اُسے کب خیال ہے — قطرے عرق کے جس کے دُرِ گوش ہو گئے
رکھتے تھے وے جو ہوش کا کچھ اپنے اعتماد — صورت کو تیری دیکھ کے بے ہوش ہو گئے
کس کس کو یاد کیجیے، پردے میں خاک کے — کیا کیا نہ ماہ پارے کہ رُو پوش ہو گئے
اس مے کدے میں مثلِ خمِ بادہ مصحفی
دو دن ہمارے دل کے بھی سرجوش ہو گئے

622

دین وایماں، دل و جاں سب تجھے دوں، ایسے جی[5] — ایک بوسہ بھی عوض اس کے نہ لوں، ایسے جی
مجھ سے کہتے ہو: تجھے قتل نہیں کرنے کے — غیر سے پھر یہ اشارہ ہے کہ ہوں ایسے جی
ہر کوئی منھ میں، مری جان زباں رکھتا ہے — گالیاں دو مجھے، میں کچھ نہ کہوں، ایسے جی

---

[1] ن۲: نہ کچھ سراغ۔ [2] برودوش= لفظاً بغل اور کندھے، مراد وہ آغوش، قد۔ [3] سے بمعنی کی طرح، مثل۔ [4] مانگے کی سجاوٹ۔ [5] ایسے جی یہاں لب ولہجے میں کیا کیا تیور دکھا رہا ہے۔ جیسے گفتگو میں کہتے ہیں، ایسے ہی ہو، بڑے آئے کہیں کے، کیا کہنے ہیں تمھارے وغیرہ۔

مار گیری میں ہوں استاد میں اے افعیِ زلف — اک ذرا ہاتھ لگاتے ہی یہ فوں، ایسے جی
آپ ہردم جو یہ کہتے ہیں کہ تو کیوں ہے کھڑا — دل تمہیں دے کے میں کیا بیٹھ رہوں، ایسے جی
ذبح کر ڈالو ابھی تم تو غریبوں کے تئیں — بخش دیوے تمھیں اپنا کوئی خوں، ایسے جی

زیست کی، قیس نے جس طرح کہ ویرانی میں
مصحفی تو بھی ہے گر اہلِ جنوں، ایسے جی[1]

623

اس بت کو نہیں ہے ڈر خدا سے — بگڑی بندے سے گر، خدا سے
گو خلق بھی جانے حال میرا — پوشیدہ نہیں مگر، خدا سے
ہے ہم سے تو آہ آہ کرنا — دینا اِس کو اثر، خدا سے
ہم نے اُسے اپنا سوُد جانا — پہنچا بھی اگر ضرر، خدا سے
دیکھا ہے میں جب سے وہ بتِ شوخ — پھر گئی ہے مری نظر، خدا سے
بازیچے میں ہے اُدھر وہ مشغول — اور بن رہی ہے ادھر، خدا سے
کچھ خوب نہیں یہ خود نمائی — ہاں اے بتِ شوخ ڈر، خدا سے
ہے بیَر خدائی اور خودی میں — اتنی بھی خودی نہ کر، خدا سے
یہ سارے خداشناس ہیں لیک — دیتا نہیں کوئی خبر، خدا سے

اے مصحفی کچھ کمی نہیں واں
جو چاہے سو مانگ، پر خدا سے

624

بتاں وہ مہر و محبت وہ چاہ بھول گئے — ہمارے حال پہ کرنی نگاہ بھول گئے

---

[1] یعنی اس طرح زندگی گذار۔

کل ایسی شکل سے آیا وہ بیچ مجلس کے — کہ داد مانگنی سب داد خواہ بھول گئے

ابھی تو تم نے کہا تھا کہ بوسہ[1] دیتا ہوں — پھر اتنے ہی میں، مری جان واہ بھول گئے

پھرا کریں ہیں شب و روز، کیا مگر پیارے — تمھارے کوچے میں کچھ مہر و ماہ بھول گئے

تمھارے دل میں جو خطرہ نہیں محبت کا — مگر ہماری وہ فریاد و آہ بھول گئے

ہمیشہ مصحفی ہم راہ[2] راہ جاتے تھے
گئے کل اس کی گلی میں تو راہ بھول گئے

625

جاویں کیدھر کو اب اس تاب وتعب کے مارے — اے بتاں ہم تو خدا کے ہیں غضب کے مارے

ابھی چاہیں تو تمھیں بھرلیں، میاں کولی میں[3] — چھیڑتے ہم جو نہیں ہیں تو ادب کے مارے[4]

جا کے پوشیدہ ہوئے کوہِ بدخشان کے بیچ — لعل و یاقوت تری سرخیِ لب کے مارے

ایک بوسہ نئے قلیاں ہی کا دے، اے گل رو — دل مرا سوخت ہوا جا[5] ہے طلب کے مارے

کون ہوتا ہے بلد[6] گم شدگاں کا تیرے — کوچۂ عشق میں وے پھرتے ہیں کب کے مارے

خاک بھی ان کی جو جلتی ہو تو کچھ دور نہیں — مر گئے وے جو ترے عشق کی تب کے مارے

مصحفی ہم میں تو طاقت نہ رہی، خانہ خراب
گریۂ روز کے اور نالۂ شب کے مارے

626

ہوسِ گریہ سے ہو دل کوئی دم تا خالی — آنہ اے رشک ہے آنکھوں میں تری جا خالی

---

[1] ن۲: میں بوسہ دیتا ہوں۔ [2] راہ راہ جانا= رستے پر ٹھیک ٹھیک، راہ پہچانتے ہوئے، چلنا۔

[3] دیکھو ۴۸۷۔۲ کا حاشیہ۔ [4] یہ مارے بھی بولی ہے، ادب کی وجہ سے، Due to کی جگہ۔

[5] یہ پورا مصرع ہی روہیل کھنڈ کی بولی ہے۔ [6] بلد = واقف۔

بس کہ فرقت میں تری خالی ہی گذرے ہم کو
ہم نے جو چاند کہ دیکھا سو وہ دیکھا خالی[1]

ہم وے مے نوش ہیں، ساقی کہ اگر مستی میں
منھ بھڑا دیویں تو ہو جا خُمِ صہبا خالی[2]

اور سامانِ طرب سب ہوا موجود پہ، یار
اک تجھی سے ہے ابھی بزمِ تمنّا خالی

نقدِ وقت اپنا تو برباد نہیں دیتا میں
گو زروسیم سے اب ہاتھ ہے میرا خالی

دل میں کچھ خوں نہ رہا چشم میں جب اشک آئے
جام پُر ہوتے ہی، یاں ہو گیا مینا خالی

مصحفی دیکھ کے دل کیوں نہ بھر آوے اس کو
نظر آتا ہے مجھے قیس سے صحرا خالی

627

دن رات دل اضطراب میں ہے
جی ہے سو جدا عذاب میں ہے

سبحان اللہ تیرا چہرہ
یہ نور کب آفتاب میں ہے

کرتے ہو جو تم عتاب اتنا
کچھ لطف بھی اس عتاب میں ہے

اس شاہ سوار کے میں صدقے
جس کے دو جہاں رکاب میں ہے

دل، گریۂ گرم و تر کے ہاتھوں
کچھ آتش میں، کچھ آب میں ہے

سورج نکلا پہ تیرا مکھڑا
اب تک پیارے نقاب میں ہے

اس دل میں میاں تری محبت
جیسے کہ نمک کباب میں ہے

پاس اپنے تو مصحفی زرِنقد
اک دل ہے، سو کس حساب میں ہے

---

[1] ذی قعدہ کے مہینے کو عورتوں کی زبان میں خالی کا مہینا کہتے ہیں، اس لیے کہ یہ دو عیدوں کے بیچ میں آتا ہے۔ یہاں شعر کا مطلب یہ ہے کہ خالی کا چاند سال میں ایک بار دکھائی دیتا ہے۔ مگر فراقِ یار میں ہمیں ہر مہینے کا چاند خالی نظر آتا ہے۔ [2] اس مصرع کی ساخت بھی دیکھ لیجیے، ہو جائے کی جگہ ہو جا۔ اور بھڑا دیویں، دونوں کھڑی بولی کا ٹھاٹھ دکھا رہے ہیں۔

628

معشوقۂ گل نقاب میں ہے — محجوبہ ابھی حجاب میں ہے

مہندی نہ لگا کہ، جان میری — ہاتھوں سے ترے عذاب میں ہے

تو ہے وہ بلا کہ ماہ و خورشید[1] — زلفوں کی ترے رکاب میں ہے

ہر اک تجھے آپ سا کہے ہے — قضیہ[2] مہ و آفتاب میں ہے

اللہ رے ترے پسینے کی بو — کب ایسی بھبک[3] گلاب میں ہے

اس زلف کا اینٹھنا[4] تو دیکھو — بن چھیڑے ہی پیچ و تاب میں ہے

قہاری کی شان جب سے تیری قطعہ عالم کے اُوپر عتاب میں ہے

دل کوہ کا ہو گیا ہے پانی — دریا سب اضطراب میں ہے

اُٹھ مصحفی آفتاب نکلا

اب تک تو دوانے خواب میں ہے

629

جب مری خاک پہ ٹک بیٹھ کے یار اٹھتا ہے — اس کے دامن کے پکڑنے کو غبار اٹھتا ہے

ہم کو تکلیف نہ دو، شیخ جی عمامے کی — لاویں سر کس کا، کوئی ہم سے یہ بار اٹھتا ہے

جو کوئی تجھ سے مقمّر[5] سے رکھے ہے بازی — نقدِ دل اپنا وہ اک آن میں ہار اٹھتا ہے

آ جھمکتا ہے وہیں خونِ دل آنکھوں میں مری — ناگہاں جیسے کبھی ابرِ بہار اٹھتا ہے

پُر بجاں[6] آتے ہیں ہم ہاتھ سے ناداری کے — جب ہو دکّان سے بنیے کی اُدھار اٹھتا[7] ہے

---

[1] تثنیہ کے لیے فعل واحد کا قاعدہ پرانا ہے۔ دردؔ کا مصرع: سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا۔

[2] قضیہ = بغیر تشدید یا نظم ہوا ہے۔ حالانکہ یہاں جھگڑا بھی آ سکتا ہے مگر دیکھیے قضیہ نے کیا معنوی پہنائی پیدا کی ہے۔ [3] بھبک = خوشبو کی لپٹ۔ [4] اینٹھنا = ناز کرنا، اترانا، بل کھانا۔

[5] مقمّر = بجائے مقامر، جواری۔ [6] پُر بجاں آتے ہیں = بہت ہی تنگ آ گئے ہیں۔

[7] یعنی جب بنیا اُدھار دینا بند کر دیتا ہے۔

تاب و طاقت ہے کہاں ہم میں تو اب اٹھنے کی ہاں مگر دل سے کبھی نالۂ زار اٹھتا ہے

مصحفی کے تئیں، کیا جانے ترا کیا ہے خیال
سوتے سوتے تجھے اکثر یہ پکار اٹھتا ہے

630

کاہے کو ترے دام سے آزاد ہو کوئی کیا یاں سے بھی اڑ کر کہیں برباد ہو کوئی

گلبن کے تلے جا ئیو بلبل ہے پریشاں اس گلشنِ ناشاد میں کیا شاد ہو کوئی

بس مرتبۂ عشق ہوا ختم انھیں پر من بعد نہ مجنوں ہو، نہ فرہاد ہو کوئی

تم بھیجو گے ہم[1] پاس میاں کاہے کو قاصد قاصد تو وہ بھیجے کہ جسے یاد ہو کوئی

کیا پوچھو ہو یارانِ عدم رفتہ کا احوال ان یاروں سے حاشا کہ مجھے یاد ہو کوئی

کر لے ابھی اے دل تجھے ارمان نہ رہ جائے سینے میں اگر اور بھی فریاد ہو کوئی

البتہ گرفتاری میں آزاد رہے وہ مجھ سا ہی اگر مردم آزاد ہو کوئی

چھوڑا نہ میاں مصحفی تم نے کوئی لونڈا
تم کام میں اپنے غرض استاد ہو کوئی

631

سخت نازک ہے ترا موے کمر رشتے سے اس کے واقف ہو میاں کیا کوئی سر رشتے[2] سے

ہووے ان تارِ گریباں کی قسم ہی، گل کے باغباں باندھے تو گلدستے اگر رشتے سے

زخم پیوند رفوگر سے نہ ہو عاشق کا پیچکِ[3] زلف سیے اس کو مگر رشتے سے

اب کے کیا جانیے اس بندے سے کیوں کر چھوٹیں بے طرح باندھے ہیں صیاد نے پر، رشتے سے

---

[1] ن۲: وہ بھیجے گا ہم پاس۔ [2] سر رشتے سے = بھید سے، اور ۵۱۱۳ میں سیاق و سباق کا مفہوم دے رہا ہے (نیز ۵۱۱۹)۔ [3] پیچک = دھاگے کا گولا۔

ان سے کیا فائدہ ہے اس کے سرِ زلف کا ذکر — وے جو واقف ہی نہیں بات کے سر رشتے سے
اشک کا تار نہ کر صرفِ قبا دوزیٔ دل — کفنِ مردہ کو سیتے نہیں[1] تر رشتے سے
روز و شب طولِ امل کا ہوں گرفتار، کہ ہے — دلقِ درویش کو کام آٹھ پہر رشتے سے
رشتہ داری نہیں کچھ خوب تو کر آپ کو گم — کر کے سوزن کی طرح قطعِ نظر رشتے سے

اشک مژگاں سے ٹپکے ہیں مری پے در پے
مصحفی گرتے ہیں جس طرح گہر رشتے سے

632

جان کر زلف کیا ہم نے حذر رشتے سے — سانپ کے کاٹے کو لگتا ہی ہے ڈر رشتے[2] سے
گہ کمر کا تو گہے زلف کا کرتے ہو بیاں — بات کہتے ہی نہیں تم کبھی سر رشتے[3] سے
کیا ہی دلچسپ ہے دانتوں کی ترے بتیسی — ٹانک رکھے ہیں کہے تو، یہ گہر رشتے سے
جی میں ہے کیجے گریباں کے تئیں اتنا چاک — کہ رفو' ہو نہ کبھی بارِ دگر رشتے سے
ڈوریے[4] کا نہ پہن جامہ کہ میں ڈرتا ہوں — تنِ نازک کو ترے پہنچے ضرر رشتے سے
اس قدر چاکِ گریباں کی مرے ہے مصروف — کہ نہیں سوزنِ عیسیٰ[5] کو خبر رشتے سے
کیا ستم تو نے کیا مجھ کو کھلا خط بھیجا — کچھ بھی واقف ہے مروّت کے تو سر رشتے سے
گر کمر بند بھی ہوتا نہیں تو رسم ہے یوں — باندھ دیتے ہیں ذرا خط کی کمر رشتے سے

---

[1] مردے کا کفن سیا نہیں جاتا، بیونتا جاتا ہے۔ تر رشتہ = پکا دھاگا۔ [2] محاورہ تو فارسی میں یوں ہے کہ مارگزیدہ از ریسمان می ترسد اور اردو میں کہتے ہیں سانپ کا کاٹا رسّی سے ڈرتا ہے۔ [3] یعنی مربوط طریقے سے (نیز دیکھو ۵۱۰۹۔ ۵۱۱۳۔ ۵۱۲۴) [4] ڈوریا = کپڑے کی ایک قسم جس میں دھاگے کی بناوٹ لکیروں کی شکل میں اُبھری ہوئی ہوتی ہے۔ [5] سوزنِ عیسیٰ = یہ ایک خرافی تلمیح ہے۔ کہتے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰ آسمان پر اُٹھائے گئے تو ان کے دامن میں ایک سوئی لگی ہوئی تھی۔ یہ چوں کہ اسباب دنیا میں سے تھی اس لیے فلک چہارم سے آگے نہ جاسکے۔

مصحفی اشک یہ موگاں پہ نہیں سرخ و سپید
منعقد[1] ہیں کئی یاقوت و گہر رشتے سے

633

جگر چھن گئے اس کی پلکوں کے ہلتے
ہم اے کاش اُن انکھڑیوں سے نہ ملتے

مرے داغ دیکھو، غضب تھا چمن کا
گر اس رنگ کے بھی کئی پھول کھلتے

جو دامن کشاں تو، چمن میں نہ آتا
صبا سے کہیں گل کے غنچے یہ کھلتے

وے دلّی کے کوچے ہیں اب سارے خالی
کھوے سے کھوے تھے[2] جہاں روز چھلتے

غضب تھا اگر نیزہ دارانِ مژگاں
اُٹھا گھوڑے[3] یک بارگی تم پہ پلتے[4]

میاں عید کے دن تو بے جا نہ تھا کچھ
جو تم مصحفی سے گلے لگ کے ملتے

634

ان گرم نگاہوں سے تری کوہ بھی جل جائے
تو دیکھے جو یک بار، تو پتھر بھی پگھل جائے

آرام ہو آیندہ کو اور نت کا خلل جائے
دل آب ہو سینے سے مرے کاش نکل جائے

کرتا ہے وضو شیخ، لبِ حوض پہ بیٹھا
ایسے میں تماشا ہو جو پانو اس کا پھسل جائے

جس آگ میں جلتا ہے پڑا نعلِ[5] دل اپنا
پتھر بھی اگر رکھیے تو اس آگ میں جل جائے

حسرت تو مجھے یہ ہے کہ با ایں ہمہ خواہش
آغوش میں کھینچوں اُسے اور یوں وہ نکل جائے

اک قطرۂ خوں ٹپکے گر آنکھوں سے ہماری
واللہ زمانے کا ابھی رنگ بدل جائے

---

1. منعقد بہ معنی پروئے ہوئے، منظوم۔ 2. کھوے سے کھوا چھلنا = بہت بھیڑ ہونا۔
3. گھوڑے اُٹھانا = ایڑھ لگانا۔ 4. پلنا = بکسر اول حملہ کرنا۔
5. نعل = لوہے کا بنایا ہوا جو گھوڑے کے سُم میں جڑا جاتا ہے، اس کی ساخت کو دل سے مشابہ قرار دیا ہے۔

گہ سبزے کو دیکھوں ہوں، گہے آبِ رواں کو — تا یہ دلِ غم دیدہ اسی طرح بہل جائے

اک روز تو کر مصحفی اپنے کی عیادت[1]

شاید تری پرسش سے یہ بیمار سنبھل جائے

635

ٹھکراتے طرفِ[2] دامن، بندِ قبا کو ملتے — کچھ آج زور سج سے آتے ہو دھج[3] بدلتے

وے دن کدھر گئے اب، جو وعدہ گہ میں اکثر — ہم ہوتے منتظر اور تم وو ہیں آنکلتے

یا پاس سے ہم اس کے اب آپ بھاگتے ہیں — یا ایک دن وہ تھا جو ٹالے[4] ہوئے نہ ٹلتے

شعلے میں شمع کے گر جلوہ ترا نہ ہوتا — پروانے صدقے ہو ہو اس پر سے یوں نہ جلتے

آنے کی مصحفی کے سن کر خبر شتابی

کل رہ گئے گلی سے ہم اس کی چلتے چلتے

636

انگشتری جو دے ہے مرے یار، پھینک دے — میں ہوں اِدھر کھڑا پسِ دیوار، پھینک[5] دے

آوے تو معرکے میں تو صورت کو تیری دیکھ — رستم بھی اپنے ہاتھ سے تلوار پھینک دے

آیا ہوں پھرتے پھرتے، پہ ڈر ہے یہی کہ یار — کیا جانے پھر کدھر کو بہ یک بار پھینک دے

کیا ہووے باغباں جو تو، گلشن سے چن کے گل — بلبل کے آشیاں میں بھی دو چار پھینک دے

کس کام کا یہ دل ہے مرے پاس، لے میاں — تو سر سے وار کر[6] یہ دلِ زار پھینک دے

---

[1] ن۲: اک روز تو آ مصحفی کی بہر عیادت۔ [2] طرف دامن = دامن کا کنارا

[3] دھج بدلنا = نئی وضع پیدا کرنا۔ [4] ٹالنا اور ٹلنا = محفل سے اُٹھانا اور اُٹھنا (اس کے مفہوم میں بہ لطائف الحیل بھی شامل ہے)۔ [5] یہ انیسویں صدی کی معاشرت میں خفیہ معاشقوں کی تصویر ہے۔

[6] وار کر = صدقے کر کے۔

ہووے نہ اس کا پاے طلب ریش پھر کبھی — جو راہ سے کسی کی اٹھا خار پھینک دے

دیکھے جو ایک جلوہ ترا شیخ و برہمن — یہ توڑ ڈالے سبحہ، وہ زنار پھینک دے

کیا ظلم ہے کہ کرلے ہمیں قید باغباں — اور آشیاں کو آس سوے گلزار پھینک دے

روے زمیں پہ حسن نہیں، ہاں مگر خدا — اب آسماں سے کوئی طرح دار پھینک دے

اک ٹھیکرے پہ لکھ کے کوئی حالِ دل مرا — ایسا ہو اس کے گھر میں شب تار پھینک دے[1]

کس پاس بھیجوں دل کے تئیں، لے کے ہاتھ میں — یہ ہے وہ جنس جس کو خریدار پھینک دے

کیا دور ہے جو اپنے تئیں لولیِ فلک — تجھ پر سے وار پھیر[2] کے سو بار پھینک دے

ناصح نے پکڑا تیرا گریباں تو مصحفی
بھڑوے کی تو اُتار کے دستار پھینک دے

637

تم رات وعدہ کر کے جو ہم سے چلے گئے — پھر تب سے خواب میں بھی نہ آئے بھلے گئے

رکھا قدم زمیں پہ جو اس سروِ ناز نے — پہلے قدم کے رکھتے ہی واں، دل ملے گئے

اب کس ہوس سے باغ میں دھومیں مچائیے — وہ شوق ہی نہیں رہا، وے ولولے گئے

آتش میں تیرے عشق کی مانندِ چوبِ خشک — جب تک کسی نے ہم کو جلایا جلے گئے

وعدہ تھا پشتِ بام پر اس مہ کا نیم روز — ہم نا تمام بھول گئے، دن ڈھلے گئے

رکھتا تھا مصحفی تو بہت شوقِ کوے یار
ہم ساتھ اپنے آپ ہی اس کو نہ لے گئے

638

یہ تو آوازِ ہم صفیر ہی ہے — اس قفس میں کوئی اسیر ہی ہے

---

۱ نیز دیکھو ۵۱۴۶۔ ۲ وار پھیر کے۔ صدقے اُتار کے (نیز دیکھو ۵۱۵۰)

ہو چکا دورِ خسرو و فرہاد　　اب نہ شیریں نہ جوئے شیر ہی ہے
دشت پُر صید ہے تو کیا کیجیے　　پاس اپنے کماں نہ تیر ہی ہے
دل تو، اس کوُ سے کیوں نہیں اٹھتا　　کیا کہیں یاں ترا خمیر ہی ہے
جل گئے ہم، تو اپنی خاکستر　　دیکھ لوگے نِرا عبیر ہی ہے
تیری ابرو کے روبرو مِہ نو　　اپنی آنکھوں میں تو حقیر ہی ہے
گو کہ تو میرؔ سے ہوا بہتر
مصحفیؔ پھر بھی میرؔ میر ہی ہے

639

بات سن لے خدا غریبوں کی　　اجل آوے مرے رقیبوں کی
مجھ سے تم پھر گئے بہ ایں خوبی　　یہ بھی خوبی مرے نصیبوں کی
وہ[۱] کہ تشخیص میں مرض کی مرے　　عقل حیران ہے طبیبوں کی
غنچۂ گل کی چولی مسکی دیکھ　قطعہ　عقل بھولی جو عندلیبوں کی
ہائے دیکھی نہیں انھوں نے مگر　　وضع دلّی کے جامہ زیبوں کی
کہیں کم بختی سے جو جا نکلا　قطعہ　مصحفیؔ کل طرف جیبوں کی
ان کی مرزائیوں[۲] کے ہاتھوں سے
مار اُس پر پڑی جریبوں[۳] کی

640

تسبیحِ شیخ میں گو، ہوویں ہزار دانے　　اپنے بھی اشک کے ہیں یاں بے شمار دانے

---

۱ وَہ = واہ کا مخفف بہ فتح اوّل۔　۲ مرزائی = نزاکت، دراصل مرزائی کا لفظ اس عہد میں ارسطقراطیت Aristocracy کے مترادف تھا۔　۳ جریب = ہاتھ میں رکھنے کی چھڑی، عصا۔

ازبس کہ رنگِ پاں نے تزئیں کیا ہے اس کو ہیں دانت سرخ اس کے، جیسے انار دانے

جوں خوش نما فلک پر لگتے ہیں عقدِ پرویں رکھتا ہے موتیوں کے کانوں میں یار دانے

زیرِ فلک ہے ہم پر وہ اضطراب پیدا جوں آسیا کے نیچے ہوں بے قرار دانے

ہیں جیسے اشک گلگوں اے مصحفی ہمارے

یاقوت کے رکھیں ہیں کب یہ بہار، دانے

641

لینے لگے جو چٹکی یک بار بیٹھے بیٹھے یہ چھیڑ کیا نکالی اے یار بیٹھے بیٹھے

کل وعدہ گاہ میں جب وہ بے وفا نہ آیا اُکتا کے اُٹھ گئے ہم ناچار بیٹھے بیٹھے

جو کچھ پڑھا ہے ہم نے، ہم آپھی آپ اس کی گھر میں کیا کریں ہیں تکرار بیٹھے بیٹھے

ہم نے تو اس کو ہرگز یارو، کہا نہ تھا کچھ کچھ یوں ہی ہو گیا وہ بیزار بیٹھے بیٹھے[1]

تجھ بن تو ہم نے وے بھی باخامشی ادا کیں یاد آئیاں جو باتیں دو چار بیٹھے بیٹھے

اے مصحفی انھوں میں صنعت نہیں کچھ اپنی

لکھ ڈالے ہم نے کل یہ اشعار بیٹھے بیٹھے

642

بیٹھے بیٹھے جو ہم، اے یار ہنسے اور روئے آ گیا یاد تو اک بار ہنسے اور روئے

شعر تر پڑھنے سے یاروں میں ہمیں کیا حاصل مگر اتنا ہے کہ دو چار ہنسے اور روئے

شادی و غم کی جو اٹھ جائے جہاں سے رہ و رسم پھر تو کوئی بھی نہ زنہار ہنسے اور روئے

ناتوانی نے کیا اس کو تو نقشِ قالیں کیا تری چشم کا بیمار ہنسے اور روئے

---

[1] بیٹھے بیٹھے = بلاوجہ، بے سبب۔

مصحفی رات میں افسانۂ دل کہتا تھا
سن کے ہمسائے کئی بار ہنسے اور روئے

643

خبر کچھ نہیں مجھ کو بسمل کی اپنے
میں صورت ہی تکتا ہوں قاتل کی اپنے

جو گذرے ہے مجھ پر سو حق جانتا ہے
حقیقت کہوں کس سے میں دل کی اپنے

نہ آئینے میں اس نے پھر عکس دیکھا
لے اپنی ہی صورت، مقابل کی اپنے

کوئی لوٹتا ہے، کوئی پیٹتا ہے
غرض طرفہ حالت ہے محفل کی[1] اپنے

وو ہیں خفتگانِ عدم چونک اٹھیں گے
جو جھنکار پہنچی سلاسل کی اپنے

کیا زخمی غمزہ اور پھر نہ پوچھا
خبر زور لی تم نے گھایل[2] کی اپنے

زمیں بوجھ کیوں کر ہمارا اٹھاوے
فلک کو نہیں تاب محمل[3] کی اپنے

اسے مردمِ دیدہ کیوں کر نہ سمجھے
سیاہی تو تو دیکھ ٹک تل کی اپنے

میاں، مصحفی تجھ سے کیا مانگتا ہے
صدا تو بھلا سن لے سائل کی اپنے

644

پوچھا جو ہم نے اس سے کل: تیرا نام کیا ہے
کہنے لگا: تجھے کیا' چل تجھ کو کام کیا ہے

جو ٹھوکروں کے مارے پامال ہو گئے ہیں
کوئی پوچھے ان سے اس کی طرزِ خرام کیا ہے

مستغرقِ تصوّر کیا ہو رہا ہے اے دل
ٹک سر اٹھا کے تو دیکھ بالائے بام کیا ہے

---

۱ اپنے محفل کی استعمال ہوا ہے۔ ۲ گھایل بکسر سوم باندھا ہے۔ ۳ محمل = بوجھ بفتح سوم درکار ہے۔

ہم نامہ دے چکے ہیں قاصد کو اپنے، تو کہہ　　جانِ بلب رسیدہ تیرا پیام کیا ہے
اس نازنیں کی تصویر جو دیکھے ہے کہے ہے:　　اس نیم رخ کے آگے ماہِ تمام کیا ہے
کہتا تھا تو، تو اے دل میں ہو چکا ہوں تسکیں[1]　　پھر اضطراب سایہ ہر صبح و شام کیا ہے
ہونا تھا مصحفی پر جو ہو چکا عزیزو
اب لاش پر پھر اس کی یہ ازدحام کیا ہے

645

گالی سے لبِ شیریں کو بس تلخ نہ کیجے　　جو گڑ دیے مرتا ہو اُسے زہر نہ دیجے[2]
رستے میں جو مل جائے وہ بت ہم کو خداکار[3]　　مسجد کی طرف جانے کا پھر نام نہ لیجے
جائے کہ گل و لالہ ہوں سب چاک گریباں　　بیداد ہے گر اپنے گریبان کو سیجے
کھانا کبھو اس غم کا نہ ہو ہم کو گوارا　　اور پر سے جو خونابِ جگر اس کے نہ پیجے
آہن مرے گریے سے ہوا آب و لیکن
اے مصحفی یہ سنگ دلاں بت نہ پسیجے[4]

646

نہا کر جب وہ اپنے سر کے بالوں کے تئیں جھاڑے
بجائے خار و خس موتی ہی رولے[5] جو زمیں جھاڑے
تو اے نورِ نظر جس جا قدم اپنا رکھا چاہے
ہر اک خوش چشم واں جاروبِ مژگاں سے زمیں جھاڑے

---

۱ میں تسکین ہو چکا ہوں = مجھے تسکین ہو چکی ہے۔ ۲ یہ محاورہ ہے کہ جو گُڑ دینے سے مرتا ہو اُسے زہر کیوں دیا جائے۔ ۳ خداکار = خدا کا کیا، اتفاقاً۔ ۴ پسیجنا = نرم ہونا، مروت کرنا۔
۵ رولنا = زمین میں دانہ دانہ گری ہوئی چیز جو سکیر کر اُٹھائی جائے۔

نمودِ سجدہ ہے منظور' خاک ایسی نماز اوپر
نہیں ممکن کہ زاہد جیتے جی گردِ جبیں جھاڑے

یہ سب دامن درازاں[1] بھول جائیں رقص کرنے کو
جو ہو کر دست افشاں عاشق اپنی آستیں جھاڑے[2]

نظر آویں پڑے بھٹے[3] سے سر پانووں میں یاروں کے
ابھی دو دوپٹے کے[4] کے ہاتھ اگر وہ نازنیں[5] جھاڑے

کیا کر خاک روبی مصحفی ایسے کے تو در کی
کہ جس کے واسطے رُوح الا میں عرشِ بریں جھاڑے

647

ہر اک نے نگاہوں سے مجھے ڈال دیا[6] ہے
کیا میرے تئیں عشق نے اقبال دیا ہے

ترکیب تو دیکھ اس کے خوش اسلوب بدن کی
جیسے کہ وہ سانچے سے ابھی ڈھال دیا ہے

میں ہوں وہ گنہ گار کہ غیرت نے ابھی سے
ہاتھوں میں مرے نامۂ اعمال دیا ہے

ہنستے ہو تو اچھی ہی طرح مجھ پہ ہنسو نہ
یوں منہ میں میاں کاہے کو رومال دیا ہے

ہر لحظہ گرفتار ہوں اک تازہ الم میں
یہ عشق نے جی کو مرے جنجال دیا ہے

سو منّتیں میں کی ہیں' میاں! بادِ صبا کی
تب زلف کا تیری کہیں اک بال دیا ہے

---

1. دامن دراز = بڑے دامن والے مراد صوفی، قلندر۔ (نیز دیکھو ۵۵۸۴۔ جہاں محبوب کے لیے استعمال ہوا ہے)۔ 2. آستین جھاڑنا = فارسی محاورہ آستین افشاندن کا لفظی ترجمہ۔ رقص کرنا۔
3. بھٹے سے = یہ خالص بولی کا اظہار ہے۔ سرقلم ہو کر زمین پر گر جائیں تو کہتے ہیں کہ بھٹا سا گر گیا۔ بھٹا دراصل ککڑی (مکئی کی بال) کو کہتے ہیں۔ وہ اپنے منبت سے بآسانی ٹوٹ جاتا ہے۔
4. پٹے کے ہاتھ = یہ ایک فن ہے بانک بنوٹ کی طرح۔ 5. ہاتھ جھاڑنا = مراد کرتب دکھانا۔
6. نگاہوں سے ڈال دینا = فارسی محاورہ از نظر افگندن کا لفظی ترجمہ، یعنی مردود کر دیا ہے۔

ہم بھی گہرِ اشک کی دولت سے غنی ہیں — گو چرخ نے اوروں کو زر و مال دیا ہے
رہتا ہے فقیروں کی طرح نت وہ پریشاں — اپنا جسے زلفوں نے تری جال دیا ہے
بندے ہیں تمھارے، کوئی ہر اک کو خدا نے — یہ حسن، یہ نقشا، یہ خط و خال دیا ہے

اے مصحفی اس شوخ کی باتوں پہ نہ جانا
لاکھوں کو لگا اس نے یوہیں ٹال دیا ہے

648

رات کے رہنے کا نہ ڈر کیجیے — ایک تو شب یاں بھی سحر کیجیے
لوگ کہیں گے تمھیں ہرجائی ہے — دل میں اک عالم کے نہ گھر کیجیے
دیکھتے ہو میری طرف کیا میاں — اپنی بھی صورت پہ نظر کیجیے
آہی لیا بے خبری نے ہمیں — کون ہے یاں کس کو خبر کیجیے
غیر کو جا دیتے ہو گھر میں اگر — میرے تئیں شہر بدر کیجیے
دیکھ نگاہیں تری کہتی ہے خلق — ایسی نگاہوں سے حذر کیجیے
پھر نہیں ملنا ترا مشکل میاں — جان کا گر اپنی ضرر[1] کیجیے

منزلِ ہستی میں بہت ہم رہے
مصحفی اب یاں سے سفر کیجیے

649

دل سینے میں بیتاب ہے، دل دار کدھر ہے — کوئی مجھ کو بتا دو، وہ مرا یار کدھر ہے
ہم کب کے چمن زار میں بے ہوش پڑے ہیں — معلوم نہیں گُل کدھر اور خار کدھر ہے

---

[1] ضرر کیجیے = زیاں کیجیے، داؤں پر لگا دیجیے۔

اس گُل کا پتا گر نہیں دیتے ہو تو یارو
اتنا تو بتا دو، درِ گُل زار کدھر ہے

دل چھیننے والے کوئی گھر بیٹھ رہیں ہیں
پوچھیں ہیں یہی رستۂ بازار کدھر ہے

دیکھا مجھے کل اس نے، تو غیروں سے یہ بولا
لاؤ بھی شتابی، مری تلوار کدھر ہے

یاں ہو رہا ہے سینہ مرا آگو ہی چھلنی
ڈھونڈے ہے کہاں تیر کو، سوفار کدھر ہے

احوال نپٹ تنگ ہے بیمار کا تیرے
اس وقت تو، اے آئینہ رخسار کدھر ہے

شیریں سخناں سب ہی شکر بیچیں ہیں لیکن
انصاف کرو، جوشِ خریدار کدھر ہے

برسوں نہ ملے اس سے تو اس شوخ نے ہم کو
پوچھا نہ کبھی مصحفیِ زار کدھر ہے

650

کس طرح شامِ فراق اپنی سحر ہوتی ہے
دیکھیے آج کی شب کیوں کے بسر ہوتی ہے

چشمِ بیمار کا کوئی اس کی سبب مت پوچھو
خوب رو کے تئیں البتہ نظر ہوتی ہے

اس کے کوچے میں کیے ہم نے بہت سے نالے
پر نہ پوچھا کبھی، یہ دھوم کدھر ہوتی ہے

شیخ جی چھیڑو نہ بدمستوں کو گھر کو جاؤ
بات یاں ورنہ ابھی نوعِ دگر ہوتی ہے

درمیاں سینے کے ہے اور کچھ نہیں ہوتی معلوم
ہائے یارو کہیں ایسی بھی کمر ہوتی ہے

ایسا آسان نہیں معنیِ رنگیں کا تلاش[1]
ایک اک بیت بہ صد خونِ جگر ہوتی ہے

شبِ ہجراں میں تری، شمع نمط عاشق کی
آستیں دیدۂ نم ناک سے تر ہوتی ہے

تو نے جو کچھ کہ کہا یار کہوں گا میں تمام
مصحفی اس سے ملاقات اگر ہوتی[2] ہے

---

[1] تلاش مذکر باندھا ہے۔ [2] اگر ہوگی، ہوئی۔

651

نہ چھو پیارے کہ تیری زلف کا ہر تار نازک ہے — تو کافر بل نہ دے اس کو، کہ یہ زنار نازک ہے

نہ ہو کیوں کر کوئی شاکی تری باریک مژگاں سے — چبھے ہے اس قدر ہی جس قدر یہ خار نازک ہے

گل و نسرین و سنبل ہیں سبھی نازک تراز نازک — نہ تنہا اس چمن کی نرگسِ بیمار نازک ہے

ترے چہرے کے ہنگامِ تماشا دل دھڑکتا ہے — نگاہیں سخت ہیں بیباک اور رخسار نازک ہے

نہیں تم ذبح کر سکتے جو ہم کو، یہ تو بتلاؤ — تمھارے ہاتھ ہی نازک ہیں یا تلوار نازک ہے

نزاکت عاشق اور معشوق کی یکساں نہیں ہوتی — مری گفتار نازک ہے، تری رفتار نازک ہے

نہیں تشبیہ دے سکتے ہم اس کو رشتۂ جاں سے
زبس اے مصحفی، موے میانِ یار نازک ہے

652

ناتوانی سے تلاشِ سوختن میں مر گئے — شمع تک پہنچے نہ پروانے، لگن میں مر گئے

ہر سخن اوپر تو کیوں کھینچے ہے اب تلوار کو — ہم تو میری جان، تیرے اک سخن میں مر گئے

وقت خوش ان ہم صفیروں کا کہ ہنگامِ بہار — بے غمِ دام و قفس صحنِ چمن میں مر گئے

دے جو جاں بر کف لیے پھرتے تھے کتنے تشنہ لب — آخر آخر حسرتِ چاہِ ذقن میں مر گئے

مصحفی عشقِ بتاں کا پوچھ مت کچھ ماجرا
ہم سے کتنے یار اس دیوان پن میں مر گئے

653

نہ باہر ہی اسے آرام ہے ہرگز نہ گھر ٹھہرے — وہ طفلِ شوخ کیا معنی جو ٹک اک جاے پر ٹھہرے

صفائی میں ہیں تیرے لعلِ لب کے مشتری حیراں — کہے قیمت تو کوئی تب کہ جب اس پر نظر ٹھہرے

جوابِ نامۂ عاشق کبھی حاصل نہ ہو اس سے — اگر عمرِ ابد تک پاس اس کے نامہ بر ٹھہرے

کہوں کیا اشک اپنے کی خوش آبی[۱] اور غلطانی[۲] — نہ دل، نے چشم، نے مژگاں کے اوپر یہ گہر ٹھہرے

میں مفلس ہو رہا ہوں دل کی بیتابی کے ہاتھوں سے[۳] — یہی بسمل ہے اب اکسیر، گر ٹک آگ پر ٹھہرے

زبس اے مصحفیؔ تھا ہیچ عرصہ زندگانی کا

جہاں میں آن کر ہم یک دو ساعت جو شرر ٹھہرے

654

راہ میں جاتے دو چار اک تازہ آفت ہو گئی — پوچھتے کیا ہو کہ ہم پر کل قیامت ہو گئی

پیچھے پھر پھر دیکھتا جاتا ہوں اور بھاگوں ہوں میں — اپنے سائے سے بھی اب تو مجھ کو وحشت ہو گئی

ہائے روزِ حجِ اکبر[۴] بھی رہے غش ہی کے بیچ — ہم نہ چیتے[۵] اور کعبے کی زیارت[۶] ہو گئی

نوچ ڈالا اپنا چہرہ ہم نے ناخن سے تمام — منھ چھپاتے ہی ترے یاں اور ہی صورت ہو گئی

کیا رہا تھا مجھ میں پیارے تیرے ہنگامِ وداع — اک ذرا سی جان تھی، سو وہ بھی رخصت ہو گئی

سر اٹھاؤں کیوں کے زانو سے کہ اٹھتا ہی نہیں — کیا کروں زانو سے اس سر کو محبت ہو گئی

جب تلک بیٹھا تھا تو، تھے اہلِ مجلس ہوش میں — تو ادھر اٹھ کر گیا یاں غش کی حالت ہو گئی

غیر کرتے ہی رہیں ہیں تم سے ہر دم بات چیت — ہم بھی گر بولے تو ایسی کیا قیامت آ گئی

گردمِ آخر بہ حسرت جان دی میں نے تو کیا — ایک دم کی یہ بھی اے یارو اذیّت ہو گئی

اس کو ہم اپنی طرف سے پھر نہیں کرتے ہیں ترک — جس سے ٹک اک بار بھی صاحب سلامت[۷] ہو گئی

---

۱ خوش آبی = صفائی۔ ۲ غلطانی = ڈلک۔ ۳ یہ سب کیمیا سازی کی اصطلاحیں ہیں۔ اس دور میں لوگوں کو کیمیا بنانے کا بڑا خبط تھا۔ اس کے لیے پارے کا کشتہ بھی تیار کیا جاتا ہے۔ کیمیا کے شوق میں اکثر مہوس قلاش ہو جاتے تھے۔ ۴ حجِ اکبر وہ حج کہلاتا ہے جو جمعہ کے دن ادا کیا جائے۔

۵ چیتے = ہوشیار ہوئے۔ ۶ ہو گئی = ہو چکی۔ ۷ صاحب سلامت = واقفیت، معمولی دوستی۔

شب جو ڈاڑھیں مار روئے ہم تو نقصاں کیا ہوا
بارے اس روزے سے دل کو تو فراغت ہو گئی

یوں رہے بیمار ہی نت، لیک بعد از سال و ماہ
جوں ہی ٹک دیکھا تجھے اور ہم کو صحت ہو گئی

اک نگاہِ لطف کو ہم نت ترستے ہی رہے
گو یہ جانِ ناتواں بے تاب و طاقت ہو گئی

جانِ من تو، تو توانا ہے تجھے کیا اس کا غم
گو یہ جانِ ناتواں بے تاب و طاقت ہو گئی

فصلِ گل سو بار آئی ہم نہ چھوٹے قید سے
ہم کو اس کنجِ قفس میں رہتے مدت ہو گئی

ہائے کعبے سے پھرا، اب تک نہ ہرگز مصحفی
اس کو واں کیا جانیے کس سے محبت ہو گئی

655

لیتے ہی بوسہ ہو گئے بے زار کس لیے
تم کو کیا تھا اور بھلا یار کس لیے

فصلِ بہار آئی گئی، اب قفس کے بیچ
پھڑکیں ہیں طائرانِ گرفتار کس لیے

زخمِ نخست ہی میں مرا ہو چکا ہے کام
اب دم بہ دم لگاتے ہو تلوار کس لیے

پیارے جو تم کو شوق نہیں تاک جھانک کا
پھر وا رہیں ہیں رخنۂ دیوار کس لیے

آئینہ لے کر دیکھو ٹک اپنے جمال کو
صحبت کا شب کی کرتے ہو انکار کس لیے

کیا ایسی سخت جانی ہے، مر جاتے کیوں نہیں
تیرے مریض کھینچیں ہیں آزار کس لیے

نے مہر و نے وفا نہ محبت کا تجھ میں نام
کر تجھ سے دوستی کوئی ہو خوار کس لیے

گذری سو گذری اپنے اوپر اس کے غم کے بیچ
کیجے کسی سے دردِ دل اظہار کس لیے

سو بار دَھولیں کھا چکے مسجد میں شیخ جی
پھر باندھ باندھ آتے ہو دستار کس لیے

اس نے تو اپنے مکھڑے اوپر ڈال لی نقاب
پھر اب کھڑے ہیں طالبِ دیدار کس لیے

اے مصحفی جو یار تجھے پوچھتا نہیں
جاتا ہے دوڑ دوڑ تو ہر بار کس لیے

656

خیالِ صید جو وہ عنبریں کمند کرے
تو حلقے حلقے میں لاکھوں ہی دل کو بند کرے

نفس بھی کھینچتے اب جی مراد دھڑکتا ہے
مباد آتشِ دل شعلہ پھر[1] بلند کرے

ہے صرفہ تجھ کو اب[2] اس میں کہ اے ملامت گو
تو ہم کو کچھ نہ کہے ترک وعظ و پند کرے

حدیثِ شکوہ میاں منھ پر آخر آتی ہے
کہاں تلک کوئی اپنی زباں کو بند کرے

تو آکے بیٹھے دمِ نزع جس کی بالیں پر
وہ مر بھی جائے تو آنکھیں نہ اپنی بند کرے

بغل میں جس کی کہ دل جیسا پکّا پھوڑا ہو
پھر آہ آہ نہ کیوں کر وہ درد مند کرے

ہمیں تو چاہ نہیں مصحفی کچھ اس دل کی
ہے نذر اُس کی یہ دل اس کو جو پسند کرے

657

وہ جس دم ہاتھ اپنا قبضۂ خنجر پہ رکھتا ہے
تکلّف برطرف منّت ہمارے سر پہ رکھتا ہے

ہوا تو دیدہ و دانستہ اے دل زخمیِ مژگاں
کوئی بھی پانو نوکِ نیزہ یا نشتر پہ رکھتا ہے

بتہ ہر استخوانِ زارِ یوں سلگے ہے دل اپنا
کہ جیسے خار و خس لاکر کوئی اخگر پہ رکھتا ہے

اگر غیروں سے خلوت میں نہیں مشغول وہ پیارا
تو پھر کس واسطے دربان اپنے در پہ رکھتا ہے

بہ صد بے طاقتی ہوتا ہے مانا نقشِ قالیں سے
قدم بیمار تیرا جس گھڑی بستر پہ رکھتا ہے

بسانِ آئینہ صورت پرستی کام ہے کتنا
ولیکن صاحبِ معنی نظر جوہر پہ رکھتا ہے

یہ حالِ مصحفی ہے تجھ بن اب گریے کی شدّت سے
کہ دن میں سیکڑوں رومال چشمِ تر پہ رکھتا ہے

---

[1] ن۲: شعلہ سربلند   [2] برائے صرفہ دیکھو غزل ۴۵۲ کے اشعار۔

658

کیوں کے مژگاں کو تری، تیزیِ نشتر پہنچے
جس کی خوں ریزی کو تلوار نہ خنجر پہنچے

عشق کی منزلِ اوّل بھی بڑی منزل تھی
واں تلک پہنچے تو ہم، یار پہ مر کر پہنچے

دیکھنا کم نگہی کیجیو مت، اے ساقی
بزمِ عشاق ہے، مے سب کو برابر پہنچے

اعتدال اُس قدِ رعنا کا بیاں کیا کیجیے
جس کی خوبی کو نہ سرو اور نہ صنوبر پہنچے

گردشِ چشم کبھی، مشفقِ من ایدھر بھی
بارے اس دور میں اک ہم کو بھی ساغر پہنچے

جس گلی میں کہ فرشتے کے بھی پر جلتے ہوں
کب یہ ممکن ہے کہ واں اُڑ کے کبوتر پہنچے

مصحفی میں ہوں زخود رفتہ تو وہ بے پروا
خبر احوال کی میرے اُسے کیوں کر پہنچے

659

جس گلی میں نہ صبا اور نہ کبوتر پہنچے
مشتِ خاک اپنی کی طاقت ہے کہ اُڑ کر پہنچے

یار ہم بادہ نہ ہو اپنا تو کر کے اُسے یاد
روئیے اتنا کہ خوں تالبِ ساغر پہنچے

آ گیا ہاتھ میں گر اب کے گریباں اپنا
چاک وہ دیجے کہ تا دامنِ محشر پہنچے

میں تڑپنے لگوں جب کھا کے ترا تیر اے کاش
تو شتابی سے لیے ہاتھ میں خنجر پہنچے

سینہ بے طرح میں کوٹوں ہوں غمِ دوری سے
مجھ کو یہ ڈر ہے کہیں صدمہ نہ دل پر پہنچے

اُس کی مژگاں نے کیا دل کا مرے کام تمام
کیا جیے جس کی رگِ جاں پہ نشتر پہنچے

مصحفی اتنا میں رویا کہ شبِ ہجراں میں
اشک آنکھوں سے گریباں تئیں[1] بہہ کر پہنچے

---

[1] گریباں تئیں = گریباں تک

660

ہر آن میں گالی دے ہر اک بات میں جھنجلائے — اک یار ملا ہم کو سو اس وضع کا اے وائے

کیا وجہ بتاؤں تمھیں اس زردئ رُخ کی — رنگ اُس کا یہی ہو ہے جو کوئی خونِ جگر کھائے

گر آبِ رواں سرو قدِ یار کو دیکھے — جوں دیدۂ آئینہ رہے محوِ سراپائے

کام اس سے پڑا مجھ کو جو تصویر کے مانند — میری ہی سنے گا ہے نہ کچھ اپنی ہی فرمائے

تلواریں ہی آتی ہیں نظر چاروں طرف سے — جا کر صفِ مژگاں میں یہ دل کیوں کے نہ گھبرائے

اے مصحفی جب چُو ہی پڑا اشک کے مانند
فریاد مرے[1] دل سے یہی نکلی کہ "دل ہائے"

661

بوند اشک کی اک تازہ نت آن نکلتی ہے — ان آنکھوں سے موتی کی اب کھان[2] نکلتی ہے

از بس کہ کبھی اس نے یاں تیر لگائے ہیں — دل ڈھونڈوں تو سینے سے پیکان نکلتی ہے

تو نزع میں آ جس کو دیدار دکھا دے ہے — پھر آنکھوں سے جان اس کی آسان نکلتی ہے

کیا بیٹھنا، کیا اٹھنا، کیا بولنا، کیا ہنسنا — ہر آن میں کافر کی اک آن نکلتی ہے

جب گھر سے وہ نکلے ہے بن ٹھن کے کبھی باہر — اس وقت تو پھر اور ہی کچھ شان نکلتی ہے

اے مصحفی ہجراں بھی اک طرفہ اذیّت ہے
نے یار ہی ملتا ہے، نے جان نکلتی ہے

662

جلوہ گر یار کا قامت ہے، خدا خیر کرے — حق میں عاشق کے قیامت ہے، خدا خیر کرے

---

[1] ن۳: مرے مُنھ۔ [2] موتی کی کھان = کان، خزانہ۔

دل مرا اور ترا آج جو مل بیٹھا ہے　　شیشہ و سنگ کی صحبت ہے، خدا خیر کرے
صاف بگڑا ہوا آتا ہے مرا آئینہ رو　　آج کچھ اور ہی صورت ہے، خدا خیر کرے
عشق میں اس کے جو بدنام مجھے کرتے ہیں　　یہ بُری طرح کی تہمت ہے، خدا خیر کرے
نہیں منہ موڑتی زنہار وہ تیغِ ابرو
مصحفی سر پہ بد آفت ہے، خدا خیر کرے

663

گر جدا ٹک بھی یار ہوتا ہے　　دل بہت بے قرار ہوتا ہے
تلخ و شیریں سے کچھ جہاں کے نہ پوچھ　　ہم کو سب کچھ گوار ہوتا ہے
دل کو پانوؤں تلے کھندلنا[1] واہ　　کیوں جی ایسا ہی پیار ہوتا ہے
عشق سے ہجر میں گلہ کیا ہے　　مے کا آخر خمار ہوتا ہے
کاش ہو خاک اس گلی کی یہ دل　　جس میں تیرا گذار ہوتا ہے
لیجو، اے ناخدا کہ یہ دل بھی　　اب کی کھیوے[2] میں پار ہوتا ہے
مصحفی اب وہ آن نکلے گا قطعہ　　اس کا یاں نت گذار ہوتا ہے
ٹھہر تو ٹک تو دم لے دیوانے
اتنا کیوں بے قرار ہوتا ہے

664

گل کترے[3] نہ بلبل مری فریاد کے آگے　　سر سبز ہو شاگرد کب اُستاد کے آگے

---

[1] کھندلنا = بہ معنی روندنا۔ [2] کھیوا = کشتی کو پانی میں آگے بڑھانے کے لیے دونوں ہاتھوں سے بلیاں چلائی جاتی ہیں۔ دردؔ۔　ساقی کیدھر ہے کشتیٔ مے　　اب کی کھیوے میں پار ہے ہم

[3] گل کترنا = ہنر دکھانا۔

دیر، اے ملک الموت کہ اس کوہ کنی کا — ہے کام بہت سا ابھی فرہاد کے آگے

گلشن سے اُڑا کرکے[1] صبا میرے پر و بال — مر جاؤں تو لے جائیو صیاد کے آگے

نخچیر سے تا صیدِ حرم فرق نہ سمجھے — آجائے جو کچھ اُس ستم ایجاد کے آگے

گو یار نے تلخ اُس کو کہا لیک تو قاصد — یہ حرف نہ کہیو دلِ ناشاد کے آگے

تقصیر اگر کی ہے تو اس شوخ کی، یارو — کیوں مجھ کو لیے جاتے ہو جلاد کے آگے

نے ذکر ہے، نے شغل ہے، نے یادِ خدا ہے — سب بھول گئے ہم تو تری یاد کے آگے

بد مصحفی کو شیخ جی پیچھو ہی کہو تھے[2]

اب بولتے تم کیوں نہیں داماد[3] کے آگے

665

ہے تجھ پہ تو زور ہی آن، صدقے — صدقے ترے میری جان صدقے

کیا چیز جو کیجے جان صدقے — تجھ پر سے کروں جہان صدقے

مژگاں پہ تری خدنگ قرباں — ابرو پہ تری کمان صدقے

وہ ماہ ہے تو، کہ جس کے اوپر — ہوتا ہے نت آسمان صدقے

رخسار ترے وے گل ہیں جن پر — کیجے گل و ارغوان صدقے

اے مصحفی تو نے ریختے میں

پائی ہے عجب زبان، صدقے

666

فراغت میں بُتاں کی صورتِ دل خواہ یاد آوے — پڑے جب کچھ مصیبت تب ہمیں اللہ یاد آوے

---

[1] اڑا کر کے میں کے زائد ہے مگر بولی میں آتا ہے۔ [2] پیچھو ہی کہو تھے = بولی کا لطف دیکھیے۔

[3] کیا تیکھا شعر ہے۔ عامیانہ پن ضرور ہے۔ مگر لب ولہجہ خالص کھڑی بولی کا ہے۔

بیاباں در بیاباں ہر طرف آوارہ پھرتے ہیں | نہیں بھولے ہوئے ایسے کہ ہم کو راہ یاد آوے
حقیقت دردمند ایسے کہ سن کر کیا کوئی خوش ہو | کہ جس کو بات کہتے ہر سخن پر آہ یاد آوے
سُنا کہیں ذکر یوسف کا تو میرے دل میں تو گذرا | سخن جیسے بہ تقریبِ سخن ناگاہ یاد آوے
نہ ہنسنا بولنا نے اس طرف گاہے نظر کرنا | بھلا کس بات پر ہم کو، تمھاری چاہ یاد آوے
ہم اُٹھ کر خواب سے، تیری گلی کا قصد کرتے ہیں | گدا کو صبح دم جوں بارگاہِ شاہ یاد آوے
اسی کے نور سے تھا کلبۂ احزاں مرا روشن | شبِ غم کیوں نہ مجھ کو ہر گھڑی وہ ماہ یاد آوے

نت اس کی بزم میں اے مصحفی ہے ذکر غیروں کا
یہ کیا معنی جو گاہے بندۂ درگاہ یاد آوے

667

ناچار ہو دین و دل اس شوخ کو دے گذرے | جو ہم پہ پڑی آ کر اس عشق میں کھے[1] گذرے
ہم جن کی سرِ رہ میں اک عمر سے بیٹھے ہیں | افسوس کہ اک دن بھی ادھر سے نہ وے گذرے
دی اس نے اگر ہم کو دشنام بہاے دل | ہم مثلِ غرض منداں وو ہیں اُسے لے گذرے
ہر وقت جواب ہم کو تم گالیاں دیتے ہو | نہیں ہم بھی، میاں صاحب ایسے تو گئے گذرے

رفتار پہ خوباں کی، اے مصحفی مت جانا
پامال کیا عالم جس راہ سے یے گذرے

668

ہے ماہ کہ آفتاب کیا ہے | دیکھو تو تہِ نقاب کیا ہے
میں نے تجھے تو' نے مجھ کو دیکھا | اب مجھ سے تجھے حجاب کیا ہے

---

[1] کھینا = جھیلنا کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

آئے ہو تو کوئی دم تو بیٹھو | اے قبلہ یہ اضطراب کیا ہے
اُس بن ہمیں جاگتے ہی گذری | جانا بھی نہ یہ کہ خواب کیا ہے
مجھ کو بھی گنے وہ عاشقوں میں | اس بات کا سو حساب کیا ہے
سی پارۂ دل کو دیکھ اس نے | پوچھا بھی نہ یہ کتاب کیا ہے
اس مے کدۂ جہاں میں، یارو | مجھ سا بھی کوئی خراب کیا ہے

قسمت میں ہماری مصحفی، ہائے
کیا جانے ثواب عذاب کیا ہے

669

آئے ہو تو یہ حجاب کیا ہے | مُنھ کھول دو، نقاب کیا ہے
سینے میں ٹھہرتا ہی نہیں دل | یارب، اسے اضطراب کیا ہے
کل تیغ نکال مجھ سے بولا | تو دیکھ تو اس کی آب کیا ہے[۱]
معلوم نہیں کہ اپنا دیواں | ہے مرثیہ یا کتاب، کیا ہے
جو مر گئے مارے لطف ہی کے | پھر اُن پہ، میاں عتاب کیا ہے
اوروں سے تو ہے یہ بے حجابی | مجھ سے ہی تجھے حجاب کیا ہے

اے مصحفی اٹھ یہ دھوپ آئی
اتنا بھی دوانے، خواب کیا ہے

670

مانی اُن ابرووں کی تصویر کھینچتا ہے | خورشید پر دو دستی شمشیر کھینچتا ہے
دل زلف کی طرف کو کیوں کر کھنچا نہ جاوے | کوئی اُس طرف سے اِس کی زنجیر کھینچتا ہے

---

۱ کیا ہے: بہ معنی کیسی اچھی ہے۔

رہنے دے تا کہ دل کو ہو اک ذرا تسلی — پہلو سے میرے، ظالم کیوں تیر کھینچتا ہے
ہے یہ بھی بس کہ گاہے یہ دل بتاں کے غم میں — دو چار نالے ہو کر دل گیر کھینچتا ہے
کل مصحفی کہاں اور تیمارداری اُس کی
تا صبح اور بھی یہ تاخیر کھینچتا ہے

671

خط آیا وہ ادا نہ وے اطوار رہ گئے — عشاق تھے ہزار سو دو چار رہ گئے
صحبت پہ گل کی شور نہ کر اتنا، عندلیب — اپنے بھی پاس کتنے طرح دار رہ گئے
ناگہ جو اس کے چہرے سے پردہ اُلٹ گیا — جانے سے راہ مردمِ بازار رہ گئے
تیری گلی وہ جا ہے جہاں آ کے رات کو — اکثر لباسِ فقر میں سردار رہ گئے
دستِ جنوں سے چاک فقط جیب ہی نہیں — دستار کے بھی دیکھو تو دس تار رہ گئے
سودا ہمارا یار سے نظروں میں ہو گیا — منھ دیکھتے ہی کتنے خریدار رہ گئے
ہم گذرے اس گلی سے تو بیمِ رقیب سے — آہستہ ٹک گلی میں ہی کھنکار[1] رہ گئے
قاتل سے آرزو تھی کئی زخم کی ہمیں — پر ہم تو کھا کے ایک ہی تلوار رہ گئے
صیاد نے خبر ہی نہ لی، زیرِ دام ہی — آخر تڑپ تڑپ کے گرفتار رہ گئے
بلبل کا کچھ نشاں نہ رہا باغ میں مگر — دو چار آشیاں کے خس و خار رہ گئے
بخشا سبھوں کو لب نے ترے شربتِ شفا — یاروں میں اپنے، ایک ہمیں یار رہ گئے
اوروں کو حکمِ دخل ہوا تیری بزم میں — ہم سر پٹکتے ہی پسِ دیوار رہ گئے
مِن بعد کیا ہے فائدہ جینے کا مصحفی
نے وہ جہاں کی وضع، نہ وہ یار رہ گئے

---

[1] کھنکار بروزن جھنکار نظم ہوا ہے۔ زبان پر سنوار کے وزن میں ہے۔

672

قد، قیام اور خرام آفت ہے
واں جو کچھ ہے تمام آفت ہے

دل دُکھا ہی کرے ہے سینے میں
یاں یہی صبح و شام آفت ہے

ہے غضب اک تو قد کا خم کرنا
تِس پہ طرزِ سلام آفت ہے

دل کو سمجھایئے کہاں تک، ہائے
اشتیاقِ مدام آفت ہے

نہ پیو کوئی زیادہ بادۂ عشق
اس کا تو ایک ہی جام آفت ہے

کہیئے کیا آفتاب تو اس کو
کوئی بالائے بام آفت ہے

آفتِ عشق ہے وہ دنیا میں
مصحفی جس کا نام آفت ہے

673

جا کر کہے یہ حرف مرے یار سے کوئی
سر دے دے، مارے ہے درو دیوار سے کوئی

پہنچے خبر بہار کی اس کو بھی، اے صبا
ہووے جو طائرانِ گرفتار سے کوئی

تیکھے تو ہو، پہ سچ کہو اس وقت کیا کرو
تم کو گلے لگا لے اگر پیار سے کوئی

یارو خدا کے واسطے جینے بھی دو کہیں
جاؤ نہ بولو مجھ سے دل افگار سے کوئی

دیکھیں تو ہم بھی تم کو، لگاؤ نہ مہرباں
بس ڈر گیا اس آپ کی تلوار سے کوئی

میں تم سے پوچھتا ہوں بھلا اس کا کیا علاج
پھر جائے وعدہ کر کے جو اقرار سے کوئی

دامن تمام ہو گیا افشاں، کہاں تلک
پونچھے لہو کو دیدۂ خوں بار سے کوئی

کیوں نام لیں کسی کا پہ یہ تو کہیں گے ہم
کیا ہو جو بولے ہم سے گنہ گار سے کوئی

شمع و شراب و شاہد و ساقی ہے روبرو
کیا چاہے اور طالعِ بیدار سے کوئی

پیچھے گلہ نہ کیجیو، پیارے تو مُنھ پہ کہہ
بوسہ لیا ہو گر ترے رخسار سے کوئی

تلوار جب چلے ہے تو پھر وہ کرے ہے قتل　　جیتا اگر بچے تری رفتار سے کوئی

کیوں تو نے اس کو کر دیا آزردہ مصحفی
ناداں بگاڑتا ہے طرح دار سے کوئی

674

جب میری طرح تو بھی تکے راہ کسی کی　　معلوم ہو تب تجھ کو میاں چاہ کسی کی

جوں چاہیے، صحبت کی ہوس دل سے نہ نکلی　　یارب نہ شبِ وصل ہو کوتاہ کسی کی

یہ عشق بُرا ہوتا ہے معلوم کرو گے　　گاہے جو اثر کر بھی گئی آہ کسی کی

نامے کو مرے پڑھ کے لگا یار یہ کہنے:　　"قاصد یہ حقیقت تو ہے جاں کاہ کسی کی"

اے آنکھ مری شکل کا حیران رہا ہے　　کیا دیکھی نہیں صورتِ دل خواہ کسی کی

جوں آئینہ وہ غم زدہ رہ جاتا ہے حیراں　　جب اس پہ نظر پڑتی ہے ناگاہ کسی کی

از بس کہ تو' پیارا ہے مجھے، تیرے سوا یار　　سوگند میں کھاتا نہیں واللہ کسی کی

اے مصحفی تربت کا مری نام نہ لینا
گر پوچھے تو کہیو کہ ہے درگاہ کسی کی

675

وے جو ہم لوگوں سے کرتے تھے محبت، مر گئے　　جی کے دشمن رہ گئے، اہلِ مروّت مر گئے

جوں ہی کی اُس خوبیِ عالم نے آ کر اک نگاہ　　وے جو جی اٹھے تھے پھر روزِ قیامت مر گئے

جان کو ہم اپنی کیا روویں کہ اس کوچے کے بیچ　　ہم سے کتنے کھینچ کر رنج و اذیّت مر گئے

نعش پر زاہد کی (۱) جائے ہے بہرِ نماز　　ایسے بھڑوے کتنے یاں کہلا کے "حضرت" مر گئے

---

۱ نحش (ن ۳: ناصح کی)

تو جو جاتا ہے وہیں نت دوڑ دوڑ اے مصحفی
اور کیا دنیا کے سارے خوبصورت مر گئے

676

بیٹھ کر وہ جہاں سے اٹھتا ہے — ایک فتنہ وہاں سے اٹھتا ہے
اس کو جا بیٹھنا جہاں ہوں وے — کب یہ دل دل براں سے اٹھتا ہے
نالہ کرتی ہے جس گھڑی بلبل — شعلہ اک آشیاں سے اٹھتا ہے
مُنھ کو مت کھول ورنہ عالم کے — پردہ رازِ نہاں سے اٹھتا ہے
بیٹھتا ہے وہ جنگ جُو جس جا — لڑ کے آخر وہاں سے اٹھتا ہے
شورِ محشر کہیں ہیں جس کے تئیں — میرے شور و فغاں سے اٹھتا ہے
کشتۂ عشق یوں نہیں ٹلتا — مر کے کوے بتاں سے اٹھتا ہے
جو کہ پتھر سا جم کے بیٹھے ہے — کب ترے آستاں سے اٹھتا ہے

مصحفی مت بہت رقیب کو چھیڑ
وہ کوئی درمیاں سے اٹھتا ہے

677

اہلِ دل گر جہاں سے اٹھتا ہے — اک جہاں جسم و جاں سے اٹھتا ہے
چلو اے ہم رہو، غنیمت ہے — جو قدم اس جہاں سے اٹھتا ہے
جمع رکھتے نہیں، نہیں معلوم — خرچ اپنا کہاں سے اٹھتا ہے
گر نقاب اس کے مُنھ سے اٹھی نہیں — شور کیوں کارواں سے اٹھتا ہے
وائے بے طاقتی و بے صبری — پردہ جب درمیاں سے اٹھتا ہے

پھر وہیں گر پڑے ہے پروانہ گرچہ ٹک اک شمع داں سے اٹھتا ہے

قصۂ مصحفی سنا کر، یار

عشق اس داستاں سے اُٹھتا ہے

678

تاب کس کی ہے کہ بے پردہ ترا مُنھ دیکھے غش کرے وہ وہیں اگر تیرا خدا مُنھ دیکھے

رو دیئے، ہم سے ہوئی ایسی ہی خجلت حاصل کیا کسی کا کوئی پھر روزِ جزا مُنھ دیکھے

کیا ستم ہے کہ تو آئینے کو رُو دے، ظالم اور گنہ گار سا دل دوٗر کھڑا مُنھ دیکھے

نہ رہے آپ میں پھر ماہِ شبِ چار دہم ٹک دوپٹے سے اگر تیرا کھلا مُنھ دیکھے

ایک نے اُس سے کہا: مصحفی مرتا ہے میاں قطعہ ہووے کیا اُس کا جو تو، جا کے ذرا مُنھ دیکھے

لگا کہنے کہ: ہو آئینہ بھی جس سے بیزار

ایسے بدشکل کا اپنی تو بلا مُنھ دیکھے

679

پرواہ تجھے کب ہے، میاں جان کسی کی گو تجھ پہ میاں، جان ہو قربان کسی کی

دل سخت مشوّش ہے مرا رات سے، شاید دیکھی ہے کہیں زلفِ پریشاں کسی کی

معلوم نہیں کیا غرض اب آئی ہے درپیش ہے کب سے زباں اپنی ثنا خوان کسی کی

سمجھاتے ہیں تجھ کو ہی میاں تیرے طرف دار تو ہم سے نہ اتنا بھی بگڑ، مان کسی کی

سَو بار گئے کچھ نہ ہوا نامہ بروں سے اب آپ ہی قاصد ہو مگر، جان کسی کی

بسمل تو تڑپتا تو ہے پر دیکھیو زنہار لوہو میں نہ بھر جا، زہِ داماں کسی کی

کیا مجھ کو دہن سے ترے واشد کی توقع مشکل نہ ہوئی تجھ سے تو آسان کسی کی

گر پھر گیا میں اس سے تو کیا اس کا عجب ہے — تا چند اطاعت کرے انسان کسی کی
اُس چہرے میں کچھ اور ہی صورت کی صفا ہے — کس طرح نہ ہو آرسی حیران کسی کی
ہم دم تو نہ کر میرے اُپر عشق کی تہمت — کچھ عقل بھی ہے، شکل تو پہچان کسی کی
اے مصحفی یہ شعر و سخن جائے گا سب بھول
گر کھُب گئی نظروں میں تری آن کسی کی

680

ہیں نہاں داغِ جگر زخمِ نمایاں کے تلے — جس طرح لالہ کہیں ہو گلِ خنداں کے تلے
آشیاں بندی کی تکلیف نہ دے ہم کو ہوس — گر رہیں گے کہیں دیوارِ گلستاں کے تلے
دیکھ پاوے جو ترے چاہِ ذقن کو یوسف — ہاتھ حیرت سے رکھے اپنا زنخداں کے تلے
ہیں دو عارض ترے وے گل کہ بہ صد شادابی — تازہ رہتے ہیں سدا سایۂ مژگاں کے تلے
یار پہلو پہ مرے ہاتھ سمجھ کر رکھیو — دل سی آتش ہے دبی سینۂ سوزاں کے تلے
ہائے بوسہ نہ لیا ہم نے کبھی اُس لب سے — نت رہا یاں لبِ افسوس ہی دنداں کے تلے
ہم سے آوارہ کہاں، سایۂ دیوار کہاں — یہ بھی بس ہے کہ کبھی بیٹھیں مغیلاں کے تلے
سر بہ سر چشمۂ خورشید ہے یا آبِ حیات — گر نظر سیر کرے زلفِ پریشاں کے تلے
مصحفی اس سے بھی رنگیں غزل اک اور لکھی
رکھ دیا تازہ گلستاں کو گلستاں کے تلے

681

دل تڑپتا ہے مرے سینے میں، پیکاں کے تلے — نگہِ شرم ہے تو بھی تری مژگاں کے تلے
مر بھی جاؤں جو میں پیارے تو بلا سے تیری — تو نہ رکھیو لبِ نازک کہیں دنداں کے تلے

گلبدن[1] کا نہیں پاجامہ اگر کیجیے غور سیرِ گلزارِ ارم ہے ترے داماں کے تلے

خندۂ زخمِ جگر، گل کی طرح کرتا ہے چاک سینے کا مرے چاک گریباں کے تلے

تجھ سے اک داغ کا اخفا نہ ہوا، اے لالہ یاں ہیں سو داغ چھپے سینۂ سوزاں کے تلے

سیرِ گلزارِ شہادت ہو مبارک اس کو رکھ دیا جس نے گلا خنجرِ بُرّاں کے تلے

رنگ یاقوت کے مانند پڑا جھمکے ہے رنگ لب کا مرے رنگِ مسی دپاں کے تلے

مصحفی رو رو میں اُس کوُ میں بہائے نالے
نہریں جس طرح بہیں جنتِ رضواں کے تلے

682

زلفوں کا بکھرنا اک تو بلا، عارض کی جھلک پھر ویسی ہی
آنکھوں کا مٹکنا ہوش ربا، ہر ایک پلک پھر ویسی ہی

وہ شوخ جو گذرے مثلِ صبا، تو بھڑکے نہ کیوں کر آتشِ دل
اک طور کی اس کی جنبشِ پا، دامن کی جھٹک پھر ویسی ہی

کوئی کیوں نہ گریباں چاک کرے اب دیکھ کے چھب کو اس بُت کی
پنڈے[2] کا جھلکنا ہائے خدا، چولی کی مسک پھر ویسی ہی

دل کیوں نہ کرے سینے میں تپش، جب یار کی ہو یہ راہ و روش
رفتار میں اک البیلی ادا، اور قد کی لچک پھر ویسی ہی

ہم کیوں نہ کفِ افسوس ملیں، جب وے ہی ترا پابوس کریں
دامن سے زیادہ بندِ قبا، زلفوں کی لٹک پھر ویسی ہی

---

[1] گلبدن = کپڑے کا ایک ڈیزائن۔ [2] پنڈا = جسم، بدن۔

وہ ماہ چھپایا توُ نے کہاں، ہے جس سے جگر پر داغ مرے
صورت تو دکھا دے مجھ کو ذرا' جلدی سے فلک پھر ویسی ہی

اے مصحفی میرے حال پہ اب کیوں کر نہ کوئی افسوس کرے
بے ساختہ دل بیتاب ہوا آنسو کی ڈھلک پھر ویسی ہی

683

جسے تصویر دکھلائی ہے تیری — اُسے کیا وضع خوش آئی ہے تیری
نہ کر اُس سے دلا چھپ چھپ کے باتیں — کہ ان باتوں میں رسوائی ہے تیری
ہمارا غنچۂ دل کھِل گیا ہے — صبا جب بوے خوش لائی ہے تیری
جو صید آیا سرِ تیر، اُس کے بولا: — "تجھے شاید اجل لائی ہے تیری"
حنا کے ساتھ دل خوں ہو گیا ہے — یہ کس نے مٹھی بندھوائی ہے تیری
نہیں نظروں تلے ہرگز ٹھہرتی — جو صورت دل میں ٹھہرائی ہے تیری
کوئی کیوں کر جیے گا دیکھ تجھ کو — بلاے جاں یہ زیبائی ہے تیری

قطعہ

کہا میں رات اُس سے: ایک بوسہ — جو چھپ کر دے، تو دانائی ہے تیری
خفا ہو کر لگا مجھ سے یہ کہنے: — "ارے کم بختی کیوں آئی ہے تیری"

نہ لے اے مصحفی توُ صبر کا نام
کہاں اتنی توانائی ہے تیری

684

باغ میں جا کے وہ جب بندِ قبا کھولے ہے — ہو کے محظوظ گل اے وقت تو خوش بولے ہے
سر پہ میرے ہی لگاتا ہے فلک آخر کار — تیغِ بیداد کو جو ہاتھ میں لے تولے[1] ہے

---

[1] تولنا = تلوار کو ہاتھ میں لے کر تولنا، مارنے کے ڈھب اور گرفت وغیرہ کا انداز بنانا۔

کیوں کے بچیے کہ نہنگِ فلکِ مردم خوار | کھول کر منہ کبھی اس کو کبھی اُس کو لے ہے
جب کہ آغوش میں لیتی ہے تجھے میری نگاہ | پہلے سَو بار میاں صدقے ترے ہو لے ہے
گھول گھول اُس کی جدائی میں پیا زہر میں لیک | کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ تو، کیا گھولے ہے

جان و دل دونوں ہیں حاضر، یہ پسند اس کی ہے
مصحفی بول نہ، لینے دے اُسے جو لے ہے

685

غزل سرائی میں گر، وا کروں زباں اپنی | تو جاوے مرغِ چمن بھول داستاں اپنی
یہ دل تو چیز ہے کیا بلکہ تم اگر چاہو | تو میری جان تصدّق ہے تم پہ جاں اپنی
ستارے شب کو نکلتے نہیں، جو سچ پوچھو | ہمیں دکھاتا ہے آنکھیں یہ آسماں اپنی[1]
یہ باتیں خوب نہیں منہ پہ گالیاں دینی | زباں سنبھالے ہی ٹک رکھیو، مہرباں اپنی
برنگِ آئینہ اس زنگ بارِ عالم میں | ہمیشہ تختہ ہی رہتی ہے کچھ دکاں[2] اپنی
بشرط اس کو اگر معرکے میں رکھ دیجے | کھنچے نہ ہاتھ سے رستم کے بھی کماں اپنی
میں جب کہ گھر سے نکل بیٹھتا ہوں ٹک باہر | تو لے چلے ہے وہی کہنہ داستاں اپنی

خدا کے واسطے اے مصحفی کہیں چپ رہ
بہت بھی بک نہ، طبیعت ہے ناتواں اپنی

686

چھاتی پہ لٹکتی نہیں زنجیر طلا کی | چاندی کے ورق پر ہے یہ تحریر طلا کی

---

[1] اسی مضمون کا شعر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا بھی ہے (نیز دیکھو شعر ۳۸۳۷)

کأن نجوماً أومضت فی الغیاھب | عیونُ الأفاعی أو رؤوس العقارب

[2] دکان تختہ رہنا = چوپٹ رہنا۔

افشانِ طلا سے یہ تمھارا خمِ ابرو　　آتا ہے نظر جیسے کہ شمشیر طلا کی
جو چھیٔ حسن اُس کے کو دیکھے ہے کہے ہے:　　بت خانے سے آئی ہے یہ تصویر طلا کی
جنت کی طمع کیوں نہ کرے شیخ کہ واں ہیں　　چاندی کے محل، یا کہ ہے تعمیر طلا کی
ضعفِ جگر و دل ہو جسے غم سے بتاں کے　　ہووے نہ طلا کھائے ہے تاثیر طلا کی
جاتی ہے تپ دل کوئی کافور ملے سے　　احباب عبث کرتے ہیں تدبیر[1] طلا کی
وہ سوختہ ہوں میں کہ مری خاک کو لے کر　　گر طرح کریں تو ہے وہ اکسیر طلا کی
جب آئینہ دیکھے ہے تو کندن سا ترا رنگ　　آئینے کو کر دیوے ہے تصویر طلا کی
ہم خانہ بدوشوں کو طلا گر نہیں ملتا　　کوتاہیِ قسمت ہے نہ تقصیر طلا کی

تسخیر کوئی پہنچے ہے اُس کو نہ عزیمت[2]
اے مصحفی جو ہوتی ہے تسخیر طلا کی

687

بزم سے اُٹھے جو ہم بے کل گئے　　لے کے چٹکی رات وے دل مل گئے
آہ بھی منھ سے نہ نکلی، گرچہ یاں　　عاشقوں کے سر پہ آرے چل[3] گئے
خاک پر میری وہ آیا لے کے تیغ　　جب لحد میں استخواں بھی گل گئے
دخترِ رز تو، تو کس گنتی میں ہے　　یاں پری زادوں کے جوبن ڈھل گئے
تھے جو انگارے سے گل اس باغ میں　　دیکھ اُس رنگِ کفک کو جل گئے

معرکے میں عشق کے، اے مصحفی
سامنے سے میرے رستم ٹل گئے

---

[1] طلا = طبّی اصطلاح، ملنے کی دواؤں کے لیے جو جلد میں جذب کی جاتی ہے۔
[2] تسخیر اور عزیمت دونوں عملیات کی اصطلاحیں ہیں۔
[3] حضرت زکریا پیغمبر علیہ السلام کی تلمیح ہے۔ ملاحظہ ہو قرآن شریف (۲:۱۳، ۷:۱۶، ۱۶:۴، ۶:۱۷)

688

جس دم کہ آنکھ میری اُس شوخ سے لڑی ہے — کافر نگاہ اس کی بجلی سی آپڑی ہے

اُگتے ہیں گل چمن سے، آسودۂ شہادت — کس کی لہو بھری لاش اس خاک میں گڑی ہے

کشتہ ہوں کس نگہ کا جو بہر پاسبانی — لوحِ مزار اب تک سر پر مرے کھڑی ہے

لختِ جگر سے ازبس پایا ہے رنگ اس نے — مدِّ نگاہ اپنی پھولوں کی سی چھڑی ہے

بیمار کا تمھارے کل دم الٹ گیا تھا — کہتے ہیں آج اس پر پھر اب وہی گھڑی ہے

تیری نزاکتوں کو پہنچے ہے کب وہ لڑکے — بوٹے سے قد سے تیرے، گو شاخِ گل بڑی ہے

اے مصحفیؔ، وہ اتنا خوش رو نہیں ہے اس پر
کیا جانے آنکھ تیری کس وضع سے پڑی ہے

689

اے دل تو نہ بھڑ اُس سے کہ تیغ اس کی ہے کٹی[1] — باندھے گا بھلا کون ترے زخم کو پٹی

رنگیں نہیں ناخن ترے پانوؤں کے حنا سے — پا بوس کو آئی ہیں ترے، بیر[2] بہٹی

اِس کوچے سے ظالم تو مجھے لے تو چلا ہے — اے عشق کہیں خوار نہ کیجیو مری[3] مٹی

لے جاتے ہو دل مجھ سے تو پھر مانگو ہو جاں کو — یہ زور لگائی ہے غرض آپ نے[4] چٹی

اس سینۂ صد چاک میں داغوں کا تماشا — آ دیکھ کہ ہے یہ بھی چراغان کی ٹٹی

اے پیرزن ایسی تری کیا عقل گئی ہے — یوسف کی بہا میں بھی کوئی دیوے ہے اٹی[5]

---

[1] کٹی = کاٹ سے، بہت کاٹنے والی۔ [2] بیر بہٹی بہ حذفِ واؤ ایک سرخ رنگ کا کیڑا جسے فارسی میں عروسک کہتے ہیں۔ [3] مٹی خوار کرنا = ذلیل کرنا۔ [4] چاٹ سے چٹی، ذائقہ۔

[5] سوت کی اٹیا۔ کہتے ہیں کہ بازار مصر میں جب حضرت یوسف کا نیلام ہونے والا تھا۔ تو ایک بڑھیا سوت کی اٹیا لے کر ان کی خریداری کو پہنچ گئی تھی۔

لازم ہے مجھے مصحفی وصف اپنے سخن کا
کہتا نہیں ہرگز کوئی چھاچھ[1] اپنی کو کھٹی

690

رہے جو قبضۂ شمشیر کیں پہ ہاتھ دھرے — مرے سلام کو کب وہ جبیں پہ ہاتھ دھرے
کبھی جو آئے نظر[2] سینکنے کو ہم کم بخت — تو اس نے ضد سے رخِ آتشیں پہ ہاتھ دھرے
خدا کے واسطے ہمدم ہمیں نہ چھیڑ اس وقت — کہ بیٹھے ہیں دل اندوہ گیں پہ ہاتھ دھرے
نہ دی خبر مجھے اس نے بھی زلف کی، گرچہ — میں بارہا قدمِ شانہ بیں پہ ہاتھ دھرے
یہ کس کا غم ہے جو اس انجمن میں چھوٹے بڑے — ملول بیٹھے ہیں سارے، جبیں پہ ہاتھ دھرے
پڑا میں تب میں جلوں یاں ہزار حیف، کہ واں — طبیب اُس کے تنِ نازنیں پہ ہاتھ دھرے

چل اس طرح کہ نہ اے مصحفی لگے ٹھوکر
پڑے ہیں وے جو سرہانے زمیں پہ ہاتھ دھرے[3]

691

خنجر تلے، اے دل نہ تڑپ اتنا بھی، دم لے — کیا کرتا ہے، قاتل کا کہیں ہاتھ تو تھم لے
کب چشمِ خماریں کا تری وصف ادا ہو — لکھیے نہ اگر ہاتھ میں نرگس کی قلم لے
اُن ماتمیوں کی بھی تجھے خیر و خبر ہے — کوچے سے ترے جو گئے نالوں کے علم لے[4]

---

1. چھاچھ = دودھ میں سے مکھن نکالنے کے بعد جو پانی باقی بچتا ہے اُسے کہتے ہیں۔ ''کوئی اپنی چھاچھ کو کھٹی نہیں کہتا'' یا کوئی اپنے بیروں کو کھٹا نہیں بتاتا، یہ کہاوت ہے۔

2. نظر سینکنا = آنکھیں سینکنا، محض نظارہ بازی کرنا۔ 3. مصرع میں ذرا سی تعقید ہے یعنی ''وہ جو زمین پر سرہانے ہاتھ دھرے پڑے ہیں''۔ 4. ہندوستان میں ایرانی معاشرت کے اثر سے بعض جگہ انیسویں صدی تک جنازے کے ساتھ ساتھ علم بلند کر کے چلتے تھے۔

جو اشک کہ گرتا ہے مری آنکھوں سے مجھ کو
کہتا ہے یہی تو' بھی یو ہیں راہِ عدم لے

ہاتھوں کی کلائی پہ تری رحم ہے مجھ کو
چُن چُن کے گل اس باغ سے دامن میں تو کم لے

کعبے سے نکالا جو ہمیں اب کے تو ہم بھی
بُت خانے میں جا بیٹھیں گے کوئی تازہ صنم لے

چاہا ہو اگر تیرے سوا ہم نے کسی کو
تو جیسی کہ چاہے، تو میاں ہم سے قسم لے

کس طرح میں دیکھوں کہ مرے سروِ رواں کی
پا بوسی کرے رنگِ حنا، زلف قدم لے

اے ناخنِ غم کیا ہے تجھے اتنی شتابی
مرہم کا یہ پھاہا تو مرے داغ پہ جم لے[1]

اوروں نے متاعِ طرب و عیش اٹھائی
ہم غم زدہ دنیا سے گئے درد و الم لے

کیا مصحفی خستہ کے دل پر تو، مٹا ہے
زلفوں کی کمندوں میں کوئی صیدِ حرم لے

692

دکھا کر مُنھ کو چھپ جایا نہ کیجے
ہمیں اس وضع ترسایا نہ کیجے

مجھے کیا بلکہ مشاطہ کو اپنے
حنائی ہاتھ دکھلایا نہ کیجے

جو آیا کیجیے بندے کے آگے
تو میری جان شرمایا نہ کیجے

تمھیں کہتا ہوں، اے دامن درازو
مری آتش کو بھڑکایا نہ کیجے

پکارے گو کوئی، یوں گھر سے باہر
کھلے بالوں نکل آیا نہ کیجے

تمھاری زلف بل کھاوے تو کھاوے
ولیکن آپ بل کھایا نہ کیجے

خطا پاؤ گے اک دن مصحفی تم
بہت اس کوچے میں جایا نہ کیجے

---

[1] جم لے = جم جائے، چپک جائے۔

693

کیا کروں میں جو گلستاں میں بہار آئی ہے
یاں تو آنکھوں میں مری جانِ نزار آئی ہے

مر گیا ہوں تو مری روح بھی تجھ کو قاتل
تیرے دروازے پہ جا جا کے پکار آئی ہے

اک ذرا رہ کہ مری آنکھوں میں جوں قطرۂ اشک
جاں ترے قدموں پہ ہونے کو نثار آئی ہے

تیغ کو سان پہ رکھا ہے مرے قاتل نے
آج شاید اجلِ تازہ شکار آئی ہے

ہے بہت رنگِ حنا آج جو تغییر مگر
بازی ہاتھوں سے ترے رات وہ ہار آئی ہے

مصحفی ضد سے وہ ٹھکرا کے چلا ہے اس کو
راہ میں اس کی اگر میری مزار[1] آئی ہے

694

محبت میں صادق یہ اغیار ٹھہرے
ہم اک بات کہہ کر گنہ گار ٹھہرے

نہ ٹھہرے مرے دل میں پیکاں تو تیرا
غنیمت ہے یہ بھی جو سوفار ٹھہرے

میں بیچا دل اپنا تمھارے ہی ہاتھوں
کہ اس جنس کے تم خریدار ٹھہرے

گلی سے تری کوئی بچ کر نہ آیا
چُٹیلے[2] گئے وے جو دوچار ٹھہرے

دل آنسو سے ہے سیل کی رہ گذر میں
عجب ہے کہ اس گھر کی دیوار ٹھہرے

ستم یہ بڑا ہے کہ یہ بے وفا بھی
ستم کر کے ہم پر وفادار ٹھہرے

ہوئے کامیاب اُس سے بیدرد یارب
ہم ان حسرتوں کے سزاوار ٹھہرے

برسنے کا ساون کے خطرہ نہیں کچھ
جھڑی تیری اے چشمِ خوں بار ٹھہرے

صفِ جنگ سے ٹل گئے سب فلک کی
جو ٹھہرے تو میدان میں یار ٹھہرے

گلی سے تری ہم تو اُٹھ کر چلے تھے
ہوا ضعف مانع، سو ناچار ٹھہرے

---

[1] مزار مؤنث [2] چوٹ کھائے ہوئے

ٹھہر جائے یہ جانِ بر لب رسیدہ — جو وعدے پہ اپنے وہ عیار ٹھہرے
تو اک وار میں ہانپ جاتا ہے پیارے — ترے ہاتھ میں کیوں کے تلوار ٹھہرے
سدا ہم سے بے ہوشیاں ہی ہوئیں یاں
ہم اے مصحفی کیوں کے ہشیار ٹھہرے

695

برقِ رخسارِ یار پھر چمکی — اس چمن کی بہار پھر چمکی
تو نے پھر اس کو سان پر رکھا[1] — تیرے خنجر کی دھار پھر چمکی
میرے گریے سے آب و تاب[2] آیا — صورتِ روزگار پھر چمکی
خونِ عاشق سے وہ زہِ دامن — دمِ شمشیر وار[3] پھر چمکی
دیکھیو پانْو رکھ دیا کس نے — آج کیوں نوکِ خار پھر چمکی
وہ جو اک ٹیس سی ہے دل میں مرے — رہ کے بے اختیار پھر چمکی
مصحفی کی جو تو نے در ریزی
شاعری تیری یار پھر چمکی

696

کبھی جو ہجر میں ہم بے قرار ہوتے تھے — تو جا کے اُس کی گلی کے نثار ہوتے تھے
لگا رہا تھا نشانے پہ کل وہ تیر اُدھر — اِدھر وہ میرے کلیجے کے پار ہوتے تھے
گئے وہ دن کہ بہ تحریکِ نالۂ بلبل — ہم اِس چمن میں مہیاے کار ہوتے تھے
خوشی کے مارے میں گُل کھا کے رہ میں جا بیٹھا — کہ کل وہ سیرِ چمن کو سوار ہوتے تھے

---

[1] سان پر رکھنا = تلوار پر دھار لگانا۔ [2] آب و تاب مذکر۔ [3] وار = مثل۔

میں دیکھتا تھا کھڑا اک طرف جو راہ میں رات — تمھارے غیر کے قول و قرار ہوتے تھے
عرق کی بوندیں نہ گرتی تھیں اس کے مکھڑے سے — ستارے بدر کے رُخ پر نثار ہوتے تھے
نہ پوچھو ہم سے میاں مصحفی کہاں تھے تم
خراب پھرتے تھے گلیوں میں خوار ہوتے تھے

697

لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے — کون سے شہر میں ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے
اس کے کوچے میں ہے نت صورتِ بیدادنئی — قتل ہر خستہ باندازِ دگر ہوتا ہے
نہیں معلوم کہ ماتم ہے فلک پر کس کا — روز کیوں چاک گریبانِ سحر ہوتا ہے
وو ہیں اپنی بھی ہے باریک تراز مو، گردن — تیغ کے ساتھ یہاں ذکرِ کمر ہوتا ہے
کر کے میں یاد دل اپنے کو بہت روتا ہوں — جب کسی شخص کا دنیا سے سفر ہوتا ہے
اس کی مژگاں کا کوئی نام نہ لو کیا حاصل — میرا ان باتوں سے سوراخ، جگر ہوتا ہے
مصحفی ہم تو ترے ملنے کو آئے کئی بار
اے دِوانے تو، کسی وقت بھی گھر ہوتا ہے

698

کبھو پلکیں جی میں ڈبا[1] گئے کبھو انکھڑیوں کو لڑا گئے
غرض اس طرح ہی یہ خوبرو مجھے چاہ اپنی جتا[2] گئے

سحر آکے مجھ کو وے ناز سے چڑھی بھوں جو اپنی دکھا گئے
کہوں کیا کہ غصّے کی شکل سے مرے دل کو کیسے وہ بھا گئے

---

1 ڈبانا = ڈبونا۔ 2 ن ۳: دکھا گئے۔

ہے قدم قدم پہ نشانِ خوں، سر خار سارے ہیں لالہ گوں
کوئی مجھ سے پوچھے تو یوں کہوں کئی یاں سے آبلہ پا گئے

سرِ راہ باتیں وہ کرتے تھے کِسو ساتھ آنکھ ملا ملا
میں اچان چک[1] جوں ہی آ گیا مجھے دیکھ نظریں چرا گئے

رہے نقشِ پا کی طرح سے ہم چمنِ جہاں میں ہزار حیف
جو مثالِ بادِ وزیدہ تھے وے برنگِ موجِ ہوا گئے

کُھلے بندوں در پہ وہ بیٹھے تھے جوں ہی سامنے سے میں آ گیا
نہ بن آیا کچھ تو دوپٹے میں وو ہیں گات اپنی چھپا گئے

نہ چلے جنازے کے ساتھ وے مرے، دو قدم بھی تو ناز سے
یو ہیں کہنے سننے سے خلق کے ذرا ہاتھ آ کے لگا گئے

ٹک اسی بہانے سے دیکھیں ہم تمھیں اس میں کیا ہے بھلا بُرا
اگر آ کے کوٹھے پہ دھوپ میں کبھو سر کے بال سکھا گئے

گئے چھوڑ وادیٔ عشق میں مجھے ہم رہاں سبھی مصحفی
میں اکیلا روتا ہی رہ گیا کہ نہ ساتھ اپنے بلا گئے

699

غرض ان بے وفاؤں سے وفاداری تو مشکل ہے
نہ کیجے آپ بھی گر اپنی غم خواری تو مشکل ہے

بتنگ آئے ہیں ہم تھوڑی سی رنجش میں معاذاللہ
گر آئے درمیاں میں اور بیزاری تو مشکل ہے

تب غم کا علاج اے دل جو کچھ ہو تجھ سے کر ناوہ
وگرنہ ہو گئی مُزمن[2] یہ بیماری تو مشکل ہے

---

[1] اچان چک = اچانک۔ [2] مزمن = پرانی۔

ہجومِ جلوۂ خوباں کے ہم پامال ہیں، ہم سے — اب ایسے وقت میں دل کی خبرداری تو مشکل ہے
مرمت قصرِ تن کی کر کہ ہے ناموسِ[1] جاں اس میں — جو ناگہ ڈھے گئی یہ چار دیواری تو مشکل ہے
بہت ناصح نے ضبطِ گریہ وزاری کو فرمایا — کروں کیا آہ، ضبطِ گریہ زاری تو مشکل ہے
مداوا دیدۂ خوں بار کا اپنے بھی کچھ کیجے — اگر یوں ہی رہے ناسور سے جاری تو مشکل ہے

لگا بیٹھے ہو تم جی جان تک داؤں، محبت میں
یہ بازی بھی جو تم نے مصحفی ہاری تو مشکل ہے

700

تیرے سوا کسو کی تمنا نہ چاہیے — تو چاہے گر ہمیں تو میاں کیا نہ چاہیے
خوگر نہیں ہوئے ہو تماشے کے تم ابھی — ہر لحظہ تم کو آئینہ دیکھا نہ چاہیے
مجلس میں اپنی میری نگاہوں کو دیکھ کر — کہتا ہے: اس کے سامنے بیٹھا نہ چاہیے
پیچھے پڑے ہو تم جو بلا کی طرح، تمھیں — اتنا خیالِ عاشقِ رسوا نہ چاہیے
ہر گوشہ دیکھتے ہو کہ نرگس ہے دیدہ باز — بندِ قبا کو باغ میں کھولا نہ چاہیے
دل بن رہا ہے غم سے ترے جیسے آبلہ — کیا فائدہ ہے، بس اسے چھیڑا نہ چاہیے
اسبابِ زندگی جو میسّر ہو، تو دلا — سب چاہیے ہے زیست[2] کو کیا کیا نہ چاہیے
ساعد کی نازکی پہ یہ تیری ہے مجھ کو رحم — ہاتھوں میں تیرے پھولوں کا دستانہ چاہیے
غافل نہ آسماں کے تلے خواب گاہ کر — زیرِ پُلِ شکستہ تو سویا نہ چاہیے
کہتی ہے شرمِ عشق یہی نت مجھے کہ یار — گلیوں میں ڈاڑھیں مار کے رویا نہ چاہیے
آنے میں نو بہار کے کہتے ہیں دیر ہے — ہم کو بھی غش سے ہوش میں آیا نہ چاہیے

---

[1] ناموس = عزّت، مگر محاورے میں بیوی بچوں یا گھر کی خواتین کو بھی ناموس کہا جاتا ہے اور یہاں یہی تلازمہ ہے۔ [2] ن ۲: عیش کو۔

جس تازہ گُل میں ہووے نہ تیرے بدن کی بُو　　انصاف تو یہ ہے اُسے سونگھا نہ چاہیے

غصّے میں منہ تھتھائے[1] وہ بیٹھا ہے مصحفی
اب اُس سے ایسے وقت میں بولا چاہیے

701

وحشت اگر یہی ہے تو صحرا کو جائیں گے　　صحرا کے وحشیوں سے دل اپنا لگائیں گے

صورت سے تو ہماری خفا ہے، تو لے چلے　　پھر آ کے تجھ کو اپنی نہ صورت دکھائیں گے

ان خوش قدوں کے ہاتھ سے جاؤں کہاں نکل　　یہ چال ہے تو مجھ پہ قیامت یہ لائیں گے

مانگی ہزار بار دُعا پر نہ کچھ ہوا　　ناچار اب دُعا ہی سے ہم ہاتھ اٹھائیں گے

محرابِ تیغ یار ہوئی جلوہ گر تو ہم　　سجدے میں سب سے آگے سر اپنا جھکائیں گے

آنکھیں برنگِ آئینہ اس دم تو خشک ہیں　　گر تر ہوئیں، تو ان سے ہی دریا بہائیں گے

کل ایک نے کہا کہ میاں مصحفی، یہ بات قطعہ کہتے تھے اب کی اس کی جو مجلس میں آئیں گے

پھونکیں گے اس کے کان میں کچھ اور ہی فسوں　　اور اس بہانے زلف کا بوسہ اڑائیں گے

کہنے لگا وہ شوخ ''کچھ ان دنوں کے بیچ
وے بے ادب ہوئے ہیں بہت مار کھائیں گے''

702

چمن کے بیچ ہے اب تو بہار عبّاسی[2]　　نگہ سے کیجیے بوس و کنار عبّاسی

اُگا ہے خاک سے شاید بہ طالعِ عاشق　　کہ رنگِ زر سے ہے مانا عذار عبّاسی

سپید و سرخ نظر آتے ہیں گل اس کے مجھے　　ہیں پھول سیم و طلا کے نثار عبّاسی

---

[1] منہ تھتھانا = ناراض ہونا، کبیدہ ہونا۔　　[2] عبّاسی = ایک پھول کا نام۔

گلابی رنگ کی میں اس کے کیا کروں تعریف ہے میری آنکھوں میں اب تک خمارِ عبا سی
چمن ہے تختۂ نقاش کی سراسر شکل ولے ہوا ہوں میں اس میں دو چار عبا سی
بنا ہے ان سے زبس تختۂ چمن گل دام[1] ہوا ہے مرغِ دل اپنا شکار عبا سی
گنے وہ کیوں کے بھلا داغ میرے سینے کے نہ کی ہو باغ میں جس نے شمار عبا سی[2]
بہارِ لالۂ خونیں کی خوش نہیں آتی ہوا ہے جب سے مرا دل فگار عبا سی

فقط نہ اس نے کیا شیخ مصحفی کا خوں
ہے سیّدوں کی بھی قاتل بہار عبا سی

703

دردمندِ دوست بے آہ و فغاں کیوں کر رہے عشق ہے یہ، تو چھپائے سے نہاں کیوں کر رہے
جوشِ گل سے سا کنانِ باغ پر ہے عرصہ تنگ دیکھیے بلبل کا اس میں آشیاں کیوں کر رہے
یوں بھی ہوتی ہے اُسے تو ہائے بے چینی زیاد ایک ہی کروٹ یہ جسمِ ناتواں کیوں کر رہے
کیا بلا در پیش آئی اُن کو ایسی، کیا ہوا پیچھے اس منزل میں میرے ہم رہاں کیوں کر رہے
وصل کی شب ہے، نہیں تدبیر بن آتی کچھ آہ کیا کروں گردش سے اس شب آسماں کیوں کر رہے
اک نگہ میں صبر و طاقت کا ہوا خانہ خراب دل مرے کہنے میں اب اے دوستاں کیوں کر رہے
میں تو زنداں میں پھنسا، اے جانِ عاشق یہ کہو بارے تم کرنے سے سیرِ گلستاں کیوں کر رہے
جب کترنی[3] سی چلے اس کی زباں ہر بات میں منہ میں مجھ کم بخت کے، یارو زباں کیوں کر رہے
خلق نے میری طرف سے اس کو کچھ کچھ ہے کہا پاس میرے رات کو وہ بدگماں کیوں کر رہے

عشق کا گھوڑا نپٹ منہ زور ہے، اے مصحفی
عشق میں میرے بھلا اس کی عناں کیوں کر رہے

1۔ جال کی ایک وضع جسے اوپر پھولوں سے ڈھک دیا جاتا ہے۔ 2۔ شمار مؤنث۔ 3۔ کترنی = مقراض، قینچی

704

مگر کہ جذب کی طاقت گئی گریباں سے — کہ اشک گذرے ہے مانندِ چاک داماں سے
زمینِ جادہ جو ہے رشکِ کہکشاں، یارب — گیا ہے گریہ کناں کون اس بیاباں سے
ادائے شکر کروں کیا میں تیرے تیروں کا — کہ چاکِ دل کو مرے سی دیا ہے پیکاں سے
نظر تو کیجیو کن شوخیوں سے رنگِ کفک — کرے ہے جلوہ گری اس کے طرفِ داماں سے
خبر تو لیجو کوئی خستہ مرگیا تو نہ ہو — کہ آج آتی ہے آوازِ نوحہ زنداں سے
یہ کیا سلوک کیا تو نے مجھ سے دستِ جنوں — کہ سی دیا مرا دامن مرے گریباں سے
سراغِ قافلۂ اشک کیجیے کیوں کر — گیا ہے دوٗر نکل وہ دیارِ حرماں سے
زبس میں آنکھوں پہ دھر دھر کے ہاتھ روتا ہوں — ہیں آستینوں کے حلقے دیارِ طوفاں سے
نمک کو چھڑکے ہے وہ زخم پر مرے کم کم — مزہ ہو جب کہ نمک گر پڑے نمکداں سے
ذرا تو دیکھیو اُس طفلِ نازنیں کی بہار — بغل پھول لیے آئے ہے گلستاں سے
ہوا نہ گریے سے کم سوزِ سینۂ میرا بلک[1] — یہ آگ اور بھی بھڑکی ہوائے باراں سے
بغیر قیس کے یاں تک یہ دشت سونا ہے — کہ وحشت آتی ہے اک سایۂ مغیلاں سے

یہ کس کے شوق میں اے مصحفی تو روتا ہے
لہو چوئے ہے جو یوں تیری چشمِ گریاں سے

705

گڑے ہیں کشتۂ الفت جہاں زمیں کے تلے — بنے ہیں خون سے واں گلستاں زمیں کے تلے
ذرا تو گورِ غریباں میں رکھ سمجھ کے قدم — کہ ہر قدم پہ ہے یاں آستاں زمیں کے تلے
اس آسماں سے دل اپنا[2] تنگ آیا ہے — بنا دیں گے کوئی اور آسماں زمیں کے تلے

---

[1] اصل = بلکہ مرا۔ [2] ن۳: اب دل تنگ آیا ہے۔

زمیں کے پردے نہ ہوں کس طرح سے چادرِ نور ہوئے ہیں چاند کے ٹکڑے نہاں زمیں کے تلے
گیا میں لے کے جو داغِ فراق سیم براں[1] جلا کریں گے مرے استخواں زمیں کے تلے
مسافرانِ عدم کی خبر نہ پوچھو کچھ کہ گم ہوئے ہیں بہت کارواں زمیں کے تلے
جو دیکھا کھول کے میں مصحفی کی تربت کو
گڑے ہوئے تھے کئی استخواں زمیں کے تلے

706

اگر بتوں کی تمنا سے دل مرا پھر جائے تو وہیں شعر و سخن کا مرے مزا پھر جائے
قبول ہوتی ہے زاری، نہ ہے دُعا میں اثر میں ہوں وہ بندہ کہ جس بندے سے خدا پھر جائے
جو دیکھتا ہے مرا حالِ زار کہتا ہے خدا کرے کہ کہیں اس سے دل مرا پھر جائے
بھلا رکھے کوئی بیگانے سے توقع کیا جب آشنا ہی سے بے ہیچ آشنا پھر جائے
عجب نہیں جو تری خو کے ڈر سے اے ظالم زباں پر آ کے مری حرفِ مدُعا پھر جائے
بغیر خشت نہ ہو ہم کو تاجِ زر روزی ہمارے سر پہ اگر سایۂ ہُما پھر جائے
کیا ہے بند خدا نے درِ اجابت کو کہ تا پٹک کے سر اپنا مری دُعا پھر جائے
اگر میں رونے پہ آؤں برنگِ ابرِ بہار ابھی زمانے کی اے دوستو ہوا پھر جائے
پڑا ہے اس طرح اُس زلفِ تابدار میں پیچ کہ جس طرح کوئی نٹ کھاتے ہی کلا[2] پھر جائے
ہمارے دل کو مشبک[3] ہی پھر تو دیکھے خلق گر اس طرف تری مژگاں کا رخ ذرا پھر جائے
بکو ہو شیخ جی تم آج کتنا بے ہودہ مجھے یہ ڈر ہے کہیں سر نہ آپ کا پھر جائے
تری ہی راہ میں بنوادیں گے مزار اپنی ہماری خاک پہ شاید قدم ترا پھر جائے

---

[1] ن۲: سیم تناں۔ [2] کلا = قلا، نٹ کا قلا بازی کھانا۔
[3] مشبک = چھید کیا ہوا۔ جال کی طرح سوراخوں والا۔

خدا خدا بھی کہا میں تو کچھ نہیں ہوتا — ہزار حیف کہ بندے سے یوں خدا پھر جائے

پکارتا ہے تجھے مصحفی جواب تو دے
کھڑا رہے یہ ترے آستاں پہ یا پھر جائے

707

قفس میں مرغِ گرفتار کیوں پھڑکتا ہے — خبر تو لو کوئی کیا اُس کا دل دھڑکتا ہے

نہ میری آگ پہ دامن جھپک صبا ورنہ — اس آگ سے ابھی شعلہ کوئی بھڑکتا ہے

کہو نہ ابر کو[1] دل کھول کر ذرا برسے — یہ میری خاک پہ پانی سا کیا چھڑکتا ہے

کدھر چلا ہے کھڑا رہ' ذرا تماشا دیکھ — ابھی تو خاک پہ بسمل ترا پھڑکتا ہے

میں اس کی نظروں میں اتنا ہوا ہوں خوار و ذلیل — کہ بات بات پہ میرے تئیں جھڑکتا ہے

ملوں میں مصحفی اُس خانہ جنگ[2] سے کیوں کر
کہ اُس کے ملنے سے اپنا تو جی دھڑکتا ہے

708

واں کب سے ذقن اس نے زلفوں میں چھپالی ہے — جی دیتے ہیں ہم ناحق' یہ چاہ نرالی ہے

پھولوں کی چھڑی جس کے ہاتھوں سے نہ اٹھتی تھی — اب نامِ خدا اس نے تلوار سنبھالی ہے

مجلس میں کوئی اس کی کیا جاوے کہ اب واں تو — ہر حرف میں جھڑکی ہے ہر بات میں گالی ہے

وہ حُسن و صفا اے بُت تجھ میں ہے' کہ صانع نے — تصویر تری گویا اب سانچے میں ڈھالی ہے

تیغِ خمِ ابرو کا دیتا ہے نشاں سب کو — سینے میں مرے یارو' جو زخم ہلالی ہے

ہر گام پر اک ٹھوکر لگتی ہے مرے دل کو — ان روزوں نئی اس نے کچھ چال نکالی ہے

---

[1] یعنی کوئی ابر سے کہو، نا۔ [2] خانہ جنگ = شورہ پشت، لڑائی جھگڑا کرنے والا۔

کب پیک کا رنگ[1] ایسا ہوتا ہے خبر تو لے　　دامن پہ ترے ظالم لوہو کی سی لالی ہے

کس طرح کوئی جھانکے، دیوارِ فلک میں تو　　رخنہ ہے نہ روزن ہے، غرفہ ہے نہ جالی ہے

نت لختِ جگر کا ہے ازبس کہ ہجوم ان پر　　ہر مدِّ نگہ میری پھولوں کی سی ڈالی ہے

کیا جانے گیا ہوں میں آغوش میں کس گل کی　　آغوش مری مجھ سے اس رات تو خالی ہے[2]

کرتا ہوں رقم کس کے وصفِ کمرِ نازک
اے مصحفی جو میرا ہر شعر خیالی ہے

709

زلف اگر دل کو پھنسا رکھتی ہے　　آنکھ پردوں میں چھپا رکھتی ہے

ساتھ فہمیدگی گر ہووے تو پھر　　بت پرستی بھی مزا رکھتی ہے

چہچہا[3] رنگ مرے خون کا سا　　ترے پاؤں کی حنا رکھتی ہے

آرسی ہوتی ہے سنمکھ[4] تیرے　　کچھ بھی آنکھوں میں حیا رکھتی ہے

کردیا اس نے تو مجھ کو مدہوش　　کس کی بُو بادِ صبا رکھتی ہے

خاکِ دہلی کی ذرا سیر تو کر　　کہ عجب آب و ہوا رکھتی ہے

ہائے تیکھی نگہ اس کافر کی　　کیا کہوں میں جو ادا رکھتی ہے

تیری تصویر کو لے کر شیریں　　اپنی چھاتی سے لگا رکھتی ہے

بارے اس باغ میں کیا دیکھا ہے　　نرگس آنکھوں کو جو وا رکھتی ہے

جب تلک آوے ہے تو پھر کے، یہ چال　　خاک میں مجھ کو ملا رکھتی ہے

---

1. پیک = بروزن بھیک، پان چبانے سے پیدا ہونے والا لعاب دہن۔
2. جگر مرادآبادی: مل کے جس دن سے گیا ہے کوئی اک بار جگر　　مجھ کو یہ لگتا ہے جیسے مرا آغوش نہیں
3. چہچہا = شوخ، گہرا سرخ۔　4. سنمکھ = مقابل، روبرو۔

آرسی سے نہ کرو، کج نظری — اس کا تم سے وہ گلا رکھتی ہے
آہ میری ہے اثر سے ہم دوش — طالعِ زلفِ رسا رکھتی ہے
کیا ہے تقصیر جو ہم کو تجھ سے — گردشِ چرخ جدا رکھتی ہے
جھک[1] پڑے ہے، تیری پابوسی کا — زلف بھی شوقِ بلا رکھتی ہے
گوشت اور پوست بھی گل جاتا ہے قطعہ — جسم کے بیچ یہ کیا رکھتی ہے

مصحفی نام ہے جس چیز کا چاہ
آدمی کو تو کھپا[2] رکھتی ہے

710

فندق کہیں بندھی ہے کہیں ہے حنا لگی — بے طرح ہاتھ یار کے طرزِ جفا لگی
نازک ہے میرا شیشۂ دل اس قدر کہ بس — مثلِ حباب پھوٹ گیا گر ہوا لگی
جوں سایہ لگ چلا میں تو وہ مجھ کو دیکھ کر — بولا یہ میرے پیچھے کہاں کی بلا لگی
کیوں نیچی نظریں کرلیں، میاں یہ تو تو بتا — آئینہ دیکھتے ہی تجھے کیا حیا لگی

پھرتا ہے تو، جو گلیوں کے اندر خراب و خوار
اے مصحفی یہ کس کی تجھے بددُعا لگی

☆☆☆☆☆

---

[1] یعنی جھکی پڑے ہے۔ [2] کھپا رکھتی ہے= ختم کردیتی ہے۔

مسدّس

ترکیب بند

اے کہ ہم بزمیِ اغیار خوش آئی ہے تجھے　　کیا کسی نے کوئی ترکیب دکھائی ہے تجھے
صلح غیروں سے، مرے ساتھ لڑائی تجھے　　وضع کس شوخ طرح دار کی بھائی ہے تجھے
ان دنوں تجھ کو مشوّش میں بہت پاتا ہوں
بکھرے بالوں کو ترے دیکھ کے گھبراتا ہوں

کیا کسی سے تجھے ناورد[1] ہے، کیوں خیر تو ہے　　پھول سا چہرہ ترا زرد ہے کیوں، خیر تو ہے
اور دمِ گرم ترا سرد ہے، کیوں خیر تو ہے　　سچ تو بتلا تجھے کا درد ہے، کیوں خیر تو ہے
اشک آنکھوں سے تری ہیں یہ رواں کس کے لیے
اپنا منھ دیکھ تو روتا ہے میاں کس کے لیے

بعضے کہتے ہیں کہ آسیب پری ہے تجھ کو　　بعضے کہتے ہیں پریشاں نظری ہے تجھ کو
بعضے کہتے ہیں کہ دردِ جگری ہے تجھ کو　　بعضے کہتے ہیں زخود بے خبری ہے تجھ کو
تہمتیں چند، میاں تجھ کو لگا چاہتی ہیں
تیری آنکھیں تری پلکوں کا بُرا چاہتی ہیں

---

[1] ناوُرد = ناگوار بات۔

اشک آنکھوں سے تری نت جگری نکلے ہے ساتھ اس اشک کے پھر خوں بھی ذری نکلے ہے
گھر سے تو' بال کھلے جیسے پری نکلے ہے وضع سے اک تری شوریدہ سری نکلے ہے
میں نہ مانوں گا ہوا ہے تو کسی پر عاشق
آرسی ہاتھ میں لے' ہے نہ اسی پر عاشق

رنگ چہرے کا ترے زرد ہے اے غیرتِ ماہ مجھ کو بتلا تو ترا کون ہے ایسا دل خواہ
کر گئی دل میں اثر تیرے یہ کس بت کی چاہ حسرت آگیں نظر آتی ہے مجھے تیری نگاہ
کوفت دل کی ترے چہرے سے عیاں ہوتی ہے
چاہ بھی چیز ہے ایسی کہ نہاں ہوتی ہے

پر تعجب ہے یہ مجھ کو بہ ایں کاہشِ غم نہیں رتبے سے گرا حسن کا تیرے عالم
اک کھلے بالوں سے تو نکلے ہے وضعِ ماتم ورنہ آنسو ترے عارض پہ ہیں گل پر شبنم
جس سے دونی نظر آتی ہے نزاکت کی بہار
گل نے پائی ہے کہاں ایسی لطافت کی بہار

پھول گل کھاتے ہیں اب تک تری رعنائی پر آنکھیں تاروں کی پڑی ہیں تری زیبائی پر
وہی عالم ہے ترے حسن کی سرسائی[1] پر تو نے باندھی ہے کمر کس لیے رسوائی پر
نام چاہت کا جو ہر دم تو' لیا کرتا ہے
اور دن رات یہی ذکر کیا کرتا ہے

وہی چشمک ہے' وہی جھانوے[2] کی ویسی ہی نگاہ وہی منہ پھیر کے چلنا' وہی ہر بات پہ واہ
وہی انداز قدم کا' وہی رنگینیِ راہ وہی دامن کی درازی' وہی ٹھوکر کا نباہ
دیکھ سب زیر و زبر جس کو ہوئے جاتے ہیں
مردے جی اٹھتے ہیں اور زندے موئے جاتے ہیں

---

[1] سرسائی = [2] جھانوے =

آستینوں کی تری مُہریاں[1] ویسی ہی تنگ   وہی چولی کی مسک اور وہی پنڈے کا رنگ
وہی تن شیشے سا نازک، وہی دل سختی میں سنگ   وہی مکھڑے کی صفا جیسے کہ تصویرِ فرنگ

اس پہ بھی قدر کو اپنی تو، نہ جانے تو نہ جان
عاشقی خوب نہیں، تجھ کو کہا، میری جان

گو تو، ظاہر میں، زباں پر نہیں لاتا یہ راز   پر کہے دیتے ہیں سب مجھ کو یہ تیرے انداز
کون اس کام میں ایسا ہوا تیرا انبار   جس کے اغوا سے تو شاہد سے ہوا شاہد باز

آنکھ تیری بھی لگی حسن و نمک پر پڑنے
تو بھی لچّوں[2] سے لگا تیغ پکڑ کر لڑنے

خانہ جنگی کی اگر وضع خوش آئی تجھ کو   روے خوش پر نہیں زیبندہ لڑائی تجھ کو
ورنہ دو کھے گی کھڑی ہو کے خدائی تجھ کو   کوئی دینے کا نہیں اس میں بھلائی تجھ کو

شہر کے لوگ بُرا تجھ کو کہیں گے سارے
مان کہنے کو مرے بہرِ خدا، باز آرے

حق میں تیرے نہیں یہ خیرہ[3] سری ہرگز خوب   کیوں کہ ہے جان مری تو ابھی آپھی محبوب
عشق بازی کا یہ ہرگز نہیں ہوتا اسلوب   نیک و بد جانتے ہیں اس کے تئیں سب معیوب

کون کہتا ہے نظر باندھنی کیجے موقوف
اک ذرا تیغ و سپر باندھنی کیجے موقوف

اور بھی لوگ ہیں دنیا میں میاں حسن پرست   حوصلہ تم نے کہاں سے یہ نکالا یک دست[4]
ہاتھ میں تیغ لیے پھرتے ہو جیسے بدمست   مجھ کو یہ ڈر ہے کہیں آپ پہ آوے نہ شکست

---

[1] مُہریاں = کف۔ [2] لچّا کی جمع باضافہ واؤ نون۔ آوارہ گرد، بدقماش، بانکے۔
[3] خیرہ سری = شوریدہ سری۔ [4] یک دست = اچانک۔

کیوں کہ دلّی ہے یہاں سیکڑوں خوں ہوتے ہیں
خانہ جنگوں کے علم جلد نگوں ہوتے ہیں
عاشقی شیوۂ خوبانِ خوش اندام نہیں   عاشقی سے کوئی معشوق تو بدنام نہیں
تو دل آرام ہے، کیا اور دل آرام نہیں   مصحفی کے تئیں پر اس سے بھی کچھ کام نہیں
یہ سخن محض بھلائی کو تری کہتا ہے
اور جو اس میں بھی بُرا مانے تو چپ رہتا ہے

(۱۴ بند)

مخمس

پروانہ اور شمع میں چاہت نہیں رہی بلبل سے گل کی گرمئ صحبت نہیں رہی
مجنوں کے ساتھ لیلیٰ کی سنگت[1] نہیں رہی دنیا میں دل کو دل سے محبت نہیں رہی
ہرگز کہیں دو شخص میں الفت نہیں رہی

سینے سے بہ گیا ہے یہ دل آب ہو کے سب دیکھوں تو میں جگر میں بھی باقی رہی ہے کب
جُثّہ[2] تھا جب تلک، میں اُٹھاتا تھا نہ تعب اے دیدہ زار زار نہ رو اس قدر کہ اب
مجھ کو بھی گریہ کرنے کی طاقت نہیں رہی

بعد از ہزار سعی کہ ہمت دلیل ہو بالفرض ملنے کی بھی گر اس سے سبیل ہو
جاؤں نہ میں فرشتہ مرا گر کفیل ہو مجلس میں اس کی جا کے کوئی کیا ذلیل ہو
ہرگز موافق اپنے وہ صحبت نہیں رہی

صفحے سے دل کے حرفِ طمع کو اٹھایئے اہلِ دُوَل سے ملنے کو ہرگز نہ جایئے
بہتر تو یوں ہے حالِ بد اپنا چھپایئے کیا جا کے اب کسی کے تئیں منھ دکھایئے
وقتے کہ وہ زمانے کی صورت نہیں رہی

---

1 سنگت = رفاقت۔ 2 جثہ = جسم، لیکن بولی میں جسمانی طاقت کے لیے آتا ہے۔

مشہور ہے جہاں میں تو، زور آور اس قدر　　ہاتھوں سے تیرے سیکڑوں ظالم گئے ہیں مر
کیا فائدہ جو ہووے مری جان کا ضرر　　اے غم فشارِ دل میں نہ اتنی بھی سعی کر
جانے بھی دے کچھ اس میں تو حالت نہیں رہی

لائی قضا شکنجِ اسیری میں جب ہمیں　　مشقِ طپش میں ان نے رکھا روز و شب ہمیں
گو ذبح ہوویں وہ حس و حرکت ہے کب ہمیں　　پھڑکے ہیں زیرِ دام ہم اتنے کہ اب ہمیں
خنجر تلے تڑپنے کی حسرت نہیں رہی

اس شرمگیں کی بزم میں گر اب کی آیئے　　اپنی بھی شرم کو نہ تو، اس کو دکھایئے
دیکھے بھی وہ تو آپ نہ سر کو اٹھایئے　　کیا فائدہ ہے اس سے گر آنکھیں ملایئے
آنکھوں میں اس کی کچھ بھی مروّت نہیں رہی

واں گر کے ریزہ ریزہ ہو پھوٹی ہے آرسی　　ہیبت نے اس کی سنگ سے کوٹی ہے آرسی
خادم کا ہاتھ کانپا ہے پھوٹی ہے آرسی　　آتے ہی اس کے سامنے ٹوٹی ہے آرسی
ہرگز نظر سے اس کی سلامت نہیں رہی

ظاہر کی دوستی ہی رہی گو ہمارے ساتھ　　اور نت ہم اس کے ساتھ پھریں وہ ہمارے ساتھ
پر یہ نہیں کہ گرمِ وفا ہو ہمارے ساتھ　　اتنا رمیدہ خو ہے کہ اس کو ہمارے ساتھ
الفت تو اک طرف، کہ خصومت نہیں رہی

بازی نہ کھائیو کہیں ان سے تو وہ سیاہ　　آتے ہیں پیش بے ادبانہ یہ کج کلاہ
ہر چند ہوویں چہرے میں مانندِ مہر و ماہ　　اے مصحفی نہ کیجے سوئے کودکاں نگاہ
اس کام میں بزرگوں کی حرمت نہیں رہی

مخمس

ترکیب بند

(برغزل آصفی)

جب سے ہوا ہے مجھ سے وہ پیماں شکن جدا　　آتش میں تن جلے ہے جدا اور من جدا
ہووے کسو طرح سے یہ رنج و محن جدا　　''صورت گراں ہلاکم ازان سیم تن جدا
سازید صورتے کہ بنا شدزمن جدا''

ہرگز غمِ معاش سے رکھتا نہیں میں درد　　فکرِ معاد نے نہ کیا رنگِ چہرہ زرد
جورِ بتاں سے بھی نہیں بھرتا میں آہِ سرد　　''دارم زلالہ زارِ جہان داغہا کہ کرد
یعقوب راز یوسفِ گل پیرہن جدا''

ہے بس کہ میری جان مجھے تجھ سے اتحاد　　تیرے سوا کسی کی نہیں میرے دل میں یاد
جب تک کہ میں ہوں اور ہے تو ہے یہی مراد　　''دور از رخت مباد مرا دیدہ بلکہ باد
مردم زدیدہ' دیدہ زسر' سر زتن جدا''

جس وقت تیرے چہرے پہ کرتا ہوں میں نظر　　ہوتا ہے اشتباہ مجھے دل میں بیش تر
بہر خدا تو میرے تئیں اس سے دے خبر　　''خال است زیرِ چشم سیاہت زمشک تر
یا نافہ شد زنافِ غزالِ ختن جدا''

کی زندگی میں تجھ سے وفا میں نے گلبدن ایسی کہ گل سے کر نہ سکے بلبل چمن
مرنے کے بعد بھی جو مرا خاک ہوگا تن ''پیوند نگسلد زسگت استخوانِ من
روزیکہ بند بند شود از کفن جدا''

ہردم ترا ست برہمہ یاران ترحمی گاہے بخویش و گہہ بہ عزیزان ترحمی
گاہے بہ مصحفی غزل خوان ترحمی ''داری بحالِ زارِ غریباں ترحمی
جز آصفی کہ بہر تو شداز وطن جدا''

☆☆☆☆

رُباعیات

....1....

جو اشک ان آنکھوں سے جدا ہوتا ہے　　مژگاں تلک آیا کہ فنا ہوتا ہے
نظروں سے گرے نہ کوئی کسی کی یارب　　نظروں سے گرا بہت برا ہوتا ہے

....2....

درد و غمِ یار جی کا جی ہی میں رہا　　اُس گل سے یہ خار، جی کا جی ہی میں رہا
روئے تو بہت سے ہم ولیکن افسوس　　نکلا نہ غبار جی کا، جی ہی میں رہا

....3....

جو اچھے ہیں رکھتے ہیں سبھی منھ پہ نقاب　　آنکھوں میں ہر اک بشر کی ہوتا ہے حجاب
اے خانہ خراب لیکن انصاف تو کر　　اتنا بھی کوئی کسی کو کرتا ہے خراب

....4....

کر کے اس در پہ آہ و نالے کتنے　　مر مر گئے ہم سے مرنے والے کتنے
اچھی طرح اُس نے منھ دکھایا کس کو　　ترسا ترسا کے مار ڈالے کتنے

....5....

دل شغل میں نالے کے تو کیوں رہتا ہے　　اور اشک ہو آنکھوں سے تو کیوں بہتا ہے
اپنا تو جی آیا ترے ہاتھوں سے بتنگ　　اے خانہ خراب کہہ لے کیا کہتا ہے

....6....

در ذکر محبوبہ خود

اے کاش نہ ہم ایسی محبت کرتے　　اور کرتے تو کچھ تو صبر و طاقت کرتے
گر ہے یہی بے کلی تو اک دن یارب　　مرجاویں گے یوں ہیں "عصمت عصمت" کرتے

....7....

ہے جی میں مقیمِ کنجِ عزلت ہوویں　　رو رو کے یہ داغ اپنے دل کے دھوویں
کیا فائدہ نت کی ہرزہ گردی سے بھلا　　دنیا تو گئی ہے، دیں کو پھر کیوں کھوویں

....8....

در مذمّت عصمت

ہے حیف تو یہ کہ باجمالے چوں حور　　عصمت اور ہووے مائلِ فسق و فجور
یہ وہ ہے مثل کہ مصحفی کہتے ہیں　　"برعکس نہند نامِ زنگی کافور"

....9....

ٹوٹا ہے پڑا ایک طرف پیمانہ　　لوٹے ہے کوئی ایک طرف مستانہ
نے ذکر ہے یاں نماز، نے روزے کا　　مسجد نہ ہوئی ہوا یہ قہوہ خانہ

....10....

بہ تقریبِ غسلِ صحت

تب سے ہوئی بندگانِ عالی کو شفا　　ہے دل میں سرور یاں ہر اک کے پیدا
ہاں وقت ہے خرّمی کا اور عہدِ طرب　　بھر بادۂ ناب سے تو، ساقی مینا

....11....

وہ شوخ ابھی تو مجھ سے رم کرتا ہے　　جوں چاہیے اختلاط کم کرتا ہے
اتنا تو ستم نہیں، نہ ملنا اُس کا　　غیروں سے ملے ہے یہ ستم کرتا ہے

....12....

جس دم وہ بہ قصدِ دل ربائی آوے — کچھ کام نہ زہد و پارسائی آوے
گو دین سے اپنے ایک عالم پھر جائے — وہ بت نہ پھرے اگر خدائی آوے

....13....

اے دل تو رہے گا کہہ شرابی کب تک — جوں غنچہ بغل بیچ گلابی کب تک
اب ہو ہے بنائے عمر کوئی دم میں خراب — اے خانہ خراب یہ خرابی کب تک

....14....

مارے تبِ غم کے میں گلا جاتا ہوں — اس داغِ جگر سے سب جلا جاتا ہوں
موقوف بہ حسن نہیں ہے جانا میرا — جوں شمع کھڑا ہوں اور چلا جاتا ہوں

....15....

افسوس کہ دل کی بے قراری نہ گئی — فریاد و فغان و آہ و زاری نہ گئی
وہ کون سا روز ہے کہ تجھ بن جوں شمع — روتے ہوئے مجھ کو رات ساری نہ گئی

....16....

ہر چند کہ وہ ہو کے خفا جاتا ہے — اس بن کوئی عاشق سے رہا جاتا ہے
دل بستگی ہے دل کو زبس اس سے کمال — وہ جھڑکے ہے، یہ ساتھ لگا جاتا ہے

....17....

کا درک کرے مدرکۂ انسانی — جوں آئینہ لازم ہو جسے حیرانی
سب دیکھا بہ چشمِ دل با ایں ہمہ دید — سوجھا نہ وہ وائے غفلت و نادانی

....18....

اے عشق کہیں آگ لگا دے مجھ کو — میں ہیزمِ خشک ہوں جلا دے مجھ کو
لے جل کے میں خاک بھی ہوا آپھی آپ — اب دیر نہ کر اس میں، اڑا دے مجھ کو

....19....

در مدح میر نعیم خاں

اس سال کہ پھر عیدِ سعید آئی ہے — تیرے لیے پیغامِ خوشی لائی ہے
کر میر نعیم خان تو عیش و عشرت — جب تک کہ ترا جلوسِ اُمرائی ہے[1]

....20....

میں دردِ دل اپنا جو ہیش اظہار کیا — پھر نام دوا کا نہ طبیبوں نے لیا
عیسٰی کی بھی کر چکا میں کتنی منت — اس نے بھی مجھے جوابِ شافی نہ دیا

....21....

وہ سیرِ نظارۂ در و بام کہاں — وہ وعدۂ صبح، وہ گرمیِ شام کہاں
وہ زیرِ لب خندہ[2] و دشنام کہاں — دل کس سے لگائیے، دل آرام کہاں

....22....

دنیا پردپوچ[3] محض مفہوم ہوئی — خاطر یہاں آکے سخت مغموم ہوئی
بندے سے نہ کیجے اب خدا کا شکوہ — بس آپ کی کائنات معلوم ہوئی

....23....

جو دم ہے سو دیدا اس جہاں کا کیجے — اندیشہ نہ کچھ سود و زیاں کا کیجے
کچھ واں بھی کیا تھا فکر یاں آنے کا — پس کا ہے کو یاں بھی فکر واں کا کیجے

....24....

گو آٹھ پہر سامنے نظروں کے رہو — یوں کوئی کسی حسین کو تک تو سکو
کیا آنکھ میں اس کی رہی ہے آنکھ گڑ دے[4] — اس آرسی کا تو دھویا[5] دیدہ، دیکھو

---

[1] اُمرائی = بروزن پُروائی، امیری کی بگڑی ہوئی عامیانہ شکل۔ بہ معنی امارت۔ (امیر کی جمع اُمراء سے منسوب)
[2] اضافت توصیفی مقلوب ہو گی یعنی خندہ و دشنامِ زیرلب۔ [3] پردپوچ = لغو، مہمل۔
[4] آنکھ گڑونا = غور سے دیکھنا، آنکھ ملانا۔ [5] دھویا دیدہ = حیا سے خالی آنکھیں۔

....25....

نے شکوۂ دورِ آسمانی کیجے نے ذکرِ شہانِ باستانی[1] کیجے
اے مصحفی اب تو اس زمانے کے بیچ جس طرح سے ہووے زندگانی کیجے

....26....

درمدح نوروز

نوروز عجب سالِ سعید آیا ہے نوروز نہیں یہ روزِ عید آیا ہے
بادام سے کر شگن تو اوّل یعنی[2] بادام کے رنگ یہ پدید آیا ہے

....27....

درمدح نوروز

ہے برجِ حمل آئینہ دارِ نو روز خورشید شَرف میں ہے دو چار نو روز
لے آئینہ تو بھی ہاتھ میں تا کہ تجھے آنکھوں سے نظر آئے بہار نوروز

....28....

درمذمت شہر لکھنؤ

یارب شہر اپنا یوں چھڑایا تونے ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تونے
میں اور کہاں یہ لکھنؤ کی خلقت اے وائے یہ کیا کیا خدایا تو نے

...29...

درمدح شاہزادہ جوان بخت جہاندار شاہ

یارب! تری بزم رشکِ گلزار رہے اور بختِ جواں سدا ترا یار رہے
ہے مصحفی غریب کی نیت یہ دُعا جب تک کہ جہاں رہے جہاندار رہے

---

[1] باستانی = گذرے ہوئے

[2] شگن کرنا = فصل یا سال کے آغاز میں کوئی چیز چکھنا یا کھانا۔ جس سے تمام سال یمن و برکت حاصل رہے۔

......30......

اس طرح سے رو کہ دل کو تسکیں ہووے گو دامن و آستیں نہ تزئیں ہووے
اے دیدہ لہو کی تہ نہ آنسو میں ملا ہیرے کا عیب ہے جو رنگیں ہووے

☆☆☆☆

مثنوی

در ہجو پسر حجّام

زبس آئینہ رو ہے طفلِ حجّام نہیں بن دیکھے اس کے جی کو آرام
وہ گرچہ عاشقوں کا ہے کلیجا پہ سر سہلائے کے کھاتا ہے بھیجا[1]
اُسے ہر اک نے بالادست پایا تبھی تو اس کے آگے سر[2] نوایا
نہیں آئینہ ہی با چشمِ نمناک ہے شانے کا بھی دل اس ہاتھ سے چاک
جو دیکھے انگلیاں وہ گوری گوری بنے خورشید پانی کی کٹوری[3]
ہے اس کے ہاتھ سے ہر ایک مفتوں برنگِ شیشۂ حجّام دل خوں

---

[1] سر سہلا کے بھیجا کھانا = میٹھے انداز سے کام تمام کرنا۔ [2] نوانا = بکسر اول بروزن گرانا، بہ معنی جھکانا۔ [3] اس مثنوی میں حجام کی کسبت کے سارے لوازم بیان ہوگئے ہیں، دیکھیے: آئینہ، سر سہلانا، بالادستی، سر جھکانا، شانہ، انگلیاں، پانی کی کٹوری، نہرنی (ناخن کاٹنے کا اوزار)۔ کسبت، استرہ، مقراض، زنبور تسمہ، سنگ (پتھر جس پر استرے کی دھار سیدھی کرتے ہیں)۔

نہرنی لے کے جب وہ پاس آوے	مِہ نَو بدر ناخن سے بناوے
حجامت اس سے بنواوے جو شائق	کرے یک بارگی ترکِ علائق
نہیں محتاج کسبت کا وہ لڑکا	ہے اس کے پاس سب ساماں مہیّا
بہ شکلِ استرا ہے تیغِ ابرو	نہیں کچھ فرق اس میں یک سِر مُو
بہ چشم و دیدۂ باریک بیناں	کٹوری چشم ہے اور شانہ مژگاں
حقِ عاشق میں بہر قطعِ اعراض	کرے ہے انگلیوں سے کارِ مقراض
کفِ دست اس کا تسمہ سنگ ہے دل	نہ کہیے کیوں کر اس کو تیغِ قاتل
مپرس از سرمۂ دنبالہ دارش	کہ ناخن گیر شد ہنگامِ کارش
وہ جس کے روبرو ناگاہ آیا	اسے حیرت نے آئینہ دکھایا
اگر آوے بہ قصدِ موے چینی	کرے بینی تلک باریک بینی
نہ کھینچے خامۂ مُو اس کی تمثال	کہ ہے وہ عاشقوں کی ناک کا بال
ہے اس کے ہاتھ میں روزی کی مفتاح	خطِ خوباں کو دیتا ہے وہ اصلاح
نہیں ملتا وہ ہرگز صبح تا شام	کرے ہے گرم جوشی روزِ حمام
کرے جب خوش وہ کر کے مُشت مالی	نہ ہو عاشق کا کیوں کر کیسہ خالی
وہ ہے دنداں شکن باللہ مشہور	نہیں جوں دیگراں محتاجِ زنبور
کچھ اس میں غیرِ جلاّدی نہیں ہے	کہ اس کا کام فصادی نہیں ہے
ملا جب آئینے کو ایسا نائی	بنائی چار ابرو کی صفائی

سنے ہے مصحفی اب تو بھی فی الحال
منڈا کر سر کو ہو جا فارغ البال

مثنوی

در ہجو چارپائی

یہ جو ہم پاس چارپائی ہے — گور ہے یا کنواں یا کھائی ہے
پٹّی پائے تمام ناہموار — اور بانوں[1] کی جھول جیسے کہ غار
کج و وا کج ہے بس کہ وہ یکسر — نعشِ[2] گردوں کو رشک ہے جس پر
کیوں نہ دل داغِ غم سے ہووے تنگ — کہ درندے ہوئے ہیں مثلِ پلنگ
ڈھانچ ہے اس کا بس کہ اول جلول[3] — کہیں سَل بیٹھتی نہیں[4] ہے چوُل[5]
پائے ہیں کہنگی سے زرد و سیاہ — سیرووں[6] کا بھی حال پھر ہے تباہ
بس کہ ہے ڈھلڈھلی[7] و پوچ و لچر — چوُل کو روز چاہیے پچڑ[8]
اس کی کَستا ہوں جس دم[9] اَدوائن — اک ذرا اُس گھڑی تو جائے ہے تن
لیک جس وقت اس پہ پانو دھرا — جیسے کوئی کنوئیں میں آن گرا

---

1. بان = جس سے چارپائی بُنی جاتی ہے۔ 2. نعش گردوں = بنات النعش، یا وہ سات ستارے جو قطب کے چاروں طرف چکّر لگاتے ہیں اُنھیں کھٹولا بھی کہتے ہیں اور ان کی ترتیب میں بھی ناہمواری ہے۔ یہاں یہی تلازمہ ہے۔ 3. اول جلول = بے کینڈے، ناہموار۔ 4. سَل بیٹھنا = جمنا۔ ٹھیک بیٹھنا۔ 5. چول = پٹّی کا وہ حصّہ جو پائے کے سوراخ میں رہتا ہے۔ 6. سیروا بروزن گیروا، عرض میں دونوں پایوں کو ملانے والی پٹّی۔ 7. ڈھل ڈھلی = ڈھیلی ڈھالی۔ 8. پچڑ = لکڑی کا ٹکڑا جو پائے کو جمانے کے لیے چول میں دھانسا جاتا ہے۔ 9. ادوائن = بروزن اجوائن۔ پائینتی کی طرف کا حصّہ جس میں رسّی ڈال کر کستے ہیں تاکہ پلنگ سخت رہے۔

بافت[1] کی اس کی کیا کروں تعریف — تھا وہ با فندہ بس کہ ذاتِ شریف
چھید رکھتے ہزار بانوں میں — گر ہیں بے شمار بانوں میں
گر گدیلے[2] کا اس پہ ہو بستر — تو بھی چبھتی ہیں پھانسیں جوں نشتر
آ کے جب رات اس پہ سوتا ہوں — کر کے ضامن کو یاد روتا ہوں
یہ وہی ناتواں پلنگڑی ہے — جس کو کہتے ہیں لولی لنگڑی ہے
نہ چھپر کھٹ[3] سے اس کی نسل ملے — نہ کھٹولے[4] کی قسم کوئی کہے
بس کہ ہے تنگ گیر اس کا ناتو — اس پہ بیٹھے، پڑیں ہیں کاٹھ میں پانو
نیچے اونچے جو اس کے ہیں پائے — ہیں معطّل زمیں پہ پروائے
بس کہ دل اس سے خوش نہیں ہوتا — مارے غصّے کے میں نہیں سوتا
جب کہیں آدھی رات جاتی ہے — اونگھ کے مارے نیند آتی ہے
کیوں کے اس پر کوئی دوگانہ[5] ہو — گر رہے[6] مجھ سا جو یگانا[7] ہو
طول میں میرے قد سے بھی کم تر — عرض میں میرے تن سے بھی لاغر
ایسی جب تنگ چارپائی ہو — بس مسافر کی کیا سمائی ہو

اب بھی جانے تو گھر کو خالی کر
مصحفی اس سے بوریا بہتر

☆☆☆☆

---

[1] بافت = بناوٹ۔ [2] گدیلا = روئی کا بھرا ہوا گدا۔ [3] چھپر کھٹ = بڑا پلنگ جس کے چاروں پایوں میں اوپر کی طرف بھی ڈنڈے اُٹھا کر چھت کا چوکھنڈا بنا دیا جاتا ہے اور اس پر مچھر دانی وغیرہ تان لیتے ہیں۔ [4] کھٹولا = پلنگ سے چھوٹا۔ [5] دوگانہ ہو = دو ہو کر سوئے۔
[6] گر رہے = آ پڑے۔ [7] یگانہ = تنہا، مجرد۔

مثنوی

درصفتِ اجواین[1]

کیا کروں وصف تیرے اجواین — تو ہے آرامِ جان و راحتِ تن
باؤگولے[2] کا تو نے سر توڑا — رنج نے تیرے ہاتھ گھر چھوڑا
اشتہا تجھ سے صاف ہوتی ہے — موت سر کو پکڑ کے روتی ہے
بھوک لگتی ہے تجھ سے صبح و شام — تب تو ہے نانخواہ تیرا نام
سوءِ ہضمی کو دیوے ہے تو شفا — اِمتلا تجھ سے ہے اسیرِ بلا
تجھ سے فوراً ڈکار آتی ہے — گُلِ جاں پر بہار آتی ہے
تیسرے درجے ہے تری تیزی[3] — سونٹھ حدّت کو تیری کب پہنچی
گاہ کھولے تو سُدّہ اَمعا[4] کا — گہ کرے بلغمِ لزج[5] کو فنا
بلغمی صفرا جس کو ہوتا ہے — تیرا اک دانہ اس کو کھوتا ہے
ہاتھ پاؤں میں جس کے ہو گٹھیا — ہے ترا تیل اس کا عقدہ کشا
تیری گرمی میں کچھ نہیں ہے قصور — تجھ سے سردی کا دردِ سر ہو دور

---

[1] اس میں طبّی اصطلاحات نظم ہوئی ہیں۔ [2] باؤ گولا = ریاح
[3] از روے اصول طب اجوائن درجہ سوم میں حار دیابس (گرم خشک) ہے۔ [4] آنتوں کا سُدہ
[5] لزج = گاڑھا چیپ دار بلغم

بس کہ اس کی نصیح کی ہے دوا　　دردِ اورام تجھ سے پاوے شفا
وقتِ حاجت ترے عرق کا قطور[1]　　کرتا ہے دردِ گوش[2] ریحی دور
ہڑ کے پانی نے کی بہت تیزی　　پر نہ پہنچا وہ گرد کو تیری
نت تو لذّت ہر ایک کی چکھے　　عرقِ گھی کوار میں بھی تو ہے
کوئی تجھ سے بناوے بچلونا　　باندھ لاوے کوئی ترا دونا
تو نہ چوُرن میں ہو اگر داخل　　پھر وہ چورن بنے تو کیا حاصل
دے جو اجزا کو کوٹ چھانتے ہیں　　جزوِ اعظم تجھی کو جانتے ہیں
قدر فلفل کی تیرے آگے نہیں　　حق نے دی ہے وہ تیزی تیرے تئیں
تیرے دو دانے جو کوئی کھاوے　　دو ہیں عمرِ دوبارہ وہ پاوے
درد دکھ میں جو ہووے تو درکار　　جھاڑ اور پھونک کر تجھے یکبار
بعضے پانی کے ساتھ کھاتے ہیں　　بعضے سوکھی ہی پھانک جاتے ہیں
الغرض خشک و تر ہے تو نافع　　ہیضۂ محتبس[3] کی بھی دافع
تجھ کو کب پہنچے زنگی[4] ہڑ بھونڈی　　پیپلا[5] موڑ ہے تری لونڈی
بس کہ گرمی ہے تیری بر سر کار　　ترپھلے کا بھی سرد ہے بازار
گر تری منفعت کو پائے کوئی　　نہ مربّے کو ہڑ کے کھائے کوئی
جان تیرے عرق کی قیمت ہے　　عرقِ بادیاں فضیحت ہے
بس کہ تو ہے محلّلِ بلغم[6]　　تجھ سے کٹتا ہے نت دلِ بلغم

---

[1] قطور=قطرہ ٹپکانا [2] دردگوش ریحی = کان کا درد جو ریاح کے باعث ہو۔ [3] ہیضہ محتبس = مرض کی ایک قسم جس میں ہیضے کا احتباس ہو جاتا ہے اور زہریلا مادہ باہر نہیں نکلتا۔ [4] زنگی ہڑ = ہلیلہ سیاہ ایک دوا کا نام [5] پیپلا موڑ (واؤ معروف) پیپلی کی جڑ' یہ موڑ غالباً مول (मूल) کی تدبھو شکل ہے۔

[6] بلغم کو تحلیل کرنے والی۔

منفعت تجھ میں ہیں نہفتہ ہزار — ریگِ صحرا سے جن کا ہو نہ شمار
نخلِ صحت کو تن میں بوتے ہیں — تیرے دو دانے دُکھ کو کھوتے ہیں
تو غریبوں کے کام آتی ہے — رخ صحت انھیں دکھاتی ہے
کوئی کھا جائے گر دو لقمے زیاد — اس کو کردے ہے معدے میں تو اماد[1]
تیرے دانے کو مرغ اگر کھاوے — سنگ دانہ ہو آب بہ جاوے
قِسم تیری جو ہے خراسانی[2] — اور ہے اس میں بھی تن آسانی
چوٹ کو اس کی سینک جو دیوے — پوٹلی اُس کی درد چُن لیوے
گر سٹھورے[3] میں ہو نہ دخل ترا — نہ زچہَ کو ہو اُس سے نفع ذرا
اور جو کہتے ہیں تو نہ ہو مخلوط — عقل ہووے نہ فربہ و مضبوط
بس کہ تو ہے عزیزِ دیں داراں — از برائے شفائے بیماراں
وے جو قرآں کریں ہیں اکثر ختم — رمضاں میں کریں ہیں تجھ پر ختم[4]
بعد ازاں ہاتھوں ہاتھ پیر و جوان — تجھ کو لے جاتے ہیں تبرّک جان
چاٹے کوئی ترے جو پتّے ذرا — باغ کے باغ پھر تو کردے ہوا
کھاوے حیواں اگر ترے اشجار — نہ نباتات کا رہے آثار
میں تو لاؤں اکھاڑ پاؤں جہاں — بیج و بُن سب تری ہے داروے جاں
لے کے دو پھول جو ترے کھاوے — غنچہَ طبع اس کا کھل جاوے

---

[1] اماد = غالباً آمادن سے مرکب ہضم کردینا۔ [2] اجوائن خراسانی اچھی سمجھی جاتی ہے۔

[3] وہ مشروب جو زچہ عورتوں کو پلانے کے لئے بنایا جاتا ہے اور انہیں طاقت بحال کرنے کے لیے زائیدگی کے بعد دیا جاتا ہے۔ [4] رمضان میں شبینہ کرکے اجوائن پر ختم کرتے تھے اور وہی تقسیم کرتے تھے اس کا سبب غالباً یہ ہوگا کہ راتوں کو جاگنے اور افطار میں معمول کے خلاف اشیاء کھانے کی وجہ سے معدے میں گرانی ہوجاتی ہے جس کے لیے اجوائن بہت نافع ہے۔

باغِ جنت میں گر نہ ہووے تؤ ۔۔۔ میں تو ہرگز کروں نہ اودھر رؤ
کیوں کہ واں کے جو کھایئے میوے ۔۔۔ کون اصلاح[1] ان کو پھر دیوے؟
ہو زباں تیز پات تا نہ مری ۔۔۔ کس طرح کر سکوں میں وصف تری
مصحفی کو جلا دیا تو نے ۔۔۔ قطعہ شعر کا یہ صلا دیا تو نے

تیری ہمت پہ آفریں کہیے
جانِ آدم ترے تئیں کہیے

مثنوی جذبۂ عشق[2]

عشق ہے جوہرِ محیطِ جہاں ۔۔۔ عشق ہے جسم آدمی میں جاں
عشق ہے کائنات کا مفہوم ۔۔۔ گر نہ ہو عشق تو ہیں سب معدوم
عشق ہے شمعِ انجمن افروز ۔۔۔ عشق سے ہے یہ گرمی شب و روز
عشق سے ہے زمین کا کوہاں ۔۔۔ تا قیامت بہ زیرِ بارِ گراں
عشق سے کوہ پابہ جا ہے ۔۔۔ عشق سے اضطرابِ دریا ہے
عشق سے آسماں ہے سرگرداں ۔۔۔ عشق سے ہے یہ گردشِ دوراں
عشق سے ہے سرِ فلک پُرشور ۔۔۔ عشق سے جنّ و انس کا ہے ظہور
عشق سے ہے دوام عالم کا ۔۔۔ عشق سے ہے نظام عالم کا
عشق ہے باعثِ قوامِ جہان ۔۔۔ عشق ہے چاشنی شیرۂ جان

---

[1] اصلاح سے مراد اُن کی مضرت کو روکنے والی چیز۔

[2] یہ مثنوی دیوان اوّل کے مخطوطات رامپور، بنارس اور دیوبند میں نہیں ہے۔ نسخہ پٹنہ و لکھنؤ میں شامل ہے۔ اس کا متن خدابخش کے نسخے پر مبنی ہے اور تصحیح نسخہ لکھنؤ یونی ورسٹی سے کی گئی ہے۔

عشق سے آبِ بحر جاری ہے　　عشق طوفانِ بے قراری ہے
عشق کی ہر جگہ ہے شان نئی　　عشق رکھتا ہے آن بان نئی
عشق ہے آشنائے خستہ دلاں　　عشق ہے مدعائے خستہ دلاں
عشق سے ہے محبت زن و مرد　　عشق ہے درمیاں میں جوہر فرد
عشق سے دل میں درد ہوتا ہے　　عشق خود آہِ سرد ہوتا ہے
عشق سے سینہ چاک ہے گُلِ صبح　　عشق سے ہے فغانِ بلبل صبح
عشق سے ہے فروغ لالۂ باغ　　عشق سے سینۂ چمن ہے داغ
عشق سے یار ہووے بیگانہ　　عشق ہر شمع کا ہے پروانہ
عشق سے آشنا نگاہ ہوئی　　عشق سے دل کو دل میں راہ ہوئی
عشق سے کافر آکے ہو دیں دار　　عشق سے پہنے اہلِ دیں زنّار
عشق سے دیدہ ہو تماشائی　　عشق سے جاوے عقل و دانائی
عشق سے خونِ مردہ کھاوے جوش　　عشق سے ہوشیار ہو بے ہوش
عشق سے گبر بھی مسلماں ہے　　عشق عاشق کا دین و ایماں ہے
عشق ہے وہ بلائے خانہ خراب　　جس سے طاقت کا زہرہ ہووے آب
عشق وہ زخمِ تیغِ خوش خم ہے　　جس کا الماسِ سُودہ مرہم ہے
عشق سے ہے نظارۂ درِ بام　　عشق سے عہدِ صبح، وعدۂ شام
عشق سے ذوقِ کوچہ گردی ہے　　عاشقی اور پائے مردی ہے
گرچہ جلّاد عشق ہے سفّاک　　قابلِ عشق کب ہے ہر ناپاک
عشق کب سب کے تیغ مارے ہے　　عشق عاشق کا سر اُتارے ہے
عشق میں مرد سر لگاتے ہیں　　عشق میں جی پہ کھیل جاتے ہیں

عشق سے قیس سر پٹک کے موا | عشق سے کوہ کن کا خون ہوا
عشق گر جی کسی کا لیتا ہے | اس کو پھر جان تازہ دیتا ہے
زندہ و مردہ زندہ ہے عاشق | پروہ جو عاشقی میں ہو صادق
عشق ہے جانِ طالب و مطلوب | عشق ہے جذبِ جاذب و مجذوب
عشق کے جذب ہیں بہ چندیں طور | وہی سمجھے جو دیکھے کرکے غور
نہ فقط خس کو انچ لیتا ہے | عشق لوہے کو کھینچ لیتا ہے
بر سرِ مطلب اب میں آتا ہوں | عشق کا جاذبہ سناتا ہوں

خاکِ دہلی میں اِک جوانِ حسیں | صاحبِ وضع، صاحبِ تمکیں
تھا شکارِ خدنگِ کاریِ عشق | دل میں رکھتا تھا بے قراریِ عشق
رات دن اشک جاری رہتے تھے | اس کی چشموں سے چشمے بہتے تھے
دل میں رکھتا تھا بسکہ پنہاں درد | گلِ سرخ اُس کا ہو گیا تھا زرد
گرچہ تھا جوہری وہ پاک نژاد | عشق تھا اس میں جوہرِ فولاد
عاشقِ زار اپنی زن پر تھا | بلبل اس خانگی چمن پر تھا
نہ وہ زن تھی رقم جواہر کی | کیا کروں وصف اس کے زیور کی[1]
حسن ایسا کہ کہیے لعبتِ چیں | نور ایسا کہ جو نہ ہووے کہیں
سطح سینہ تھا مثل سطحۂ آب | چھاتیاں اس میں دو بشکل حباب
رنگ کندن سا جو دمکتا تھا | جس میں جوبن پڑا جھلکتا تھا
دی تھی یہ نازکی نے اس کو بہار | جس سے ہر عضو اس کا تھا گلزار

---

[1] لکھنؤ: حسن و زیور

پنجہ مرجان سے باج لیتا تھا — گل سے عارض خراج لیتا تھا
کیا کہوں غبغب اور گلو کی صفا — جس کا روکش نہ تھا یدِ بیضا
بس کہ ساعد میں تھی صفائے بلور — باج دیتے تھے جس کو ساعد حور
دیکھ کافر کی شوخیِ رفتار — دنگ رہتے تھے مردمِ بازار
اس کی چتون کی وہ نگاہ تھی قہر — جس کو کرتا سلام سارا شہر
تس پہ وہ برچھیاں نگاہیں تھیں — جس سے مژگاں تمام آہیں تھیں
تھی وہ اس خوبی و صفا کے ساتھ — ہوتی میلی نظر سے جس کی گات
دیکھ وہ اس کے گوہرِ دنداں — تھا بہت اپنے کام میں حیراں
جا کے بیٹھی تھی لعل سے لب پر — لعل سے اُٹھ گئی تھی اس کی نظر
اس کے بن دیکھے رہ نہ سکتا تھا — رات دن اس کے منھ کو تکتا تھا
دل نہ لگتا تھا جب کہ اور کہیں — قبلہ کرتا تھا اس صنم کے تئیں
گاہ پاؤوں پہ سر کو رکھ دیتا — گاہ چٹ چٹ بلائیں ہی لیتا
گاہ جاتا لپٹ گلے سے وو ہیں — چومتا گہ لب اور گاہ جبیں
گہ جھٹک ہاتھ کو بٹھا دیتا — گہ لپٹ کر اسے لٹا دیتا
گاہ کرتا وہ جو کہ ہے دستور — چومتا گاہ نرگسِ مخمور
گاہ اس لب سے بوسہ پاتا تھا — گاہ دشنامِ تلخ کھاتا تھا
دل سے کاڑھے تھا اپنے عشق کی خوز — اس طرح محوِ حسن تھا شب و روز
عشق کی طبع میں مدارا تھیں — گالی کیا دھولیں بھی گوارا تھیں
عرصہ کرتا تھا بس کہ اس پر تنگ — دیکھ زن اس کے چاہنے کے ڈھنگ
گاہ ناخوش تو گاہ خوش ہوتی — گاہ ہنستی تو گاہ پھر روتی

اس سے کہتی کہ کیا بلا ہے تو　　کیوں بلا سا مجھے لگا ہے تو
جوں جوں اس سے لگا چلا جاتا　　وصل میں ہجر کا مزا پاتا
بحرِ الفت میں تھا جو یکسر غرق　　وصل اور ہجر میں نہ پاتا فرق
وصل کی اس پہ جو گھڑی گذری　　ساعتِ ہجر سے کڑی گذری
مثل ماہی کے گرچہ تھا تہ آب　　پر نہ تھا اس کی تشنگی کا حساب
دن بدن چاہ بڑھتی جاتی تھی　　مرگ دیکھ ان کو مسکراتی تھی
لیک فارغ زفتنہ سازیِ چرخ　　غافل از کارِ حیلہ بازیِ چرخ
عیش و عشرت میں پاکے ان کے تئیں　　کیا دونوں پہ چشم بد نے کمیں
یوں جدائی اگر نہ ٹھہرائی　　سببِ ہجر موت ہو آئی
زوجۂ جوہری تھی نرم اندام　　پنبہ لیتی تھی اس سے نرمی دام
گر ہوا اُس بدن کو لگ جاتی　　برگِ گل کی طرح وہ تھرّاتی
نازکی کے سبب سے زہرہ جبیں　　پانو رکھتی نہ تھی بروے زمیں
کبھی گر چلتی جوں نسیمِ بہار　　تہِ پا اُس کے سبزہ تھا سر خار
اِس نے جب خوب سا فشار دیا　　اس نے گرمی میں آبخار کیا
لب پہ تبخالہ یوں ہوئے اس دم　　جس طرح برگِ گل پہ ہو شبنم
ووہیں کمھلا گئی وہ جیسے پھول　　گئی کمھلا کے اپنی سُدھ بُدھ بھول
حال اپنا سبھوں کو دکھلا کر　　بسترِ غش پہ گر پڑی جاکر
چشمِ بیمار اس کی ہو کے نزار　　بن گئی رشک نرگسِ بیمار
حلقے آنکھوں کے سب نکل آئے　　دیدے کچھ بے خطر اگل آئے
رنگ ہلدی سا ہو گیا پیلا　　چہرہ آنے لگا نظر نیلا

گلِ عارض پہ پھر گئی سبزی — زہرِ الفت نے یہ سرایت کی

اس کی ماں بہنیں اور ہمسائیں[1] — دیکھ کر اس کو سخت گھبرائیں

کوئی بولی ہے اس کو دردِ جگر — کوئی بولی اسے لگی ہے نظر

کوئی بولی کہ اس کو سکتہ ہوا — کوئی بولی کسی نے سحر کیا

کوئی بولی کھڑی تھی کوٹھے پر — پڑ گئی ہے کسی کی اس پہ نظر

کوئی بولی پری کے سائے تلے — آگئی ہے کہیں یہ بال کھُلے

کوئی بولی بلاؤ سیانے کو — کوئی بولی اسے فلیتہ دو

کوئی بوی کہ دَوڑ ہی جاؤ — مرچیں[2] جاکر کہیں پڑھا لاؤ

کوئی بولی کہ صدقہ دو فی الحال — کوئی بولی دکھاؤ جاکر فال

کوئی بولی کہ بید[3] کو لاؤ — اس کی ناڑی[4] تو اس کو دکھلاؤ

الغرض تھی بہت یہ ہانک پکار — نہ کھُلے تھا کسی پہ یہ اسرار

کہ یہ نازک بدن جو کمھلائی — یک بہ یک اس پہ کیا بلا آئی

بسکہ ہے نت مزاجِ حسن غیور — نہیں راضی بہ یک نظارۂ دور

نہ کی یہ[5] اختلاط چسپاں ہو — یک دگر دامن اور گریباں ہو

وہ جو خلقت میں زن ہیں نرم اندام — جامِ صحت سے کم ہیں بے آشام

دیکھ شوہر نے اس کا حال زبوں — کیا آنکھوں کو غرقِ لجّۂ خوں

---

۱ ہمسائی کی جمع ہمسائیں بہ اضافہ ین بنائی ہے اور ایک یا حذف کردی ہے علاقہ روہیل کھنڈ کی بولی میں یہ عام ہے۔
قائم چاند پوری: کچھ حرمزدگییں اپنی بھی تجھے یاد ہیں شیخ؟

۲ نظر بد کا اثر زائل کرنے کے لیے مرچیں پڑھ کر آگ میں جلائی جاتی ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ اگر جلنے میں دھسک پیدا نہ ہو تو نظر ہونا ظاہر ہو جاتا ہے۔

۳ وید: آیورویدک معالج ۴ ناڑی=نبض ۵ کذا فی الاصل

جو دوائی کسی نے بتلائی　　وو ہیں بازار سے وہ منگوائی
فال جا کر کہیں دکھاتا تھا　　نقش لکھوا کہیں سے لاتا تھا
کبھی بامہن[1] سے پوچھتا کہ یہ ماہ　　آ گیا کیوں کسوف میں ناگاہ
کبھو رمال کے کنے جاتا　　اس سے ہر بار قرعہ پھنکواتا
کبھی جوگی کوئی جو پاتا تھا　　گھر میں لاکر اُسے دکھاتا تھا
بہرِ تیمارِ آں مہِ دل کش　　تھی بہت اس کی کہربا آتش
الغرض جو جتن تھے سب وہ کیے　　لیک بیمار مرگ کیوں کے جیے
بعد یک چند وہ زنِ بیمار　　اسی حالت میں مر گئی اک بار
طائرِ روح کر گیا پرواز　　ہو گیا صعوہ صیدِ چنگلِ باز
صرصرِ مرگ ناگہاں آئی　　چمنِ حسن میں خزاں آئی
چہرہ اُس کا جو رنگ میں تھا وَرد[2]　　ہو گیا برمثالِ لالۂ زرد
لعل لب تھے جو شکلِ لعلِ مذاب[3]　　جوں وہ ہو گئے بے آب (کذا)
دستِ رنگیں جو اُس کا تھا دل کش　　دی لگا اُس نے اور ہی آتش
غنچے فندق کے تھے جو مرجھائے　　پھول رنگِ حنا کے کمھلائے
دُرِ دنداں میں وہ صفا نہ رہی　　چشم و ابرو کی وہ ادا نہ رہی
ہو گئی چشم سے نظر رُخصت　　چھا گئی اس میں صورتِ حیرت
کر کے[4] پابوس اُٹھ گئی رفتار　　ہاتھ ملتی سی رہ گئی اک بار
بن گئی جعد اُس کی صورت آہ　　ہو گیا روز زلف کا بھی سیاہ

---

[1] بامہن = برہمن۔ [2] ورد = گلاب کا پھول۔ [3] لعلِ مذاب = پگھلا ہوا لعل
[4] اصل: کوکری

گات میں اس کی وہ نہ لوچ رہا　　نور مہ دیکھ اس کو سوچ رہا
اور سے اور ہو گئی صورت　　بن گئی جیسے کاٹھ کی مورت
دیکھ یہ شکل اس کی آخرِ کار　　تھے عروسی جو اس کے ہار سنگار
سن کے فریادِ گریہ و زاری　　صرفِ ماتم ہوئے بہ یک باری
بن گئی میلِ سرمہ صورت آہ　　ہو گیا سرمہ داں کا روز سیاہ
سر پہ مسّی نے اپنے ڈالی خاک　　برگِ پاں نے کیا گریباں چاک
پڑے آویزۂ طلائی ٹوٹ　　لی وو ہیں اوربسی[1] نے چھاتی کوٹ
بالیاں کانوں سے جو لی تھیں اُتار　　چشم حیراں بنی تھیں نرگس وار

تھے کرن پھول وہ جو مثل چراغ　　غم فرقت میں ہو گئے تھے داغ
جھومکے وہ جو جگمگاتے تھے　　سر افسوس کو ہلاتے تھے
یک طرف دست بند، بازو بند　　حلقہ غم میں تھے اسیرِ کمند
یک طرف کانوں کی وہ چودانیں[2]　　پڑی آٹھ آٹھ آنسو روتی تھیں
آنکھیں چھلّوں کی بھر بھر آئی تھیں　　دل پہ بانکوں[3] نے بانکیں[4] کھائی تھیں
انگلیاں ہو گئی تھیں یوں عریاں　　جیسے شاخیں گلوں کی وقت خزاں
وہ جو ہوتا ہے زیور اک اودراج　　سربسر لٹ گیا تھا اس کا راج
دیکھ چنپا کلی کو خوں روتی　　سر پٹکتے تھے مانگ کے موتی

---

[1] اوربسی = ایک زیور کا نام۔ [2] چودانی' کے آویزے جس میں موتیوں کے چار چار دانے ہوتے ہیں۔
[3] بانک = بازوبند' جوشن۔
[4] بانک = ٹیڑھ خمیدگی مراد چوٹ' ضرب

تھا جو تعویذ سر کے بالوں پر　　کسی کو نے پڑا تھا خستہ جگر

چاند رہتا تھا وہ جو زیب جبیں　　نعل ماتم بنا تھا ہو کے حزیں

آرسی تھی جو رونق ابہام[1]　　بن گئی تھی وہ غم سے داغ تمام

جُگنی[2] جگنو سی جو چمکتی تھی　　اشک خوناب ہو ٹپکتی تھی

تھے کڑے ہاتھ کے جو ہیرا نما　　پیس کر کھا گئے تھے وہ ہیرا

جوڑی ایک اور تھی جو شیر دہاں[3]　　دستِ شیرِ اجل سے تھی نالاں

کرکے پانوؤں کی اُنگلیوں کی یاد　　بچھوے[4] کرتے تھے جوتی میں فریاد

تس پہ اَنوٹ[5] کا تھا جو حال زبوں　　ہو گیا تھا برنگ حلقہ نگوں

گُلِ ماتم کھلے تھے شاخ بہ شاخ　　مُرکیوں[6] کے ہوئے تھے دل سوراخ

نے وہ توڑے[7] کہ تھے نے وہ چھڑے[8]　　روتے تھے لگ بہم گلے سے کڑے

جب سے کنگن گیا تھا ہاتھ سے چھوٹ　　موتیوں کی گئی تھی مالا ٹوٹ

وہ جو پانو کے اس کے تھے خلخال　　سوکھ کر ہو گئے تھے رشک ہلال

اس سوا اور بھی جو تھا زیور　　میری حدّ شمار سے باہر

اس کے ماتم میں گرمِ شیون تھا　　سینہ ہر یک کا شکل روزن تھا

زر و زیور کو جب ہوا یہ غم　　اور کھنچا[9] دور نازنین کا غم

گھر میں اس جوہری کے دھوم پڑی　　تھی جو غم کی گھٹا وہ جھوم پڑی

پہنچی گھر گھر برادری میں خبر　　کہ گئی آج اس کی جورو مر

---

[1] ابہام = انگوٹھا۔ [2] گلے کا ایک زیور۔ [3] ہاتھ میں پہننے کے کڑے جن کے ملنے والے دونوں سروں پر شیر کا منھ بنا ہو۔ [4] بچھوے پانوؤں کی انگلیوں میں پہننے کا زیور۔ [5] انوٹ = پیر کے انگوٹھے میں پہننے کا زیور۔ [6] مُرکی = کانوں کے چھلّے (عموماً مردوں کے) [7] توڑے = ہاتھوں کا زیور۔
[8] چھڑے = پیروں میں پہننے کے زیور۔ [9] دور کھنچا = فارسی محاورے کا ترجمہ 'بڑھ گیا' فزوں ہو گیا۔

تھیں زمیں قوم کی جو پیر وجواں آئیں سر پیٹتی بہ آہ و فغاں
سر سے چادر اتار کر روئیں ہو کھڑی داڑھیں مار کر روئیں
سن کر مردوں نے بھی سر اپنا دُھنا جب خبر گو سے حرف کال[1] سنا
تھے جو واں خویش وقوم یک دیگر چلے کپڑے پہن کے اُس کے گھر

اتنے میں ارتھی کا جو تھا ساماں لے کلاوے[2] سے تا بہ بیڑۂ پان
ہوئے حاضر وہیں بہ یک باری کی اٹھانے کی اُس کے تیاری
ڈال ارتھی پہ اُس پری رؤ کو سروِ گل رؤ بُتِ سمن بو کو
لے چلے کر کے جب کہ اطلس پوش یک دگر خویش وقوم دوش بہ دوش
نالہ فریاد، دل خراشی تھی آنسوؤں سے گلاب پاشی تھی
دم بہ دم ''رام رام ست'' کی صدا جائے تھی تا بہ گنبدِ خضرا
قدم اس دھج سے اُن کے پڑتے تھے گویا بخت اور اجل سے لڑتے تھے

پہنچے جمنا سے جب کہ ہو کر پار بیچ مرگھٹ کے بادلِ افگار
اس دم اس نازنیں کو نہلا کر غوطے پانی میں کتنے دلوا کر
ڈھیر میں لکڑیوں کے رکھوایا آگ دی اور اُن کو بھڑکایا
شعلہ اک گرم آسماں کو گیا نہیں معلوم وہ کہاں کو گیا
بعد شعلے کے اک دھواں سا اٹھا اس زمیں سے وہ آسماں سا اٹھا
کیا کہوں میں غرض وہ رشکِ قمر ہو گئی جل کے وہیں خاکستر

---

[1] حرفِ بد، بری خبر سناؤنی۔ [2] لال دھاگے جن سے مردے کی ارتھی باندھی جاتی ہے۔

آگ نے جو اُسے جلایا تھا — اپنے تئیں شعلہ اک بنایا تھا
یعنی حسن اُس کا آگ میں جو ملا — آگ کا شعلہ تھا یدِ بیضا
آگ کی لَو جو اُس کی لٹ کو لگی — وہ بدن سے لپٹ کے اُس کے جلی
گرچہ خود شمع تھی وہ جانانہ — جل گئی لیک مثل پروانہ
تھے جو اعیان وہ تسلّی کر — گئے سب اٹھ کے اپنے اپنے گھر
شب نہ گذری کہ دل اُدھر جو کھنچا — جاکے بستر پہ وہ مریض گرا
بارے جوں جوں بہ تعزیت داری (کذا) صرف جو تھا بہ حال بیماری
تھی جو اس کے رسوم ماتم کی — بارہ دن تک وہ رسم پیہم کی
تیرھواں دن ہوا جوہیں یک بار — آئی پھر وہ ہیں مرگِ عاشقِ زار
کیا کہوں اس جواں کا میں احوال — عشق تھا بس کہ اس کے نت دنبال
جوہیں ماتم سے ٹک فراغ ہوا — سینہ فرقت سے داغ داغ ہوا
سو بھی فرقت سو کس مصیبت کی — ہو نہ امید جس سے وصلت کی
جی رُکا جان پر بلا آئی — جی میں مرنے کی اپنے ٹھہرائی
اپنے یاروں سے یوں کہا جاکر: — اک غریبی سے ہو کے خاک بسر
کہ میں ہوتا ہوں تم سے رخصت آج — ہے مرے دل پہ داغ حسرت آج
اپنے معشوق پاس جاتا ہوں — تم سے یہ بات کہہ سناتا ہوں
مجھ کو اب زیست خوش نہیں آتی — نظر آتی ہے جان ہی جاتی
ہے خبر شرط کہہ چلا تم سے' — کہیو جو پوچھے ماجرا تم سے
کہہ کے یہ بات اپنے گھر تو گیا — تھا جدھر روے دل اُدھر کو گیا
آکے اس خواب گہ میں بادلِ زار — تان چادر کو سو رہا اک بار

کھنچ گئی روح جانبِ محبوب — ہو گئے ایک طالب و مطلوب

نہ جدائی کا کچھ رہا دھڑکا — ہو گیا صبح وصل کا تڑکا

اس میں سوتے ہوئے جو دیر ہوئی — بولی ماں یوں: اسے جگاؤ کوئی

اک نے جا کر کے جو ہیں منھ کھولا — نہ ہلے لب نہ منھ سے کچھ بولا

مردنی رخ پہ آشکار ہوئی — دوڑیو دوڑیو پکار ہوئی

اک تو ماتم سرا وہ خود گھر تھا — ماتم ایک اور بھی ہوا اس جا

دیکھ اس جوہری کا مردہ جمال — ہو گیا سب جواہروں کا یہ حال

نیلم اس غم سے داغ درد ہوا — رنگ پکھراج کا بھی زرد ہوا

ہو کے ماتم میں اس کے اشک فشاں — خاک پر لوٹا گوہرِ غلطاں

سرخ یاقوت تھے سو خوں روئے — موتی سب اشک آب گوں روئے

تھا جو وہ تانبڑہ[1] بہ حال تباہ — ہو گیا رنگ سرخ اُس کا سیاہ

رنگ لہسینے[2] کا سپید ہوا — کھا کے فیروزہ زہرِ غم کو موا

سر پہ اپنے صدف میں ہو غم ناک — ڈالی دُرِ یتیم نے بھی خاک

کوفت غم کی جو تھی کمیدک[3] پر — جلوہ کرتا تھا وہ بہ رنگِ دِگر

اشک مونگوں[4] کے کچھ نہ تھے گلگوں — بعضے ہیرے کا بھی جگر تھا خوں

جس طرح اشک[5] صرف کے ہمراہ — خوں کی اک پُٹھ[6] نمود ہو ناگاہ

روئیں سر جوڑ موتیوں کی لڑیں — عقد رشکوک ٹوٹ ٹوٹ پڑیں

---

[1] تانبڑا ایک قیمتی پتھر جو یاقوت کی طرح سرخ ہوتا ہے۔ [2] لہسنیا 'زردی مائل سفید رنگ کا ایک پتھر جسے عربی میں عین الہرۃ اور انگریزی میں CAT'S EYE کہتے ہیں۔ یہ لنکا اور مالابار کے علاقے میں پایا جاتا ہے۔ [3] کمیدک = یہ بھی ایک قیمتی پتھر ہے۔ [4] مونگا سرخ رنگ کا قیمتی پتھر مرجان۔

[5] غالباً اشک محض مراد ہے۔ [6] پٹھ یا پٹ = جز' چھوٹا ریزہ

تھا جو الماس کا بڑا دانا آپ وہ زہر کا تھا پیمانہ
کہ اسے پی کے دو ہیں مرجاوے قصہ کوتہ کرے گذر جاوے
لعل لوٹیں تھے خوں میں جوں بسمل چُنّیوں[1] کے چھدے پڑے تھے دل
یشم[2] کی تھی جو واں کوئی تختی بن گئی تھی وہ لوحِ بدبختی
سن کے یہ ماجرائے جاں کاہی رنگِ یاقوتِ زرد تھا کاہی
تھی ترازو جو وزنِ گوہر[3] کی چھاتی کرلی تھی اس نے پتّھر کی
لیکن اس گل کا جب یہ حال سنا سوکھ کر غم سے ہو گئی کانٹا
سب جواہر کو تھا جو اس کا غم بن گئے تھے وہ صورتِ ماتم
پتّھروں کا ہو جب یہ حال تباہ آدمی کیوں کے ہو نہ جامہ سیاہ
الغرض جب خبر یہ سب کو ہوئی کہ موا وہ بھی جس کی جورو موئی
سن کے اس واقعہ کو پیر و جواں شکل تصویر رہ گئے حیراں
بڑے چھوٹے سب اس میں گھبرائے تھے جو نزدیک دو ہیں گھر آئے
کوئی بولا کہ زہر کھا کے موا کوئی بولا کہ یہ تو قہر ہوا
سن کے اس ماجرے کو آخرکار ہو گیا بند جوہری بازار
جوہری سارے ہو کے خستہ جگر تیرھویں دن پھر آئے اس کے گھر
گھر سے مردے کو اس کے اٹھوا کر ارتھی کو ہاتھوں ہاتھ لے جا کر
اسی صورت بشکلِ زود از زود جا کے مرگھٹ کے بیچ کر کے فرود

---

[1] ریزہ لعل [2] یشم = یشب ہلکے سبز رنگ کا پتھر جس کی تختی گلے میں ڈالتے ہیں یہ خفقان کے لیے نافع کہی جاتی ہے۔ [3] یعنی موتی تولنے کی، اگلے شعر میں لفظ کانٹا استعمال ہوا ہے بہ طور ایہام [4] نے بہ معنی بانسری استخوان کی طرف مضاف ہے۔

اس کو بھی آگ کے حوالہ کیا — ہر نئے استخواں نے نالہ کیا
آگ میں جس طرح جلے ہے شمع — جل گیا یہ بھی واں میان جمع
سچ ہے ہاں عشق کی ہے وہ آتش — جس کا شعلہ ہے تند اور سرکش
ذرّہ اس کا پڑے جو خارا پر — جل کے ہو جائے وہ بھی خاکستر
آئے پھر گھر کو خویش و بیگانہ — جل گئے تھے جو شمع و پروانہ
قصہ یہ شہر میں ہوا مشہور — آیا سب کی زبان پر مذکور
بات مجھ تک بھی یہ جو ہیں پہنچی — حد کڑھا اس گھڑی تو میرا جی
لیک انجام عشق تھا جو یہی — اس کی ہمّت پر آفریں میں کہی
عاشقی میں یہ تازہ تھا مضموں — میں نے اس کے تئیں کیا موزوں
کوئی عاشق جو اس کو دیکھے گا — دیوے گا طبع مصحفی کو دعا
کہ عجب قصہ مختصر ہے یہ — لعل بل پارۂ جگر ہے یہ

ہوئی یہ مثنوی جو مجھ سے تمام
جذبۂ عشق میں نے رکھا نام

☆☆☆☆☆